

شہ حب کی پہلی بارش

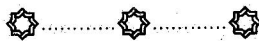


نازیہ کنول نازی

جدا ہونے کا اندیشہ جدا ہونے سے پہلے تھا
وہ مجھ سے انتہائی خوش، خفا ہونے سے پہلے تھا
جنوں کا دور گزرا تو مجھے بھی بھول بیٹھا وہ
نمازِ عشق تھا لیکن قضا ہونے سے پہلے تھا



چلو اس شہر چلتے ہیں
چلو تقدیر کو پھر آزماتے ہیں
چلو ہم ریت سے پیروں کے جا کر نقش چلتے ہیں
ہواؤں پر لکھی مگر کوشیوں کو آج سننے ہیں
چلو پلکوں سے نیلے اور شہری ریشی سے خواب بنتے ہیں
ہتھیلی پر کس نے لکھ دیا تھا بس ہونٹوں سا
اور ان آنکھوں کے دریچوں میں ادھورا خواب رکھا تھا
سماعت ان چھوٹی سی آہٹوں کی زد میں ہے شاید
جبھی تو دھڑکنیں چپ ہیں، جبھی تو ساعتیں چپ ہیں
چلو اس شہر چلتے ہیں
جہاں پر وصل کو زنجیر سے باندھا نہیں جاتا
معافی کو جہاں تحریر سے باندھا نہیں جاتا
جہاں دل کو کسی جاگیر سے باندھا نہیں جاتا
جہاں پر چاند تاروں سے مزین رات ہوتی ہے
جہاں پر چاہتوں کی ہر طرف برسات ہوتی ہے
جہاں پر دل کے سارے دشمنوں کو مات ہوتی ہے
چلو اس شہر چلتے ہیں



بارش تیز ہو رہی تھی۔ گلاس ونڈو کے اس پار اپنے شاندار آفس میں کھڑے صمد حسن صاحب کی نگاہیں سڑک کے اس پار تیز بارش میں بھینکتے اور درختوں اور پرندوں کو دیکھتے دیکھتے جیسے تھکنے لگی تھیں، آنکھوں سے چشمہ اتار کر وہ پلٹے اور شکستہ بوجھل قدموں سے اپنی سیٹ پر آ بیٹھے، بہت دنوں کے بعد آج پھر ان کا دل بے حد اداس ہو رہا تھا، سارے جسم پر جیسے صدیوں کی تھکن حاوی تھی، جانے کیوں ان کا دل چاہ رہا تھا کہ کسی سنسان ویران دشت میں جا کر بیٹھ جائیں اور خوب روئیں، پلکیں موند کر دو دنوں آنکھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے ابھی سیٹ کی پشت گاہ سے سر نکالیا ہی تھا جب عائدہ دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد کمرے میں چلی آئی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! جیتی رہو، ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔“ اسے دیکھتے ہی انہوں نے خود کو سنبھالا۔ وہ کرسی کھینچ کر ان کے مقابل ٹک گئی۔

”خیریت؟“

”ہوں..... خیریت ہی ہے، زاویار پاکستان آرہا ہے۔“

”واؤ..... یہ تو اچھی خبر ہے، کب آرہے ہیں؟“

”پرسوں رات کی فلائٹ سے۔“

”چلیں اچھی بات ہے، اب آپ کو بھی تھوڑا آرام ملے گا۔“

”ہوں یہ تو ہے، مگر مجھے نہیں لگتا وہ آفس سنبھالے گا۔“

”کیوں..... کیوں نہیں سنبھالیں گے وہ آفس؟“

”اس کی باتوں سے لگتا ہے عائدہ، بہت خود پسند لڑکا ہے وہ، اپنی محنت کے بل بوتے پر کچھ کرنا چاہتا ہے، باپ کی ہموار کی ہوئی زمین پر فصل نہیں اگانی اسے۔“

”یہ آپ سے کہا اس نے؟“

”نہیں..... واضح تو نہیں کہا، مگر میں نے محسوس کیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، اللہ مالک ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔“

”پریشان تو نہیں ہوں تم جیسی پیاری بیٹی کے ہوتے ہوئے بھلا کیسے پریشان ہو سکتا ہوں میں؟“

”ہوں..... بڑگ؟“ ذرا سی آنکھیں پھیلا کر اس نے گھورا تو وہ کھل کر ہنس پڑے۔

”نہیں بڑگ نہیں، سچ ہے۔“

”چلیں آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں، ویسے آفس ٹائم آف ہو گیا ہے، باہر بارش بھی بہت تیز ہو رہی ہے، گھر چلنے کا کوئی پروگرام ہے کہ نہیں؟“

”بالکل ہے، تمہارے آنے سے پہلے اٹھ ہی رہا تھا، بلکہ ایسا کرتے ہیں کہ آج تمہاری طرف چلتے ہیں، بہت دن ہوئے کرنل صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔“

”ہوں گڈ آئیڈیا..... بابا بھی بہت یاد کر رہے تھے آپ کو۔“

”تو پھر چلو..... دیر کس بات کی؟“ فوراً سیٹ سے اٹھتے ہوئے انہوں نے اپنا کوٹ اور موبائل اٹھایا۔



عائدہ نے جس وقت گھر کی دہلیز پر قدم دھرے سدید پانی کے ٹپ میں کپڑے بھگوئے اپنی شرٹ کے کف رگڑ رہا تھا۔ ڈریس پیٹ کے پانچے فولڈ ہونے کے باوجود بھیگ رہے تھے۔ جبکہ کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی شرٹ بھی اچھی خاصی بھیگ چکی تھی۔

وہ سرسری سی نظر اس پر ڈالتی صمد صاحب کی ہمارہی میں ہی آگے بڑھ آئی۔ صمد صاحب رکے تھے۔

”کیسے ہو برخوردار؟“

”فائن، آپ سنائیں؟“ ان سے مصافحہ کے لیے سدید ہاتھ دھو کر قریب چلا آیا، عائدہ کرنل صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں، بہت دن ہوئے نظر نہیں آئے، کہاں رہتے ہو آج کل؟“

”کہاں رہنا ہے جناب، ٹریننگ شروع ہو گئی تھی، اسی میں مصروف تھا۔“

”ہوں..... گویا برف پوش پہاڑوں سے عشق کا خواب پورا ہو گیا آپ کا؟“

”جی بس یہی سمجھ لیں۔“ وہ مسکرایا، تب ہی وہ اسے لے کر کرنل صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گئے، عائدہ اب وہاں نہیں تھی، وہ کمرے میں داخل ہوئے تو کرنل صاحب اسٹڈی ٹیبل پر پاکستان کا نقشہ سامنے پھیلائے ایک باریک چھڑی سے سٹروک لگا رہے تھے، قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر صمد صاحب کو دیکھا۔

”السلام علیکم!“ آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے انہوں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے کرنل صاحب نے اپنائیت سے تھام لیا۔

”وعلیکم السلام! کیسے ہو صمد..... بڑے دنوں بعد آنا ہوا۔“

”معذرت چاہتا ہوں کرنل صاحب..... زندگی نے آج کل بہت الجھا رکھا ہے، آپ سنائیں کیا ہو رہا تھا؟“

”کچھ نہیں..... بس یہ سیاچن اور کارگل کے بلند پہاڑوں پر بیٹھے، شیر جوانوں کو، کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا، دیکھو شدید سردی اور برف نے کیسے ان کے سونے جیسے رنگ سانولا دیئے ہیں۔“ اسی سال کی طویل عمری میں بھی ان کے بارعب چہرے پر وطن سے محبت کا جذبہ دیکھنے لائق تھا۔ صمد صاحب کی نگاہیں بے ساختہ ٹیبل پر دھرے نقشے پر جا پڑیں، جیسے کرنل شیر علی کی طرح وہ بھی نقشے میں موجود سیاچن اور کارگل کے پہاڑوں پر بیٹھے برف کے شہزادوں کو دیکھ رہے ہوں۔

”بہت برے حالات ہیں پاکستان کے، گزرتے ہر دن کے ساتھ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ نہ سکون رہا ہے نہ جان و مال کی حفاظت..... چھوٹی چھوٹی معصوم بچیاں درندگی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں، چھوٹی بڑی

اسکریوں پر تھرتھرتے عریانی کے اشتارات نے دماغ گھما ڈالے ہیں مزدوروں کے، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا ہوگا ہمارا۔“ قدرے آزدگی سے کہتے ہوئے انہوں نے نقشے سے نگاہیں ہٹائی تھیں، کرنل صاحب بیڈ پر تک گئے۔

”صالح قیادت کا فقدان ہے صمد..... ورنہ یہ دھرتی انمول بہروں سے خالی نہیں ہے، پسینہ بہانے والے مزدوروں سے لے کر، اینٹی ہتھیار بنانے والے ایک ایک افرتک، جو بیٹے اس ماں کی گود میں ہیں، شاید ہی قدرت نے کسی اور ماں کو دیئے ہوں، ہزار آزمائشوں اور تکلیفوں کے باوجود یہ طوفانوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتے، سینہ سپر کیے، بلند حوصلوں کے ساتھ آخری سانس تک جنگ کرتے ہیں مگر..... قیمتی سانسوں اور خون کی یہ جنگ، جب ہماری قیادت ڈائلاگ کے میز پر بار جاتی ہے تو یہاں ان برف پوش پہاڑوں سے بلند چینیں اٹھتی ہیں، آنے والے کتنے ہی دنوں تک یہ پہاڑ روتے رہتے ہیں۔“ بولتے بولتے کرنل شیر علی کا لہجہ بھیگ گیا تھا۔

صمد حسن صاحب نے بے ساختہ لب بھینچ لیے، تبھی عائدہ نے دوبارہ کمرے میں قدم دھرے تھے۔

”یہ لیجئے گرما گرم پکڑے اور چائے۔“ اس کے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے تھی۔ صمد جواب تک خاموش بیٹھا تھا ایک دم سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”یہ صمد کو کیا ہوا؟“ صمد صاحب حیران ہوئے تھے تبھی کرنل شیر علی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”سینر فائر چل رہا ہے، دونوں کے بیچ بول چال بند ہے۔“

”اوہ..... یہ تو اچھی بات نہیں ہے عائدہ۔“

”جی میں جانتی ہوں مگر میرا قصور نہیں ہے، سچ میں، اس نے خود مردہ چھپکلی لا کر میری گود میں پھینکی تھی، تبھی میں نے اس کی شرٹ جلائی۔“ اس کا انداز اتنا معصومانہ تھا کہ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

”پاگل..... چلو اب پکڑے تو کھلا دو اسے، کتنے کام کرتا ہے وہ بیچارہ تمہارے۔“

”تو میں بھی تو اس کے کتنے کام کرتی ہوں۔“ اس نے فوراً منہ بسورا۔ صمد صاحب کی آنکھوں کے گوشے مسلسل ہنسنے سے بھیگ گئے۔

”ہوں..... وہ اس لیے کیونکہ عائدہ ایک بہت پیاری اور قابل بچی ہے اور اس کا دل شفاف ندی کی طرح ہمیشہ صاف رہتا ہے، لہذا وہ کسی سے بھی زیادہ دیر تک ناراض نہیں رہ سکتی۔“ اس بار اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے صمد صاحب نے اس کی تعریف کی تو وہ شرمندہ سی مسکرا کر فوراً کمرے سے باہر نکل آئی۔

بارش ہتھم چکی تھی مگر فضا میں خنکی کا احساس ہڈیوں میں چھ رہا تھا، صمد کپڑے دھونے کے بعد اب کچن میں کھڑا اپنے لیے چائے بنا رہا تھا۔ جب وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔

”ہٹو میں بنا دیتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے، ابھی ہاتھ پیر سلامت ہیں میرے، جس دن اپنا بیج ہو کر بیٹھ گیا اس دن بنا دینا۔“ اس کا موڈ اچھا خاصا خراب تھا۔ عائدہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اوہ.....! تو یوں کہو ناں وہ تمہاری پیاری سہیلی کی نشانی تھی، پہلا اور آخری گفت۔“

”صرف ایک شرٹ جلنے پر اتنی ناراضگی؟“

”صرف شرٹ نہیں تھی وہ، میرا دل جلایا ہے تم نے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“

”اچھا پلیز ہٹو، میں چائے بنا دیتی ہوں۔ تم نے تو یونہی کلیجہ جلانا ہے اپنا۔“ زبردستی اس کے ہاتھ سے پین چھینتے ہوئے وہ چولہے کے قریب ہوئی، جب اچانک گرم گرم تھوہ اچھل کر اس کے ہاتھ کی پشت پر آگرا۔

”س..... فوراً سے پیشتر اس کے لبوں سے سسکاری نکلی تھی۔ صمد کی جان پر بن آئی۔

”کیا ہوا؟“ اس کا ہاتھ تھام کر اس نے عائدہ کی آنکھوں کے آنسو دیکھے پھر بھاگ کر پیسٹ اٹھالایا۔

”تم ہمیشہ مجھے تنگ کرتی ہو عائدہ..... پتہ نہیں کیا ملتا ہے تمہیں میرا دل جلا کر۔“

”تم بھی تو تنگ کرتے ہو خواہ مخواہ منہ بنا کر۔“

”خواہ مخواہ.....! جان بوجھ کر تم نے میری شرٹ جلائی، میرے موزے پانی میں بھگوئے، میرے کمپیوٹر سے چار فائلز اڑائیں، گرل فرینڈ کی انسٹ کی، اب بھی کہہ رہی ہو خواہ مخواہ۔“

”اوہ..... تو اصل غصہ گرل فرینڈ کی انسٹ کا ہے۔“ آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے نکال لیا تھا

”اور نہیں تو کیا، کیا سوچتی ہو کی وہ..... کتنی بدتمیز کزن ہے میری۔“

”تو اسے کون کہتا ہے شتر بے مہار کی طرح منہ اٹھائے روز یہاں چلے آنے کو۔“

”بابا کے خیال سے آتی ہے، پتہ تو ہے تمہیں اسے بزرگوں کی کمپنی کتنی پسند ہے۔“

”ہوں، بالکل، جس بزرگ کے گھر میں ایک خوب صورت اسمارٹ آرمی میں بھرتی بے حد چاق و چوبند نوجوان لڑکا رہتا ہو، اس گھر کے بزرگ کی محبت میں تو وہ نیند میں چل کر بھی آسکتی ہے۔“ اس کا انداز ایسا تھا کہ وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”چلو شکر ہے تم نے یہ تو قبول کیا کہ میں اسمارٹ اور ہینڈسم ہوں۔“

”بس رہنے دو، اللہ نے ذرا سی اچھی شکل اور ذہانت کیا دے دی کہ سنبھالا ہی نہیں جا رہا جناب سے۔“ فوراً خفگی سے منہ پھیرتے ہوئے وہ دوبارہ چائے کا پانی رکھنے لگی۔

صمد اس کی پشت پر بکھرے گھنے بالوں کی آبشار میں جیسے کھوسا گیا۔

”میرے کردار کو لے کر اگر اسی رفتار سے کڑھتی رہو گی تو اگلے چند سالوں تک بیوٹی کریمیں بھی چہرے پر رزلٹ دینا چھوڑ دیں گی۔“

”ہونہہ..... بیوٹی کریمیں استعمال کرتی ہے میری جوتی۔“

”اتنی سستی بھی نہیں ہوئیں ابھی کہ جوتیوں تک نوبت آجائے، بہر حال چائے اور پکڑے میرے

کمرے میں لے آنا، بہت سردی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ زیادہ دیر وہاں رک کر اپنا ضبط کھونا نہیں چاہتا تھا بھی حکم صادر کرتا فوراً کچن سے نکل گیا۔



حمید حسن صاحب نے جس وقت گاڑی گھر کے پورچ میں کھڑی کی، شام خاصی گہری ہو چکی تھی، پرہیان اور سارا بیگم میں سے کوئی بھی گھر پر نہیں تھا، وہ جانتے تھے سارا بیگم یقیناً اپنے بوتیک پر ہوں گی، جبکہ پرہیان کسی نہ کسی دوست کی طرف، جب ہی وہ سیدھے اپنے بیدروم کی طرف بڑھ آئے تھے۔

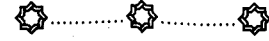
سردی کا احساس دور دور تک نہیں تھا، پھر بھی کمرے میں آتے ہی نیم گرم پانی سے شاور لے کر وہ بستر میں گھس گئے۔ ابھی چند روز قبل انہوں نے اپنی پچاسویں سالگرہ سیلبریٹ کی تھی، مگر اپنی شخصیت کے رکھ رکھاؤ اور قابل رشک صحت کی وجہ سے وہ چالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔

زاویار..... جوان کا اکلوتا بیٹا تھا، اٹھائیس سال کا ہو چکا تھا، مگر بہت سے لوگ اسے ان کا بیٹا ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے، وقت انہیں چھوئے بغیر گزر گیا تھا، تب ہی ان کی نگاہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی تھی جہاں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ”قریب مرگ میں محبت“ رکھا ہوا ان کا دل دھڑکا گیا تھا۔ کتنے دنوں کے بعد آج وہ اس کتاب کو دیکھ رہے تھے۔ جس کے پہلے ہی صفحے پر سرخ روشنائی سے، موتیوں جیسی لکھائی میں لکھا تھا۔

”میر نے لیے محبت چلتی سانسوں کا نام ہے، جس دن یہ سانسیں رک گئیں اسی دن حمید حسن کی محبت سے میری ذات کا تعلق ٹوٹے گا۔“ کتنے پر اثر الفاظ تھے، ایک دم سے ان کی آنکھوں کے گوشوں میں نمی اتر آئی۔

کوئی اس طرح بھی پھرتا ہے اپنے الفاظ سے، جس طرح وہ پھر گئی تھی؟ اگلے ہی پل خود ان کا ہاتھ اپنے والٹ پر جا پڑا جس کی پاکٹ میں اس کی تصویر تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے انہوں نے وہ تصویر نکالی اور نیچے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے، جانے کیوں اتنے سال گزر جانے کے باوجود آج بھی ہر موسم کی شدت میں ان کا دل صرف اسی ایک جود کی تمنا کرتا تھا کہ جس کی خوشبو ان کی سانسوں میں کھلی تھی۔

بہت دیر تک بھیگی آنکھوں سے اس چھوٹی سی تصویر کو دیکھتے رہنے کے بعد اچانک وہ اپنے ہونٹ اس تصویر پر رکھتے ہوئے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے تھے۔



چند لمحوں کا ہوا کرتا ہے خوابوں کا سفر
آنکھ کھلتی ہے تو صدیوں کی تھکن ہوتی ہے

رات کے دو بجے تھے جب سارا بیگم اور پرہیان دونوں کی گاڑیاں آگے پیچھے پورچ میں آرکی تھیں۔ ذرا سے فاصلے پر کھڑی حمید حسن کی گاڑی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ گھر پر موجود ہیں۔ پرہیان نے ایک نظر ان کی گاڑی پر ڈالی پھر تھکن سے چور جسم اور اعصاب کے ساتھ اندر لاؤنج کی طرف بڑھائی تبھی سارا بیگم

کی پکار نے اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک لیا تھا۔

”پرہیان۔“

”جی ماما!“ وہ رکنا نہیں چاہتی تھی مگر رک گئی تھی۔

”بات سنو۔“

”سوزی ماما، میں اس وقت بہت تھکی ہوئی ہوں، صبح بات کریں گے۔“ اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی، سارا بیگم کا دل تڑپ اٹھا، پرس صوفے پر پھینکتے ہوئے وہ اس کے قریب آئی تھیں۔

”زندگی نے جتنا تمہاری ماں کو تھکا دیا ہے، اتنا تمہیں کبھی نہیں تھکا سکتی پرہیان۔“ بھیکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اسے بازو سے پکڑ کر باہر لان میں لے آئی تھیں۔ چاند کی مکمل روشنی میں جسم کو کپکپا دینے والی سرد ہوا نے ان کے تھکے ہوئے اعصاب پر جیسے مرہم کا کام کیا تھا۔ پرہیان کے آنسو مزید شدت سے بہنے لگے۔

”دکس سے مل کر آرہی ہو؟“ بہت دیر کی خاموشی کے بعد بلا خرسارا بیگم نے پوچھا، جب وہ آنسو پونچھتے ہوئے رخ پھیر گئی۔

”سادیز سے۔“

”رو کیوں رہی ہو؟“

”پتہ نہیں۔“

”کال کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں؟“

”مما پلیز..... میں اس وقت آپ کے سوالوں کے جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ ایک دم سے وہ پلٹی اور اس نے اپنے اندر کا غبار نکالا۔ سارا بیگم پریشان سی اسے دیکھتی رہ گئی تھیں۔

”تم جانتی ہو پرہیان میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی۔“

”جھوٹ کہتی ہیں آپ..... کیونکہ اگر یہ سچ ہوتا تو آپ مجھ سے میری حقیقت کبھی نہ چھپاتیں۔“

”کیسی حقیقت؟“

”آپ جانتی ہیں میں کس حقیقت کی بات کر رہی ہوں۔“ مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، سارا بیگم جیسے تھک گئیں۔

”اب تم مجھے پریشان کر رہی ہو پرہیان۔“

”پریشان ہی تو نہیں کرنا چاہتی میں آپ کو، ورنہ ضرور بتاتی کہ جس وقت مجھے یہ پتہ چلا کہ میں پرہیان حمید حسن نہیں، پرہیان عزیز ہوں، اس وقت مجھ پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی۔“ آنسو پونچھتے ہوئے ایک دم سے وہ جذباتی ہو گئی تھی۔

سارا بیگم جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

”کیا سمجھا تھا آپ نے، مجھے کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ میں کون ہوں..... میری حقیقت کیا ہے؟ میں جو خود پر غرور کرتی نہیں تھکتی تھی کہ میں حمید حسن جیسے ایک آئیڈیل انسان کی اکلوتی بیٹی ہوں، آج میرا یہ غرور ٹوٹ

”میں جانتی ہوں ماما، مگر سوری میں آپ کو مریرہ صمد تک نہیں پہنچا سکتی۔“ بے دردی سے بہتے آنسوؤں کو سختی سے صاف کرتی اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ سارا بیگم اس سے مزید کوئی سوال کرتیں، وہ تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

سارا بیگم کو لگا جیسے کسی نے ان کے بدن سے لہو نچوڑ لیا ہو، بعض حقیقتیں کتنی سفاک ہوتی ہیں..... اندر تک کاٹ کر رکھ دیتی ہیں، وہ بھی کٹ رہی تھیں، لمحہ بہ لمحہ، اندر سے بکھر رہی تھیں مگر..... ابھی اس حقیقت تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکی تھی۔



بہت خوب صورت علاقہ تھا۔

سبزہ ہی سبزہ..... ہلکی ہلکی پڑتی پھوار..... اور قریب بہتی شفاف ندی کے پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی وہ حور..... اسے لگا شاید کبھی اس کی پشت پر بکھرے، آبشاروں سے گھنے بالوں پر سے نگاہیں نہیں ہٹا سکے گا۔

وہ خوب صورت تھی، بے حد خوبصورت.....

مگر اس کے لیے تو وہ پوری دنیا تھی، تبھی وہ کچھ دیر سینے پر بازو باندھے اسے دل چسپ نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر ہونہی اس کے گھنے، خوب صورت بالوں پر نگاہ جمائے، ابھی اس کے پہلو میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ آنکھ مل گئی۔

”صیام۔“ ماں جی اس کی چار پائی کے قریب کھڑی اسے آواز دے رہی تھیں۔ اس نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

”جی ماں جی۔“

”دن چڑھ گیا ہے پتر، دفتر نہیں جانا۔“

”جانا ہے ماں جی، بس کل رات تھکن بہت ہو گئی تھی تو صبح آنکھ بھی نہیں کھلی۔“ اب وہ اٹھ بیٹھا تھا۔

ماں جی پریشان سی اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”اللہ سوہنا خیر کرے، تیرے ابا جی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں کل رات سے..... ساری رات تڑپ تڑپ کر گزاری ہے، اوپر سے یہاں گاؤں میں کوئی اچھا ڈاکٹر بھی نہیں ہے۔“ شب بیداری ان کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

صیام گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں ماں جی، میں آج دفتر جاتے ہوئے انہیں ساتھ لے جاؤں گا۔“

”اللہ حیاتی کرے پتر..... پریشانیوں تو ہم غریبوں کی قسمت کا حصہ ہیں، ادھر تیرے ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور ادھر شگفتہ کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔“

”اتنی جلدی؟ ابھی تو پندرہ دن ہوئے ہیں رشتہ کیے۔“

کرپاش پاش ہو گیا۔“ ٹوٹے لہجے میں کہتے ہوئے وہ جیسے خود بھی ٹوٹ رہی تھی۔ سارا بیگم کو لگا ان کے جسم سے خون نچر گیا ہو، بھی پھٹی نگاہوں سے پرہیزان کی طرف دیکھتے ہوئے وہ کین کی چیر پر جیسے ڈھے گئی تھیں۔

”مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے ماما، میں جانتی ہوں آپ نے زندگی میں سوائے میری خوشیوں اور کامیابیوں کے اور کچھ نہیں چاہا، مگر انسان ہمیشہ خوش نصیب نہیں رہتا ماما، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی موڑ پر اسے قسمت کی لکھی ٹھوکر کھائی ہی پڑتی ہے۔“ اب وہ زمین پر بیٹھ کر اپنا سر سارا بیگم کی گود میں رکھ رہی تھی، جن کی آنکھوں سے انمول موتی ٹوٹ کر بکھرتے جا رہے تھے۔

”پتہ ہے ماما..... اس وقت مجھے جتنا اپنی تقدیر پر رونا آ رہا ہے اتنا ہی درکنون صمد حسن کی قسمت پر رشک آ رہا ہے، کتنی خوش قسمت ہے ناں وہ، جو پاپا جیسے ایک آئیڈیل انسان کی سگی بیٹی ہے، اور اس کی ماں وہ گورت ہے جسے پاپا جیسے آئیڈیل نے ٹوٹ کر چاہا ہے..... ہے ناں۔“ شفاف آنکھوں میں ہیروں کی مانند دکتے آنسو لیے، اب وہ سارا بیگم کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جواب میں وہ آنسوؤں کے ساتھ محض اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

”کس نے بتائیں تمہیں یہ سب باتیں؟“ بڑی مشکل سے وہ پوچھنے کے قابل ہوئی تھیں جب پرہیزان نے آنسو پونچھ لیے۔

”سادیز نے.....“

”وہ کیسے جانتا ہے یہ سب؟“

”آج سے پہلے نہیں جانتا تھا، اسے بھی آج ہی پتہ چلا ہے۔“

”کیسے؟“

”درکنون اس کی دوست رہ چکی ہے ماما، دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھتے رہے ہیں، باتوں باتوں میں یونہی آج اس کا ذکر آگیا تو سادیز مجھے اس کا گھر دکھانے لے گیا، وہیں میں نے پاپا کی تصویر دیکھی اور ان کی بھی جنہیں وہ آج بھی اپنی سانسوں سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔“

”وہاٹ..... تم کہنا چاہتی ہو کہ درکنون اسی شہر میں رہتی ہے؟“

”نہیں..... میں یہ نہیں کہہ رہی، مگر میں نے اس کا گھر دیکھا ہے، وہ گھر جہاں وہ چند سال قبل اپنی ماما کے ساتھ رہتی تھی۔“

”کہاں ہے وہ گھر؟“

”سوری ماما..... یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی، کیونکہ میں جانتی ہوں، جس روز آپ یہ سراغ پالیں گی اس روز پاپا کی زندگی کی کتاب سے آپ کے نام کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا، اور یہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گی، کیونکہ میں جانتی ہوں، جتنا پاپا نے مریرہ صمد کو چاہا ہے اس سے کچھ ہی کم آپ نے بھی پاپا کو چاہا ہے۔“

”یہ خود غرضی ہے پرہیزان..... اور میں خود غرض نہیں ہوں۔“

”ہاں..... مگر ان کی بھی مجبوری ہے پتر، اب جوان رکی دوسری بیٹی کے سرال والے ہیں وہ جلدی کر رہے ہیں اور تمہیں تو پتہ ہے پتر آج کل اچھے رشتے ملنا کتنا مشکل ہے۔“

”ہوں..... آپ پریشان نہ ہوں، اللہ مالک ہے۔“ وہ انہیں تسلی دیتے غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ شگفتہ نے جلدی جلدی اس کے کپڑے پر لیس کرنے کے بعد جوتے بھی پالش کر دیئے، عشرت جو شگفتہ سے دو سال بڑی تھی ابھی دو ماہ پہلے بیوہ ہو کر ایک عدد بیٹے کے ساتھ پھر سے بھائی کے در آئی تھی۔

ناشتہ اسی نے بنایا تھا، اپنے چھ ماہ کے بیٹے کے ساتھ ساتھ صیام میں بھی اس کی جان تھی۔ وہ اس کے کھانے پینے اور دیگر سارے معاملات کا بہت خیال رکھتی تھی، خود صیام بھی دونوں بہنوں کی خوشی اور چھوٹی چھوٹی فرمائشوں کا خاص خیال رکھتا تھا۔

ساون شروع ہو رہا تھا مگر اس نے ابھی تک کمروں کی چھتیں پکی نہیں کروائی تھیں۔ کروانا بھی کیسے اخراجات سانس لیتے ہی نہیں دے رہے تھے۔ اس روز وہ تقریباً ایک بجے آفس پہنچا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! شکر تم آگئے، مجھے لگا آج ضرور کسی لڑکی نے گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا ہوگا تمہیں۔“ حنان جو اسی کا انتظار کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی بولا تو وہ مسکرا دیا۔

”کیوں؟“

”پورے ہیرو جو لگ رہے ہو، بالکل فواد خان کی طرح۔“

”بس کر، زیادہ بٹرنگ نہ کیا کر۔“

”بٹرنگ نہیں کر رہا یار، میری نظر سے دیکھ خود کو۔“

”تیری نظر خراب ہو گئی ہے مجھ پر، ٹھیک کر لے۔“

”ہا ہا ہا، یہ تو ہے، ویسے آج میڈم نے بھی مکمل بلیک سوٹ پہنا ہے۔“

”اچھا؟“ میڈم کے ذکر پر اس کا دل زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

حنان گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”سچ کہتا ہوں یار، اگر میں پہلے سے بک نہ ہوتا تو ضرور میڈم درمی سے عشق کر بیٹھتا۔ اتنی اچھی لڑکی میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔“ وہ اس کے دل سے واقف نہیں تھا، تبھی کہہ رہا تھا اور صیام نے بے نیازی سے کمپیوٹر آن کر لیا۔

”خیال رکھنا، تمہارے یہ نادر خیالات تمہاری منگیتر صاحبہ تک نہ پہنچ جائیں، ورنہ جو تمہارے ساتھ ہوگا وہ تم بہتر جانتے ہو۔“

”چھوڑو یار..... اماں کی پسند ہے، وہی نبھاہ کریں گی اس کے ساتھ، میں انٹر سٹڈ نہیں ہوں۔“

”ہوں..... ہو بھی کیسے سکتے ہو باہر جو ایک سوئس پیچھے لگا رکھی ہیں ان کا کیا بنے گا۔“ وہ اس کی رگ رگ اور پل پل سے واقف تھا۔ تبھی وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”ان ایک سوئس سے ایک بھی میڈم درمی جیسی نہیں ہے، خیر تم بتاؤ آج اتالیٹ کیوں ہو گئے، میڈم دوبار پوچھ چکی ہیں تمہارا۔“

”ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یار، انہیں چیک اپ کے لیے لے کر جانا تھا واپسی پر بائیک پکچر ہو گئی۔“

”اوہ..... کتنی بار کہہ چکا ہوں تجھ سے کہ بائیک بدل لے، مگر تمہارے نزدیک میری باتوں کی اہمیت کہاں۔“

”ایسا مت کہو یار، تم جانتے ہو میری زندگی میں بہت مسائل ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے مگر.....“ وہ ابھی بول ہی رہا تھا کہ انٹر کام بج اٹھا۔

”جی میڈم۔“ فوراً سے پیشتر اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف درکنون تھی۔

”جی میڈم ابھی تشریف لائے ہیں۔“

”ٹھیک ہے میرے کمرے میں بھیج دیجئے۔“

”جی بہتر۔“ ادب سے کہتے ہوئے اس نے ریسیور رکھ دیا۔

”چل بیٹا آگیا تیرا بلاوا آج خیر نہیں تیری۔“

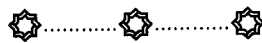
”کیوں؟“

”میڈم کا فون تھا دوبار پوچھ چکی ہیں تمہارا، یہ تیسری کال تھی۔“

”خیر تو ہے۔“

”کیا پتا یہ تو میڈم ہی بتا سکتی ہیں جا اندر بلا رہی ہیں تجھے۔“

”تو بتایا کیوں نہیں، ایویس اتنی دیر سے دماغ چاٹ رہے ہو۔“ وہ خفا ہوا اور حنان کھل کر ہنس دیا۔



زاویار کی پاکستان کے لیے سیٹ کنفرم ہو چکی تھی۔

اس وقت وہ دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ڈنر انجوائے کر رہا تھا، جب جولی رابرٹ جس کا شمار اس کی قریبی دوستوں میں ہوتا تھا اس پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے بولی۔

”زاویار کل رات کی فلائیٹ سے پاکستان جا رہا ہے۔“

”واہ..... مگر کیوں؟“ ایک کو جھٹکا لگا، جولی نے آہستہ سے کندھے اچکا دیئے، تبھی وہ بولا۔

”جانا تو ہے یار، میرے ڈیڈ کو میری ضرورت ہے، ویسے بھی میں ساری عمر کے لیے دیار غیر کی خاک چھاننے کے لیے نہیں آیا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم نے کہا تھا تم یہیں اپنا بزنس اور فیملی اریج کرنا چاہتے ہو۔“

”ہوں..... پلان تو یہی کیا ہے، باقی جو اللہ کی مرضی۔“

”ہوزان کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر ایک نے پوچھا، زاویار نے ڈرائنگ کا بڑا سا گھونٹ لے کر گلاس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تمہیں کیا لگتا ہے مجھے اس کے لیے کچھ سوچنے کی ضرورت ہے؟“

”نہیں..... مگر وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے زاویار، مرجائے گی وہ تمہارے لیے۔“

”تو مرجائے میں نے کسی کی زندگی کا ٹھیکہ نہیں لیا، ویسے بھی میں ان ہڈل کلاس گھرانوں کی تھرڈ کلاس لڑکیوں سے شدید الرجک ہوں۔“ جولی نے دیکھا اس کی خوب صورتی پیشانی پر کئی بل پڑ چکے تھے۔ ایک نے کندھے اچکا دیئے۔

”تمہاری مرضی، مگر وہ بہت خوددار ہے، عام لڑکیوں جیسی کوئی بات نہیں ہے اس میں۔“

”عام لڑکیوں میں کیا بات ہوتی ہے؟“

”تم زیادہ بہتر جانتے ہو مجھ سے، بہت سی لڑکیاں مفاد پرست ہوتی ہیں، صرف اپنے فائدے کے لیے کیش کی صورت رشتوں کو استعمال کرنے والی، مگر وہ ایسی نہیں ہے۔“

”مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ کیسی ہے کیسی نہیں، اور پلیز تم اب اس کی وکالت کرنا بند کرو۔“ وہ بری طرح چڑ گیا تھا۔ ایک خاموش ہو گیا ہوزان اس کی بچپن کی دوست تھی، بے حد سادا اور حساس لڑکی تھی، بچپن میں باپ کی وفات کے بعد اس کی ساری عمر محنت مشقت کی نذر ہو گئی تھی، وہ اور اس کی ماں ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں کئی سال سے اکٹھی رہ رہی تھیں۔ جب وہ چھوٹی تھی تو اس کی ماں ایک اسٹور پر کام کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھی، مگر جیسے ہی اس نے اپنی تعلیم مکمل کی، اس نے اپنی بیمار ماں کو گھر بٹھا کر خود اسٹور پر جانا شروع کر دیا۔

زاویار کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات بھی یہیں ہوئی تھی، وہ خاصا فضول خرچ تھا اور ہوزان ہمیشہ اس کی خریداری کو حیرانی اور حسرت سے دیکھتی تھی، وقت کے ساتھ ساتھ یہ حیرانی اور حسرت، محبت میں ڈھلتی چلی گئی، زاویار کا رویہ اس کے ساتھ بے حد نرم اور دوستانہ ہوا کرتا تھا، وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا خیال رکھنے لگا تھا، مگر جیسے ہی اس کے جذبے اس پر آشکارہ ہوئے وہ بدک گیا۔

ہوزان کو وہ بیگنی شام ہمیشہ یاد رہتی تھی، جب اس نے زاویار حسن کو اپنی محبت سے آگاہ کیا تھا، جواب میں وہ خاصی حیرانی سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد فوراً برہم ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس میں انٹرسٹ نہیں ہے اور نہ ہی اس چیز کو پسند کرتا ہے کہ وہ اس میں دل چسپی لے، ہوزان کا دل ٹوٹا گیا تھا، اگلے ایک ہفتے تک وہ بخار میں مبتلا، بستر میں منہ چھپا کر روتی رہی تھی مگر زاویار کو پروا نہیں تھی، وہ میسر بدل چکا تھا۔

اور اب..... جبکہ اس نے لبوں پر چپ کا قفل ڈال لیا تھا تو وہ اس کا ملک چھوڑ کر جا رہا تھا، جولی اور ایک کے ساتھ اس کا تعلق اب بھی ویسا ہی تھا مگر..... وہ صرف اس کے لیے بدل گیا تھا، ہوزان اپنا قصور نہیں جانتی تھی تاہم اس کا دل اب بھی صرف زاویار کی محبت کا تمنائی تھا، وہ کسی صورت خود کو زاویار حسن کی تمنا سے باز

نہیں رکھ سکتی تھی۔ زاویار کے اب بھی وہی معمولات تھے، بس اس نے اب اس کے اسٹور پر آنا چھوڑ دیا تھا۔ اس روز بہت دنوں کے بعد جب وہ تازہ گلاب کے خوب صورت بو کے لیے، اسے سال گرہ کی مبارک باد دینے اس کے فلیٹ پر آئی تب اسے پتہ چلا کہ زاویار کل رات کی فلائیٹ سے پاکستان جا چکا ہے۔ کتنی ہی دیر تک اسے یقین نہیں آیا کہ وہ یوں چپ چاپ اس کا دیس چھوڑ کر پاکستان بھی جاسکتا ہے، وہ پاکستان جو صرف اپنی کرپشن، لوڈ شیڈنگ، نارگٹ کلنگ، دہشت گردی، زلزلے اور سیلابوں کی وجہ سے ہمیشہ ایک خوف ناک تصور کے ساتھ اس کے حافظے میں محفوظ رہتا تھا اور اب..... وہ اسی دیس جا چکا تھا، ایک دم سے اس کا دل جیسے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

اس روز بہت دیر تک وہ اس کے گھر کے باہر بیٹھیوں پر بیٹھی بری طرح روتے ہوئے گلاب کی پتیوں کو نوچ نوچ کر پھینکتی رہی تھی۔



زاویار پاکستان آچکا تھا۔

صمد صاحب کو لگا جیسے ایک مدت کے بعد انہوں نے زندگی کے حسن کو محسوس کیا ہو۔ سارا بیگم اور ہانہاں بے حد خوش تھیں۔ صمد صاحب کی مصروفیات کے پیش نظر اسے ایئر پورٹ سے ریسیو بھی ان دنوں نے ہی کیا تھا۔ وہ گھر آیا تو صمد صاحب کتنی ہی دیر اسے خود سے لپٹائے روتے رہے تھے۔ دیار غیر میں رہ کر کیسے نکھر گیا تھا وہ، کہ ان کی نظر اس کے شفاف چہرے سے ہنسنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

اس کے آنے کی خوشی میں وہ اپنی تمام کاروباری مصروفیات ترک کر چکے تھے۔

پرہیزان کی شادی کی ڈیٹ فکس ہو چکی تھی اور ایسے موقع پر زاویار کا پاکستان چلے آنا ان کے لیے بے حد خوشی اور طمانیت کا باعث بنا تھا۔ بہت سا بوجھ تھا جو ایک دم سے انہیں اپنے کندھوں سے اترتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

اگلے روز شام میں صمد صاحب نے شام کی چائے پر عائکہ اور سدید کو بھی انوائٹ کر لیا۔ سنہری رنگت اور تھیکے نقوش والی عائکہ علوی بھی زاویار کے پاکستان آنے پر بہت خوش تھی مگر زاویار نے اسے کوئی لفٹ نہیں کرائی اور اس بات کو صمد صاحب نے بہت محسوس کیا تھا۔

وہ زاویار کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف تھے مگر عائکہ جیسی اچھی اور نیک صفت لڑکی کے لیے انہیں زاویار کا خشک رویہ بالکل بھی پسند نہیں آیا تھا مگر وہ مجبور تھے کہ سالوں بعد گھر واپس آنے والے محبوب بیٹے کو ڈانٹ بھی نہیں سکتے تھے۔ وگرنہ عائکہ علوی کی دل آزاری انہیں کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں تھی اور ان کے گھر لے تمام افراد سوائے زاویار کے اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے۔



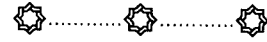
رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔

کمرے کی ونڈو کھلی تھی اور شریر ہوا کے سرد جھونکے ان کی رائٹنگ ٹیبل پر پڑے کورے صفحات کو بری طرح پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ ایک نظر ان صفحات پر ڈالنے خود بھی کھڑکی کے قریب آکھڑے ہوئے باہر خاصی سرد ہوا کا راج تھا مگر انہوں نے کھلی ہوئی کھڑکی کے پٹ بند نہیں کیے تھے۔ عرصہ ہو گیا تھا زندگی کی جھیل مریرا نامی خوب صورت پرندے کی ہجرت کے بعد وہ جیسے سرد موسموں کے شیدائی ہو کر رہ گئے تھے۔

سارا بیگم آج بھی کمرے میں نہیں آئی تھیں۔

نیچے لاؤنچ میں زواریار اور پرہیان کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دونوں بہن بھائیوں میں بلا کی انڈر اسٹینڈنگ اور پیار تھا۔ وہ کافی دیر زواریار کے ساتھ نیچے بیٹھے اس کے ایک ایک نقش کو نظر میں اتارتے رہے تھے۔ بے شک وہ ہوہو مریرا کی کاپی تھا۔ اس نے ایک ایک نقش اپنی ماں کا چرایا تھا۔ جب جب ان کی نگاہیں اس کے چہرے کی طرف انہی دل کے اندر کہیں کوئی نہیں ضرور سر اٹھاتی تھی۔

دو ہفتے ہو گئے تھے اسے گھر آئے اور ان دو ہفتوں میں صمد حسن صاحب نے اس کے ساتھ جیسے صدیوں کا سفر طے کیا تھا۔ تھکی ہوئی آنکھوں میں آپ ہی آپ گزرے ہوئے وقت کی دھول اڑنے لگی تھی اور پھر وہ جیسے اس دھول میں گم ہوتے چلے گئے تھے۔



صمد حسن صاحب ایک نہایت غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد بچوں کے اسکول کے سامنے ٹھیلہ لگاتے تھے، سارا سارا دن تیز دھوپ میں کھڑے رہ کر بھی وہ اتنے پیسے نہیں کما سکتے تھے کہ اپنے گھر کی ضرورتوں کو پورا کر سکتے، ان کی بیوی کو اٹھرا کا مرض تھا، جس کی وجہ سے اوپر تلے ان کے سات بچے وقفے وقفے سے لقمہ اجل بن گئے تھے۔ صمد حسن کا نمبر آٹھواں تھا اور خوش قسمتی سے وہ بچ گئے تھے۔ کل آٹھ بہن بھائیوں میں صرف وہی اپنے ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ان کے خوابوں کا مرکز تھے۔ بے حد غربت کے باوجود ان کے والد صاحب ان کی ہر خواہش کو پورا کرنا اپنا اولین فرض سمجھتے تھے۔

وہ ابھی مڈل میں تھے کہ ایک روز ان کی صابر شا کر ماں حالات اور غربت سے ہار مان کر دنیاے فانی سے کوچ کر گئیں۔ صمد حسن صاحب اس وقت اتنے میچور نہیں تھے کہ موت کی حقیقت کو سمجھ سکتے، تبھی وہ جیسے بکھر کر رہ گئے تھے۔ ایک اور بچے کی خواہش نے ان کی نظر میں ان کی ماں کی جان لے لی تھی اور یہ بات ان کے دل میں ایسی بیٹھی کہ پھر کبھی نکل ہی نہ سکی، تاہم ان کے لاغر باپ نے یہاں بھی ہمت نہیں ہاری تھی، اندر ہی اندر مسماہ ہوتے وہ ان کا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔

دن بھر ٹھیلہ لگانے کے بعد گھر واپسی پر گھر کا سارا کام بھی انہی کے سپرد تھا۔ صمد حسن صاحب کا

کام صرف پڑھنا تھا، اسکول سے نکل کر وہ ابھی کالج لائف میں آئے تھے کہ ایک روز وہ بھی انہیں داغ مفارقت دے گئے۔ پچھلے چند ماہ سے ان کی طبیعت نہایت ناساز تھی، مگر انہوں نے حسن صاحب کو اس کی بھٹک بھی نہ پڑنے دی۔ وہ پیسے جو ان کی دوائیوں پر لگنے تھے انہوں نے اکلوتے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر لگا دیئے، نتیجتاً موت نے انہیں شکار کر لیا۔

والدین کی آگے پیچھے وفات کے بعد زندگی صمد حسن کے لیے بہت تلخ ہو کر رہ گئی تھی تعلیم سے ان کا تعلق ٹوٹ گیا، پیٹ بھر روٹی کے لیے وہ کالج کی مہنگی ترین تعلیم چھوڑ کر اپنے باپ کی جگہ بچوں کے اسکول کے سامنے ٹھیلہ لگانے لگے تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب عائکہ علوی کے دادا کرنل شیر علی نے ان کے سر پر دست شفقت رکھا تھا۔ وہ آرمی سے وابستہ تھے اور صمد حسن صاحب کی طرح ان کا بھی صرف ایک ہی بیٹا تھا، سکندر علوی صمد حسن کے والد کی طرح ان کی آنکھوں میں بھی اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے بہت سے خواب تھے، وہ انہیں آرمی میں بڑا افسر بنانا چاہتے تھے، اسی مقصد کے لیے انہوں نے گاؤں میں اپنی زمین بیچ کر اسے ملک سے باہر پڑھنے بھیج دیا تھا۔

گھر میں اب صرف وہ اور ان کی دو بھتیجیاں رہتی تھیں، بریرا اور مریرا۔ بریرہ کی نسبت ان کے بیٹے ماندر علوی کے ساتھ ملے تھے، جبکہ مریرا اسی اسکول میں دسویں جماعت میں زیر تعلیم تھی جس کے باہر صمد حسن کا شاید نام نہ نہ ملے۔ یعنی کے بعد شیر علی صاحب اسے صمد حسن سے بھنے ہوئے چنے خرید کر دیتے تھے، بریرہ الملک لالہ لالہ کے بعد اب کان لی دنیا میں قدم رکھنے کی تیاری کر رہی تھی، رفتہ رفتہ صمد حسن کے حالات کرنل شیر علی کے علم میں آئے تو وہ بصد اصرار انہیں اپنا بیٹا بنا کر گھر لے آئے۔ وہ گھر جہاں کئی سال ہوئے ان کی بیوی کی رحلت کے ساتھ بھائی اور بھابی کی وفات بھی ہو گئی تھی۔ تب سے وہ تنہا زندگی کی جنگ لڑتے چلے آ رہے تھے۔

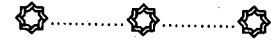
صمد کی شرافت اور کردار کی مضبوطی نے انہیں بہت متاثر کیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انہیں بالکل اپنے سکے بیٹے کے برابر اہمیت دینے لگے تھے۔

اس گھر میں آنے کے بعد صمد حسن کا تعلیم سے ٹوٹا تعلق دوبارہ بحال ہو گیا تھا۔ گریجویشن کلیئر کرنے کے بعد انہوں نے کچھ گھروں میں ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی تھی، رات میں ٹیوشن سے فارغ ہو کر وہ گھر واپس آتے تو سب کو اپنا منتظر پاتے، کوئی بھی ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ شیر علی صاحب آرمی سے ریٹائر ہو چکے تھے، ان کا زیادہ وقت گھر پر کتابوں اور پودوں کی نذر ہوتا تھا۔

صاف ستھرا کشادہ گھر جس میں نرم بستر، گرم کھانا، دھلے کپڑے سب میسر تھا، ان کے لیے کسی جنت سے کم نہیں تھا، بریرہ اور مریرا دونوں ہی بے حد ذہین مگر اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکیاں تھیں، صمد نے کبھی انہیں اونچی آواز میں بولتے یا ہنستے نہیں دیکھا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے ایک بار بھی انہیں بے پردا نہیں دیکھا تھا، دونوں ہی بہت کم ان کے سامنے آتی تھیں، خود انہوں نے بھی کبھی دانستہ نظر اٹھا کر ان کی

طرف دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ چھٹی والے دن بھی بہت کم وہ گھر پر رکتے تھے، گھر کا سودا سلف اور دیگر اشیاء کی خریداری بھی شیر علی صاحب کے سپرد تھی، کئی بار انہوں نے صمد حسن کو ٹیوشن پڑھانے سے منع کیا تھا مگر وہ ان پر زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ تبھی ان کے بے پناہ خلوص اور محبت کے باوجود، اپنے تعلیمی اخراجات کے لیے انہوں نے روزگار کی راہ تلاش کر لی تھی، اب اکثر اپنے پیسوں سے اپنا تعلیمی خرچ نکالنے کے ساتھ ساتھ وہ گھر کے لیے کوئی نہ کوئی چیز بھی لے آتے تھے۔

سکندر علوی کے خط کا بے لگا ہے آتے رہتے تھے۔ جب بھی ان کا خط آتا، اگلے کئی روز تک گھر میں اسی کا ذکر رہتا ایسے میں شیر علی صاحب کی آنکھوں کی جگمگاہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔



وقت نہایت سبک روی سے اپنا سفر طے کرتا آگے بڑھ رہا تھا، کہ اچانک شیر علی صاحب شدید بیماری کی لپیٹ میں آگئے۔

صمد حسن نے ابھی یونیورسٹی لائف میں قدم رکھا ہی تھا، نئی نئی کلاسز تھیں مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنا آپ ان کے لیے وقف کر دیا تھا، گھر کے سودا سلف سے لے کر شیر علی صاحب کی تیمارداری تک ہر کام اپنے ذمے لے لیا تھا، بریرہ کی فرمائش پر سمندر پار سکندر علوی کو اطلاع بھی دی جا چکی تھی۔ مگر وہاں اس کے امتحانات چل رہے تھے، تبھی چاہنے کے باوجود وہ پاکستان نہ آ سکے تاہم انہوں نے صمد سے اپنے باپ کا خیال رکھنے کی درخواست ضرور کی تھی۔

بریرہ اور مریرا کی پریشانی ان دنوں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

اس روز بہت دیر تک وہ شیر علی صاحب کے پاس بیٹھ کر ان کی تیمارداری کرنے کے بعد ابھی اپنے کمرے میں آ کر سوئے ہی تھے کہ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک کی آواز نے انہیں ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا، کچی نیند سے بیدار آنکھیں بے ساختہ وال کلاک کی جانب اٹھی تھیں، جہاں رات کے دو بجے کا وقت تھا، تبھی بنا جوتوں کی پرواہ کیے وہ فوراً بستر سے نکلے، اور دروازہ کھولا تو سامنے مریرا کھڑی رو رہی تھی۔

”بڑے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پلینز آپ ابھی انہیں ہسپتال لے جائیں۔“ وہ اس کے لہجے سے اس کی اذیت کا اندازہ کر سکتا تھا، تبھی فوراً شیر علی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا جہاں بریرہ بنا چادر کی پرواہ کیے، شیر علی صاحب کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی، کمرے میں اس کی موجودگی محسوس کرتے ہی وہ سائیڈ پر ہو کر کھڑی ہو گئی تھی، صمد نے اسی وقت اپنے ایک دوست کو کال کر کے گاڑی منگوائی اور پھر اسی کے ساتھ ہسپتال روانہ ہو گیا۔ اگلی صبح وہ گھر آیا تو شیر علی صاحب کی طبیعت خاصی سنبھل چکی تھی، تاہم مریرا نے رورود کر اپنا حال برا کر لیا تھا، بریرہ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر وہ اس کے قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی، تبھی مجبور ہو کر اس نے صمد سے کہا تھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے بڑے ابو کی؟“ رات بھر جاگ کر رونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے گوشے سرخ ہو رہے تھے۔ صمد جو اپنے پاس جمع کیے ہوئے پیسے نکال رہا تھا اس کے استفسار پر چونک کر پلٹا۔

”ٹھیک ہے..... پہلے سے کافی بہتر ہیں وہ آپ پریشان نہ ہوں۔“

”شکر ہے اللہ کی پاک ذات کا آپ ہسپتال جائیں تو پلینز مریرا کو بھی ساتھ لے جائیے گا وہ بہت رو رہی ہے رات سے۔“ پہلی بار وہ اس سے یوں مخاطب تھی۔

صمد نے رخ پھیر لیا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے، وہاں میں اور میرا دوست ہیں ان کی دیکھ بھال کے لیے۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے، بیٹی ہوں میں ان کی، آپ سے زیادہ میرا حق بنتا ہے، ان پر سگے باپ سے بڑھ کر عزیز ہیں وہ مجھے، آپ اور آپ کا دوست ان کا ویسا خیال نہیں رکھ سکتے جیسا میں رکھ سکتی ہوں۔“ مریرا اچانک آدھی طوفان کی طرح کمرے میں نمودار ہوئی تھی، وہ ٹھنکا تھا۔

بڑی بڑی آنکھوں میں پھیلے ہوئے کا جل اور کندھوں پر ڈھلکتی شال سے بے نیازی کے ساتھ وہ اسے حیران ہی تو کر گئی تھی۔

”ٹھیک ہے، چلیں ساتھ، میں بس نکل ہی رہا ہوں۔“ اگلے ہی پل نظریں چراتے ہوئے وہ فوراً پیسے کیپ میں رکھنے کا تھوڑی دیر بعد: اب وہ بایک اشارت کر رہا تھا وہ بریرہ کو دروازہ اچھی طرح بند کرنے کی ہدایت کرتی اس نے ساتھ بیٹھے آٹھمی تھی۔ اس طرح سے کہ اس کا وجود بالکل بھی صمد کے وجود سے بچ نہیں ہو رہا تھا۔ پورے راستے دونوں کے مابین خاموشی حائل رہی تھی، ہسپتال پہنچ کر جیسے ہی مریرا کی نظر، بستر پر بے سدھ پڑے شیر علی صاحب پر پڑی وہ پھر زار و قطار رونا شروع ہو گئی، تبھی صمد نے اسے ڈانٹا۔

”آپ بچی نہیں ہیں۔ جو ہر بار آپ کو ڈانٹ کر چپ کروانا پڑے، انکل بالکل ٹھیک ہیں، سکون آور دوائیوں کے زیر اثر سو رہے ہیں، آپ پلینز ان کے لیے پریشانی کری ایٹ مت کریں۔“ اس کی ڈانٹ کا ہی اثر تھا کہ اس نے فوراً اپنے آنسو پونچھ لیے تھے اور چپ کر کے سائیڈ پر بیٹھ گئی تھی۔ صمد نے دیکھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ان کی پیشانی چومتی، کبھی نہایت پیار کے ساتھ ان کے چہرے پر ہاتھ پھیرے جاتی، وہ مسکرایا اور وارڈ سے باہر نکل آیا تھا۔

اسی شام شیر علی صاحب کو ہوش آنے کے بعد وہ انہیں انہی کے اصرار پر ہسپتال سے ڈسچارج کروا کر گھر لے آیا، جہاں بریرہ اور مریرا دونوں پاگلوں کی طرح جیسے ان کا سایہ بن گئی تھیں۔ شیر علی صاحب نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ سکندر علوی کو فون کرے اور اسے کہے کہ جیسے ہی اس کے امتحانات ختم ہوں وہ فوراً پاکستان کا چکر لگائے، صمد نے من و عن ان کا پیغام سکندر علوی تک پہنچا دیا تھا، جواب میں وہ اسی مہینے کی آخری تاریخ میں امتحانات سے فراغت کے بعد فوراً پاکستان چلے آئے تھے۔

بریرہ اور شیر علی صاحب کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، ایک دم سے ان کی ساری بیماری جیسے اڑن

”اچھا نہیں لگا۔“

”اور باقی کا دودھ کیوں پیا؟“

”اچھا لگ رہا تھا۔“

”غصہ نہیں آیا آپ کو؟“

”نہیں۔“

”اچھا، ابھی کیا پڑھ رہے ہیں؟“

”شہاب نامہ۔“

”شہاب نامہ میں تو بہت سے باب ہیں، آپ کون سا پڑھ رہے ہیں؟“

”چندر راوتی۔“

”اوہ..... بہت خوب صورت باب ہے یہ، آپ کو پتہ ہے یہ کتاب پڑھنے کے بعد میرا شدت سے دل چاہا تھا کہ میں قدرت اللہ شہاب صاحب سے صرف ایک بار ضرور ملوں، لیکن پھر جب مجھے ان کی رحلت کا پتا ہوا تو بہت دنوں تک میں روتی رہی تھی۔“

”اے اے! اور آتا بھی کیا ہے آپ کو۔“ اس بار اس نے نظریں اٹھائی تھیں، مریرا معصومیت سے

”اے اے!“

”بی بی! سچ کہہ رہے ہیں آپ، امی ابو کی رحلت کے بعد واقعی مجھے رونے کے سوا کچھ نہیں آتا۔“

”اب آپ نیچے جائیں پلیز، میں تنہائی میں پڑھنا چاہتا ہوں۔“ فوراً ہی اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ روڈ ہو گیا تھا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”سوری میں آپ کو ڈسٹرب کرنے نہیں آئی تھی، اصل میں مجھے آپ سے اپنا ایک مسئلہ شیئر کرنا تھا۔“ غزلی انگلیاں چٹختے ہوئے وہ قدرے پریشانی لگی، تبھی صمید نے کتاب بند کی۔

”فرمائیے۔“

”وہ..... میں روز بس سے کالج جاتی ہوں تو وہاں اسٹاپ پر کچھ لڑکے بہت پریشان کرتے ہیں، پہلے کالج تک ساتھ جاتے تھے، کل ان میں سے ایک یہاں گھر تک بھی چلا آیا، میں ان کے منہ نہیں لگنا چاہتی، مگر میری مجبوری ہے کہ مجھے اسی ٹائم پر کالج کے لیے گھر سے نکلتا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتی وہ میری خاموشی کو میری کمزوری سمجھ کر، میرے ساتھ کوئی بدتمیزی کریں، اسی لیے اگر آپ کچھ روز کے لیے صبح یونیورسٹی جاتے ہوئے مجھے کالج ڈراپ کر جایا کریں تو مہربانی ہوگی..... پلیز۔“ شہد آگئیں نگاہوں میں عجیب سی التجا تھی، وہ بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

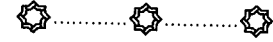
”انکل سے اجازت لی آپ نے؟“

”نہیں..... میں نے ابھی صرف بریرہ سے بات شیئر کی ہے، اسی نے یہ مشورہ دیا کہ میں آپ سے

چھو ہو گئی۔ سکندر کو آئے تیسرا دن تھا جب شیر علی صاحب نے اچانک اس کی شادی کا شوشہ چھوڑ دیا۔ اس بار کسی صورت وہ اسے اکیلا بھیجنے کو تیار نہیں تھے، سکندر نے بہت ہاتھ پیر مارے دو ہائیاں دیں مگر ان کا کوئی عذر کوئی بہانہ قابل قبول نہ ہو سکا۔ نتیجتاً صرف پندرہ دن بعد ان کی شادی انجام پا گئی۔

صمید نے اس موقع پر بھی اپنا کردار بھرپور طریقے سے نبھایا تھا۔

شادی کے تقریباً دو ماہ بعد سکندر دوبارہ واپس چلا گیا تو گھر میں پھر سے وہی خاموشی در آئی جو اس کے آنے سے پہلے اس گھر کا حصہ تھی، مگر شیر علی صاحب اور بریرہ بہت خوش اور مطمئن تھے۔



اس روز صبح جب وہ یونیورسٹی کے لیے تیار ہو رہا تھا مریرا نے اس کے لیے دودھ کا گلاس تیار کیا، جلدی جلدی تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آیا تو شیر علی صاحب چائے پی چکے تھے، جبکہ مریرا کالج کے لیے تیار بیٹھی، ابھی ناشتہ کر رہی تھی۔ اس نے سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد فوراً دودھ کا گلاس لبوں سے لگا لیا تھا، مگر اگلے ہی پل جیسے اس کا گلہ رندہ گیا۔ دودھ میں چینی کی بجائے نمک کس کیا گیا تھا، جس کے باعث وہ کھانسا اٹھا تھا، جبکہ آنکھوں میں بھی خاصا پانی جمع ہو گیا تھا، مریرا اس کا حال دیکھ کر بے ساختہ سر جھکائے اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی، وہ حیران رہ گیا، بھلا وہ اس سے اتنی فریخ تھی کہ ایسا مذاق کرتی؟ شیر علی صاحب اب اس کے قریب کھڑے اس کی پیٹھ سہلا رہے تھے۔

”آرام سے پیو بیٹا، اتنی جلد بازی بھی اچھی نہیں ہوتی۔“

”جی.....“ سعادت مند ذی سے کہہ کر اس نے پھر سامنے بیٹھی مریرا پر نگاہ ڈالی، جو شرارتی نگاہوں سے مسکراتے ہوئے خود بھی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی، کیا نہیں تھا ان نگاہوں میں؟ محبت، شرارت اور درخواست کہ وہ شیر علی صاحب کے سامنے اس کی بدتمیزی کا پردا چاک نہ کرے، تبھی اس نے چپ چاپ گلاس دوبارہ لبوں سے لگا لیا تھا۔

اسی شام ٹیوشن سے واپسی پر جب وہ چھت پر بیٹھا شہاب نامہ پڑھ رہا تھا، وہ اس کے پاس چلی آئی

تھی۔

”السلام علیکم۔“ صمید نے چونک کر دیکھا۔

”جی..... وہ اصل میں مجھے آپ سے معذرت کرنی تھی، صبح شرارت میں جو حرکت میں نے کی شاید

نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”کوئی بات نہیں، گزرے ہوئے وقت پر ملال نہیں کرنا چاہیے۔“ ایک نظر اس کے جھکے ہوئے سر پر ڈالنے کے بعد اس نے دوبارہ توجہ کتاب کی جانب مرکوز کر دی تھی مقصد اسے وہاں سے رخصت کرنا تھا، مگر وہ رخصت ہونے کی بجائے خاصی بے فکری سے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

”آپ نے بڑے ابو سے شکایت کیوں نہیں کی؟“

”بس..... چپ..... اب آپ اچھے بچوں کی طرح جا کر سو جائیں، صبح بات ہوگی۔“ اس کی پیشانی چومتے ہوئے انہوں نے بات ختم کی، پر ہیان دل میں ان کی بے پناہ محبت اور عقیدت کے احساس کے ساتھ شکستہ قدموں سے واپس پلٹ آئی۔



”بہ خاص نہیں پایا، پر ہیان کو شاپنگ کے لیے لے جانا ہے، پھر مہندی کے فنکشن کی تیاری کے لیے گاؤں کا ہا ہی اکانا ہے، میں چاہتا ہوں شادی کے سارے انتظامات ہم گاؤں میں ہی رکھیں۔“

”ہوں میری بھی یہی خواہش ہے، بات بھی کر رکھی ہے میں نے، بہتر ہے آپ جا کر جائزہ لے آئیں، بہر حال آفس کے لیے کیا سوچا ہے آپ نے؟“ وہ بات جو پچھلے دو ہفتوں سے کرنا چاہ رہے تھے اب آخر لبوں پر لے ہی آئے۔

”السلام علیکم صبح بخیر۔“ سب کو مشترکہ سلام کرتی وہ قریب آئی تھی۔ زاویار نے دیکھا اس کی آمد پر سب ہی بہت خوش ہو گئے تھے

”وعلیکم السلام، بڑی لمبی عمر ہے میری بیٹی کی، ابھی میں تمہیں ہی یاد کر رہا تھا۔“ صمدی صاحب اٹھے

تھے۔

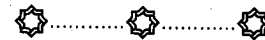
سارا بیگم نے مسکراتے ہوئے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا تھا جبکہ پرہیزان نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اسے اپنے ساتھ والی کرسی پر بٹھالیا۔

”خیریت؟“ بنازاویار کو کوئی اہمیت دیئے وہ بڑے استحقاق کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی تھی۔ وہ جل کر

مددوں، اگر آپ مان جاتے ہیں تو وہ بڑے ابو سے بات کر لے گی۔“

”ٹھیک ہے، آپ ان سے کہیں کہ وہ انکل سے بات کر لیں، اگر انہوں نے اجازت دے دی تو مجھے آپ کو ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔“

”شکریہ..... میں جانتی تھی آپ کبھی مجھے مایوس نہیں کریں گے، کیونکہ آپ بہت اچھے ہیں۔“ پل میں بچوں کی طرح خوش ہوتی فوراً وہ اٹھ کر بھاگ گئی، صمید کتنی ہی دیر تک بند کتاب کو دیکھتا مسکراتا رہا۔



”آپ جاگ رہے ہیں ابھی تک؟“
 ”ہوں..... بس نیند نہیں آ رہی تھی تو.....“
 ”میں جانتی تھی آپ جاگ رہے ہوں گے اسی لیے چلی آئی۔“ ان کی ادھوری وضاحت پر نرمی سے
 مسکراتے ہوئے وہ قریب آئی تو وہ بھی مسکرا دیئے۔
 ”زاو بار سو گیا؟“

”جی بڑی مشکل سے جان بخشی ہے میں نے اس کی، وہ بھی اس شرط پر کہ وہ جلد از جلد آفس جوائن کر لے۔“ ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے وہ ان کے قریب ہی ونڈو میں آکھڑی ہوئی تھی، باہر چاند اپنی مکمل نماہٹ کے ساتھ پورے آسمان پر اپنی مدہم روشنی بکھیر رہا تھا، صمد صاحب اس کی بات پر مسکرائے۔

”پاپا جانی..... مجھے اصل میں آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔“ اگلے ہی پل ان کی خاموشی پر اس نے ونڈو کے اس بار دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی بیٹے کہیں، میں سن رہا ہوں۔“

”وہ..... میں کل سے آفس نہیں جاؤں گی، اب زاویار آگیا ہے تو بہتر ہے کہ وہی آپ کی جگہ سنبھالے اور پایا جانی، وہ جو بنگلہ آپ میرے لیے شادی کے گفت کے طور پر خرید رہے تھے وہ نہیں چاہیے، آپ کی محبت اور دعاؤں کے سوا مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔“

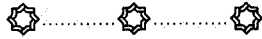
”جانتا ہوں، مگر پھر بھی میں اپنی بیٹی کو دنیا کی ہر چیز ہر خوشی دینا چاہتا ہوں۔“

”مگر پایا.....!“

”کوئی اگر مگر نہیں، یہ میرا مسئلہ ہے کہ میں کہا دے سکتا ہوں، کہا نہیں، میری بیٹی نے بس اپنا حق سمجھ

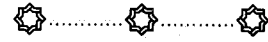
ان تین دنوں میں ہی یہ لڑکی اس کے لیے قطعی ناقابل برداشت ہو گئی تھی، وہ ابھی دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی پیشانی سہلا رہا تھا جب وہ سرخ چہرے اور نم آنکھوں کے ساتھ بنا اجازت طلب کیے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”یہ میرا ریزائن لیٹر ہے..... میں یہ جاب اور اپنے بچپس دن کی تنخواہ آپ کے منہ پر مار کر جا رہی ہوں..... خدا حافظ۔“ ہوا کے تند جھونکے کی مانند جیسے وہ آئی تھی ویسے ہی واپس بھی پلٹ گئی، زاویار حیرت سے گنگ اس کی جرأت اور بدتمیزی دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا اسے واپس بلائے اور اس کے منہ پر زور دار تھپڑ رسید کر کے اسے اس کی اوقات یاد دلانے، ابھی وہ خود کو نارمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ صمد حسن صاحب کی گاڑی اس کے شاندار آفس کے باہر آرکی۔



راکھ ہو گیا تھا۔
”ہوں، خیریت ہی ہے، آج زاویار بھائی مجھے شاپنگ کروا رہے ہیں تو ماما اور پاپا چاہ رہے تھے کہ تم بھی اپنی شاپنگ مکمل کر لو۔“

”نہ باباناں، مجھے تمہارے زاویار بھائی کی جیب خالی کروانے کا کوئی شوق نہیں، ویسے بھی آج میری بہت ایمپورٹنٹ میٹنگ ہے ہمدانی صاحب کے ساتھ کسی طور یہ میٹنگ مس نہیں کر سکتی میں۔“ زاویار جتنا ضبط کر رہا تھا وہ اتنا ہی پھیل رہی تھی، اس نے ناشتے سے ہاتھ روک لیا، پھر اس سے پہلے کہ پرہیان کچھ کہتی، وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور کرسی پیچھے دھکیلتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی اس حرکت پر سارا بیگم اور پرہیان کے ساتھ ساتھ خود عائلہ بھی حیران ہو گئی تھی۔ جبکہ صمد حسن صاحب لب بھینچ کر رہ گئے تھے۔



زاویار حسن کو آفس سنبھالے تیسرا دن تھا جب اس روز وہ اس پر برس پڑا۔
”آپ اپنی سفارشات اور تعلقات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہیں مس عائلہ علوی اور میں ایسے لوگوں کو ہرگز اپنے آفس میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ ہاتھ میں پکڑی فائل زور سے میز پر پھینکتے ہوئے اس نے اپنا غصہ اور نفرت اس پر واضح کی تھی، جواب میں عائلہ کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہوا تھا۔
”مائیڈاٹ سر..... جس غلطی کے لیے آپ اتنا چراغ پا ہو رہے ہیں، وہ غلطی اور وہ فائل میری نہیں ہے نہ ہی میں نے اس پر اپنے سائن کئے ہیں، آپ کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ آپ کا غصہ خشک گھاس کی طرح آپ کی عقل کو آگ بن کر کھا جاتا ہے اور ایسے میں آپ کو دیکھنا بھی یاد نہیں رہتا کہ حقیقت کیا ہے، بہر حال میں یہاں صرف اپنی محنت اور قابلیت کے بل بوتے پر کام کرتی ہوں، کسی کی سفارش یا تعلق کی بنا پر نہیں۔“
”جسٹ شٹ اپ..... اوکے..... اپنی اوقات میں رہ کر بات کریں۔“

”اوقات میں رہ کر ہی بات کر رہی ہوں، بہتر ہوگا اگر آپ بھی اپنی اوقات میں رہ کر بات کریں کیونکہ میں یہاں آپ کی درکار ضرور ہوں مگر بھکاری نہیں ہوں، جو آپ بلاوجہ میری تذلیل کریں اور میں خاموش رہوں۔“ جتنی سرفی اس وقت زاویار حسن کے چہرے پر تھی اس سے زیادہ سرفی عائلہ علوی کے چہرے سے جھلک رہی تھی، پہلی لڑکی تھی اس کی زندگی میں جس نے یوں اس کی شخصیت کے رعب میں آئے بغیر اس کی تذلیل کی تھی۔ وہ جل بھن کر ہی تو رہ گیا تھا۔

”جسٹ شٹ اپ یور ماؤتھ اینٹ گیٹ لاسٹ۔“ اس بار چہرے کے تاثرات کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی ذلت آمیز ہو گیا تھا۔ عائلہ کی آنکھیں ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود آنسوؤں سے بھر آئیں، وہ پلٹی اور فوراً اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی، زاویار ایک گہری سانس خارج کرتا اپنی سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر پلکیں موند گیا۔

سب چونک اٹھے۔

”مقبول حسین، چالیس سال بعد، مگر وہ تو غائب تھا‘ شہید سمجھ لیا گیا، مگر اس وقت سامنے کھڑے سپاہی کا چہرہ خوشی سے دھک رہا تھا اور تم جانتے ہو وہ سپاہی ہے مقبول حسین.....“ وہ خاموش بیٹھی کرنل شیر علی کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی جب وہ بولے۔

”ستمبر ۱۹۶۵ء..... سپاہی مقبول حسین، کیپٹن شیر علی کی قیادت میں ایک اہم مشن پر روانہ ہوتے ہیں، ان کے بھائی مکھن خان، دو بہنیں، مگیتیر، ان کے والد، والدہ انہیں اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں کی چھاؤں میں خدا حافظ کہتے ہیں یہ مشن مقبوضہ کشمیر میں دشمن کے ٹھکانوں پر حملہ کر کے اس کے اسلحے کے ڈپو اور دوسری تنصیبات کو تباہ کرنے پر مبنی تھا تا کہ دشمن کی اس تیاری پر بروقت کاری ضرب لگائی جاسکے جو وہ پاکستان پر حملے کے لیے کر رہا تھا۔ مقبول حسین شانے پر وائزلیس سیٹ اور ہاتھ میں رائفل لیے، معرکے میں اترتے ہیں۔ مشن کی تکمیل کے بعد فورس اپنے بیس کی جانب واپس آتی ہے، مگر سپاہی مقبول حسین دشمن کے فائر کی زد میں آجاتے ہیں اور دشمن کے ہاتھوں پکڑے جاتے ہیں، جینوا کنونشن کی خلاف ورزی ہوتی ہے اور انہیں جنگی قیدی بھی نہیں بنایا جاتا، نہ ہی سول قیدیوں میں ان کا اندراج کیا جاتا ہے۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے جنگی قیدیوں کے تبادلے میں بھی ان کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ان افراد کی لسٹ میں لکھے جاتے ہیں جن کے بارے میں وہ قماں اہا ہاتا ہے کہ وہ کھم گئے ہیں یا شہید ہو گئے ہیں۔

اس پائل کا دل دین دین کی قید میں ایسی ایسی اذیتیں برداشت کرتے رہے کہ انسانی ظلم کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی قید تنہائی تنگ و تاریک دن رات..... موسموں کی سختی..... جانوروں کی طرح رینگنے کا علم..... جسمانی ایذا کے ایسے ایسے حربے جو حیوانیت اور بربریت کی ناقابل برداشت مثالیں ہیں۔

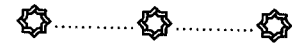
”جواب دو..... بولتے کیوں نہیں..... بتاؤ پاکستان میں فوجی اڈے کہاں کہاں ہیں؟ تمہیں سب راز افغان ہوں گے بولو جو کچھ تمہیں معلوم ہے نفسیاتی طور پر انہیں مار چر کیا جاتا ہے شب و روز پٹرول پلایا جاتا ہے‘ نوخوار کتے چھوڑے جاتے ہیں‘ جوان کی پنڈلیاں چپا جاتے ہیں مگر..... وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہتے ہیں‘ ان کی زبان پر ایک ہی نعرہ ہوتا۔

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر تیرے رخ پر کھڑ گئی ہوگی
”پاکستان زندہ باد“

اس قید خانے کی دیواریں مقبول حسین کے خون سے رنگی جاتی ہیں اور وہ ہر جگہ لکھ دیتے ہیں۔

”پاکستان زندہ باد، پاکستان پائندہ باد“، تبھی ایک افسر چلاتا ہے، کاٹ دواس کی زبان کاٹ دو اور پھر ان کی زبان بھی کاٹ دی جاتی ہے تا کہ وہ پاکستان جا کر کبھی یہ نہ بتا سکیں کہ ان کے ساتھ کیسا غیر انسانی سلوک روا رکھا گیا‘ انہیں نفسیاتی مریض بنا کر پاکستان دھکیل دیا جاتا ہے اور چالیس سال بعد وہ اس سرزمین پر لوٹتے

چھپتی ہے قلب و جاں میں ستاروں کی روشنی
اے چاند ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے
میں نے کبھی یہ ضد تو نہیں کی پر آج شب
اے مہم جبین نہ جا کر طبیعت اداس



وہاں میں نہیں تھی
فقط خالی پنجرہ بدن کا پڑا تھا۔
اور نیم والاں کو اڑوں سے ہر چہ چڑا ہٹ میں
حیرانیاں بولتی تھیں
زمین کی فضا سے کسی نے مجھے باہر دھکیلا
فلک تک میری دسترس کیوں نہیں تھی
نجانے میں کب تک فضا میں بھٹکتی رہی تھی!

سرد ہوا کے تپیزے فضا کی خشکی میں اضافہ کر رہے تھے، مگر وہ موسم کی پرواہ کیے بغیر پیدل ہی چلی جا رہی تھی۔ آنسو تھے کہ ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے تھے بار بار زاویار حسن کا توہین آمیز لہجہ تصور میں آکر اسے مزید دکھی کر رہا تھا۔ کتنے سالوں سے وہ اس کمپنی کے لیے کام کر رہی تھی بالکل ایسے جیسے وہ اس کی اپنی کمپنی ہو پچھلے چند سالوں میں اس کی قابلیت اور محنت نے اس کمپنی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا اور آج بنا کسی قصور، کسی جرم کے اسی کمپنی کے مالک نے ایک منٹ میں اسے اس کی اوقات یاد دلا کر رکھ دی۔ اس کا دل چاہا، وہ سڑک کنارے بیٹھ کر خوب روئے، اتنے سالوں کی محنت کا یہ صلہ اس جیسی حساس لڑکی کے لیے موت کے مترادف تھا۔ تب ہی اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ گھر پہنچی تو دوپہر ڈھل چکی تھی۔ سدید بچن میں کھڑا پیاز کاٹ رہا تھا۔ جبکہ کرنل صاحب لاؤنج میں بیٹھے اس سے ملکی حالات پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ان کے سرخ چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔ وہ بیگ گود میں رکھ کر وہیں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ کرنل صاحب بتا رہے تھے۔

”سترہ ستمبر ۲۰۰۵ء کی بات ہے آزاد کشمیر جمہنفل کمانڈیٹ کے سامنے ایک عمر رسیدہ شخص صبح کے وقت، بوسیدہ لباس کے ساتھ خاموش کھڑا تھا‘ اشارے سے بتاتا ہے کہ وہ ڈیوٹی پر واپس آگیا ہے، بولنے سے معذور ہے‘ کاغذ پر لکھ کر بتاتا ہے، تین تین پانچ ایک تین نو.....

ہیں تو ان کے استقبال کے لیے نہ گاؤں میں ان کا بھائی مکھن خان ہے اور نہ ان کے وہ دوست کہ جن کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ بس چند قبریں ہیں اور ایک حوصلہ مگر کون جانے.....!

”جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستین کا“

اور آج چالیس سال بعد سپاہی مقبول حسین نمبر تین تین پانچ پانچ ایک تین نو، پھر ڈیوٹی پر حاضر ہے انہیں کی ملکیت ہے یہ سرزمین، یہی حقیقی وارث ہیں زمین کے اس نگرے کے، مگر افسوس صد افسوس کہ ان کی ایسی قابل فخر خدمات کے عوض، پاکستان کی حکومتیں اور عوام ان کے مزاروں سے جالے تک صاف نہیں کروائیں، قوم کے چٹانوں سے مضبوط سینوں والے جاں بازوں کے ساتھ ہی یہاں انسانیت بھی سو گئی ہے بھوک سے بلکتے، سیلابوں اور زلزلوں کے مارے معصوم بچے، ایٹمی قوت ہونے کے باوجود ڈرون حملوں میں مرتے بے گناہ شہری، مہنگائی کے بوجھ تلے دب کر لمحہ بالمحہ سسکتے غریب عوام اور اسی عوام کے سینے پر روزانہ کروڑوں کی شاہ خرچیاں کرتے حکمران، خود سوچو سدید کیا مستقبل ہو سکتا ہے اس ملک کی بد نصیب قوم کا؟“ سرخ چہرے پر دبا دبا جوش اچانک غصے اور پھر شدید دکھ میں ڈھل گیا تھا۔ سدید پیاز کاٹ کر ہاتھ دھونے کے بعد کچن سے نکل آیا۔

”آپ صحیح کہتے ہیں بابا، مگر کیا کیا جاسکتا ہے سوائے کڑھنے اور دل جلانے کے اب مقبول حسین اور اس جیسے سینکڑوں قابل فخر جوان ملک کی قیادت سنبھال کر یہاں انقلاب تو نہیں لاسکتے نا؟“ کرنل شیر علی کی طرح اس کا دل بھی دکھی تھا۔ تبھی ان کی نظر عائلہ کی طرف اٹھی۔

”تم کب آئیں“

”ابھی..... تھوڑی دیر پہلے۔“ اس کا لہجہ بجھا سا تھا وہ چونک اٹھا۔

”کمال ہے پتہ ہی نہیں چلا..... آنکھوں کو کیا ہوا ہے کتنی سرخ ہو رہی ہے۔“ فوراً ہی اس کی سرخ

آنکھوں پر غور کرتا ہوا وہ پریشان ہوا تو عائلہ نے سرجھکا لیا۔

”کچھ نہیں صبح سے خارش ہو رہی ہے شاید انفیکشن ہو گیا ہو۔“

”چلو پھر ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“

”ابھی نہیں سدید، بہت تھکن پل ہو رہی ہے، سوؤں گی۔“

”یہ کون سا ناٹم ہے سونے کا عشاء کی نماز پڑھ کر کھانا کھا کر سونا۔“

”نہیں بھوک نہیں ہے نماز رات میں اٹھ کر پڑھ لوں گی پلیز۔“ اس کے لہجے میں بے حد تھکن تھی مگر

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا وہ انھی اور کرنل صاحب کے گال پر پیار کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف

بڑھ گئی، پیچھے وہ اور کرنل صاحب پریشانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

جڑ بھی ایک پھول ہے

بس فرق صرف اتنا ہے

کہ اسے نمائش سے نفرت ہے

صمد حسن صاحب کی گاڑی کے ٹائر عین اس کے آفس کے باہر چرچائے تھے۔ وہ بے نیاز سا بیٹھا پیپر ویٹ گھماتا رہا۔ پھر جس وقت صمد صاحب نے اس کے کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا وہ فوراً سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”السلام علیکم پاپا۔“

”وعلیکم السلام پاپا کی جان۔“ فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ قریب آئے۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”کچھ نہیں، ہمدانی صاحب کے ساتھ میٹنگ کی تیاری کر رہا تھا۔“

”گڈ..... ہمدانی صاحب ہمارے بہت اچھے کلائنٹ ہیں، خاص طور پر عائلہ کی ذہانت اور قابلیت

سے بہت متاثر ہیں۔“

”آپ کے بیٹے میں بھی لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت ہے پاپا۔“ اسے فی الوقت عائلہ کی تعریف

بری لگی تھی۔

صمد صاحب اس کے لب بھجنے پر مسکرا دیئے۔

”بے شک..... میں نے یہ کب کہا کہ میرے بیٹے میں کوئی صلاحیت یا خوبی نہیں ہے الحمد للہ میرے

بہنو کی ساری باتوں کا تو زمانہ مٹرف ہے۔“ فخریہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے زاویار کے کندھے پر ہاتھ رکھا

وہ انہیں نے اٹھایا۔

”میری پاپا۔“

”وہیلیم مانی سن کیسا لگا یہ آفس اور آفس کے لوگ؟“ اگلے ہی پل وہ اس کے مقابل سیٹ سنبھال کے

بند پٹے تھے زاویار نے بھی اپنی سیٹ سنبھال لی۔

”ابھی تک تو ٹھیک ہے پاپا آہستہ آہستہ پتہ چلے گا کہاں کہاں کیا کیا غلط ہے۔“

”ہوں، تم چاہو تو عائلہ سے مدد لے سکتے ہو بہت قابل بچی ہے تمہاری مامتا رہی تھیں کہ اسے بخار

بے فکر پھر بھی وہ آفس چلی آئی۔“ اگلے ہی پل پھر سے عائلہ کی تعریف نے اس کا اطمینان غارت کر دیا۔ تب ہی

وہ کہہ ہی مانس بھرتے ہوئے بولا۔

”اس نے ریزائن کر دیا ہے پاپا۔“

”ہاٹ۔“ مگر کیوں؟“ جتنے سکون سے اس نے بتایا تھا صمد صاحب کو اتنا ہی شاک لگا۔ وہ لاعلمی

سے اپنا ہاتھ کیا۔

”پتہ نہیں شاید اسے میرے ساتھ کام کرنا پسند نہیں۔“

”نہیں ایسا ہوتا تو وہ مجھے ضرور بتا دیتی۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے ضرور تم نے اسے تنگ کیا ہوگا۔“

”ایم سوری پاپا میری اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کہ اسے تنگ کرتا پھروں، وہ خود ہی نہایت بدتمیز

ہے۔“ لی نے خواہواہ سرچڑھا رکھا ہے آپ نے اسے۔“

”زاویار عائلہ میری بیٹی ہے اور میں کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میری بیٹی کے

لیے ایسے الفاظ استعمال کر لے خواہ وہ میرا اپنا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔ ایک پل میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

زاویار کے اندر آگ جل اٹھی۔

”آپ ایک معمولی لڑکی کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کی انسلٹ کر رہے ہیں پاپا۔“

تمہارا باپ اس لڑکی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“

”چاہے وہ آپ کے بیٹے کو سرعام گالیاں دیتی رہے؟“

”وہ ایسی نہیں ہے، وہ تو چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کو تکلیف نہیں دیتی، تمہیں کیسے دے سکتی ہے۔“ بناء اس کی جلن کی پروا کیے انہوں نے بے حد مضبوط لہجے میں کہا، پھر کوٹ کی جیب سے موبائل نکال کر عائکہ کو کال ملائی۔

دوسری طرف ان کی کال کو کوئی رسپانس نہیں دیا گیا تھا، تب ہی انہوں نے سدید کو کال ملائی۔

”السلام علیکم انکل کیسے ہیں آپ؟“ دوسری ہی نیل پر ان کی کال ریسید کر لی گئی تھی۔

”علیکم السلام، میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسے یاد کیا؟“

”یاد تو ہر وقت کرتا ہوں بیٹے، اس وقت عائکہ بیٹی سے بات کرنا چاہ رہا تھا، مگر وہ کال پک نہیں کر رہی۔“ بناء زاویار کی طرف دیکھے وہ بات کر رہے تھے۔ جس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ پڑ رہا تھا۔

”جی انکل، وہ اصل میں کچھ ڈسٹرب ہے شاید اس کی آنکھوں میں کچھ انفکشن ہو گیا ہے تو کمرابند کر کے سو رہی ہے، میں آپ کا پیغام دے دوں گا اسے وہ اٹھتے ہی آپ سے بات کر لے گی۔“

”ہوں ٹھیک ہے کرنل صاحب کی خدمت میں میرا سلام عرض کیجیے گا۔“

”جی ٹھیک ہے انکل۔“

”خدا حافظ۔“ کال بند کرتے ہی انہوں نے پھر زاویار کی طرف دیکھا۔

”یاد رکھنا زاویار، عائکہ اس کمپنی میں کوئی معمولی ورکر نہیں ہے اس کمپنی کی بنیاد جن پیسوں سے رکھی گئی، وہ پیسے تمہارے باپ کو عائکہ کے دادا، یعنی کرنل شیر علی نے مہیا کیے تھے۔ وہ اس کمپنی میں اصولاً اور قانوناً بیس پرسنٹ کے شیئر کے مالک ہیں تم اور میں دونوں چاہیں تب بھی انہیں باہر نہیں کر سکتے، سنا تم نے، میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ تم بلاوجہ اس لڑکی کا دل دکھاؤ۔“ اپنی سیٹ سے اٹھتے ایک بار پھر سے انہوں نے اسے تنبیہ کی تھی۔

زاویار کا بس نہ چلتا رہا تھا کہ اپنا سردیوار پہ دے مارے..... کیا تھی وہ لڑکی؟

ایک مڈل کلاس گھرانے کی، نارمل سی شکل و صورت والی لڑکی، جس کی شخصیت سے اگر ذہانت اور خود اعتمادی کو نکال دیا جاتا تو باقی صفر بھی نہیں بچتا تھا، مگر اسی لڑکی کے لیے اس کا پورا گھریلو پاگل تھا جیسے وہ آسمان سے اتری کوئی حور ہو۔

صمید صاحب کمرے سے اٹھ کر جا چکے تھے۔ پیچھے وہ کھولتے خون کے ساتھ، میز پر زوردار مکارسید

کر کے رہ گیا۔



سورج ڈوب چکا تھا۔

عائکہ کی آنکھ کھلی تو کمرے میں اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ریشمی بال سمیٹتی، بیڈ سے اتری، وہ بہت دیر تک سوتی رہی تھی تب ہی اسے ہلکی ہلکی جھوک کا احساس بھی ہو رہا تھا۔

کمرے کی ساری لائٹس آن کرنے کے بعد، وہ باہر لاؤنج میں آئی تو سدید ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ کرنل صاحب اب وہاں موجود نہیں تھے، وہ اسی کے پاس آ بیٹھی۔

”السلام علیکم۔“

”علیکم السلام، اٹھ گئیں تم؟“ فوراً سے پیشتر ٹی وی کا ولیم کم کرتے ہوئے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

عائکہ نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلایا۔

”طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہوں۔“

”گڈ، کھانا کھاؤ گی۔“

”ہوں۔“

”لگتا ہے اب زبان پر انفکشن ہو گیا ہے۔“ ہلکی سی چپٹ اس کے سر پر رسید کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور عائکہ سست سی وہیں بیٹھی رہی۔

”یہ یو مستقبل کے شہید کے ہاتھوں کا بنا کھانا کھا کر دیکھو روح خوش ہو جائے گی کھا کر۔“ اگلے پانچ منٹ کے بعد ہی وہ کھانے کی ٹرے اٹھا کر لے آیا تو عائکہ اٹھ کر ہاتھ منہ دھوا آئی۔

جب تک وہ کھانا کھاتی رہی سدید خاموشی سے اسے گاہے بگاہے دیکھتا رہا، پھر جیسے ہی اس نے کھانا ختم کر کے پانی کا گلاس اٹھا یا سدید نے اسے روک دیا۔

”کتنی بار کہا ہے عائکہ، کھانا ختم کرنے کے فوری بعد پانی نہیں پیتے۔“

”ہوں، اگر سالن میں مرچیں تیز نہ ہوں تو۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ کھانا اچھا نہیں پکا۔“

”جی ہاں۔“

”بس..... ناشکری ہی رہنا ہمیشہ۔“ وہ خفا ہوا عائکہ مسکرا دی۔

”بابا کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“

”کیوں؟“

”کیا مطلب کیوں؟ رات کے ساڑھے گیارہ ہو رہے ہیں اس وقت اپنے کمرے میں نہیں جائیں گے تو اور کہاں جائیں گے؟“

محبت ہے
جیسی تو کچھ بھی کہتے ہو
تمہاری سرد مہری کے سمندر میں
پڑے چپ چاپ سہتے ہیں
محبت ہے جیسی تو ہم
پرنندوں کی طرح سے لوٹ آتے ہیں
تمہاری ذات کے گنجان برگد میں
جہاں پر کوئی بھی نہیں
ہماری خواہشوں کو گھونسلہ رکھنے نہیں دیتی
محبت ہے جیسی تو ہم نے تیری یاد کا جگنو
حسین رو پہلے چہروں کی ضیاء میں آج تک کھویا نہیں
جیسی تو ہم دیے کی طرح جلتے ہیں، سلگتے ہیں
تمہاری بھری تاریک راہوں میں سنوں جاناں
ہماری خاک کو گرتم ہواؤں میں اڑاؤ گے
تو واپس لوٹ آئیں گے
کہ..... ہمیں تو خاک ہو کر بھی تیرے قدموں میں رہنا ہے!
رات وہ خاصی دیر سے گھر واپس آیا تھا۔
پر یہاں اپنی ساری مصروفیات ترک کیے اس کے انتظار میں لاؤنج میں بیٹھی وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی۔
سرسری ایک نظر اس پر ڈالتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
صمید صاحب بھی ابھی تک جا رہے تھے، مگر اس وقت وہ کسی طور پر زلویار سے بات کرنے کے موڈ
میں نہیں تھے۔ تبھی ان کی ایماء پر یہاں اٹھ کر اس کے کمرے میں آئی تھی، جو کمرے سے ملحقہ واش روم میں
کھسا منہ پر پانی کے چھپا کے مار رہا تھا۔
”زارویار بھائی، کھانا لاؤں؟“
”نہیں..... بھوک نہیں ہے۔“ چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے چہرہ خشک تو لیے سے رگڑا۔ بلیک
شرٹ کی آستین بھی کہنوں تک فولڈ کی ہوئی تھی وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔
”ٹھیک ہے مگر ایک کپ کافی تو پی سکتے ہیں ناں میرے ساتھ؟“
”ہوں..... ضرور۔“ چہرہ خشک کرنے کے بعد تولیہ اس نے سائیڈ میں صوفے پر پھینک دیا تھا۔
”یہاں مطمئن سی دوبارہ نیچے چلی آئی، تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں اپنا اپنا کافی کاگ ساتھ میں لیے باہر لان
سے ماہ قد بیڑھیوں پر آ بیٹھے تھے۔
”میں جانتی ہوں اس وقت آپ بہت ڈس ہارٹ ہیں، یقیناً پاپا سے ناراض بھی ہے ناں؟“ کچھ دیر

”اوہ..... مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ اتنا ناٹم ہو گیا۔“
”ہو بھی کیسے سکتا تھا، سارے گدھے گھوڑے بیچ کر جو سوئی تھیں، خیر وہ صمید انکل کئی بار تمہارا پوچھ
چکے ہیں، کیا تم ان سے ناراض ہو کر آئی تھیں؟“
”نہیں۔“
”جھوٹ؟“ اب وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ عائلہ نے نظریں چرا لیں۔
”میری واقعی ان سے کوئی ناراضگی نہیں ہے سدید۔“
”کوئی ناراضگی نہیں تو وہ اتنے پریشان کیوں ہیں اور تم اتنی رو کر کیوں آئی ہو وہاں سے، مجھے بتاؤ پلیز
کیا بات ہے؟“
اب وہ سختی سے پیش آرہا تھا، عائلہ جانتی تھی وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ تبھی یوں بے
چین ہو رہا تھا، وہ خود بھی تو اس سے کوئی بات نہیں چھا سکتی تھی۔ تبھی آہستہ آہستہ سر جھکا گئی تھی۔
”میں صمید انکل سے ناراض نہیں ہوں، نہ ہی آج تک کبھی مجھے ان سے کوئی شکایت ہوئی ہے
مگر..... ان کا بیٹا ان جیسا نہیں ہے سدید، پتہ نہیں کیوں وہ مجھ سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ بات بات پر مجھے بے
عزت کرنا اس نے جیسے اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ میں اب تک صمید انکل کی وجہ سے بہت کچھ برداشت کرتی رہی
ہوں مگر اب نہیں، روز روز اس شخص کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہو سکتی میں.....“ اسے بتاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر وہ
رو پڑی تھی۔
سدید کی جان پر بن آئی۔
”کیا کہا ہے اس نے تم سے؟“
”کچھ نہیں، بس وہ چاہتا ہے کہ میں صمید انکل اور ان کی فیملی سے دور رہوں۔“
”ہوں..... تو تم نے کیا سوچا ہے پھر؟“
”میں ایسا نہیں کر سکتی سدید، صمید انکل کے مجھ پر بہت احسان ہیں، ان کی فیملی نے مجھے بہت زیادہ
پیار دیا ہے، میں اس بد دماغ، ذہنی مریض شخص کے لیے اتنے پیارے لوگوں کو نہیں چھوڑ سکتی۔“
”ٹھیک ہے مگر یاد رکھنا، دوبارہ اگر کسی بھی وجہ سے میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو سچ کہتا
ہوں عائلہ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“ وہ ایسا ہی تھا ٹوٹ کر چاہنے والا۔
عائلہ بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی۔
”اچھا..... اور جو خود ہر وقت رلاتے رہتے ہو..... وہ؟“ اسے مسکراتے دیکھ کر وہ قدرے ریلکس
ہوا۔
”میری خیر ہے۔“
”پیئر (بے ایمان.....)“ کھل کر مسکراتے ہوئے اس نے سدید کے بازو پر زور دار مکارسید کیا
جواب میں وہ اس کی ناک دباتے ہوئے خود بھی مسکرا دیا۔



خاموشی کے بعد پر یہاں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

زاویار نے جواب میں ایک بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا۔
”نہیں۔“

”جھوٹ مت بولیں۔“

”جھوٹ نہیں بول رہا میں، اور میرے خیال سے نہ ہی اس کی کوئی ضرورت ہے۔“

”اوکے“ تو کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ اتنی رات کو بناء کسی وجہ کے آپ گھر سے باہر کہاں

مصروف تھے؟“

”ہوں..... اپنے ایک دوست کی طرف گیا تھا، امریکہ کا ٹکٹ کنفرم کروانے۔“

”وہاٹ..... مگر کیوں؟“ جتنے سکون سے اس نے اطلاع دی تھی وہ اتنی ہی بے چین ہو گئی تھی۔

زاویار نے ایک اور بڑا سا گھونٹ اپنے اندر اتارا۔

”کیونکہ میری یہاں ضرورت نہیں ہے۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟“ فوراً رخ اس کی طرف پھیرتے ہوئے اس نے پوچھا مگر زاویار نے

جواب نہیں دیا۔

”ایک بات پوچھوں بھائی؟“ کچھ پل خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔ وہ محض سر ہلا سکا۔

”ہوں۔“

”آپ عائکہ علوی سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ سوال خاصا غیر متوقع تھا۔ اس کی پیشانی کے

بلوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”بہتر ہوگا پر یہاں اگر ہم اس لڑکی کے ٹاپک پر کوئی بات نہ کریں، پلیز۔“

”اوکے“ مگر میں آپ کے یوں اچانک امریکہ واپس جانے کی وجہ ضرور جاننا چاہوں گی۔“

”کوئی وجہ نہیں ہے۔“ اس نے جیسے کچھ بھی نہ بتانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”چلو اب سو جاؤ، رات بہت ہو گئی ہے۔“ اچانک وہ اس کے پہلو سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو

وہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

زاویار نے کمرے میں واپس آنے کے بعد دروازہ لاک کیا، تھوڑی دیر کے بعد جولی رابرٹ اس کے

ساتھ اسکا پیپ پر آن لائن تھی۔

”کیسے ہوزی؟“

”فائن تم سناؤ، ایک کہاں ہے؟“

”کل تک تو یہیں تھا، آج صبح شکار گویا ہے، کچھ کام تھا، تم تھوڑے پریشان لگ رہے ہو، کیا بات

ہے؟“

”کچھ نہیں، بس میں امریکہ واپس آ رہا ہوں۔“

”خیریت.....؟“

”ہوں..... خیریت ہی ہے۔“

”مگر تم تو کہہ رہے تھے؟ تمہارے بابا کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”غلط فہمی تھی میری، ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”تم کہنا چاہتے ہو کہ وہاں تمہاری غیر موجودگی میں تمہاری بہن ان کی مدد کر رہی ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر تم یہاں کیوں آرہے ہو؟“

”تمہیں کوئی مسئلہ ہے میرے واپس آنے سے؟“ ایک دم سے وہ بھڑک اٹھا تو جولی کھل کر ہنس دی۔

”نہیں..... مگر میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی فرسٹریشن ضرور شیئر کرو۔“

”کوئی فرسٹریشن نہیں ہے۔“

”کم آن زاویار..... میں بہت سالوں سے تمہیں جانتی ہوں، اور بہت اچھی طرح سے مجھے اس بات کا

پتہ ہے کہ تم کوئی بھی فیصلہ یوں اچانک نہیں کرتے۔“ وہ ابھی بھی مسکرا رہی تھی، زاویار نے جیسے تھک کر سر کرسی کی

پشت گاہ سے نکال دیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ناچاہتے ہوئے بھی وہ اپنی ساری الجھن اس کے ساتھ شیئر کر چکا تھا۔

”ہوں..... اگر ایسی بات ہے تو پھر تمہیں ہر صورت وہیں رہنا چاہیے۔ کیا تم ایک اجنبی لڑکی کو اپنے

پاپا کے بزنس پر آسانی سے ہاتھ صاف کرنے دو گے؟“

”میرا پاپا کے بزنس پر کوئی حق نہیں ہے جولی، وہ لڑکی انہیں مجھ سے زیادہ عزیز ہے۔“

”ایسے مت کہو زاویار..... تم ان ٹڈل کلاس لڑکیوں کی حقیقت نہیں جانتے، بہت چالاک ہوتی ہیں یہ

اپنے مفاد کے لیے کسی کو بھی ہاتھ میں کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا ان کے لیے۔“

”تو.....؟“

”تو یہ کہ تم اپنے بابا کا بزنس خود اپنے ہاتھ میں لو، ان کا اعتبار جیتو اور آہستہ آہستہ اس لڑکی کا پتہ صاف

کر کے سارا بزنس یہاں امریکہ میں منتقل کر لو، آفر آل یہ تمہاری خواہش بھی ہے۔“

”ہوں میرا خیال ہے یہ ایک بہترین مشورہ ہے۔“

”یقیناً ویسے بھی میدان جنگ سے بھاگنا بزدلوں کا کام ہے اور تم بزدل نہیں ہو۔“

”تھینکس جولی، ایک مرتبہ پھر تم نے میری مشکل آسان کر دی۔“ وہ اب مسکرا رہا تھا، جولی بھی

مسکرا دی۔

”یو آل ویز ویلکم سر۔“ تھوڑی دیر مزید ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے سسٹم آف کر دیا، یقیناً جولی

نے اسے صحیح بات سمجھائی تھی، واقعی وہ لڑکی اپنے حالات بدلنے کے لیے اس کے گھر والوں کی محبت کیش کر رہی

تھی، مگر وہ اب اسے ایسا کوئی موقع نہیں دینے والا تھا۔

☆.....☆.....☆

زاویار صمد حسن کے کمرے کی لامیٹ جل رہی تھی۔

صمد صاحب نے پر یہاں سے اس کا امریکہ واپسی کا ارادہ جان کر چپ سا دھ لی، وہ صرف شکل و

صورت میں اپنی ماں پر نہیں گیا تھا بلکہ اس نے عادتیں مزاج بھی اسی کا چرایا تھا۔
پر یہاں اپنے کمرے میں جا چکی تھی وہ تھکے تھکے سے باہر لان میں چالے آئے جہاں ایک کونے میں مدھم سا جلتا دودھیا بلب بے حد اداس دکھائی دے رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جہاں زوایاں اور پر یہاں بیٹھے تھے وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔

رات کی سرد خاموشی ہوا، ایک دم سے انہیں بے کل کر گئی تھی۔

خیر اور شر کی کرنیں بکھیرتا چاند اب بادلوں سے آنکھ پھولی کر رہا تھا، وہ نڈھال سے ہلرے ٹیک لگا کر پلکیں موند گئے، گزرے ہوئے وقت کی یادوں کا ریلا پھر انہیں بہانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ کتنے سال ہو گئے تھے مگر..... آج بھی بیتی ہوئی یادوں کے زخم تازہ تھے۔

یادوں کا چڑھتا دریا کسی طور خشک ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

کیا نہیں تھا آج ان کے پاس؟

عزت..... دولت..... شہرت.....

مگر پھر بھی تشنگی تھی کہ کسی طور ختم ہوتی دکھائی نہ دے رہی تھی، کسی ضدی بچے کی طرح آج بھی ان کا دل اسی آنگن میں پناہ ڈھونڈنا چاہتا تھا جہاں کبھی مریرا جن سے ان کی محبت پروان چڑھی تھی۔

وہ محبت..... جس نے ہجر کا روپ دھار کر پھر ان کا ماس تک کھالیا تھا..... نک..... نک..... نک..... گھڑی کی سوئیاں آگے ہی سفر کرتی جا رہی تھیں، مگر وہ اور ان کا دل پیچھے جا رہے تھے، گزرے ہوئے ان سالوں کی طرف جو صدیوں پر محیط ہو کر انہیں اندر سے ختم کرتے جا رہے تھے۔

مریرا جن ان دنوں بہت خوش تھی۔

روز صبح کالج جاتے ہوئے وہ اس کے خوب کان کھاتی تھی، اب وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی بے حد خیال رکھنے لگی تھی۔ شیر علی صاحب بریرا بھی اس سے بہت خوش تھے کہ ان کی بات کا مان رکھ لیا تھا۔ انہی دنوں بریرہ کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ جو بھی چیز کھاتی فوراً واپس الٹ دیتی۔ اس روز سڈے تھا اور مریرا شیر علی صاحب کے حکم پر زبردستی اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں دونوں کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

وہ امید سے تھی اور اس کے حمل کو تیسرا مہینہ لگ چکا تھا۔

شیر علی صاحب کو اس بات کی خبر ہوئی تھی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ فوراً سمندر پار بیٹھے سکندر علوی کو بھی اطلاع دی گئی، بہت دنوں کے بعد صمد نے اس گھر میں خوشیوں کے چھوٹے چھوٹے جگنو ٹمٹماتے دیکھے تھے۔

مریرا کی مصروفیات بڑھ چکی تھیں۔

اس نے بریرہ کو مکمل ریست دینے کے لیے خود کو کوہلو کو بیل بنالیا تھا۔ رات میں سب کاموں سے فارغ ہو کر پڑھنے بیٹھتی تو نیند اس کے اعصاب پر تسلط جمالیتی، اور وہ کبھی کمرے میں، کبھی صحن میں اور کبھی کبھی لاونچ میں ہی بیٹھی بیٹھی سو جاتی۔

صمد کو اس پر بے حد ترس آتا تھا۔ بے پنہا کشش کی حامل وہ پیاری سی لڑکی رشتوں پر قربان ہونا بہت اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس رات بھی جب وہ نیوٹن سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا تو وہ باہر صحن میں پڑھتے پڑھتے، کتابوں پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ صمد اپنے کمرے کی طرف بڑھتے بڑھتے اچانک رک گیا تھا۔ باہر صحن میں سرد ہوا کے پھیڑے اسے نقصان پہنچا سکتے تھے، جبکہ اس نے کوئی شال لے رکھی تھی نہ ہی سویٹر پہن رکھا تھا، بریرہ اور شیر علی صاحب شاید سوچے تھے اسے تھوڑا کام تھا لہذا وہ تھوڑا لیٹ ہو گیا تھا اور اب گیٹ کی ایکسٹرا چابی سے لاک کھول کر بنا کسی کو ڈسٹرب کیے اندر چلا آیا تھا، تاہم صحن میں موجود مریرا نے اسے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے سے روک دیا۔ کچھ دیر پر سوچ لگا ہوں سے اسے دیکھتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے پکارا تھا۔

”مریرا“ اور جو سدا سے نیند کی چکی تھی اس کی پکار پر فوراً جاگ گئی۔

”ہوں۔“

”اندر چلو یہاں بہت ٹھنڈ ہو رہی ہے۔“

”نہیں..... مجھے ابھی پڑھنا ہے میرا میسٹ ہے کل۔“

”ایسے پڑھتے ہیں سو کر؟“ بناء اس کی آنکھوں کی سرخی نوٹ کیے اس نے خفیف سا طنز کیا، وہ سر جھکا گئی۔

”سوری..... مجھے پتا ہی نہیں چلا کب آنکھ لگ گئی۔“

”اسی لیے کہہ رہا ہوں، ابھی سو جاؤ، صبح اٹھ کر پڑھ لینا۔“

”نہیں..... صبح نہیں پڑھ سکتی، صبح مجھے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔“

”آپ کی مرضی..... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ وہ پلٹا تھا جب اس نے بتایا

”آج کلاس میں میری بہت انسٹ ہوئی۔“

”ہوئی ہی تھی..... سارا دن کوہلو کے تیل کی طرح گھر کے کاموں میں جتی رہو گی تو پڑھائی تو متاثر ہوگی، اوپر سے زبردستی جاگ جاگ کر صحت کا بیڑا غرق بھی کر رہی ہو۔“

”آپ میری صحت کی ٹینشن نہ لیں، میں ابھی بس تھوڑی دیر میں سو جاؤں گی۔“ بناء اس کی نصیحت پر کان دھرے اس نے قطعیت سے کہا تو وہ کندھے اچکا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر کرنل شیر علی اس سے کہہ رہے تھے۔

”صمد بیٹا، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم رات میں نیوٹن سے ذرا جلدی گھر واپس آ جایا کرو۔“

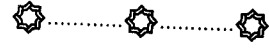
”ہو سکتا ہے انکل، نیوٹن سے تو میں عموماً جلدی فارغ ہو جاتا ہوں، پھر کوئی نہ کوئی دوست ساتھ گھسیٹ لیتا ہے، آپ کا حکم کریں۔“

”حکم کیا کرنا ہے، درخواست ہے، جلدی گھر واپس آ جایا کرو تو تھوڑی دیر مریرا کو نیوٹن دے دیا کرو، بریرہ کے خیال میں اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے انکل..... آپ کا ہر حکم میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتا ہے، میں پڑھا دیا کروں گا۔“

’شاباش..... مجھے تم سے ایسی ہی سعادت مندی کی امید تھی۔“ وہ خوش ہوئے تھے، جواب میں صمد

حسن نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیے۔



اس روز مریرا کا ٹیوشن کے لیے پہلا دن تھا۔

کالج سے واپسی کے بعد اس نے روزمرہ کے تمام امور تند ہی سے انجام دیئے اور کتابیں لے کر سرشام ہی صحن میں آ بیٹھی صمید گھر واپس آیا تو اسی نے اسے گرم کھانا اور چائے مہیا کی، کرنل صاحب کی بیماری بریرہ کی پریکٹس کے بعد ان دونوں کا کھانا علیحدہ پکتا تھا جسے وہ وقت پر پہلے ہی کھا لیتے تھے۔ مریرا بھی اکثر بریرا کے ساتھ ہی کھا لیتی اور صمید کی گھر واپسی پر اس کا کھانا گرم کر دیتی۔

اس روز وہ بہت تھکا ہوا تھا اس لیے زیادہ دیر نہ پڑھا سکا، تاہم مریرا اس کے لیے بے حد محنت اور ذہین طالبہ ثابت ہوئی تھی۔ ذہین بریرہ بھی بہت تھی مگر شادی کے بعد اس نے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ صمید مریرا کو ایک بار سرسری سے انداز میں بھی جو چیز سمجھا دیتا تھا وہ اسے کبھی نہیں بھولتی تھی۔ چند ہفتے اسی مصروفیت کی نذر ہو گئے تھے تب ہی اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ بہت چپ چاپ سی رہنے لگی تھی۔

کام کاج سے فارغ ہو کر آیا تو کرنل صاحب کے کمرے میں گھسی رہتی یا پھر بریرہ کے پاس ٹیوشن کے ٹائم بھی اس کا سر زیادہ دیر جھکا ہی رہتا تھا۔ بہت کم وہ صمید کی طرف دیکھ کر بات کرتی تھی۔ اس روز بھی گھر واپسی کے بعد فریش ہو کر وہ باہر صحن میں بیٹھا تھا جب وہ گرم شال میں لپٹی، کتابیں سینے سے لگائے اس کے مقابل آ بیٹھے۔

”کیسا ر ہا کل کا ٹیٹ؟“ کتاب اس سے لیتے ہوئے اس نے پوچھا۔ جب وہ بولی۔

”بہت اچھا۔“

”گڈ..... مجھے تو یقین تھا تم اپنے استاد کا سر کبھی نیچا نہیں ہونے دو گی۔“

”ہوں..... آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے پڑھائی میں مجھے مدد دینے کی درخواست قبول کر لی، ورنہ شاید میں گھر اور کالج میں بیننس نہ رکھ پانی، بہر حال میں وعدہ کرتی ہوں، پڑھائی کے سلسلے میں آپ کو کبھی مجھ سے شکایت کا موقع نہیں ملے گا، بالکل بھی تنگ نہیں کروں گی میں آپ کو۔“ جھکے سر کے ساتھ ہی وہ وعدہ کر رہی تھی، صمید کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی۔

”اچھی بات ہے، چلو اب کتاب کھولو۔“ مریرا نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں کتاب کھول لی۔ اب وہ کتاب پر نظریں جمائے بول رہا تھا، بے حد محنت سے اسے پیچیدہ کیے سمجھا رہا تھا مگر مریرا کی نظریں کتاب پر نہیں تھیں، جانے ایک دم سے کیا ہوا تھا کہ وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی تھی، وہ پڑھا رہا تھا اور وہ عجب پاگلوں کی طرح سراٹھائے یک تک اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی یہاں تک کہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

یونہی اس کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ ٹوٹ کر کتاب پر گرا تو صمید چونک گیا، فوراً سے پیشتر کتاب سے نظریں ہٹا کر اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر جیسے ٹھٹک گیا، شفاف کا کالج سی آنکھوں میں صحراؤں سی وحشت لیے وہ پاگلوں کی طرح اسے دیکھتے ہوئے رو ہی تھی۔ صمید کا دل زور سے دھڑاٹھا۔

”اسے پڑھنا کہتے ہیں؟“ فوراً کھٹکھار کر اسے ہوش دلاتے ہوئے اس نے ڈپٹا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”سوری۔“

”سوری کی بچی..... میں پاگلوں کی طرح ایک گھٹنے سے نان اسٹاپ بولے جا رہا ہوں، اور تم نے کچھ سنا ہی نہیں۔“ وہ برہم ہوا تھا، تکلفات کی دیوار بھی اچانک سے گری تھی، مریرا نے جلدی سے آنکھیں صاف کر لیں۔

”معاف کر دیں پلیز، دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔“ جھکے سر کے ساتھ کہتی وہ بے حد شرمندہ دکھائی دے رہی تھی صمید نے سر جھٹک کر دوبارہ پڑھانا شروع کر دیا۔



اس روز بھی بہت ٹھنڈی تھی۔

صمید ٹیوشن سے فارغ ہو کر آیا تو مریرا کو کچن میں مصروف پایا، جبکہ بریرہ گرم شال اوڑھے صحن میں بیٹھی تھی، شاید مریرا کی طرح اسے بھی رات میں ٹھنڈ کے باوجود صحن میں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ صمید نے محسوس کیا تھا جیسے جیسے اس کی ذلیوری کے دن قریب آرہے تھے، وہ بہت پریشان رہنا شروع ہو گئی تھی، زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی محصور رہتی، لمبے لمبے وظائف اور نوافل کو اس نے اپنا معمول بنالیا تھا، خاموش طبع تو وہ پہلے ہی بہت تھی اب اور بھی خاموش ہو کر رہ گئی تھی۔ اوپر سے سکندر علوی کی کوئی خبر نہیں تھی، کرنل صاحب بھی اس کے لیے بے حد فکر مند تھے کئی کئی دن صمید کا اس سے سامنا نہیں ہوتا تھا۔

اس وقت بھی گھر واپسی کے بعد اپنے کمرے میں جانے کی بجائے وہ صحن میں اس کے پاس ٹک گیا تھا۔

”السلام علیکم..... کیسی ہیں آپ؟“ بریرہ نے اس کے سلام پر چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر جلدی سے آنسو صاف کر لیے۔

”وعلیکم السلام، میں ٹھیک ہوں آپ کی پڑھائی اور ٹیوشن کیسی چل رہی ہے۔؟“

”اے ون..... سکندر صاحب سے کوئی رابطہ ہوا؟“

”نہیں..... بہت دنوں سے ان کی کال نہیں آئی، میں نے خود دو تین بار ثرائی کیا تھا مگر ہر بار ان کا نمبر بندل رہا تھا۔“

”ہوں..... اللہ خیر کرے گا، آپ پریشان نہ ہوں، میرے ایک دوست کا بھائی امریکہ میں رہتا ہے، اسے میں نے سکندر بھائی کا کانٹیکٹ نمبر اور ایڈریس دے دیا ہے، جلد ہی وہ ان سے مل کر ہمیں انفارم کر دے گا۔“

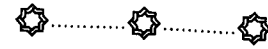
”بہت شکریہ صمید بھائی۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔“ وہ مشکور ہوئی تھی صمید نے مسکرا کر بات سمیٹ دی۔

”مریرا کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا تھا جواب میں اسے مریرا کی آنسوؤں سے لبریز نگاہیں یاد آ گئیں، کیسی عجیب دیوانگی اور وحشت تھی ان آنکھوں میں کہ وہ اگلے کئی دن

تک سکون سے نہیں سو سکا تھا۔
 ”اچھی جارہی ہے۔“ نظریں جراتے ہوئے اسے کہنا پڑا تھا۔ وہ مطمئن ہوگئی، عین اسی پل کچن میں کچھ کرنے کی آواز آئی تھی صمد نے ایک نظر بریرہ کی طرف دیکھا پھر کچن کی طرف بڑھ گیا۔
 ”کیا ہوا؟“ کچن کے فرش پر فرانی پین اور گرم تیل بکھرا پڑا تھا جبکہ مریرا سہمی ہوئی چڑیا کی طرح سائیڈ پر کھڑی اپنے جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کی تکلیف برداشت کر رہی تھی۔
 ”کچھ نہیں۔“ بناءً نظریں اٹھائے اس نے جواب دیا تھا۔ تبھی بریرہ بھی وہیں چلی آئی۔
 ”او میرے خدا! یہ کیا کیا تم نے؟“ ایک نظر پیچھے سلیب پر پڑے کچے کبابوں کی پلیٹ پر ڈالنے کے بعد وہ تیزی سے اس کی طرف لپکی تھی۔ پھر جلدی سے پیسٹ نکال کر اس نے اس کے ہاتھ اور جلے ہوئے پاؤں کی انگلیوں پر لگا دیا۔

”کئی بار کہا ہے جو کام نہ کرنا آئے مت کیا کرو مگر تم پر کبھی اثر نہیں ہوتا۔“
 پیسٹ لگاتے ہوئے وہ اسے ڈانٹ رہی تھی اور مریرہ سر جھکائے ہونٹ کاٹنے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ صمد نے ایک نظر پیچھے سلیب پر دھری کچے کبابوں کی پلیٹ پر ڈالی پھر مریرا کے جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کی طرف دیکھا عجیب سے احساسات کے ساتھ واپس پلٹ گئے۔
 اس رات ایک مرتبہ پھر وہ نہیں سو سکا تھا ہاتھ مریرا کا جلا تھا مگر اس کی تکلیف وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا۔



بہت سے دن عجیب سی بے کلی کی نذر ہو گئے تھے۔
 بریرہ کی طبیعت آج کل خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ چلتے چلتے ہانپ جاتی، خون کی کمی بڑھتی جارہی تھی مگر وہ تھی کہ اسے اپنا کوئی خیال نہیں تھا ڈاکٹرز کے مطابق اس کا کیس بھی خاصا پیچیدہ تھا اور ادھر سکندر علوی نے لائق کی قسم کھا رہی تھی۔
 کرنل صاحب بہت پریشان رہنے لگے تھے، خود صمد بھی امتحانات میں الجھ رہ گیا تھا۔ ایسے میں صرف ایک مریرا تھی جو سب کا خیال رکھ رہی تھی۔

”میرا انعام؟“ جیسے ہی وہ صحن میں چارپائی پر آکر بیٹھا، اس نے بے حد استحقاق سے اپنی شفاف ہتھیلی اس کے سامنے پھیلائی اور صمد جانتا تھا کہ وہ اپنا انعام ضرور مانگے کی، تبھی اس کی فرمائش پر مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے ادھ کھلی گلاب کی کلی اس کی شفاف ہتھیلی پر رکھ دی۔ مریرا کی آنکھوں میں جیسے ہزاروں جگنوؤں نے بھرا کر لیا تھا، جگر جگر کرتی روشن نگاہیں اٹھا کر اس نے ایک نظر سامنے بیٹھے صمد حسن کی طرف دیکھا پھر آہستہ سے اپنے لب گلاب کی ادھ کھلی کلی پر رکھ دیئے۔
 ”تھینک یو۔“ بے حد محبت سے اس نے کہا اور فوراً کچن میں گھس گئی۔

پچھلے دنوں جلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کے باوجود وہ اس کے سارے کام معمول کی مانند سرانجام دیتی رہی تھی جبکہ صمد نے منع بھی کیا تھا، عجیب لڑکی تھی مگر اس کی خاموشی محبت اس سے بھی عجیب تھی۔

اگلے روز اس کے دوست کے بھائی نے اسے سکندر علوی سے متعلق ساری معلومات فراہم کر دی تھیں، اس کے بقول سکندر کئی سال سے ایک کلاس فیلو کے عشق میں مبتلا تھا اور بالآخر کچھ روز قبل اس نے وہیں امریکہ میں بنا کسی کا خیال کیے اسی کلاس فیلو کے ساتھ شادی رچائی تھی یہی وہ واحد وجہ تھی جس نے اسے پاکستان اور اپنے رشتے بھلا رکھے تھے۔

اسے بے حد دکھ ہوا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کرنل صاحب اور پل پل انتظار کی سولی پر لٹکتے اس نیم مردہ وجود کو اس حقیقت سے آگاہ کرے جو اسکی راہ دکھتی پتھر ہو رہی تھی۔ بہت دن کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس روز گھر واپسی پر کرنل صاحب کی تفتیش کے جواب میں اس نے انہیں حقیقت سے آگاہ کر دیا تھا۔ تاہم وہ نہیں جانتا تھا کہ بریرہ یہ حقیقت چھپ کر جان لے گی شاید پتہ ہوتا تو کبھی لب نہ کھولتا مگر..... جو لکھ دیا گیا تھا ہو کر ہی رہنا تھا۔

بریرہ علوی کی طبیعت اسی رات بگڑ گئی تھی وہ اور کرنل صاحب اسے ہسپتال لائے تھے جہاں ایک مردہ بیٹے کو جنم دینے کے بعد اس نے بھی ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں، قیامت سی قیامت تھی، کسی کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یوں پل کی پل میں تقدیر ایسا قہر ڈھا سکتی ہے مریرا تو جیسے پاگل ہو گئی تھی بہت مشکل سے اس نے اسے سنبھالا تھا، سمندر پار سکندر علوی کو بھی اطلاع دی جا چکی تھی..... مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس موقع پر بھی اس نے بے حسی کا مظاہر کرتے ہوئے فوری پاکستان آنے سے معذرت کر لی۔

صمد کے اندر جیسے کوئی نیزہ گڑھ گیا تھا۔ بریرہ کی ناگہانی موت کا درد ہی کم نہیں تھا کہ سکندر نے ایک اور گھاؤ لگا دیا، کرنل صاحب کو آخری وقت تک اس کے آنے کی امید رہی تھی، مگر جیسے ہی بریرہ کے وجود نے مٹی اور مٹی ان کی امید ٹوٹ گئی۔

ہنسا بستا گھر ایک دم سے اجڑ کر رہ گیا تھا۔ کرنل صاحب کمرائشیں ہو کر رہ گئے تھے۔ جبکہ مریرا کو نے کھدروں میں چھپ چھپ کر روتی رہتی اور بریرہ کے ننھے منے شہزادے کے کپڑوں کو چومتی رہتی جو اس نے سی کر رکھے تھے۔ اس روز کرنل صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا، موسم سرما کا اینڈ تھا اور وہ اپنے کمرے میں مطالعے میں مصروف تھا جب مریرا نے اسے کرنل صاحب کا پیغام دیا۔ فوری کتاب بند کر کے وہ ان کے حضور حاضر ہوا جو اپنے کسی شاگرد کیپٹن سے فون پر مصروف تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے بات سمیٹی اور فون بند کر دیا۔
 ”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام آؤ صمد! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“
 ”خیریت؟“

”ہوں خیریت ہی ہے۔“ ان کے چہرے پر ہلکی سی ہلاکت تھی، صمد قریب ہی بیٹھ گیا۔
 ”کیپٹن اسد کا فون تھا، کارگل کے محاذ پر خاصی اہم پیش رفت کی ہے اس نے۔“
 ”مگڈ۔“ وہ بھی خوش ہوا، تبھی وہ بولے۔

”سناؤ آگے کی زندگی کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟“

”کیا سوچنا ہے انکل! فی الحال تو بس پڑھائی چل رہی ہے اس کے بعد میرا اپنا بزنس کرنے کا ارادہ

ہے۔“

”گڈ..... شادی کے لیے کیا سوچا ہے؟“ فوراً ہی وہ اصل بات کی طرف آگئے تھے۔ صمد کا دل زور

سے دھڑک اٹھا۔

”ابھی تو دور دور تک کوئی پلان نہیں ہے، کیوں؟“

”میں مریرا کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہ رہا تھا، بریرہ کے بعد بہت بکھر کر رہ گئی ہے وہ شادی ہوگی

تو ذرا بہل جائے گی۔“

”ہوں، مگر ابھی تو وہ بہت چھوٹی ہے۔“

”چھوٹی تو ہے مگر بالغ ہے اور لڑکیوں کی یہی عمر ہوتی ہے شادی کی، میری زندگی کا کیا پتہ ادھر سکند

ر کا حال تم نے دیکھ ہی لیا، کیا بنے گا اس کا اگر کسی بھی وقت مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو؟“ وہ صبح پریشان تھے، صمد

الچہ کر رہ گیا۔

”ایک دو قابل لڑکے ہیں میری نظر میں مگر..... میں پہلے تمہاری مرضی جاننا چاہ رہا تھا۔ تم کیا کہتے

ہو؟“ فوراً ہی گیند اس کی کورٹ میں آگئی تھی، وہ اچھا خاصا بوکھلا گیا۔

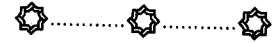
”میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل، اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میرے لیے یہ سعادت کی بات ہوگی

کہ میں آپ کی خواہش کا مان رکھ سکوں۔“

”شاباش میرے بیٹے مجھے تم سے ایسی ہی فرمانبرداری کی امید تھی۔“ فوراً اٹھ کر اسے گلے لگاتے

ہوئے وہ بے حد خوش ہوئے تھے جبکہ دوسری طرف دروازے کے اس پار کھڑی مریرا حن بھاگ کر اپنے کمرے

میں جا چھپی تھی۔



چٹ مگنی پٹ بیاہ کے مصداق اسی ہفتے ان کی شادی طے پاگئی تھی۔

کرنل صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ خود صمد کے پاؤں مارے خوشی کے زمین پر نہیں لگ

رہے تھے ایک مریرا تھی جو خوش تو تھی مگر بریرہ کو یاد کر کے اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ کمرے میں آیا تو وہ توقع کے عین مطابق گھنٹوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی، صمد دروازہ لاگ

کرنے کے بعد اس کے مقابل آ بیٹھا۔

”السلام علیکم۔“ مریرا نے اس کے سلام پر جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

”بریرہ کے لیے اتنا رو رہی ہو یا اس پر کہ انکل نے کس نکلے لڑکے کے ساتھ نصیب پھوڑ دیا۔“ اس کا

ہاتھ تھامتے ہوئے وہ مسکرایا، وہ نظریں جھکا گئی۔

”میں جانتا ہوں تم اسے کبھی بھول نہیں سکتیں، وہ اس قابل تھی بھی نہیں کہ اسے بھلایا جاسکے، مگر کچھ

معاملات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے مریرا، خواہ انسان کتنا ہی دیواروں سے سرکیوں نہ مارے اسے صبر کرنا

پڑتا ہے، اسی لیے تو اسلام میں صبر کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔“

اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

”میرے بس میں ہو تو میں کبھی تمہارا ہی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دو مگر..... دکھ اسی بات کا ہے کہ

میرے بھی اختیار میں کچھ نہیں ہے، ورنہ جس روز میری وجہ سے تم نے اپنا ہاتھ اور پاؤں جلایا تھا میرا بس نہ چلتا

تھا کہ تمہیں ساری عمر کے لیے پھولوں کے بستر پر بٹھا دوں۔“

”بس..... زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔“ ایک دم سے سراٹھاتے ہوئے اس نے اسے گھورا،

وہ حیرانی سے مسکرا دیا۔

”کیسا جھوٹ؟“

”یہ جھوٹ ہی ہے کہ آپ کو میری ذات سے کوئی دل چسپی ہے۔“

”اچھا؟“

”اور نہیں تو کیا؟ میں نے خود سنا تھا جب بڑے ابو نے آپ سے شادی کی بات کی تھی تو آپ نے

لیے بے نیازی سے کہہ دیا تھا کہ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں انکل، اگر آپ مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو میرے لیے یہ

عادت کی بات ہوگی کہ میں آپ کی خواہش کا مان رکھ سکوں۔“ گویا یہ صرف بڑے ابو کی خواہش کا مان رکھا ہے

آپ نے آپ کے دل کی رضا شامل نہیں تھی اس میں۔“ وہ شکوہ کر رہی تھی، صمد کھل کر ہنس دیا۔

”ااا، اتنی سی بات دل میں رکھی ہوئی ہے تم نے؟“

”تو اور کیا۔“

”پاکل لڑی ہو تم اور کچھ نہیں۔“ مسلسل ہنس کر کہتے ہوئے اس نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔

”بہت رومینٹک بندہ ہوں میں..... ٹوٹ کر پیار کرنے والا..... میرے ساتھ زندگی گزارو گی تو میری

محبتوں کی شدت کا اندازہ بھی ہو جائے گا، مگر یہ شدتیں میں کسی اور پر کبھی ظاہر نہیں کر سکتا تھا، انکل پر تو بالکل بھی

نہیں، کیونکہ جو اعتماد ان جیسے عظیم انسان نے مجھ جیسے لاوارث انسان پر کیا، میں کبھی چاہ کر بھی اپنی کسی معمولی سی

لزوری سے ان کے اعتماد کا خون ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا، بہر حال جذبے اگر سچے ہوں تو ملاپ بھی ہو ہی جاتا ہے

ای لیے میں نے ان کے حکم کا مان رکھا، کتنا اچھا ہے نا کہ وہ اس احساس کے ساتھ جنیں کہ میں نے ان کی

خواہش کو زیادہ اہمیت دی۔“

”ہوں۔“

”اب تو نہیں روؤ گی نا؟“ اگلے ہی پل اس کی طرف ذرا سا جھکتے ہوئے اس نے سرگوشی میں

پوچھا۔

مریرا کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”نہیں۔“

”تھینک یو۔“ جذب سے کہتے ہوئے صمد نے اس کے ہاتھ چوم لیے تھے۔ شادی کی پہلی رات وہ

بے حد رومینٹک بندہ ثابت ہوا تھا۔ اس کے پیار میں واقعی بے حد شدت اور گہرائی تھی۔



صمد حسن کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔

یونیورسٹی کو خیر باد کہنے کے بعد آج کل وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ایک چھوٹی سی فیکٹری میں شیئر حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اسی لیے مریرا اور گھر پر اس کی توجہ قدرے کم ہو گئی تھی جس پر وہ اس سے بے حد خفا تھی۔

اس روز صبح اس کی آنکھ کھلی تو وہ کمرے میں نہیں تھی۔

صمد گرم کمرے میں لیٹا کچھ دیر سکون سے سویا رہا، پھر اٹھ کر واش رو میں گھس گیا، تھوڑی دیر نیم گرم پانی سے شاور لینے کے بعد وہ فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا تو وہ کچن میں آنا گوندھ رہی تھی جبکہ کرنل صاحب ابھی ابھی واک سے لوٹے تھے۔

صمد نے دیکھا وہ بے حد خفا تھی اور ضرورتاً بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، وہ دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس وقت اسے آفس سے دیر ہو رہی تھی تبھی اسے منانے کا ارادہ آفس سے واپسی پر موقوف کر دیا تھا۔ تاہم جس وقت وہ کرنل صاحب کو چائے دے کر اسے اس کا کپ پکڑا رہی تھی اس نے شیر علی صاحب سے نظر بچا کر اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی تھی، جسے مریرا نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ کر ناکام بنا دیا۔ تاہم اس چکر میں ذرا سی چائے چھلک کر مریرا کا ہاتھ جلا گئی تھی۔

”سی“ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بمشکل اس نے اپنے آنسو روکے تھے۔

”سوری۔“ صمد نے فوراً شرمندہ ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا، پھر خود ہی اٹھ کر کچن سے برنال نکال لایا۔

”آپ اپنا کام کریں، میں خود ہی لگالوں گی۔“ وہ اس سے خفا تھی لہذا اسکے ہاتھ سے برنال لے کر

کچن سے آگئی، پیچھے وہ پریشان سا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

رات میں آفس میں واپسی کے بعد وہ اس کے لیے بے حد خوب صورت گجرے لایا تھا کیونکہ مریرا کو گجرے بہت پسند تھے، مگر اس وقت اس نے انہیں ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا تھا۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے کا ٹائم تھا اور اسے شدید بھوک لگی تھی۔ کرنل صاحب فون پر کسی افسر کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھے، تبھی وہ کمرے سے نکل کر باہر صحن میں آیا تو مریرا نے کھانا لا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

”بیٹھو۔“ جیسے ہی کھانا رکھ کر وہ پلٹی اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، پھر مجھے بھی بھوک نہیں ہے، ملے جاؤ اٹھا کر۔“

”تو کر نہیں لگی ہوئی میں خود رکھ آؤ جا کر۔“ ابھی تک اس کا غصہ ہوا تھا، وہ مسکرا دیا۔

”ابھی تک ناراض ہو؟“

”مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے ناراض ہونے کی۔“

”میں صرف اپنی بات کر رہا ہوں ڈیر مریرا۔“ اب وہ اس کی چوڑیوں سے کھیل رہا تھا۔ مریرا نے ہنسی

سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے نکال لیا۔

”تو؟“

”تو یہ کہ پلیز معاف کر دو، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

”کتنے دنوں سے یہی بات کہہ رہے ہیں آپ؟“ اب کے اس کی آنکھوں کے گوشوں میں ہلکی سی نمی چمکی تھی۔ صمد نے دانتوں تلے لب دبا لیے۔

”پراس..... اب جلدی گھر آیا کروں گا اور سارا ٹائم تمہیں دوں گا خوش؟“

”بہت زیادہ جھوٹے ہیں آپ۔“ وہ جانتی تھی کہ وہ جھوٹا وعدہ کر رہا ہے مگر پھر بھی ذرا سا مسکراتے ہوئے اس نے صلح کا پرچم لہرا دیا تھا۔ صمد اس کی معصومیت پر کھل کر ہنس دیا۔

اگلی صبح کرنل صاحب واک پر نہیں گئے تھے۔

صمد فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا تو جیسے وہ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! صبح بخیر۔ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”خیریت؟“

”ہوں، خیرت ہی ہے، تم سناؤ تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”دس پرسنٹ شیئرز کے لیے کوشش کی تھی، الحمد للہ بات بن گئی، اب پے منٹ کرنی ہے۔ کچھ پیسے

میرے پاس ہیں، کچھ مزید پیسوں کے لیے ایک دوست سے رابطہ کر رہا ہوں، امید ہے یہاں بھی بات بن جائے گی۔“

”ان شاء اللہ..... کتنے پیسوں کی ضرورت ہے؟“

”پانچ لاکھ روپے میرے پاس ہیں، مزید پانچ لاکھ کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔“

”ہوں، میں نے بریرہ اور مریرا کی شادی کے لیے کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے، وہ ابھی تک انہیں استعمال

لانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اچھا ہے وہ پیسے اب تمہارے کام آجائیں گے۔“

”نہیں انکل، اس کی ضرورت نہیں ہے، میں خود کر رہا ہوں ناں۔“

”میں نے تم سے اجازت نہیں مانگی، صرف اطلاع دی ہے، ویسے بھی مریرا کی شادی کہیں اور طے

ہو جاتی تو اس سے زیادہ پیسوں کا جہیز بن جاتا، تم سمجھ لو میں تمہیں جہیز کی رقم ہی دے رہا ہوں۔“

”نہیں، میں نہیں لے سکتا، یہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”اب تم میری نافرمانی کر رہے ہو صمد اور مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”انکل پلیز، میرا ضمیر مجھے اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ میں آپ پر مزید کوئی بوجھ ڈالوں، آپ

لے پہلے ہی مجھ پر بہت احسانات ہیں۔“

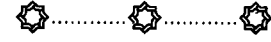
”ٹھیک ہے اب میں مزید تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“ وہ خفا ہو گئے تھے صمد پریشان ہو کر رہ گیا۔

”انکل پلیز، مجھے اتنی بڑی آزمائش میں مت ڈالیں، پلیز۔“

”اب جاؤ، مجھے لگا تھا شاید تم میرے سکے بیٹے ہو۔“ قدرے خفا خفا سے وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

جب صمد نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔

”اوکے..... جیسا آپ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا، مگر پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں پلیز۔“ وہ ان کا فرمانبردار بیٹا تھا اور کرنل صاحب جانتے تھے، وہ انہیں کبھی ناراض نہیں کر سکتا، تبھی وہ مسکرائے اور پھر فخریہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے آہستہ سے اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔



اسے کہنا محبت ایک صحرا ہے.....

اور صحرا میں کبھی بارش نہیں ہوتی.....

اگر بالفرض ہو بھی تو، فقط ایک پل کو ہوتی ہے!

اور اس کے بعد صدیاں خشک سالی میں گزرتی ہیں

اسے کہنا، محبت ایک صحرا ہے

اور صحرا کے سراپوں میں بھٹک جانے کا خدشہ

سب کو رہتا ہے

کبھی پیاسے مسافر جب، سراپوں میں بھٹک جائیں

انہیں رستہ نہیں ملتا

اسے کہنا، محبت ایک صحرا ہے

وفاؤں کے سراپوں سے اٹا صحرا!

محبت کے مسافر گروفا کے ان سراپوں میں

بھٹک جائیں تو پھر وہ زندگی بھر

ان سراپوں میں ہی رہتے ہیں

کبھی واپس نہیں آتے

درمکنوں آج کل ایک نیا پراجیکٹ شروع کر رہی تھی۔

اسی سلسلے میں اس روز اس نے وقار الحسن کی گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں شرکت کا فیصلہ کیا تھا۔

آفس ٹائمنگ کے بعد تقریباً شام سات بجے صیام گھر سے تیار ہو کر درمکنوں کے گھر پہنچا تو آگے مریرا

بیگم جیسے اسی کی منتظر بیٹھی تھیں۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! کیسے ہو صیام؟“ اپنے نازک سے دلکش سراپے کی مانند، ان کا لہجہ بھی ہمیشہ بہت مشفق

ہوتا تھا، وہ مودب سا ان کے قریب ہی ٹک گیا۔

”جی میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟“

”بہت کرم ہے میرے مالک کا، تم سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟“

”سب ٹھیک ہیں الحمد للہ آپ اب آفس نہیں آتیں۔“

”ہوں، بس آج کل طبیعت ساتھ نہیں دے رہی، پھر میں زیادہ یہاں پاکستان میں رہتی بھی نہیں ہوں“

خیر مجھے تم سے درمکنوں کے بارے میں کچھ بات کرنی تھی۔“

”خیرت؟“ وہ چونکا جبکہ اس کا دل پھر سے دھڑک اٹھا۔

مریرا بیگم نے آہستہ اثبات میں سر ہلایا۔

”ہوں، خیریت ہی ہے، اصل میں میں درمکنوں کی طرف سے بہت پریشان ہوں، پچھلے کچھ دنوں سے

بہت چپ ہو کر رہ گئی ہے، کھانا پینا بھی چھوڑ دیا ہے، سارا دن کراہند کیے پڑی رہتی ہے، فون بھی آف رہتا ہے،

دوبار ڈرائیو کرتے ہوئے اپنا ایکسیڈنٹ بھی کروا چکی ہے، خدا کا شکر ہے کہ کوئی بڑی چوٹ نہیں آئی، ورنہ پتہ نہیں

کیا ہو جاتا، میں نے اسے اتنا آزرہ کبھی نہیں دیکھا، اسی لیے میں تم سے جاننا چاہتی ہوں کیا آفس میں ایسی کوئی

بات ہوئی ہے جس کی اس نے اتنی ٹینشن لے رکھی ہے۔“

”نہیں۔“

”تو پھر کیا وجہ ہے، وہ اتنی کم حوصلہ تو کبھی نہیں رہی، وہ ماں تھیں اور بالکل صحیح پریشان تھیں۔“

صیام نے ذرا سارخ پھیر لیا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، وہ اپنے ذاتی معاملات کسی سے شیر نہیں کرتیں۔“ ابھی اس نے اپنی بات مکمل

نہیں کی تھی کہ درمکنوں اپنے کمرے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی، نیچے ہال میں چلی آئی۔

”چلیں صیام صاحب۔“ بے حد خوبصورت لباس کے ساتھ اس نے فل میک اپ کیا ہوا تھا۔

صیام کی آنکھیں جیسے پلکیں جھپکنا بھول گئیں۔

”اتنا ہیوی میک اپ کرنے کی کیا ضرورت تھی در؟“ مریرا بیگم کو اس کی تیاری ایک آنکھ نہیں بھائی،

نہ اسے پروا نہیں تھی۔

”اچھا لگ رہا تھا ماما، آپ کھانا کھا کر سو جائیے گا۔“ میں شاید لیٹ ہو جاؤں۔“

”نہیں مجھے اکیلے کھانا کھانے کی عادت نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، آپ کی مرضی۔“ بناء کوئی بحث کیے وہ وہاں سے باہر نکل گئی تھی۔

مریرا بیگم سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔

”اس کا خیال رکھنا صیام، تم میرے لیے صرف ایک درک نہیں، میرے بیٹے کی طرح ہو، میں امید کرتی

ہوں کہ تم ہمیشہ میری عزت کا پاس رکھو گے۔“

”کہنے کی ضرورت نہیں ہے میڈم، اللہ نے چاہا تو آپ ہمیشہ ہر معاملے میں، مجھے ایمان دار ہی

بانیں گی۔“

”شکریہ۔“ صیام ان کی پریشانی سمجھ سکتا تھا، تبھی ان کے شکریہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ان کی طرف

اُپنا۔ وہ خود بھی درمکنوں کے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔

اس کا دل ابھی تک معمول پر نہیں آیا تھا۔

”اماں، ان کے ملبوس سے اتنی خوشبو جیسے اس کے حواس سلب کر رہی تھی۔“

”کیوں میرا معاملہ نہیں ہے موم..... پاپا میرے باپ ہیں، میں ان کے حوالے اور پہچان کے ساتھ سر اٹھا کر فخر سے چلتا ہوں..... مس عائلہ کیا ہیں؟“ وہ بھڑکا۔ بھی صمد صاحب آنکھوں سے چشمہ اتارتے ہوئے سرد لہجے میں بولے۔

”عائلہ میری بیٹی ہے بالکل ویسے ہی جیسے پریشان میری بیٹی ہے۔“

”عائلہ اور پریشان کی کوئی مماثلت نہیں ہے پاپا“ آپ اس لڑکی کو اس کی اوقات اور ضرورت سے بڑھ کر اہمیت دے رہے ہیں۔

”اس کی اوقات..... کیا ہے اس کی اوقات؟“ زاویار کے جذباتی ہونے پر صمد صاحب نے بے حد دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری کیا اوقات ہے ہوں؟ تمہاری..... سارا کی پریشان کی کیا اوقات ہے سب کی؟ کیا ہے ایسا ہمارے پاس جو عائلہ کے پاس نہیں ہے صرف دولت؟ وہ دولت جس نے آج تک کبھی کسی کو سکون نہیں دیا، وہ دولت..... جس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب ہاتھ سے ریت کی مانند پھسل جائے..... مت بھولو زاویار کہ تمہارا باپ بھی سدا امیر نہیں تھا۔“

”آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے پاپا“ ایک پرانی لڑکی کے لیے آپ ہر بار اپنے بیٹے کو ڈس ہارٹ نہیں کر سکتے۔“

”ڈس ہارٹ نہیں کر رہا، مگر محتاط ضرور کر رہا ہوں“ آئندہ تم عائلہ کے لیے کوئی غیر مناسب الفاظ استعمال نہیں کرو گے۔ صمد صاحب کو غصہ بہت کم آتا تھا مگر جب آتا تو پھر بوڑھے شیر کی مانند دھاڑتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی کر رہے تھے زاویار کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔

”عائلہ مائی فٹ۔“ شدید غصے میں نفرت بھری ایک نگاہ عائلہ علوی پر ڈالنے کے بعد وہ تن فن کرتا گھر سے نکل گیا تھا، پیچھے عائلہ کے آنسو مزید روانی سے بہنے لگے۔

”انکل پلیز..... آپ میری وجہ سے اپنے بیٹے کو ناراض مت کریں۔“

”نہیں عائلہ پاپا نے کچھ غلط نہیں کیا، انسانی درجہ بندی کی بنیاد اس کے اچھے اعمال اور کردار پر ہوتی ہے اور تمہارا کردار اور اعمال سب کے سامنے ہیں۔“ پری فوراً اس کی سائیڈ لیتے ہوئے بولی، سارا بیگم نے بھی اس کی تائید کی۔

”پری ٹھیک کہہ رہی ہے عائلہ..... تم زاویار کی باتوں کو دل پر مت لینا، وہ دل کا برا نہیں ہے۔“

”ہوں..... اور جب تک میں زندہ ہوں کبھی جاب چھوڑنے کا سوچنا بھی مت۔“ صمد صاحب کے لہجے میں بھی اس کے لیے بے پناہ محبت تھی۔

عائلہ نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”میں نے زندگی میں کبھی دولت کو اہم نہیں جانا انکل، میرے پاپا روزرات میں مجھے اپنی اور آپ کی مہمانی سنایا کرتے تھے اکثر دولت کے اتار چڑھاؤ کی کہانیاں بھی سناتے تھے۔ مگر میں نے کبھی انہیں مہمان نہ یا اپنے حالات کا داویلا کرتے نہیں دیکھا، بری ہی سہی مگر وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھے، ہاں مگر کبھی وہ

بڑی مشکل سے اس کے ہوش رہا سراپے کو نظر انداز کر کے اس نے گاڑی اشارٹ کی تھی۔ وہ بے نیاز سی پلکیں موندے، سریٹ کی پشت گاہ سے ٹکائے کھڑکی سے آتی سرد ہواؤں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی رہی۔ کچھ دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اس نے ایک دم سے آنکھیں کھولی تھیں۔

”ایک سوال پوچھوں آپ سے؟“

”ہوں۔“ وہ چونکا تھا۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

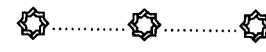
”کیا آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کوئی سوال بھی پوچھ سکتی ہے تبھی جواب گول کر گیا۔

درمکون نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد وہ لوگ ”وقار ہاؤس“ پہنچ چکے تھے۔ گاڑی سے اترنے کے بعد جس وقت وہ گاڑی پارک کر کے آگے بڑھا، درمکون نے چپکے سے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

صیام کو لگا جیسے اس کے وجود میں کرنٹ دوڑ گیا ہو..... مگر درمکون نے اس کی حیرانی کی پروا نہیں کی، وہ تو شاید اس وقت کسی کی پروا بھی نہیں کر رہی تھی۔



شام ڈھل رہی تھی۔

تھکا تھکا سا آفس سے وہ گھر آیا تو سامنے لاؤنج میں صمد صاحب، سارا بیگم اور پریشان کے ساتھ عائلہ علوی بھی موجود تھی۔

زاویار کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

”السلام علیکم۔“ ایک کڑی نگاہ عائلہ علوی کے جھکے ہوئے سر پر ڈالنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

اس نے وہاں رک کر اپنے سلام کا جواب سننے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ فریش ہو کر کمرے سے نکلا تو صمد صاحب عائلہ سے کہہ رہے تھے۔

”عائلہ بیٹے! اگر زاویار نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتا ہوں۔“

”اٹس انف پاپا۔“ میڑھیوں پر اس کے قدم جیسے تھم گئے تھے۔ جبکہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ ڈھیلے قدموں سے باقی ماندہ میڑھیاں کر اس کرتا وہ ان کے مقابل آ بیٹھا تھا۔

”سوری..... مگر میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا، مس عائلہ ہماری ملازم ہیں۔ آپ ان کے ملازم نہیں ہیں جو اس طرح سے معافی مانگ رہے ہیں۔“ صمد حسن صاحب کے الفاظ پر زاویار حسن کے اندر جیسے آگ لگ گئی تھی۔

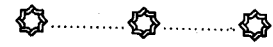
تبھی سارا بیگم نے اسے ڈانٹا تھا۔

”تم چپ رہو زاویار..... یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔“

مجھے اپنے گلے سے لگا کر رو پڑتے تھے، انھیں لگتا تھا جیسے انہوں نے میری زندگی کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے مگر میں نے ہمیشہ ان کی ہمت بندھائی انہیں یہ احساس دلایا کہ میرے لیے رشتے دولت سے زیادہ قیمتی ہیں اور آج بھی میری یہی سوچ ہے، میں نے کبھی خود کو کسی سے کمتر نہیں سمجھا، کیونکہ الحمد للہ میرے مالک نے مجھ میں کوئی کمی نہیں رکھی، پورے جسمانی اعضاء کے ساتھ اس نے مجھے شعور کی دولت دی، اور ہر اچھی اور بری چیز میں فرق سمجھایا، کبھی اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں کیا، میں دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہوں دنیا کی نظر سے نہیں..... شاید اسی لیے مجھے زاویار صاحب کی نفرت سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں مگر بناء کسی غلطی کے بار بار سب کے سامنے ان کا عزت نفس مجروح کرنا، میں چاہتے ہوئے بھی برداشت نہیں کر سکتی، کیونکہ شاید میرے اندر کی خود دار لڑکی کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔“ اس کا سر جھکا ہوا جبکہ لہجہ بے حد دھیمہ تھا۔

صمد صاحب پھر سے شرمندہ دکھائی دینے لگے۔
 ”میں سمجھ سکتا ہوں بیٹے، مگر ان شاء اللہ آج کے بعد وہ ایسا نہیں کرے گا“ میں سمجھا دوں گا اسے۔“
 ”کوئی بات نہیں انکل، جہاں اتنے محبت کرنے والے لوگ موجود ہوں وہاں کسی ایک فرد کی نفرت سے کیا فرق پڑتا ہے۔“
 اس بار وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

”خیر اب میں چلوں گی بابا پریشان ہو رہے ہوں گے، سدید بھی گھر پر نہیں ہے، کسی دوست کی طرف گیا ہوا ہے۔“
 ”نہیں ہرگز نہیں، کرنل صاحب کو میں فون کر دیتا ہوں، تم آرام سے کھانا کھا کر جانا۔“
 ”ہوں..... تمہارے انکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، میں ابھی کھانا لگواتی ہوں۔“ سارا بیگم سے کہتے ہوئے فوراً کھڑی ہو گئی تھیں۔
 ”نہیں انکل، بہت دیر ہو جائے گی، پلیز ابھی جانے دیں، میں پھر آ جاؤں گی۔“
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ قطعی لہجے میں کہتے وہ فوراً کرنل صاحب کو کال ملانے لگے تھے۔
 عائکہ بے بس سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔



کتنی زلفیں کھلیں، کتنے آنچل اڑے

چاند کو کیا خبر؟

کتنا ماتم ہوا، کتنے آنسو بہے چاند کو کیا خبر؟

مدتوں اس کی خواہش میں چلتے رہے ہاتھ آتا نہیں

چاہ میں اس کی ہیں پیروں میں آبلے، چاند کو کیا خبر؟

وہ جو نکلا تو بھٹکتے رہے ہیں مسافر کئی

اور لٹتے رہے ہیں کئی قافلے چاند کو کیا خبر؟

وہ تو اپنی ہی مگرمی میں مدھوش ہے، کب سے خاموش ہے

کون راجہ بنا، کتنے سید لڑے، چاند کو کیا خبر؟

اس کو دعویٰ بہت بیٹھے پن کا وحی، چاند کو کیا خبر؟

وہ ابھی سو کر اٹھی تھی۔

کھڑکی کے اس پار پھیلی نکھری نکھری اجلی دھوپ نے اسے میٹھی نیند سے بیدار کرنے میں اہم کردار ادا

کیا تھا۔

کل، حسن پیلس، سے واپسی کے بعد وہ بہت بے سکون رہی تھی۔

زاویار کا لہجہ، اس کی نفرت، اس کے الفاظ سے جھلکتی تحقیر، اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ایک عجیب سی

تکلیف میں مبتلا کر رہی تھی۔ رات یونہی اس کے بارے میں سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

سدید جس وقت کھانا کھا کر اس کے کمرے میں آیا، وہ سوچکی تھی، تاہم کمرے کی جلتی ہوئی لائٹ نے اسے

پریشان کیا تھا، تب ہی وہ بنا اسے بیدار کیے اس کی تھکن کے پیش نظر فوراً اس پر کمبل ڈال کر لائٹ آف کرتے

ہوئے اس کے کمرے سے نکل آیا تھا۔ عائکہ بیدار ہونے کے بعد فریش ہو کر کمرے سے باہر آئی تو سدید

اور کرنل شیر علی ناشے کی میز پر موجود شاید اسی کی ذات کو ڈسکس کر رہے تھے، کیونکہ اسے دیکھتے ہی سدید نے

اسے سائل پاس کی تھی۔

”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام، صبح بخیر!“

جواب سدید کی طرف سے آیا تھا۔ وہ چپ چپ کر سی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”رات کہاں تھے تم؟“

”بابا کو بتا کر ایک دوست کی طرف گیا تھا، تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟“

”فٹ اینڈ فائن“ آج تم مجھے آفس ڈراپ کر کے آؤ گے۔“

”وجہ؟“

”بس..... میرا دل چاہ رہا ہے آج تمہیں آفس سے لیٹ کروانے کو۔“

”ہا ہا ہا..... تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں آج آفس نہیں جا رہا۔“

”کیوں..... آرمی والوں نے بھگا دیا؟“

”ہوں..... یہی سمجھ لو۔“

”دیکھا..... میں کہتی تھی ناں تمہاری کسی کے ساتھ نہیں بن سکتی۔“

سدید کی اطلاع پر وہ جیسے خوش ہوئی تھی، کرنل صاحب مسکرا دیئے، وہ فطرت اور عادتوں میں بالکل

میریہ صمد پر گئی تھی اور سدید..... صمد حسن پر۔

وقت جیسے پھر سے پلٹ آیا تھا، کردار بدل گئے تھے، محبت نے اپنا روپ بدل دیا تھا، وہ چپ چاپ

محبت مہری نگاہوں سے ان دونوں کی نوک جھونک کو دیکھتے رہے۔

”زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے مذاق کر رہا تھا۔“ اگلے ہی پل سدید نے مسکرا کر عائکہ کو

چڑایا تھا جواب میں وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

”تم ہو بھی مسخرے پتہ نہیں تمہاری بیوی تمہیں کیسے برداشت کرے گی؟“

”کر لے گی تم اس کی ٹینشن نہ لو۔“ وہی اس کی ازلی بے نیازی، وہ کڑھ کر رہ گئی۔

”مجھے کیا ضرورت ہے ٹینشن لینے کی، چلو اٹھو، مجھے دیر ہو رہی ہے آفس سے۔“

”سوری“ میرا موڈ نہیں ہے، وہ صاف اسے تنگ کر رہا تھا۔ عائلمہ نے اپنا روئے خن کرنل صاحب کی

طرف موڑ لیا۔

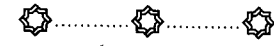
”بابا دیکھ رہے ہیں اسے صبح صبح تنگ کر رہا ہے۔“

”ہوں“ دیکھ رہا ہوں کرتے ہیں کچھ اس کا بندوبست بھی، تم ٹینشن نہ لو۔“ کرنل صاحب کا کہنا تھا

اور سدید کا قہقہہ لگا کر ہنسنا تھا، وہ حیران سی ان دونوں کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

”چلو..... تمہیں آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“ اگلے ہی پل شرارت سے اس کی پونی کھینچتے ہوئے وہ

اٹھ کھڑا ہوا۔ کرنل صاحب دیر تک ان دونوں کے بارے میں سوچتے ہوئے مسکراتے رہے۔



”عائلمہ.....“ تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی وہ مکمل طور پر اپنے کام میں مصروف تھی جب پرہیان

ان کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ پلٹی تھی۔

”ارے پرہیان..... تم یہاں؟“

”جی ہاں“ تم نے فون نہ اٹھانے کی قسم کھالی ہے میں نے سوچا خود ہی چلی آؤں۔“ اس کے گلے لگتے

ہوئے وہ شکوہ کر گئی تھی۔ عائلمہ مسکرا دی۔

”ایسی بات نہیں ہے، اصل میں میرا سیل سائینٹ پر تھا اور کام کی مصروفیات میں دیکھنے کا وقت نہیں

ملا، خیر کیسی ہو، مجھے کیوں یاد کر رہی تھیں؟“

”کھڑے کھڑے سارے سوال پوچھ رہی ہو، یہاں اس کمرے میں بیٹھا کر حال پوچھنے کا رواج نہیں

ہے کیا؟“ نشو سے چہرے پر آیا ہلکا ہلکا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے عائلمہ کو شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا

پھر اس سے پہلے کہ عائلمہ کچھ کہتی وہ بول اٹھی۔

”خیر..... میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں، تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ مارکیٹ چلو۔“

”یار ابھی نہیں جاسکتی۔“

”کیوں؟“

”ابھی بہت مصروف ہوں اور پھر تمہارا کھڑوس بھائی بھی اس وقت آفس میں موجود ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ میں بھائی سے پوچھ لیتی ہوں۔“

”نہیں یار، اس نے خود مجھے کام میں پھنسا دیا ہے، اسے تو بس موقع چاہیے کہیں بھی میری انسلٹ

کرنے کا۔“

”پرہیان۔“ عائلمہ کے لفظ ابھی منہ میں تھے کہ دبلیز پر کھڑے زاویار حسن کی پکار نے اسے دانتوں

میں زبان دہانے پر مجبور کر دیا۔

”جی بھائی۔“

”باہر گاڑی میں چل کر بیٹھو، میں آتا ہوں۔“ دونوں ہاتھ پینٹ کی پاکٹس میں گھسائے، وہ بہت

خشکیں نگاہوں سے عائلمہ علوی کو دیکھ رہا تھا۔ تبھی پرہیان بولی۔

”عائلمہ کو بھی ساتھ لے چلیں بھائی، پلیز۔“

”عائلمہ ابھی فارغ نہیں ہے، تم چلو۔“ اس کا لہجہ اتنا خشک تھا کہ پرہیان مزید بحث نہ کر سکی تاہم اس

کے چہرے پر پھیلی مایوسی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

عائلمہ نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے کے بعد توجہ پھر سے سامنے رکھی اسکرین پر مرکوز کر لی

تھی۔ تب ہی پرہیان کے کمرے سے نکلنے کے بعد زاویار اس کے مقابل آیا تھا۔

”بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہیں آپ مس عائلمہ علوی، مگر یاد رکھیے، میں آپ کو آپ کی اوقات

یاد دلا کر رہوں گا، میرے گھر والوں کی مہربانی ہے، جو آپ یہاں اس ادارے میں کام کر رہی ہیں وگرنہ دو ٹکے کی

اوقات نہیں ہے آپ کی۔“

”صحیح کہا آپ نے۔“ اس کے سر دلچھ پر وہ بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے بولی تھی۔

”میری اوقات واقعی دو ٹکوں کی نہیں ہے، مگر آپ کی اوقات کتنے ٹکوں کی ہے یہ بتا سکتے ہیں؟“

”جسٹ شٹ یور ماؤتھ اوکے۔“ وہ بھنایا مگر عائلمہ نے پروا نہیں کی۔

”یوشٹ اپ..... میں نہیں جانتی آپ کے دماغ میں یہ کتنی برتری کا خناس کیوں سمایا ہوا ہے، مگر

اتنا جان لیجئے آپ کے گھر والوں سے میرا تعلق کسی غرض کا نہیں، دل کا ہے۔ محبت کی فاختہ ہوں میں، جہاں بیمار

ملے گا جاؤں گی آپ جیسے بد دماغ اور گھمنڈی لوگ میرا راستہ روک سکتے۔“

”چٹاخ.....“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی زاویار کے زوردار تھپڑ نے اسے لٹکھڑانے پر مجبور کر

دیا۔

”میرا خیال ہے، یہ تھپڑ آپ کو آپ کو اوقات یاد دلانے کے لیے کافی ہے۔“ لبوں پر تلخ مسکراہٹ

بمیرے وہ شاید اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔

عائلمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

اتنی تحقیر؟

اس قدر ذلالت؟

وہ کتنی ہی دیر تک اسے پھٹی پھٹی ناقابل یقین نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی، تب ہی اس نے پرہیان کو

لے کر دبلیز پر پھر سے نمودار ہوتے دیکھا تھا۔

”بھائی آ ابھی جائیں پلیز، اور کتنا انتظار کروں؟“ زاویار چونکا، عین اسی لمحے عائلمہ نے اپنی آنکھوں

اکھوں کی پھروں سے صاف کی تھیں۔

”سنو زاویار صمد، چاہوں تو میں بھی جواب میں آپ کو ایسا ہی تھپڑ مار کر، آپ کی اوقات یاد دلا سکتی

ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گی، کیونکہ آپ جیسے بدتمیز اور گھٹیا شخص کو میں اپنی نفرت کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔“ اس کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی دہک رہا تھا، پھر اس سے پہلے کہ پرہیان اس سے کچھ پوچھتی وہ اپنا پرس اور موبائل اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ پرہیان اسے آواز دے کر روکنا چاہتی تھی مگر وہ رکنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جا رہے تھے۔ پرہیان کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”بھائی آپ نے عائکہ پر ہاتھ اٹھایا؟“

”ہاں وہ اسی قابل ہے تم چلو ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

”نہیں..... کبھی نہیں، مجھے اب آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا، سمجھے آپ؟“ شدید دکھی لہجے میں

صفا چٹ انکار کرتے ہوئے وہ خود بھی عائکہ کے پیچھے نکل گئی تھی۔ زاویار نے عجیب سی بے بسی کے احساس کے ساتھ سامنے پڑی میز پر زور دار مکار سید کر دیا۔

اس رات اس کی گھر واپسی پر بہت لیٹ ہوئی تھی۔

شراب اور شباب کی محفل میں خوب وقت ضائع کرنے کے بعد جس وقت وہ اپنے کمرے میں آیا، اس کے حواس مکمل طور پر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے نشے کی شدت کے سبب ہی اگلے روز اس کی آنکھ بہت تاخیر سے کھلی تھی۔

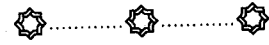
صمد صاحب گھر پر نہیں تھے وہ ابھی بستر سے نکل کر وارڈروب کے سامنے کھڑا، اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہا تھا، جب ہلکی سی دستک کے بعد سارا بیگم اس کے کمرے میں چلی آئیں، وہ ان کی آمد کی وجہ جانتا تھا، تب ہی بے نیازی سے رخ پھیر گیا۔

”گڈ مارننگ موم۔“

”پھر گڈ مارننگ، کتنی بار کہا ہے السلام علیکم کہا کرو۔“

”اوسوری، السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام، آج آفس نہیں جانا؟“



نہیں مام..... موڈ نہیں ہو رہا..... کیوں خیریت؟

”ہوں..... خیریت ہی ہے مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔“

”جی پوچھیں۔“

قطعی فرمانبرداری سے کہتے ہوئے اس نے مڑ کر بغور ان کا چہرہ دیکھا۔ جہاں پھیلی ہوئی سنجیدگی معاملہ سیریس ہونے کا سگنل دے رہی تھی۔ سارا بیگم نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر آہستہ سے رخ پھیر لیا۔

”عائکہ سے کیا کہا ہے تم نے؟“

”کچھ نہیں..... وہ اس قابل ہے کہ میں اس سے کچھ کہوں؟“

”اس قابل نہیں ہے تب ہی پوچھ رہی ہوں۔“ زاویار کی بے نیازی پر وہ ہلکی سی مشتعل ہوئی تھیں۔ وہ

سر جھٹک کر رہ گیا۔

”مجھے اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے ماما، بس یونہی ذرا سی اوقات یاد دلائی تھی اسے۔“

”مگر کیوں؟ تم کون ہوتے ہو اسے اس کی اوقات یاد دلانے والے۔ وہ تم سے لے کر کھاتی ہے تمہاری مقروض ہے، بیوی ہے، لونڈی ہے، کیا ہے؟“ پہلی بار وہ اس پر غصہ ہوئیں تھیں، وہ بھی عائکہ علوی کی وجہ سے، زاویار دنگ رہ گیا۔

”ماما، آپ اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے اپنے بیٹے سے لڑ رہی ہیں؟“

”نہیں..... لڑ نہیں رہی، سمجھا رہی ہوں، کیونکہ میں نہیں چاہتی جس بیٹے سے میں اتنا پیار کرتی ہوں، وہ کسی کی دل آزاری کرے، بے وجہ کسی کو تکلیف پہنچا کر اس کی بددعائیں لے، اللہ کے ناپسندیدہ بندوں کی لسٹ میں شامل ہو، کیونکہ تم نہیں جانتے، انسان جتنا بھی گنہگار ہو رحمن و رحیم، جس کے سینکڑوں صفاتی نام ہیں، اپنے ہر بندے کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے کوئی اس کے کسی بندے کی دل آزاری کرے وہ معاف نہیں کرتا حالانکہ اس کی صفات میں رحم و کرم کی کوئی حد نہیں، اور پھر..... عائکہ تو بہت پیاری بچی ہے میں نے کبھی اس میں عام لڑکیوں جیسی کوئی بات نہیں دیکھی۔“

”سوری ماما، میں نہیں جانتا وہ کیسی ہے کیسی نہیں، مگر مجھے اس سے بہت نفرت ہے پتہ نہیں کیوں۔“ دے دے غصے میں اس نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

سارا بیگم گہری سانس لے کر رہ گئیں۔

”پاگل ہو تم اور کچھ نہیں، بہر حال آئندہ میں ایسی کوئی بات نہ سنوں، پرہیان اسے لے کر بہت دکھی

ہے۔“

”پری پاگل ہے ماما، اب میں نے ایسا بھی کچھ نہیں کیا کہ وہ مجھ سے بات کرنا ہی چھوڑ دے۔“

”میں سمجھاؤں گی اسے تم فریش ہو کر نیچے آ جاؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے اور کوئی حکم؟“

”نہیں اور کوئی حکم نہیں آج کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔“ زاویار گہری سانس بھرتا پھر سے مسکرا کر واڈروب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے وہ واپس پلٹ گئی تھی۔



جدائی دینے والے تم سے امید وفا کیسی

تعلق ٹوٹ جائے جب، محبت روٹھ جائے جب

تو پھر رسم دعا کیسی، ملن کی التجا کیسی

بھنور میں ڈوبتی کشتی سے ساحل کی تمنا کیا

اکھڑتی سانس ہو تو زندگی کی آرزو بھی کیا

جو منزل کھوپکی ہو اس کی پھر سے جستجو بھی کیا

رضائے عشق پر اچھا سر تسلیم خم کرنا

سکھنے سے یہی بہتر ہے نا امید ہی مرنا
مگر دل نے تمہیں کس واسطے سے یاد رکھا ہے
ابھی تک میں نے کیوں خود کو بہت برباد رکھا ہے
جدائی دینے والے آشنائی کی قسم تم کو
تمہاری کج ادائی، بے وفائی کی قسم تم کو
مجھے اتنا بتادینا
وفا کی چاہتوں کی مثلعلیں کیسے بجاتے ہیں؟
نشاں کیسے مٹاتے ہیں؟
بھلانا ہو جنہیں، ان کو بھلا کیسے بھلاتے ہیں؟
رات آدھی سے زیادہ بھیک چکی تھی۔

سبک رومی سے چلتی، ٹھنڈی سرد ہوا کے جھوٹے، باہر کشادہ سڑک پر ٹپ ٹپ گرتی بارش کی ننھی ننھی منی
بوندوں کے ساتھ مل کر ایک عجب سا شور برپا کر رہے تھے۔ کتنا سکون تھا باہر سبک رومی سے چلتی سرد ہواؤں
میں..... مگر!

ان کے اندر یہ سکون نہیں تھا۔
سارا بیگم ان کے پاس ان کے کمرے میں سو رہی تھیں، کیونکہ پچھلے دو دنوں سے ان کی طبیعت ٹھیک
نہیں تھی، تاہم ان کے پہلو میں ہوتے ہوئے بھی وہ جیسے صدیوں کی مسافت پر تھیں۔
اس وقت ہلکے ہلکے بخار کے باوجود وہ بستر سے نکل کر ایزی چیئر پر آ بیٹھے تھے، سارا بیگم کی آنکھ فوراً
کھل گئی۔

”صمد۔“
”ہوں۔“ وہ چونک کر فوراً متوجہ ہوئے تھے، وہ اٹھ بیٹھیں۔
”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں آپ کی؟“

”ہوں۔“

”کوئی پریشانی ہے؟“

”نہیں۔“

”پھر وہاں کیوں بیٹھے ہیں؟“

”بس یونہی..... کچھ گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔“

”زاویار کو جگاؤں؟“

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں، میں ٹھیک ہوں تم سو جاؤ پلیز۔“ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ سارا

بیگم نے سر جھکا لیا۔

”ٹھیک ہے، کچھ دنوں سے میں آپ کو کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔“

”کیا؟“

ان کے کمزور سے لہجے پر وہ فوراً ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ سارا بیگم نے ذرا سارخ پھیر لیا
جیسے وہ الجھن کا شکار ہوں کہ کیا بتائیں اور کیا چھپائیں؟ تب ہی صمد صاحب ان کے قریب آ کر بیٹھے تھے۔
”کیا بتانا چاہتی ہو؟ کیا زاویار کے متعلق؟“

”نہیں..... زاویار کے بارے میں نہیں، پرہیان کے بارے میں۔“

”پرہیان کے بارے میں؟ کیا؟“

وہ جیسے حیران ہوئے تھے۔ سارا بیگم کا سر مزید جھک گیا۔ وہ بولیں تو ان کا لہجہ بہت مدہم تھا۔

”پرہیان کو پتہ چل گیا ہے کہ وہ آپ کی حقیقی بیٹی نہیں ہے۔“

”وہاٹ..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”سچ کہہ رہی ہوں، ابھی کچھ روز پہلے گھر واپسی پر وہ بہت دکھی تھی، بہت رو رہی تھی، بہت مشکل سے
اس نے مجھے بتایا کہ وہ اپنی حقیقت جان گئی ہے۔“

”کیا مطلب؟ کیا اسے پتہ لگ گیا ہے کہ وہ.....؟“

”نہیں..... اسے صرف یہی پتہ لگا ہے کہ وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے۔“

”او میرے خدا“ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ زندگی میں کبھی یہ سچ اس کے سامنے آ سکتا ہے۔
وہ یقیناً بہت دکھی ہوئے تھے تبھی انہوں نے اپنی آنکھیں ضبط کی شدت سے میچ لی تھیں۔ سارا بیگم
لب کاٹ کر رہ گئیں۔

”میں نے بھی کبھی نہیں چاہا تھا، کہ اسے اس حقیقت کا پتہ لگے، وہ خود کو، آپ کے حوالے سے معتبر
سمجھتی ہے مگر زندگی..... میں ہمیشہ صرف وہی تو نہیں ہوتا جو آپ چاہتے ہیں۔“

”ہوں..... مگر وہ یہ سب کیسے جان سکتی ہے، اس حقیقت کا تو ہم دونوں کے سوا صرف مریرہ کو پتہ
تھا۔“

”جی..... یقیناً اسی کے گھر سے یہ حقیقت اس کے علم میں آئی ہے، اصل میں ساویز اور درمکنوں
یونیورسٹی فیلورہ چکے ہیں، درمکنوں کی ساری زندگی ساویز کے سامنے ہے، دوست ہونے کے ناطے شاید وہ اپنی
ذاتیات بھی اس کے ساتھ شیئر کرتی رہی ہے، اسی لیے جب ساویز پر بہانہ کو اس سے ملوانے کے لیے اس کے گھر
لے گیا تو پرہیان وہاں آپ کی تصویر دیکھ کر شاکڈ رہ گئی، تب اس کے استفسار پر ساویز نے اسے بتایا کہ وہ تصویر
درمکنوں کے پاپا کے کی ہے، جنہیں وہ ٹوٹ کر پیار کرتی ہے، جب پرہیان نے اسے بتایا کہ وہ تصویر تو اس کے
پاپا کی ہے تب ساری کہانی کھلی۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ پرہیان مریرہ اور درمکنوں سے مل چکی ہے؟“

صمد صاحب کے مضطرب لہجے پر سارا بیگم نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

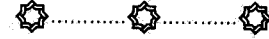
”نہیں، مریرہ سے نہیں، مگر درمکنوں سے ضرور ملی ہوگی، کیونکہ اس کے بقول ساویز اسے درمکنوں سے
ملوانے ہی وہاں لے کر گیا تھا جہاں وہ چند سال قبل مریرہ کے ساتھ رہتی تھی، اب وہ گھر لا کڈ رہتا ہے، کبھی کبھی

ہی درمکنوں وہاں آتی ہے۔“

”اوہ..... میں جانتا ہوں میری سزا اتنی جلدی ختم ہونے والی نہیں ہے۔“

اس بار وہ جیسے رو پڑے تھے۔

سارا بیگم ایک تھکی تھکی سی نگاہ ان کے شکستہ سراپے پر ڈالتے ہوئے بیڈ سے اتر آئیں، صمد صاحب کے ساتھ ساتھ اس بار وہ خود بھی بہت شکستہ تھیں۔



ابھی وقت ہے، ابھی سانس ہے، ابھی لوٹ آ میرے گمشدہ مجھے ناز ہے بڑے ضبط کا مجھے خوں رلا میرے گمشدہ یہ نہیں کہ تیرے فراق میں، میں اجڑ گیا یا بکھر گیا ہاں محبتوں پہ جو مان تھا وہ نہیں رہا میرے گمشدہ مجھے علم ہے کہ تو چاند ہے، کسی اور کا مگر ایک پل میرے آسمان حیات پر ذرا جگمگا میرے گمشدہ تیرے التفات کی بارشیں، جو میری نہیں تو بتا مجھے تیرے دشت چاہ میں کس لیے، میرا دل جلا میرے گمشدہ گھنے جنگلوں میں گری ہوں میں بڑا گھپ اندھیرا ہے چاروں کوئی ایک چراغ تو جل اٹھے ذرا مسکرا میرے گمشدہ



میریرحمان کی تصویر اسٹڈی ٹیبل پر ان کی نگاہوں کے بالکل سامنے تھی اور وہ جیسے کسی مجرم کی طرح اس تصویر کے بالکل سامنے کرسی پر بیٹھے زار و قطار رو رہے تھے۔

اس وقت وہاں کمرے میں کوئی بھی ان کے آنسوؤں کے ستاروں کو شمار کرنے والا نہیں تھا۔ دن بھر دنیا کے گورکھ دھندوں میں مصروف رہنے کے باوجود شب کے اس پہر وہ اپنے دل کی بے بسی پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔ انہیں یاد تھا شادی کے ابتدائی دنوں میں میریرحمان نہیں پا کر کس قدر خوش تھی۔

اس کی زندگی میں صمد حسن جیسا ہم سفر کیا آیا وہ گویا اداس رہنا ہی بھول گئی، ہر لمحہ، ہر پل صمد حسن کی بے تحاشا محبت کرنل شیر علی خان اسے خوش دیکھ کر خود بھی بے حد خوش اور مطمئن تھے۔

صمد ان دنوں اپنی فیکٹری کے لیے بے حد سرگرم تھا، اکثر صبح ناشتہ کیے بغیر گھر سے نکل جاتا اور پھر رات گئے بہت لیٹ گھر واپسی کی راہ لیتا، تب تک مریرا اس کے انتظار کی شدت سے ہار مان کی نیند کی بانہوں میں جھول جاتی۔

صبح جب وہ اٹھتا تو وہ اس سے خفا ہوتی مگر وہ اپنے پیار کی چابی کا استعمال کر کے اسے منالیتا، جب تک وہ نہ مانتی وہ آفس سے لیٹ ہوتا رہتا، تنگ آ کر اسے معافی دینی ہی پڑتی تھی۔ چھٹی والے دن اس کا ایک

ایک لمحہ مریرا اور کرنل صاحب کی امانت ہوتا تھا، خود مریرا بھی اس دن اس کی خوشی کا خاص خیال رکھتے ہوئے اس کے لیے مزے مزے کے پکوان بناتی، اس کی پسند کا ڈریس پہنتی اور خوب آگے پیچھے پھرتی۔

ان دنوں وقت جیسے سنہری ریت کی طرح تھا جس پر حالات کے سورج کی کرنیں پوری آب و تاب کے ساتھ پڑتی، ہر ہر لمحے کو جگمگا رہی تھیں بالکل ریت کے سنہری ذروں کی طرح۔

اس روز صبح مریرا کی آنکھ کھلی تو وہ سوئے ہوئے صمد کی ہانہوں کے حلقے میں جکڑی ہوئی تھی۔ رات جانے کب وہ گھر واپس آیا تھا اس کا دل چاہا وہ اسے جگا کر خوب جھگڑا کرے مگر پھر کچھ سوچ کر چپ چاپ پڑی رہی۔

صمد حسن سے اس کی شادی کو ایک سال مکمل ہو گیا تھا۔

اس روز ان کی شادی کی سالگرہ تھی، مگر..... صمد کو یاد نہیں تھا۔ دو سے چار اور چار سے آٹھ کی خواہش نے اسے جیسے ہر چیز بھلا دی تھی۔ تب ہی کچھ دیر چپ چاپ پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھی اور معمول کی مانند، روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

صمد جس وقت فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا وہ کرنل صاحب کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ اس کے چہرے پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ آج پھر اسے جتنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ تب ہی مسکراتے ہوئے وہ جان بوجھ کر اس سے چپک کر بیٹھ گیا تھا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! کیسے ہو صمد؟“

اس کے سلام کا جواب صرف کرنل صاحب کی طرف سے آیا تھا، وہ مسکرا دیا۔

”بالکل ٹھیک بابا جان، آپ سنائیں صبح صبح لوگ کیا چغلیاں کھا رہے ہیں آپ سے ہماری۔“

”ہا ہا ہا..... لوگوں کو اتنا تنگ بھی کیوں کرتے ہو کہ وہ چغلیاں کھانے پر مجبور ہو جائیں۔“

”مجبوری ہے بابا جان، جان بوجھ کر تو نہیں کرتاناں؟“

”بس رہنے دیں، دنیا میں باقی سارے مرد تو جیسے جھک مار رہے ہیں ناں، ایک بس آپ ہی بزنس کر رہے ہیں۔“

اس کی وضاحت پر وہ تپتی تھی۔ صمد پھر مسکرا دیا۔

”کہہ سکتی ہو کیونکہ تمہیں کچھ بھی کہنے کا مکمل اختیار ہے۔“

”بات مت کریں مجھ سے، کیونکہ میں اس وقت آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔“

اگلے ہی پل شدید جذباتی انداز میں کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

صمد کی مسکراہٹ پل میں سمٹ گئی۔

”مریرا۔“

اسنے اسے پکارا تھا مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔ تب ہی کرنل صاحب نے کہا تھا۔

”اس کی بات کا برا مت منانا صمد، وہ بہت جذباتی ہے اور شاید تم سے پیار بھی بہت کرتی ہے اسی

لیے اس سے تمہاری مصروفیات برداشت نہیں ہو رہی پھر آج تم دونوں کی شادی کی سالگرہ بھی ہے خیال رکھا کرو تھوڑا سا بیٹے، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی زندگی کا حسن ہوتی ہیں۔

”جانتا ہوں بابا، اسے سمجھتا بھی ہوں مگر کیا کروں آپ تو جانتے ہیں کسی نئی زمین پر پیر جمانا کتنا مشکل ہوتا ہے ہزار لوگوں سے ملنا پڑتا ہے ہزار تدبیریں کرنی پڑتی ہیں پھر بھی میں کوشش کروں گا اپنی مصروفیات میں کمی لانے کی۔“

”شاباش..... چلو اب جا کر آنسو پونچھو اس کے یقیناً وہ رورہی ہوگی۔“

”جی۔“

کرنل صاحب کی محبت پر آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ خود بھی وہاں سے اٹھ آیا تھا۔ مریرا بیڈ روم میں تھی اور اس نے اپنی کالج کی چوڑیوں سمیت وہ سارے تحائف جو صمد نے اسے وقافو قفا مختلف مواقعوں پر دیئے تھے توڑ پھوڑ دیئے تھے اور اب ان ٹوٹے ہوئے تحائف کے پاس بیٹھی وہ واقعی رورہی تھی۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔

”مریرا۔“ بے تابی سے اسے پکارتے ہوئے وہ اس کے مقابل آ بیٹھا تھا تاہم مریرا نے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے۔

”مرگنی مریرا، خبردار جواب محبت کے نام پر مزید کوئی اور جھوٹ بولا آپ نے۔“

”صمد نے دل پر اس کے الفاظ سے جیسے گھونسا سا پڑا تھا مگر اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”میری مریرا کیوں مرے میں اس کے دشمن، تم بتاؤ اب تک کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے؟“

”سچ کون سا بولا ہے؟“

”ترخ کر پوچھتے ہوئے اس نے بھیگی پلکیں اٹھائی تھیں، صمد تڑپ کر رہ گیا۔

”کچھ اور سچ ہو نہ ہو مگر یہ سچ ہے مریرا کہ تم میں میری جان ہے۔“

”بس کرو پلیز، بہت بلیک میل کر لیا آپ نے ایسے الفاظ سے مجھے اب اور نہیں۔“

وہ بیزار تھی۔ صمد شدید تکلیف میں ہونے کے باوجود ہنس پڑا۔

”بلیک میل؟ کیا بلیک میل کیا ہے میں نے تمہیں؟“

”پتہ نہیں، تم جاؤ پلیز یہاں سے میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہو رہا ہے۔“

”اچھا چلا جاؤں گا پہلے مبارکباد تو وصول کر لو شادی کی پہلی سالگرہ پر۔“

وہ ہاتھ چھڑا رہی تھی اور صمد اتنی ہی شدت سے ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لیے دبا رہا

تھا۔

”مجھے نہیں کرنی۔“

”نہ سہی، مگر میں تو پھر بھی وش کروں گا۔ کیونکہ یہ میرا اخلاقی، دینی معاشرتی اور معاشی فرض ہے۔“

خوشگوار لہجے میں کہتے ہی اس نے مریرا کو اپنی ہانہوں میں سمیٹ لیا تھا، وہ پھر پھر کر رہ گئی۔

”میں جانتا ہوں تم اس وقت بہت غصے میں ہو، میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتیں، مگر پھر بھی میں تم

سے پیار کرتا ہوں مریرا اتنا کہ شاید تم کبھی تصور بھی نہ کر سکو اور جو آج کا دن ہے اس دن کے لیے میں نے ایک ایک لمحہ انگلیوں پر شمار کیا ہے اگر یقین نہ آئے تو میری دھڑکنوں سے پوچھ لو۔

مجھ میں بے لوث محبت کے سوال کچھ بھی نہیں

تم جو چاہو میری سانسون کی تلاشی لے لو

وہی اس سب سے بڑا ہتھیار محبت..... اور وہی مقابل ایک عورت..... وہ پکھلنا نہیں چاہتی تھی مگر پکھل گئی تھی۔

صمد اب اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو دیوانوں کی طرح چومنے کے بعد اسے بتا رہا تھا۔

”یہ دیکھو“ کل رات پورا ڈیڑھ گھنٹہ مختلف شاپنگ مالز اور جیولز کی شاپس کی خاک چھاننے کے بعد

میں نے تمہارے لیے کتنا پیارا نیگلکس خریدا ہے“ گلے میں پہنوں گی تو آئینہ بھی جگمگا اٹھے گا۔“

اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں واقعی ایک خوبصورت نازک سائیکلس جگمگا رہا تھا۔

مریرا کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”واؤ یہ تو بہت خوبصورت اور قیمتی ہے۔“

”ہوں..... مگر تمہاری مسکراہٹ اور خوشی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“

”پھر بھی آپ کو اتنا قیمتی گفٹ نہیں خریدنا چاہیے تھا“ ابھی تو آپ نے کام شروع کیا ہے آپ کو زیادہ

پیسوں کی ضرورت ہے۔“

”نہیں..... مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے مریرا“ تمہاری محبت اور تمہاری خوشی کی..... بس..... وہ

سر تا پیر محبت کا عکس بنا تھا“ مریرا نے آہستگی سے سر جھکا لیا۔

”مجھے لگا آپ کو آج کا دن یاد نہیں رہا۔“

”جانتا ہوں“ اسی لیے اتنے قیمتی موتی لٹائے ہیں تم نے۔“

وہ اس کی رگ رگ سے واقف تھا“ مریرا بھیگی پلکوں سمیت مسکرا کر اس کا گال چوم گئی۔

”سوری..... مگر میں نے تو آپ کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔“

”کوئی بات نہیں“ تم سے اپنی پسند کا گفٹ میں خود ہی وصول کر لوں گا۔“

اگلے ہی پل اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی تھی۔ مریرا کے چہرے پر سرخی بکھر گئی۔ فوراً اس کی گرفت

سے نکلتے ہوئے اس نے فرار چاہا تھا مگر اس لمحے اس کے لیے محبت کے خوبصورت درنگین پنجرے سے رہائی ممکن نہیں تھی۔



”صمد.....“

اسی روز رات میں وہ کرنل صاحب کے پاس سے اٹھ کر بیڈ پر آیا تھا جب مریرا اس کے پیچھے ہی

کمرے میں چلی آئی۔ وہ نیلی ویژن آن کرتے کرتے رک گیا۔

”ہوں۔“

”مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ سے۔“

”اس وقت؟“

”جی ہاں۔“ وہ کچھ سنجیدہ تھی۔ صمد نے ریہوٹ سائید پر رکھ دیا۔

”کہو۔“ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے مقابل بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی اٹھ بیٹھا۔ مریرا نے ایک پل کچھ

سوچنے کے بعد اپنے گلے سے وہ نیگلکس اتار لیا جو اسے صبح ہی صمد نے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا تھا۔

”یہ لیں“ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

اگلے ہی پل وہ نیگلکس صمد کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے اس نے سر جھکا لیا تھا۔

”اپنی شادی کی پہلی سالگرہ پر مجھے آپ سے بہت قیمتی گفٹ چاہیے صمد، اور میں توقع رکھتی ہوں کہ

آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔“

اس کا انداز ایسا تھا کہ صمد کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”مریرا.....“

”صمد پلیز..... میں اس وقت کوئی وضاحت کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ بہت کچھ پا کر

بھی مجھے لگتا ہے جیسے میرا دامن خالی ہے میں ادھوری ہوں پلیز صمد میرے صبر کا امتحان مت لیں“ پلیز۔“

صمد کا ہاتھ تھام کر اس کی گود میں سر رکھتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ وہ شاکدہ رہ گیا۔ مریرا رملن اتنی

بلدی اس سے کوئی ایسا مطالبہ بھی کر سکتی ہے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تب ہی وہ برہم ہوا تھا۔

”یہ چیونگ ہے مریرا“ شادی کی پہلی رات ہی میں نے تم پر واضح کر دیا تھا کہ کم از کم اگلے پانچ سال

تک میں تمہیں یہ خوشی نہیں دے سکوں گا“ تم چاہو تو ساتھ چلو“ چاہو تو ساتھ چھوڑ دو“ پھر اب ایک دم سے یہ مطالبہ

کیوں؟“

”مجھے نہیں پتہ“ میں کچھ نہیں جانتی، میں بس اتنا جانتی ہوں کہ میری ذات ادھوری ہے جس چیز میں

اللہ رب العزت کی طرف سے عورت کی تکمیل رکھی گئی ہے میں اس سے منہ نہیں موڑ سکتی“ خدا کا واسطہ ہے آپ کو

صمد“ اپنے سارے خوف بالائے طاق رکھ کر مجھے تکمیل بخش دیں“ مجھے اولاد کی خوشی دے دیں، پلیز۔“

وہ جانتی تھی کہ اگر صمد کی محبت اس کا ہتھیار ہے تو اس کے آنسو بھی اس کا ہتھیار ہیں جن کی ضرب

ہمیشہ صمد کے دل پر کاری لگتی تھی۔ اسی لیے اس نے اس وقت اسی ہتھیار سے کام لیا تھا۔ مگر وہ بدک اٹھا۔

”سوری“ اگر تم مجھے چھوڑنا چاہتی ہو تو چھوڑ دو“ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا“ کم از کم اگلے پانچ سال تک تو

بالکل نہیں۔ اور بہتر ہوگا اگر آج کے بعد تم اس ٹاپک پر مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔“

خاصے ترش لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ کمرے میں ٹھہرا نہیں تھا۔

مریرا آنسوؤں سے بھری، بے یقین نگاہوں سے کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہ گئی۔



اگلی صبح اسکے اٹھنے سے پہلے ہی وہ آفس کے لیے نکل گیا تھا۔

مریرا بہت دکھی سی کمرے سے نکل آئی۔ پتہ نہیں رات صمد کہاں سویا تھا۔ وہ سازی رات جاگ کر

اس کی کمرے میں واپسی کا انتظار کرتی رہی تھی۔

دل عجیب بے چین سا تھا، پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہو کر بنانا شتہ کیے آفس چلا گیا تھا، وگرنہ جتنی بھی خفگی ہوتی، مریرا اسے خالی پیٹ گھر سے باہر نہیں جانے دیتی تھی۔

اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی فرمائش پر اتنا شدید ری ایکٹ کرے گا۔ کچھ ایسی غلط فرمائش تو نہیں کی تھی اس نے۔

ماں بننا اس کا حق تھا اور وہ اپنا یہ حق صمید کے بیکار کے خدشات پر قربان نہیں کر سکتی، اس کے دماغ پر جیسے یہی بھوت سوار ہو چکا تھا۔

دن میں دس بار وہ بریرہ کے لیے اپنے ہاتھوں سے سیپے ہوئے ننھے منے سے کپڑے نکالتی اور چوم کر رکھ دیتی۔

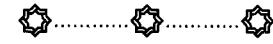
اسکے ہمسائے میں ایک نئی فیملی آئی ہوئی تھی، جن کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جو سارا دن کبھی اپنی ماں کے ساتھ تو کبھی تنہا اپنے گھر کے لان میں کھیلتے رہتے تھے، مریرا فرصت کے لمحات میں دیر تک میز پر کھڑی انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ اگلے چند روز میں وہ بچے اپنی ماں کے ساتھ اس کے گھر بھی آنے لگے تھے۔ تب ہی اس کے اندر کی متا انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی، مگر صمید کو اس کے معصوم احساسات کی پروا ہی کہاں تھی؟

وہ تو اپنے ہی خدشات کے خوف میں جکڑا ہوا تھا۔

اسکے دماغ میں یہ بات جڑ پکڑ کر بیٹھ چکی تھی کہ اگر مریرا نے کسی بچے کو جنم دیا تو وہ جان سے چلی جائے گی اور..... صمید حسن کے لیے یہ تصور ہی بہت خوفناک تھا۔

مریرا جن کے بغیر اس کی زندگی قطعی بے معنی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ دونوں اپنی اپنی الجھن میں گرفتار ایک دوسرے سے مکمل کنارہ کشی کیے ہوئے تھے۔



اس رات وہ گھر واپس آیا تو مریرا بخار کی پلیٹ میں تھی۔

رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی، پچھلے دو دن سے دونوں کے درمیان بات چیت بند تھی، مگر دونوں ہی اپنی ضد چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اب بھی خود کھانا نکال کر گرم کرنے کے بعد وہ ہیں کچن میں بیٹھ گیا تھا۔

کرنل صاحب تک ابھی ان کی جنگ کی خبر نہیں پہنچی تھی، وگرنہ یقیناً یہ جھگڑا اب تک ختم ہو چکا تھا۔

کھانا کھا کر وہ کمرے میں واپس آیا تو مریرا کمرے میں ہونے کے باوجود ہولے ہولے کپکپا رہی تھی۔

صمید نے بیرونی دندو کے پٹ بند کر دیئے۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس سے روٹھ کر مریرا نے کمر انہیں چھوڑا تھا وگرنہ وہ تو نیند کو ہی ترس کر رہ جاتا۔

مریرا کے بغیر اس بستر پر اسے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی کمرے میں گھس کر دائیں بازو پر سر ٹکاتے ہوئے اس نے پہلو کے بل مریرا کی جانب رخ کیا تھا مگر وہ اس کی طرف پیٹھ کیے سو رہی تھی، تب ہی

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو سہلایا تھا، لیکن مریرا کی طرف سے کوئی رسپانس نہیں دیا گیا۔

وہ تھوڑی دیر چپ چاپ لیٹا رہا، ایک مرتبہ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔

”مریرا!“ اگلے ہی پل وہ اس کے چہرے پر جھک گیا تھا۔ مریرا نے آنکھیں کھول دیں۔

ہلکے ہلکے بخار کے سبب اسکی آنکھیں خوب سرخ ہو رہی تھیں۔

صمید کا دل بے ایمان ہونے لگا۔

”نیند نہیں آرہی ناں؟“

”آرہی ہے۔“

وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز برت رہی تھی۔

صمید مسکرا دیا۔

”جھوٹ کب سے بولنا سیکھ لیا ہے تم نے؟“

”میں کوئی جھوٹ نہیں بول رہی، پلیز سونے دیں مجھے۔“

”اتنی ناراضگی کہ میری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔“

اب وہ گلہ کر رہا تھا۔

مریرا کا دل دھڑک اٹھا۔

”میری کوئی ناراضگی نہیں ہے آپ سے۔“

”اچھا..... ناراضگی نہیں ہے تو پھر بات چیت کیوں بند کی ہوئی ہے تمہیں تو میرے بازو پر سر رکھے

بغیر نیند نہیں آتی تھی، اب کیسے آرام سے سو جاتی ہو؟“

وہ جلا ہوا تھا، مریرا کو ہنسی آ گئی۔

”لوگ صحیح کہتے ہیں، واقعی لڑکیاں شادی کے بعد بدل جاتی ہیں، کہاں تو شادی سے پہلے میری ایک

لمحے کی نظر اندازی برداشت نہیں ہوتی تھی اور اب تین دن ہو گئے ہیں کوئی پروا ہی نہیں۔“

وہ صحیح دہائی دے رہا تھا۔

مریرا نے اس کے بازو پر سر رکھ لیا۔

”پروا ہے، مگر میں آپ سے ناراض ہوں۔“

”ناراض تو میں بھی ہوں۔“

”کیوں؟ آپ کیوں ناراض ہیں؟“

”تمہیں میری محبت کی قدر جو نہیں۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ مجھے آپ کی محبت کی قدر نہیں۔“

”ابھی بھی کہنے کی ضرورت ہے؟“

اب وہ اسے دیکھ رہا تھا۔

مریرا نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔

”آپ اپنی ضد چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“

”تم کیوں نہیں چھوڑ دیتیں اپنی ضد؟“

”یہ ضد نہیں ہے، ماں بننا میرا حق ہے۔“

”اور اپنے شوہر کی خوشی کا خیال رکھنا تمہارا فرض۔“

”تو کیا شوہر کا کوئی فرض نہیں ہے، میں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتی صمد، پلیز۔“

اگلے ہی پل وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے سیاہ سلی بال جیسے کالی گٹھاؤں کی مانند اس کی پشت پر بکھرے صمد کا دل بے قرار کر گئے تھے۔

”ہوں بچوں کے بغیر نہیں رہ سکتیں، مگر میرے بغیر وہ رہ سکتی ہو، ہے ناں؟“ وہ بھی اٹھ بیٹھا تھا۔

مریانا نے اپنا سر تھام لیا۔

”ایسی فضول بات مت کریں صمد، پلیز..... آپ جانتے ہیں میں آپ کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔“

”اگر یہ سچ ہے تو پھر اپنی فضول ضد چھوڑ دو خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔“

”کبھی نہیں..... وہ بچے صرف میرے بچے نہیں ہوں گے آپ کا بھی کوئی تعلق ہوگا ان سے۔“

”مجھے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا، سوائے تمہارے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر سو جائیں چپ چاپ، میں فی الحال آپ سے کسی اور موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

صمد کے حتمی لہجے پر غصے سے کہتے ہوئے اس نے اپنا تکیہ اٹھایا اور صوفے پر آگئی۔

صمد اس کی اس حرکت پر کتنی ہی دیر دل ہی دل میں کڑھتا، بالآخر سو گیا تھا۔

اگلی صبح وہ فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا تو مریانا بخار کے باوجود کچن میں کام کر رہی تھی۔ وہ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد، کمرل صاحب کے قریب آ بیٹھا، جو ناشتے کی میز پر صبح کے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے صمد کے قریب بیٹھنے پر انہوں نے اخبار ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام، کیسے ہو صمد؟ آج کل بہت لیٹ آنے لگے ہو۔“

”سوری بابا، مجھے بہت شرمندگی ہے کہ چاہنے کے باوجود میں اپنا وعدہ وفا نہیں کر پارہا، اصل میں میرے جو پارٹنر ہیں، وہ اپنے آبائی گاؤں میں ایک پروجیکٹ شروع کر رہے ہیں تو فیکٹری کا سارا کام مجھ پر غریب پر آپڑا ہے، آپ دعا کریں ان شاء اللہ جلد سب کچھ معمول پر آجائے گا۔“

”ان شاء اللہ، کل سکندر کا فون آیا تھا، پاکستان آنا چاہ رہا ہے۔“

”اوہ گڈ یہ تو اچھی بات ہے، آپ نے کیا کہا پھر؟“

”کیا کہہ سکتا تھا، ایک بوڑھا باپ، جس کی بیٹی اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر رہی ہو اور اس کا اتنا سانس نہ چلے کہ وہ اس بیٹی کے دعا باز شوہر کو دیار غیر سے بلا کر اس کے جنازے کو کندھا ہی دلواسکے“

اس باپ کو کیا کہنا چاہیے تھا، تمہاری نظر میں؟“

”میں آپ کا درد سمجھ سکتا ہوں بابا، مگر گزرے ہوئے برے لمحات کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔“

”تم بھول سکتے ہو صمد، مگر وہ باپ نہیں بھول سکتا جس نے خود اپنے بوڑھے ہاتھوں سے اپنی بے قصور جوان بیٹی کو مٹی کے سپرد کیا ہو۔“

اس باران کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

صمد نے رخ پھیر لیا۔

”میں نے اسے کہہ دیا ہے، جب تک میں زندہ ہوں، تب تک بھول کر بھی مجھے اپنی شکل نہ دکھائے، ورنہ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔“

”یہ ایک مشکل فیصلہ ہوگا بابا، میرا خیال ہے آپ کو ایک بار پھر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔“

”نہیں..... مشکل فیصلہ وہ تھا جب صرف بریرہ کی پسند کی وجہ سے بنا سکندر سے کھل کر بات کیے، میں نے اپنی پھول جیسی بچی کا نکاح اس جیسے قطعی غیر ذمے دار شخص کے ساتھ کر دیا تھا، اب تو سارے فیصلے ہی آسان ہو گئے ہیں، میرے خیال سے دنیا کا کوئی باپ اپنی معصوم اولاد کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، مگر قاتل بھی تو آپ کا اپنا بیٹا ہے بابا۔“

”کبھی تھا، اب نہیں ہے اور بہتر ہوگا صمد اگر آج کے بعد ہم کبھی اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔“ وہ بھجھ سکتا تھا کہ کہ بریرہ کی موت کے بعد کمرل صاحب جیسے ٹوٹ کر رہ گئے تھے، محض پچاس سال کی عمر میں وہ صدیوں کے بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

تبھی اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”ٹھیک ہے بابا، میرے لیے آپ کی خوشی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔“

”شباباش..... جیتے رہو۔“

مریانا چائے لے آئی تھی۔

صمد نے اسے تنگ کرنے کے لیے ناشتے سے صاف معذرت کر لی۔

”میں اب چلتا ہوں بابا، ناشتہ آفس جا کر ہی کروں گا۔“

”نہیں، ابھی بیٹھو، مجھے کچھ بات کرنی ہے تم سے۔“

وہ آج اسے بخشنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ناچار اسے بیٹھنا پڑا۔

”جی حکم کریں، کیا بات ہے؟“

”ناشتہ کرو پہلے۔“

وہ اس کی شرارت جان گئے تھے۔ صمد چپ چاپ کپ اٹھا گیا، تب ہی وہ بولے تھے۔

”میں کچھ دنوں سے نوٹ کر رہا ہوں، مریانا بہت اداس ہے، شاید وہ بریرہ کی کمی محسوس کرتی ہے، ایسے میں تمہارے پاس بھی اسے دینے کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے، اصل بات سے پہلے انہوں نے تمہید باندھی تھی۔“

وہ چپ چاپ چائے کے گھونٹ بھرتے ہوئے انہیں سنتا رہا۔

”میرا ایک دوست ہے، اظہار..... گاؤں میں ہم دونوں کے گھر ایک دوسرے سے بہت قریب تھے بعد میں میں فوج میں چلا گیا اور وہ نمبر دار بن گیا، مگر ہمارا تعلق نہیں ٹوٹا، وہ شہر بہت کم آتا ہے، مگر میں جب بھی گاؤں جاتا ہوں وہ تین دن سے پہلے واپس نہیں آنے دیتا، بریرہ اور مریرا کو بالکل اپنی سگی بیٹیوں کی طرح سمجھتا ہے، جن دنوں بریرہ کی موت ہوئی وہ ہسپتال میں بیمار پڑا تھا، اب اس کی بیٹی اور بیٹے کی شادی ہے، بہت اصرار سے شادی میں شرکت کی دعوت بھیجی ہے اس نے، میری خواہش ہے تم مریرا کو لے کر اس شادی میں جاؤ، تاکہ اس کا دل بھی بہل جائے اور اظہار بھی خوش ہو جائے۔“

”ٹھیک ہے بابا، میں لے جاؤں گا، مگر آپ بھی تو چلیں۔“

”مجھے پنڈی کچھ کام ہے، میں بعد میں آ جاؤں گا۔“

وہ پورا پروگرام ترتیب دیئے بیٹھے تھے۔

صمید ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ بہتر سمجھیں، مریرا سے بات کر لی آپ نے؟“

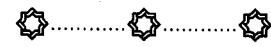
”ہوں، وہ تیاری کر لے گی، کل صبح نکل جانا تم لوگ۔“

”ٹھیک ہے، اب جاؤں آفس؟“

”ہوں جاؤ۔“

لبوں پر مسکراہٹ پھیلانے کرنل صاحب نے اسے اجازت دی تھی۔

وہ مسکرا کر ان سے گلے ملتے ہوئے آفس کے لیے نکل گیا۔



شام ڈھلنے کو تھی۔

وہ دونوں گاؤں پہنچے تو تھکن سے دونوں کا برا حال تھا۔

سورج اپنی تمام تر تمازت سمیت دھیرے دھیرے افق کے پار غروب ہوتا جا رہا تھا۔ مریرا نے دیکھا،

شام کی نارنجی مدھم پڑتی روشنی تا حد نظر لہلہاتی فصلوں کو ایک عجب ساحن بخش رہی تھی۔

گاؤں کے کچے پکے گھروں اٹھتے دھوئیں کے مرغولے اور کھیتوں سے اپنے گھروں کو لوٹتے مویشی

اسے ایک عجیب سے احساس سے دوچار کر رہے تھے۔

بچپن سے ہی اسے گاؤں اور گاؤں کے لوگوں سے بہت محبت تھی۔ وہ کئی بار بچپن میں بریرہ کے ساتھ

وہاں اس گاؤں میں آئی تھی اور جتنے دن اس کے یہاں گزرے انہیں وہ اپنی زندگی کے بہترین دنوں میں

شمار کرتی تھی۔

اس وقت بھی ٹرین کے لمبے سفر کے بعد صمید کی ہمراہی میں جیسے ہی وہ تانگے پر گاؤں کی کچی حدود

میں داخل ہوئی اس کا دل عجیب سی لے پر دھڑکنے لگا تھا۔ ہوا کے سنگ آتی، کھیتوں کی خوشبو اسے اپنے اندر تک

اترتی محسوس ہو رہی تھی۔

کتنی خوب صورت تھی گاؤں کی زندگی۔

پرسکون، پر کیف، پر لطف.....!

وہ ایک ایک منظر کو بغور دیکھتی، ماحول میں کچھ ایسی کھوئی کہ ساتھ بیٹھے صمید کی پریشانی نگاہوں کا احساس بھی نہ ہو سکا، چونکی تو اس وقت جب تانگہ چھوٹی حویلی کے سامنے ایک دم سے رک گیا۔

پچھلے دس سالوں میں وہاں اس گاؤں میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں مگر چھوٹی حویلی کے در و دیوار پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہ اب بھی ویسی ہی تھی جیسی مریرا کے بچپن میں ہوا کرتی تھی۔ مریرا حسرت بھری پر شوق نگاہوں سے حویلی کے بیرونی حصے کو دیکھتی تانگے سے اتر آئی۔

صمید نے کرایہ ادا کرنے کے بعد بھاری بیگ اپنی تحویل میں لے لیا۔

وہ دونوں حویلی میں داخل ہوئے تو جیسے وہاں عید کا سماں بپا ہو گیا۔

اظہار صاحب ان کی بیگم، بہوؤں اور ان کے بچے سب مریرا اور صمید کے گرد گھیر ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ صمید ان لوگوں کا پیار دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ابھی انہیں وہاں بیٹھے دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ خالص دودھ سے بنی چائے، باقر خائیاں اور نمکو آگنی صمید کا تھکن سے برا حال تھا لہذا چائے پینے کے بعد وہ تو سونے چلا گیا، تاہم مریرا تھکن کے باوجود بیٹھی انہیں اپنے حالات کے بارے میں بتاتی رہی۔

بارہ کمرہ پر مشتمل چھوٹی حویلی، بے حد پرانی ہو کر بھی اس وقت انوکھی چھپ دکھا رہی تھی۔ تبھی پودھرائی نے اسے بتایا تھا۔

”بریرہ کی ناگہانی موت کا سن کر بڑا دکھ ہوا تھا بچے، مگر چوہدری صاحب ان دنوں ہسپتال میں بستر پر بڑے تھے اس لیے چاہ کر بھی میں اور چوہدری صاحب تمہارا اور بھائی جی کا دکھ بانٹنے نہیں آ سکے، پر اللہ جانتا ہے مجھے اور چوہدری صاحب کو اس انہونی خبر سے بڑا دکھ پہنچا تھا، کیسی پھول سی بچی تھی، کتنی جلدی مٹی کی گود میں جاسوئی، ابھی تک کلیجے میں ہول اٹھتے ہیں۔“

وہ رو رہی تھیں۔

مریرا کا زخم پھر سے تازہ ہو گیا، اس کی آنکھیں ایک پل میں آنسوؤں سے بھر آئی تھیں۔

”بھائی جی نے بہت زیادتی کی ہمارے ساتھ، بریرہ تو چلو ان کے بیٹے کی منگ تھی، مگر تمہارے لیے تو ایک بار ہم سے مشورہ کرتے، ادھر اس کی قبر کی مٹی خشک ہوئی نہیں اور ادھر تمہارا نکاح بھی کر دیا، وہ بھی ایک بالکل انجان لڑکے کے ساتھ، کچھ تو سوچتے بھائی جی، ہمیں ایک موقع تو دیتے بات کرنے کا، سب کچھ بالا ہی بالا طے کر لیا، جیسے ہمارا کوئی حق ہی نہیں تھا تم پر۔“

اگلے ہی پل وہ اس سے گلہ کر رہی تھیں۔

وہ بے اختیار نظریں چرا گئی۔

”پھڈ زلیخا، جو ہو گیا سو ہو گیا، ہن بچی نوں پریشان نہ کر۔“

”نہیں چاچا، پریشانی کی کیا بات ہے، جتنا پیار آپ نے اور چاچی نے مجھے اور بریرہ کو دیا اس کے بعد غصہ گلہ کرنا آپ کا حق بنتا ہے، مگر بڑے ابو نے جو بھی کیا حالات سے مجبور ہو کر کیا، بریرہ کی موت کے بعد

”رات بہت ہو گئی ہے، سو جاؤ اب، باقی سب باتیں صبح ہوں گی۔“

اگلے ہی پل وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

مریرا اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

وہ کمرے میں آئی تو صمد گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک اسے دیکھتی رہی پھر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آکر چپ چاپ لیٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں نیند نے اسے بھی ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو حویلی میں زندگی اپنے معمول پر تھی۔

حویلی کے مکین اور ملازمین ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے، تاہم مریرا اور صمد کے ناشتے کے لیے ابھی بھی چولہے میں آگ جل رہی تھی۔

حویلی کے بڑے سے کشادہ صحن میں چڑیوں کے غول کے غول اترے اپنے اپنے حصے کا رزق تلاش کر رہے تھے۔ صمد انچ باتھ میں تھا، وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے بڑے سے کشادہ صحن میں چلی آئی جہاں برگد کے درخت کے نیچے بڑے سے تخت پر چوہدرانی بیٹھی مختلف ملازمین کو شادی کے کاموں کے سلسلے میں ہدایات دے رہی تھیں۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! اٹھ گئیں پتر؟“

”جی چاچی۔“

”شاباش..... صمد پتر بھی اٹھ گیا کہ نہیں؟“

”اٹھ گئے ہیں، باتھ لے رہے ہیں۔“

”چلو اچھی بات ہے، نیند تو ٹھیک سے آگئی تھی نا؟“

”جی چاچی، نیند بھلا کیسے نہ آئی، حویلی کی یہ اونچی دیواریں میرے لیے قطعی انجان نہیں ہیں۔“

”اچھا.....؟“

اس بار اس کے الفاظ پر عقب سے آواز آئی تھی۔ وہ مسکرا دی۔

”کوئی شک؟“

”شک تو ہو ہی جاتا ہے جب کوئی سالوں پلٹ کر پیچھے کی خبر نہ لے۔“

اگلے ہی پل وہ سامنے آ بیٹھا تھا، وہ رخ پھیر گئی۔

”خبر تو تم نے بھی نہیں لی، تم پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی شہر میں داخلے کے لیے۔“

”میں یہاں تھا ہی کب، خیر چھوڑو چلو اٹھ کر ناشتہ بناؤ میرے لیے، شاباش۔“

”میں.....؟“

مریرا کو حیرت ہوئی، عمر نے لب بھینچ لیے۔

”ہوں تم..... کیوں یہاں کوئی اور مریرا بھی ہے۔“

”عمر پتر..... وہ مہمان ہے۔“

حالات بہت گھمبیر ہو گئے تھے، ایسے میں صرف میری خوشیوں کے لیے انہیں فوری طور پر وہ سب کرنا پڑا جو عام حالات میں شاید وہ کبھی نہ کرتے، پلیز آپ ان سے ناراض نہ ہوں، وہ بہت شرمندہ ہیں۔“

”چلو ٹھیک ہے پتر..... جو سوہنے رب کی مرضی۔“

اس کی وضاحت پر اظہار صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ دھرا تھا، مریرا سر جھکا کر رہ گئی۔

عین اسی لمحے کوئی باہر سے وہاں بڑے سے کشادہ صحن میں آیا تھا۔

”السلام علیکم!“

آنے والے کی نظر مریرا پر نہیں پڑی تھی مگر مریرہ نے اسے دیکھ لیا تھا، تب ہی وہ فوراً چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”عمر؟“

اس کی آنکھوں میں جتنی حیرانی تھی، اتنی ہی چمک بھی تھی۔

آنے والا بھی اسے دیکھ کر ساکت رہ گیا تھا۔

”مریرا تم؟“

صرف ایک پل میں جیسے طوفان آگیا تھا، اس کی آنکھوں میں بھی اور دل میں بھی، مگر مریرا کو اس طوفان کی خبر نہ ہو سکی۔

وہ اب بھی دلکشی سے مسکرا رہی تھی۔

”کیسے ہونی چڑھے کر لیے؟“

وہ بدلی نہیں تھی۔ اسے خود کو سنبھالنا پڑا۔

”ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟“

”بے حد پیاری، ہمیشہ کی طرح۔“

وہ شوخ ہوئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

”لگتا ہے ابھی تک خوش فہمیوں کا بخار چڑھتا ہے تمہیں، بہر حال کب آئیں؟“

وہ قریب آیا تھا، چوہدرانی یاسیت سے اس کی طرف دیکھتی سر جھکا گئیں۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے، تم اب روڈ سے کب آئے؟ چاچی بتا رہی تھیں تم باہر گئے ہوئے تھے پڑھنے کے لیے؟“

”ہوں، ابھی ایک سال پہلے ہی گیا تھا، تم سناؤ خوش ہونا؟“

”ہوں، بہت خوش۔“

”چلو شکر ہے اللہ کا، کسی بیچارے کی قربانی تو قبول ہوئی۔“

لمبی سانس بھرتے ہوئے وہ ہلکے سے مسکرایا تھا۔ مریرا اسے گھور کر رہ گئی۔ کتنے سالوں بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا، اور گزرے ہوئے ان سالوں میں دونوں ہی کتنے بدل کر رہ گئے تھے۔

”ایروڈ سے کب آئے؟“

”ابھی..... ایک ہفتے پہلے۔“

”شادی کیوں نہیں کی؟“

”بس یونہی، دل ہی نہیں چاہا۔“

”دل کی کچھ زیادہ ہی نہیں سننے لگ گئے ہیں آپ؟“

اب وہ مسکرا رہی تھی۔

دہکتی نارنجی آگ میں اس کے گال خوب پتھر رہے تھے۔ وہ بے ساختہ رخ پھیر گیا۔

”کہاں ڈیز..... دل کی سن لیتا تو دل آج ویران نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

”تم سمجھو گی بھی نہیں، چلو شام ناشتہ بناؤ“ میں آتا ہوں ابھی۔“

مریہ کے لہجے پر وہ فوراً اٹھ کر رسوئی سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ سر جھٹکتی دوبارہ ناشتہ بنانے میں لگ

گئی۔

دل آباد کا برباد ہونا بھی ضروری ہے
جسے پانا ضروری ہے اسے کھونا ضروری ہے
یہ خود سر وقت، لے جائے کہانی کو کہاں جانے
مصنف کا کسی کردار میں ہونا ضروری ہے



شام کی دبیز چادر

سرخی بادلوں کے نظارے

گرے ہوئے زرد پتوں پہ

برہنہ کھڑے ہوئے پیڑ کے پاس

وہ آج بھی تمہیں یاد کرتی ہے

تاروں کے جھرمٹ میں

پھیلتی ہوئی ماہتاب کی روشنی میں

رات کے سنائے میں

تمہاری آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے

گھر کی دہلیز پہ کھڑی

منتظر ہیں اس کی نگاہیں

تمہاری راہ میں.....

لوٹ آؤ

چوہدرانی نے اسے تنبیہ کرنا چاہی تھی مگر عمر نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”ماں جی پلیز..... آپ درمیان میں نہیں آئیں گی، یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے، بھلے اس کی شادی ہو گئی ہو مگر یہ میری دوست تو ہے ناں، اس کے موجود ہوتے ہوئے میں کسی اور کے ہاتھ کا پکا کیسے کھا سکتا ہوں؟“

اسکے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ چوہدرانی چپ کر گئی تھیں۔

”ٹھیک ہے، پھر چلو تم بھی ہیلپ کرواؤ میری۔“

مریہ اس کے مزاج سے بخوبی واقف تھی، تب ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ مسکرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

مٹی کے چولہے میں گوہر سے بنے ایلے ابھی تک دہک رہے تھے، مریہ نائیلون کے تاروں سے بنا خوب صورت پیڑھا کھسکا کر ایک سائیدیر بیٹھ گئی، جبکہ عمر چولہے کے سامنے رکھی پیڑھی پر بیٹھ گیا تھا۔

نیوی بلوشلوار سوٹ میں اس کا بھرا بھرا سراپا اور پیشانی پر بکھرے گئے سنہری بال اس کی وجاہت میں بے پناہ اضافہ کر رہے تھے، دونوں بازوؤں کے کف مڑے ہوئے تھے اور دونوں کلائیوں پر چمکتے سنہری بال اس وقت بے حد بھلے لگ رہے تھے، دائیں کلائی پر بندھی بلیک سٹریپ والی قیمتی رسٹ واچ الگ چھب دکھا رہی تھی۔ مگر اسے پروا کہاں تھی وہ اب بھی خود سے اتنا ہی بے نیاز تھا، جتنا کہ نوعمری میں ہوا کرتا تھا۔

مریہ اس کے مختصر جائزے کے بعد اب آنا گوندھ رہی تھی جب وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”بریرہ کی موت کی خبر ملی تھی مجھے، لندن میں تھا میں، بہت کوشش کی پاکستان آنے کے لیے مگر نہیں آسکا، بہر حال بہت دکھ ہوا تھا، وہی تو ایک دوست تھی میری، بے حد ہمدرد اور صلح جو۔“

”ہوں..... میں سمجھ سکتی ہوں۔“

”کاش تم بھی اس جیسی ہوتیں مریہ، کاش۔“

”کیوں؟ میں نے کون سی بھینس چرائی ہے تمہاری؟“

فوراً وہ خفا ہوئی تھی، وہ مسکرا دیا۔

”پتہ نہیں کیا کیا چراچکی ہو تم میرا، مگر جانے دو اب کیا حساب کتاب کرنا تم سے۔“

”تم بہت بدل گئے ہو عمر، پہلے تو پیشانی کے بل بھی کم نہیں ہوتے تھے تمہارے تمہیں یاد ہے ایک بار میں نے تمہارے کبوتر کو اڑا دیا تھا تو تم نے کتنی پٹائی کی تھی میری، پورے دو دن روتی رہی تھی میں مگر تم نے ایک بار بھی معافی نہیں مانگی۔“

”ہوں۔“ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

”میں نے معافی نہیں مانگی، مگر اس کے بعد دوبارہ کبھی کوئی کبوتر نہیں لایا حویلی میں۔“

”کیوں؟“

”بس..... دل ہی نہیں کیا۔“

چولہے میں آگ اب زور پکڑ چکی تھی، مریہ نے جلدی سے توار کھ دیا۔

مریہ گاؤں آکر بے حد خوش تھی۔

اس نے اور بریرہ بچپن کا بہت سا خوب صورت وقت اسی گاؤں میں گزارا تھا صرف وہ گھر ہی نہیں اس گاؤں کے گلی کو چے بھی اس کے آشنا تھے۔ تبھی وہ یہاں آکر خاصی بھل گئی تھی۔

ضمیمہ کو واپس جانا تھا۔ اس کا ابھی نیا نیا بزنس شروع ہوا تھا۔ وہ اتنے دن وہاں گاؤں میں رک کر بے کار میں وقت برباد کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ تبھی سب کو اپنی مجبوری بتا کر اگلے روز شام سے پہلے شہر روانہ ہو گیا۔

عمر سے اس کی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

صبح ناشتے کے بعد، صمیمہ کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ ایک ضروری کام سے شہر نکل گیا تھا۔ جہاں سے اس کی واپسی صمیمہ حسن کی وہاں سے رخصتی کے بعد ہی ہوئی تھی۔

جس وقت وہ تھکا ہارا حویلی واپس لوٹا مریہ بے جی کے پاس بیٹھی ان سے اپنی اور صمیمہ کی باتیں شیئر کر رہی تھی۔ وہ دھپ سے اس کے برابر آکر بیٹھ گیا۔

”تمہیں سوائے اپنے شوہر کی بے جا تعریفیں کرنے کے دوسرا کام ہے کہ نہیں۔“

”تمہیں کیوں جیسی ہو رہی ہے۔“

”جیسی تو ہوگی جب اتنے قابل بندے کو چھوڑ کر تم کسی اور کی تعریف کرو گی۔“

”اف..... وہ کوئی اور میرا شوہر ہے اسنو پڑ۔“

”سو وہاٹ کوئی بھی ہو۔“

”بے جی آپ دیکھ رہی ہیں ناں اسے یہ بھی نہیں سدھرنے والا۔“

”بالکل، تعریف کے لیے شکریہ۔“ وہ مسکرایا اور ساتھ ہی ہاتھ بڑھا کر اس کے بال بھی بکھیر دیے۔

بے جی اسکی شرارت پر مسکراتے مسکراتے ایک دم سے افسردہ ہو گئیں۔

بیٹے کے دل کا حال ان سے پوشیدہ تو نہیں تھا۔ وہ گواہ تھیں ان لمحوں کی جن لمحوں میں وہ تڑپ تڑپ کر رویا تھا مریہ کی شادی کی خبر ملنے پر عجیب سودائیوں سا حال ہو گیا تھا اس کا پورے پندرہ دن بخار نہیں ٹوٹا تھا اس کا اور بے جی نے وہ سب راتیں اس کے سر ہانے بیٹھ کر کاٹی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ زندگی کی طرف لوٹا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو دنیا کے کام دھندوں میں مصروف کیا تھا۔

غم دل پر غم روزگار کو حاوی کر کے ہر پل کی اذیت سے چھٹکارا پایا تھا۔ کتنے دن ہوئے تھے بے جی نے اسے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

آج اس لمحے وہ مسکرایا تھا تو انہیں بے حد خوشی ہوئی تھی مگر اس خوشی کے ساتھ ہی اس کی اجڑی ہوئی زندگی کا سوچ کر وہ پھر سے افسردہ ہو گئیں۔

مریہ اب اسے کہہ رہی تھی۔

”حلیہ دیکھو اپنا کہیں سے بھی تعریف کے قابل نہیں لگ رہے ہو، یہ پسینے سے شرابور کپڑے یہ مٹی میں اٹے بال، لگتا ہے کسی سے لڑکر آرہے ہو۔“

”نہیں، تمہارے بعد لوگوں سے لڑنا چھوڑ دیا ہے میں نے، خیر تمہارے شوہر نظر نہیں آرہے۔ ابھی تک سو رہے ہیں کیا؟“

”جی نہیں، وہ شہر واپس چلے گئے ہیں۔“

”وہاٹ، مجھ سے ملے بغیر ہی واپس چلے گئے۔“

”ہوں، مجبوری تھی۔“

”چھوڑو یار، ایک دم بورا اور کھڑوس شوہر ہے تمہارا، ابھی کل آیا اور آج واپس بھی چلا گیا۔“

”عمر.....“ وہ زور سے چلائی۔

عمر نے ہنستے ہوئے فوراً کان پکڑ لیے۔

”سوری بابا یونہی تنگ کر رہا تھا ویسے صمیمہ حسن صاحب سے نہ ملنے کا افسوس رہے گا۔“

”زیادہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں وہ شادی سے ایک دن پہلے آجائیں گے۔“

”چلو پھر ٹھیک ہے تم کھانا نکالو میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ ابھی تھی عمر ایک نظر بے جی کے افسردہ چہرے پر ڈالتا فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔



چاندنی رات تھی۔

عمر چھت کی منڈیر پر بیٹھا تھا جبکہ مریہ چھت کے وسط میں دھری چار پائی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ نیچے گلی میں کٹڑ پر ایک چھوٹا سا پیلا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں دو گھر چھوڑ کر تیسرے گھر کے باہر لگے سندر کے قریب عمر کا وہ پالتو کتا بیٹھا تھا جو ہمہ وقت عمر کے ساتھ ہی رہتا تھا خواہ وہ کہیں بھی جاتا۔ مریہ کو اس کتنے سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ ضرورتاً بھی اس کے قریب جانے سے پرہیز کرتی تھی اور عمر کی نگاہیں اس وقت اسی کتے پر تھیں جب مریہ نے پوچھا۔

”شادو کا کیا بنا عمر، میں تو سمجھی تھی اب تک تم نے اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیا ہوگا۔“

”کیوں، اتنا نا در خیال کیوں آیا تمہارے دماغ میں۔“

”ویسے ہی اتنا پیار جو کرتی ہے وہ تم سے۔“

”کرتی رہے میں جو تے کی نوک پر نہیں رکھتا اسے۔“

”مگر کیوں.....؟“

”تمہارے کیوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔“

”مگر وہ تمہاری بچپن کی منگ ہے عمر، جان سے بڑھ کر پیار کرتی ہے تم سے، پھر تمہارے لیے بچپن میں کتنی بار گھر والوں سے مار کھائی اس نے اور پتا ہے گاؤں کی ساری لڑکیاں تمہارا نام لے کر خوب بے وقوف بناتی رہی ہیں اسے کبھی کوئی گڑمگوار ہی ہے تو کبھی کوئی مکھن..... اوہ گاڈ..... تمہیں پتا ہے ایک بار اس نے مجھ سے کتنا جھگڑا کیا صرف اس جرم کی پاداش میں کہ تم میں انو الو تو نہیں بڑی مشکل سے اسے یہ یقین دلا پائی تھی

کہ تم صرف میرے دوست ہو بس۔“

”شکر ہے تم نے بھائی نہیں کہہ دیا۔“ وہ تنک کر بولا تھا مریرہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”بھائی کہہ دیتی تب بھی کوئی حرج نہیں تھا مگر میں نے دوست ہی کہا تھا۔“

”چلو جو بھی کہا تھا میں اس چڑیل کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”مگر کیوں، تمہیں آخر اس سے اتنی چڑکیوں ہے۔“

”بس ویسے ہی مجھے اس کی عادتیں پسند نہیں۔“

”تو وہ عادتیں بدل لے گی تم ایک بار پیار سے کہہ کر تو دیکھو۔“

”پلیز اسٹاپ اٹ مریرہ تم آخر کیوں اتنی حمایت کر رہی ہو اس کی۔“ وہ چڑا۔

مریرہ چار پانی سے اٹھ کر قریب چلی آئی۔

”میں تمہارا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں عمر۔“

”دل تو بسا ہوا دیکھ نہیں پائیں اب گھر بسانے سے کیا حاصل۔“ وہ صرف سوچ پایا تھا کہہ نہیں پایا۔

مریرہ بھی چھت کی منڈیر پر آ بیٹھی۔

”تمہیں وہ تندہ روالی اماں یاد ہیں عمر، جو ہمارے لیے روزانہ اپنے بوسیدہ دوپٹے کے پلوں میں چنے

چھپا کر رکھتی تھیں۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“

”اور وہ کبڑا بابا یاد ہے جس کے بیٹوں نے اس کی بیماری میں اسے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ پورے

گاؤں کی گلیوں میں روتا پھرتا تھا۔“

”ہوں۔۔۔۔۔ سب سے یاد ہے۔“

”وہ صبح بھی یاد ہے جب ہمارا بھگڑا ہوا تھا اور میں نے تمہارے بازو پر زور سے کاٹا تھا جس کی سزا

کے طور پر تم نے مجھے پرانی حویلی کے بوسیدہ کمرے میں پورے دن کے لیے بند کر دیا تھا۔ پھر جب شام کو تم

وہاں آئے تو میں بے ہوش پڑی تھی تب کیسے جتن کیے تھے تم نے مجھے ہوش میں لانے کے لیے اور جب مجھے

ہوش آیا تو کیسے ہاتھ جوڑ کر منتیں کر رہے تھے کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں مائی گاڈ کتنے خوب صورت دن تھے ناں

وہ۔“ چھت کی منڈیر پر بیٹھی مریرہ ہنس رہی تھی۔

عمر کے لبوں پر ہلکی سی مسکان بکھر گئی۔

”میں کچھ بھی نہیں بھولا مریرہ۔۔۔۔۔ وہی لمحے تو میری زندگی تھے اور رہیں گے۔“

”آہم۔۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے تم اب مجھے مس کرتے ہو۔“

”ہوں۔۔۔۔۔“

”چلو دیر سے ہی صبح تمہیں قدر تو ہوئی میری۔“ اس کے دل کے حال سے بے نیاز وہ کہہ رہی تھی۔ عمر

خود پر ضبط کیے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”چلو رات بہت ہو گئی ہے نیچے چل کر سوتے ہیں اب۔“

”ارے ابھی تو صرف نو بجے ہیں۔“

”گاؤں میں نو بجے کا مطلب ہے آدھی رات چلو اٹھو شاہاش مجھے بہت نیند آرہی ہے۔“ اس کی

آنکھوں میں نیند کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں تھا۔

مریرہ بہت سی باتوں کی خواہش دل میں لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

عمر عباس کے لیے وہ رات پھر ایک بہت بڑی آزمائش ثابت ہوئی تھی۔



صبح سے برستی موسلا دھار بارش تھم چکی تھی۔

سدیر گھر پر نہیں تھا اور عائکہ نے میٹھے پکڑے بنا لیے۔

باہر لان میں موسم بہت اچھا لگ رہا تھا وہ کرنل صاحب کو کمرے سے اٹھا کر وہیں لے آئی تھی۔

”دیکھیے کتنا پیارا موسم ہو رہا ہے یہ ٹھنڈی ٹھنڈی بھیگی ہوئیں، یہ بادل، یہ نکھرے نکھرے پھول

پودے، اگر سچ کہوں تو دنیا میں اس سے بڑھ کر حسین کچھ بھی نہیں۔“ وہ فطرت سے پیار کرنے والی لڑکی کی تھی۔

کرنل صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”صحیح کہا تم نے، قدرتی چیزوں کے حسن سے بڑھ کر اس کائنات میں اور کچھ بھی نہیں تمہاری طرح

مریرہ کو بھی قدرت کی خوب صورتی سے بہت عشق تھا وہ بھی جان دیتی تھی۔ ان بادلوں۔۔۔۔۔ بارشوں۔۔۔۔۔ بھیکے بھیکے

ہیڑ پودوں۔۔۔۔۔ اڑتے پرندوں اور سبک روی سے چلتی سرد ہواؤں۔۔۔۔۔ سردیوں کی ٹھٹھرتی شاموں اور کہر میں لپٹی

صبحوں پر۔“

”اتنے سال گزر گئے بابا آپ نے انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟“ پہلے بھی کئی بار کا کیا ہوا

سوال اس نے پھر دہرایا۔ کرنل صاحب کی آنکھوں میں یاسیت بکھر گئی۔

”ڈھونڈا انہیں جاتا ہے عائکہ جو کھو جائیں جو خود اپنی مرضی سے چھوڑ کر چلے جائیں انہیں کوئی کیسے

ڈھونڈ سکتا ہے۔“

”مگر انہوں نے ایسا کیوں کیا بابا، صمد انکل اور ان کی لڑائی میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں تھا پھر آپ

کو چھوڑ کر کیوں گئیں وہ۔“ عائکہ کے سوال میں الجھن تھی اور کرنل صاحب نے نظریں پھیر لیں۔

وہ اس سوال سے ہمیشہ نظریں چراتے تھے مگر اس وقت جانے کس موڑ میں تھے جو چپ نہ رہ سکے۔

”اسے لگتا تھا شاید میں اس کے فیصلے میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا اسی لیے صمد کے ساتھ ساتھ اس

گھر سے بھی اس نے اپنا تعلق توڑ لیا۔“

”مگر اتنے سال ہو گئے بابا انہیں پلٹ کر خبر تو لینی چاہیے تھی آپ کی۔“

”ضروری نہیں سمجھا اس نے۔“

”مگر کیوں، آپ نے انہیں ماں باپ بن کر پالا تھا ان کی ہر ضرورت اور خواہش پوری کی تھی پھر وہ

آپ کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتی ہیں۔“ اس بار اس بار عائکہ کے سوال میں صرف الجھن ہی نہیں غصہ بھی تھا۔

کرنل صاحب کے اندر جیسے گہری چپ بکھر گئی۔

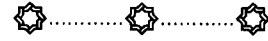
”سدید ابھی تک گھر نہیں آیا اس کا پتا کرو کہیں خراب موسم کی وجہ سے کسی مشکل میں ہی نہ پھنس گیا ہو۔“ عائلہ جانتی تھی کہ جلد یا بدیر وہ اس ٹاپک پر بات بدل دیں گے اور یہی ہوا انہوں نے بات بدل دی تھی اور تبھی وہ یاسیت سے بولی تھی۔

”میں نے اسے کال کی تھی مگر اس کا نمبر مسلسل بندل رہا ہے۔“

”اللہ خیر کرے پتا نہیں کب عقل آئے گی اس لڑکے کو بہت بے پردا ہو گیا ہے۔“ پکڑوں کی پلیٹ جوں کی توں چھوڑ کر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئے۔

عائلہ جانتی تھی وہ ڈسٹرب ہوں گے اور وہ ڈسٹرب ہو کر رہ گئے تھے تبھی اسے خود پر افسوس ہوا تھا۔ اس کے ہوش میں جب جب اس گھر میں مریرہ رحمان کا ذکر ہوا تھا وہاں کے درود یوار پر اداسیوں کی پریاں اتری تھیں۔

کرنل صاحب اور صمد حسن دونوں گھرانوں کی زندگیوں میں مریرہ رحمان نامی باب ایک ایسا باب تھا جو جب بھی کھلتا تھا تباہیاں اور بے چینیاں لاتا تھا اس رات اس گھر میں بھی یہی ہوا تھا اور رات تقریباً ساڑھے بارہ بجے کرنل صاحب کا بی بی شوٹ کر گیا تھا اور پھر صبح فجر کی اذان کے بعد ہی ان کی حالت قدرے بہتر ہو سکی تھی۔ سدید عشاء کے بعد گھر واپس آ گیا تھا۔ عائلہ نے وہ پوری رات سدید کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہاتے ہوئے گزاری تھی۔



سنو جاناں

ابھی پہلی محبت کے بہت سے قرض باقی ہیں

ابھی پہلی مسافت کی تھکن سے چور ہیں پاؤں

ابھی پہلی رفاقت کا ہراک گھاؤ سلامت ہے

ابھی مقتول خوابوں کو بھی دفنایا نہیں ہم نے

ابھی آنکھیں ہیں عدت میں

ابھی یہ دن سوگ کے دن ہیں

ابھی اس غم کی کیفیت سے باہر کس طرح آئیں؟

ابھی یہ زخم بھرنے دو

ابھی کچھ گزرنے دو

یہ غم کے نیلگوں دریا، اتر جائیں تو سوچیں گے

ابھی یہ زخم تازہ ہیں

یہ بھر جائیں تو سوچیں گے

دوبارہ کب اجڑنا ہے

شام ڈھل چکی تھی۔ صبح سے مسلسل ہوتی بارش میں بھیگتے پرندوں نے گھر واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا

مگر وہ وہیں لان میں بیٹھی رہی تھی۔

گزشتہ گزرے سالوں میں وجود ایسا سن ہوا تھا کہ جیسے ہر احساس ہی مٹ گیا تھا۔

درد کا احساس..... تنہائی کا احساس..... موسموں کے سرد یا گرم ہونے کا احساس..... پسندیدہ کھانوں کی لذت کا احساس..... کچھ بھی کھودینے کی تکلیف احساس..... بارش، پھول، پودوں کے حسن کا احساس..... کیا رہا تھا اس کے پاس؟ کچھ بھی تو نہیں.....

اب تو ہاتھوں کی لکیریں بھی مٹی جاتی ہیں

تجھ کو کھو کر تو میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں

”بیگم صاحبہ“ جانے کب تک وہ اپنے آپ میں کھوئی رہتی جب ملازمہ کی پکارنے سے حقیقت کی تلخ دنیا میں واپس گھسیٹ لیا۔ ”ہوں.....“

”عمر صاحب کا فون ہے کب سے آپ کے سیل نمبر پر کال کر رہے ہیں مگر آپ نے جواب نہیں دیا تو اب ادھر لینڈ لائن پر کال آئی ہے ان کی آپ کو بلارہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ، میں آتی ہوں۔“ ملازمہ کی اطلاع پر گہری سردا ہ بھر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ لاؤنج میں فون کی سائیڈ پر دھرے ریسیور کو سرد برقی انگلیوں سے تھامتے ہی اس نے سلامتی بھیجی تھی۔

عمر نے ساعتوں میں اس کی آواز اترتے ہی سکون کی سانس لی۔

”ولیم السلام میں نے سوچا تھا شاید جب تمہاری بیٹی بڑی ہو جائے گی تو تم گدھے گھوڑے بچ کر سونے والا مشغلہ ترک کر دو گی مگر میں نہیں جانتا تھا کہ تم اپنے نام کی ایک ہی چیز ہو اب کہنے کو تو تمہارے نام کا مطلب نازک اندام لڑکی ہے مگر حقیقت میں ایسا ہے نہیں۔“

”اچھا..... بہت شکریہ اتنی قیمتی معلومات فراہم کرنے کا۔“ اپنے اندر کی اداسی چھپا کر وہ بھی پرانے انداز میں واپس لوٹی آئی تو عمر مسکرا دیا۔

”میں نے صبح فون کیا تھا ملازمہ بتا رہی تھی تمہارے سامنے کا ایک دانت گر گیا ہے۔ یقین مانو مریرہ مجھے بہت افسوس ہوا مانا کہ اب لاٹھی کے سہارے چلنے والی عمر آگئی مگر سامنے والا دانت ٹوٹ کر گرنا..... چیچ..... چیچ..... کتنی عجیب لگو گی ناں تم سب مذاق بنائیں گے۔“ وہ تنک کر رہا تھا۔

مریرہ چند لمحوں کے لیے اپنا دکھ بھول گئی۔

”تمہیں میری فکر میں اتنا گھلنے کی ضرورت نہیں ہے یونہی خواخواہ چار پانچ کلو وزن کم ہو جائے گا۔“

الحمد للہ

”اوہو..... ابھی بھی اتنے خطرناک عزائم ہیں تمہارے۔“

”جی ہاں بالکل۔“

بھی پانا نہیں جاسکتا تھا۔



درمکنون اس رات لیٹ گھر واپس آئی تھی..... مریرہ بیگم نے ہلکے ہلکے بخار کے باوجود اسکے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا تھا اور اب آتش دان دہکا رہی تھیں۔

وہ فریش ہونے کے بعد وہیں چلی آئی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام آج اتنی دیر کر دی۔“

”سوری ممّا، اصل میں پارٹی خاصی لیٹ شروع ہوئی تھی وقار صاحب کا شوگر ڈاؤن ہو گیا تھا، مجھے اچھا نہیں لگا انہیں اس حال میں چھوڑ کر واپس آنے کا۔“

”پھر تو صیام بھی بہت لیٹ ہو گیا ہوگا؟“

”ظاہری سی بات ہے اس نے مجھے گھر ڈراپ کر کے ہی جانا تھا۔“

”مگر اس کا گاؤں بہت دور ہے پھر راستہ بھی اتنا دشوار گزار ہے تمہیں اس خیال کرنا چاہیے دری، وہ اپنے گھر کا واحد کفیل ہے۔“

”سوہاٹ ممالازم ہے تو کام تو کرنا پڑے گا اب میں صرف اس کی شکل و صورت و وجاہت پر پیسے تو نہیں دیتی اسے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے بیٹا۔“ اب وہ اسے کیسے بتاتیں کہ صیام میں انہیں اپنا زوا یا نظر آتا ہے۔

درمکنون اب کافی بنا رہی تھی۔

”میں سمجھتی ہوں اور اس کا کافی احساس بھی کرتی ہوں آپ پلیز پریشان نہ ہوں وہ چلا جائے گا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو، پراجیکٹ کیسا رہا؟“

”اے ون بھلا آپ کی بیٹی نے آج تک کبھی شکست کا سامنا کیا ہے جو آج کرتی۔“ درمکنون کے لہجے میں گھمنڈ تھا اور مریرہ کا دل یہ گھمنڈ دیکھ کر کانپ کر رہ گیا۔

”ایسا نہیں کہتے بیٹے ہمیشہ جیتنے والوں کو جب وقت اپنی لپیٹ میں لیتا ہے تو خاک چٹا کر رکھ دیتا ہے ایسے منہ کے بل گراتا ہے کہ دوبارہ اٹھ کر اپنے پاؤں پر چلنے کی سکت بھی نہیں رہتی۔“

”آپ مجھے ڈرا ہی ہیں ممّا۔“

”نہیں مطلع کر رہی ہوں مٹی سے بنے انسان کی پیشانی پر عاجزی کا جھومر ہی سباز ہے تو اچھا ہے۔“

”اوکے..... اب فنانٹ کھانا لگوائیں میں نے وہاں کچھ بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔“

”میں جانتی تھی اسی لیے میں نے تمہارے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کھانا پکایا ہے۔“

”واؤ اسی لیے تو کہتی ہوں ممّا بہت گریٹ ہیں۔“ وہ خوش ہوئی تھی۔

مریرہ کے لبوں پر اداسی سی مسکراہٹ بکھر کر رہ گئی۔ وہ کھانا کھا رہی تھی جب مریرہ نے اسے بتایا۔

”اللہ معاف کرے پتا نہیں تمہارا نام مریرہ کس نے رکھ دیا تھا میرے حساب سے تو تمہارا نام جھانسی کی رانی ہونا چاہیے تھا۔“

”چلو، یہ نام تمہاری بیٹی کا رکھ دیں گے ساٹھ سے اوپر کے ہو رہے ہو ابھی بھی وقت ہے شادی کر لو نہیں تو کسی نے لاٹھی بھی نہیں پکڑانی ہاتھ میں۔“

”خیر ہے، دیکھا جائے گا، تمہارے نیک مشورے کا شکریہ دیے میں نے تمہیں بہت مزے کی اطلاع دینے کے لیے فون کیا تھا۔“

”کیسی اطلاع۔“

”تمہارے بیٹے کو دیکھا تھا میں نے، یہاں لندن میں یقین مانو مریرہ! ایک لمحے کے لیے تو میں بالکل حیران رہ گیا۔ اتنے نین نقش چرائے ہیں تمہارے بیٹے نے تمہارے کہ ایک لمحے کے لیے تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بہر حال بہت خوب صورت اور ذہین بیٹا ہے تمہارا بالکل اپنی ماں کی طرح۔“

”شکریہ پراکتفا کیا۔“

”دری کیسی ہے۔“ عمر جانتا تھا وہ اداس ہوگئی ہوگی تبھی فوراً سے پیشتر اس نے بات بدل دی اور مریرہ سے نے آنکھیں صاف کیں۔

”ٹھیک ہے اسی کی ضد پر پاکستان آئی ہوں اس بار۔“

”ہوں ظاہر ہے تم دوئی کو کیسے چھوڑ سکتی ہو، آخر گھر میں چھپے خزانوں کی حفاظت بھی تو کرنی پڑتی ہے ناں؟“

اس نے کہا اور مریرہ اس کی توقع کے عین مطابق کھل کر ہنس پڑی تھی۔

”شکریہ کچھ پھول تو جھڑے تمہاری ہنسی سے اب رکھتا ہوں بہت بل بن گیا ہے لگتا ہے اگلے پورے مہینے صرف بریڈ اینڈ جیم پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔ دری آئے تو میرا پیار دینا اسے۔“

”ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ لائن کٹ گئی تھی۔

وہ شکستہ سی قریبی صوفے پر ڈھلے گئی۔

کیا سوچتا ہوگا اس کا بیٹا اسکے بارے میں کہ وہ کیسی سنگ دل ماں تھی جس نے صرف اپنی ضد، اپنے غصے اپنے انتقام میں اسے خود سے الگ کر کے پھینک دیا..... مائیں تو موسموں کے سرد گرم سے محفوظ رکھتی ہیں۔ معمولی سی معمولی چوٹ اور دکھوں پر اپنے آنچل میں چھپا کر سینے سے لگا کر اپنے بچوں کی ڈھارس بندھاتی ہیں۔ مگر وہ رویا ہوگا تو اس نے کسی کے آنچل میں پناہ ڈھونڈی ہوگی..... کس سے اپنے سارے دکھ اور جذبات شیر کیے ہوں گے..... کس کے سینے سے لگ کر تنہائی کی راتوں میں بلک بلک کر رویا ہوگا۔ صمد صاحب نے کیا بتایا ہوگا اسے کہ اس کی ماں کہاں ہے..... کیسے بتایا ہوگا کیوں وہ دونوں زندگی کی ڈگر پر ایک ساتھ نہیں چل سکے۔

وہ کیسی آندھیاں تھیں جو اپنے ساتھ ان کا گھر وندہ بھی بہا کر لے گئی تھیں۔ وہ کیا حالات تھے جنہوں نے ان دو پیار کرنے والے دلوں کے درمیان صدیوں کی دیوار حائل کر دی تھی..... ایسی دیوار جسے چاہتے ہوئے

”آج مسز ہمدانی کا فون آیا تھا ان کے میاں تمہاری ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر ہیں اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ تم ان کی فیملی کا حصہ بن جاؤ میرا مطلب ہے وہ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا ہاتھ مانگنا چاہتے ہیں۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”میں کیا کہہ سکتی تھی تم سے بات اور تمہاری رضا لیے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی میں۔“

”نہیں ماما، میری رضا لیے بغیر اور مجھ سے بات کیے بغیر آپ فوراً سے پیشتر کسی بھی ایسے پروپوزل کے لیے انکار کر سکتی ہیں۔“

”مگر کیوں، آخر ایسا کب تک چلتا رہے گا۔“

”جب تک مجھے کسی سے محبت نہیں ہو جاتی تب تک۔“

”فضول باتیں مت کرو دردی، آج کل کے دور میں اچھے لڑکوں اور رشتوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔“

”بالکل سچ کہا آپ نے ماما مگر زندگی صرف ایک بار ملتی ہے میں اسے کسی ایڈ ونچر یا تجربے کی نذر نہیں

کر سکتی بہتر ہے آپ اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں..... پلیز۔“

”میں تمہاری ماں ہوں دردی، تمہاری فکر کرنا فرض ہے مجھ پر۔“

”جانتی ہوں مگر آپ صرف میری ماں نہیں ہیں بلکہ میری ہمد، میری ہماز اور میری بہت اچھی دوست بھی اور پلیز ماما اگر اب آپ نے اس موضوع کو یہیں ختم نہ کیا تو میں ابھی اسی وقت کھانا چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔“

”ماں کو دھمکی دے رہی ہو۔“

”آف کورس۔“

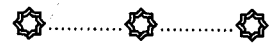
”بہت بدتمیز ہو گئی ہو تم دردی بتا رہی ہوں میں تمہیں۔“

”اس عزت افزائی اور تعریف کے لیے شکریہ عزیز از جان ماما۔“ مزے سے کھانا کھاتے ہوئے اس

نے مریرہ کو منہ پڑایا اور جواب میں مریرہ نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔

درمکون جانتی تھی کہ یہ خفگی بہت زیادہ دیر تک برقرار رہنے والی نہیں، تبھی بے نیاز بنی کھانے سے

انصاف کرتی رہی۔



بارش ٹوٹ کر برسی تھی۔

عائلہ آفس سے نکلی تو تھکن سے برا حال تھا۔

زاویار دو تین دن سے آفس نہیں آ رہا تھا مگر اس کے باوجود اس پر کام کا بہت پریش تھا۔ وہ چاہتی تو

جاب چھوڑ کر آرام سے گھر بیٹھ سکتی تھی مگر صمد صاحب کی محبت اور مان کی وجہ سے وہ چاہتے ہوئے بھی ایسا نہیں

کر سکتی تھی۔ آفس سے گھر پہنچتے عصر سے اوپر کا ٹائم ہو گیا تھا۔ وہ ابھی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی کہ اس نے کرنل

صاحب کو سدید سے کہتے ہوئے سنا۔

”میری شروع سے خواہش تھی کہ تم آئی ایس آئی جوائن کرو اس وطن کے ذرے ذرے سے اپنی محبت کا حق ادا کرو، بہت زخم ہیں اس دھرتی کے سینے پر، شروع سے اب تک لہورس رہا ہے اس کے ایک ایک عضو سے تمہیں اس لہو کا قرض چکانا ہے اپنا فرض ادا کرنا ہے دیکھو کوشش کرنا کبھی کسی بھی مرحلے پر تمہارے قدم کہیں ڈگمگانہ جائیں۔“

”ایسا نہیں ہوگا بابا آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے میں ہر مشکل برداشت کر سکتا ہو ویسے بھی میں خود جنون اور شوق کے اس رستے کا راہی ہوں آپ بس عائکہ سے فی الحال اس بات کا ذکر مت کیجیے گا۔“

”ٹھیک ہے نہیں کروں گا کیا تم نے شادی کے موضوع پر اس سے بات کی۔“

”نہیں بابا پتا نہیں کیوں میں جب بھی اس سے اس موضوع پر کوئی بات کرنا چاہتا ہوں ہمت جواب دے جاتی ہے یہ سوچ کر ہی کچھ ہونے لگتا ہے کہیں وہ کسی اور میں انٹر سٹنڈ ہو۔“

”ہوں..... جب میں نے تمہاری آنکھوں میں اس کے لیے محبت دیکھی تھی تو میں بھی الجھ کر رہ گیا

تھا۔“ صمد اور مریرہ کی کہانی ابھی پرانی نہیں ہوئی ہے میرے لیے، میں ڈرتا تھا کہیں پھر سے کچھ غلط نہ ہو جائے

مگر پھر جب تمہارے جذبات کی سچائی دیکھی تو عائکہ کے لیے تم سے بہتر کوئی لڑکا نہیں مل سکتا مجھے۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا بابا پتا نہیں وہ اب تک آئی کیوں نہیں، موسم کے تیور بھی ٹھیک نہیں دیکھ

رہے۔“ وہ اس کے لیے فکر مند تھا اور عائکہ نے اسی پل قدم آگے بڑھا دیے۔

”السلام علیکم۔“ سدید چونکا اور پھر عائکہ پر نظر پڑتے ہی مسکرا دیا۔

”وعلیکم السلام، شیطان کو یاد کرو تو وہ حاضر ہو جاتا ہے یہ پریاں کب سے یاد کرتے ہی حاضر ہونے

تلیں؟“ بس دل کو دل سے راہ ہونی چاہیے سب کچھ ہو جاتا ہے۔“

”ہوں یہ تو ہے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گھر آیا اور نہ تمہیں آفس سے پک کر لیتا۔“

”مہربانی کچھ کھانے کو ملے گا کہ نہیں؟“ وہ کرنل صاحب کے پہلو میں آ بیٹھی تھی سدید مسکرا دیا۔

”جب تک یہاں ہوں تب تک تو مل جائے گا جب چلا گیا تو پھر کوئی گارنٹی نہیں۔“

”تم کہیں نہیں جاؤ گے آئی سمجھ۔“

”او کے چلو فریش ہو جاؤ آج باہر سے بریانی لایا ہوں مل کر کھاتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ خلاف توقع وہ فوراً ہی اٹھی۔

”اسی روز شام کے بعد جب کرنل صاحب اپنے کسی دوست کے ساتھ لان میں محفل جمائے بیٹھے

تھے وہ سدید کے کمرے میں چلی آئی جو کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نجانے کس کام میں مصروف تھا۔

”سدید۔“

”ہوں۔“ وہ پلٹا تو عائکہ بیڈ کے کنارے پرک گئی۔

”تمہیں پتا ہے آئی ایس آئی جوائن کرنے کا مطلب کیا ہے؟“

”ہوں آئی ایس آئی کا مطلب ہے اس وطن سے اس وطن کے ایک ایک ذرے سے اپنی جی لگن اور

دلی محبت کا صحیح اظہار، بنا اپنی جان اور عیش و آرام کی پروا کیے اپنے وطن کے لوگوں کی بقا کوئی میڈل، کوئی صلہ

کوئی واہ طلب کیے بغیر اس مٹی کے لیے اپنا وجود مٹی کر دینا۔“

”مگر میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی، کبھی نہیں۔“

”کیوں کیا بات تم محبت وطن نہیں ہو؟“

”ہوں، مگر میں تمہیں کسی خطرے کا شکار ہوتے نہیں دیکھ سکتی سدید۔“

پلگی ہو تم عالمہ خطروں سے کھیلنا تو ہم وطن کے رکھوالوں کا سب سے پسندیدہ مشغلہ ہے وہ خون ہی کیا

جو حق میں نہ ہے۔“

مگر تم ہی کیوں اور لوگ بھی تو ہیں وہ کیوں نہیں؟“

اس راہ میں جلتے والے پروانوں کی کمی نہیں ہے عالمہ، اپنے حصے کا دیا ہر انسان کو خود ہی جلانا پڑتا ہے

بس تم دعا کرو۔ اسے کہیں، کچھ بھی غلط نہ ہو، کچھ بھی ایسا کہ جب روز محشر میں اللہ رب العزت کے سامنے پیش

ہوں تو میرا سر خوف اور ندامت سے جھکا ہوا ہو، میں اپنا فرض پوری ایمان داری سے نبھانا چاہتا ہوں برف پوش

پہاڑوں سے عشق کے بعد اب زندگی کی مشکلات کے ساتھ کھیلنا چاہتا ہوں دیکھو کیا بنتا ہے؟“

”سدید پلیر چاہے کچھ بھی ہو جائے میں کبھی تمہیں اپنی جان یوں مشکلات میں ڈالنے کی اجازت

نہیں دوں گی۔“

”نہیں عالمہ میں نے زندگی میں اس منصب تک پہنچنے کے لیے بہت محنت کی ہے بہت دعائیں مانگی

ہیں بہت خواب دیکھتے ہیں اور اب جوان خوابوں کی تعبیر پانے کا وقت آیا ہے تو تم مجھے پیچھے دھکیلنا چاہتی ہو پلیر

اب ظلم مت کرو میرے ساتھ۔“

”مگر.....“

”کچھ اگر مگر نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو، سب ٹھیک ہوگا۔“

”گویا تم نے ٹھان لی ہے کہ تم میری بات نہیں مانو گے۔“

”او پلگی تمہاری بات نہ مان کر کدھر جانا ہے میں نے، ابھی تو صرف کوشش کر رہا ہوں کامیاب نہیں

ہوا ہوں تم نے ایویں شور ڈالنا شروع کر دیا ہے خیر چھوڑو یہ بتاؤ کافی بناؤں تمہارے لیے۔“

”نہیں، آفس میں پی لی تھی۔ البتہ تمہیں بنادیتی ہوں۔“ کہتے ہی وہ اٹھ کر چکن میں چلی آئی تھی۔

”ہوں..... دوبارہ اس کھڑوس زاویا حسن نے پریشان تو نہیں کیا تمہیں؟“

”نہیں میں اب انکل کی ہدایت کے بعد ذرا کم ہی منہ لگاتی ہوں اسے۔“

”گڈ، بہتر ہے تم اس کا سامنا ہی نہ کرو کوئی تم پر گرم نگاہ ڈالے میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔“

”جانتی ہوں اسی لیے وہ جب بھی آؤٹ آف کنٹرول ہوتا ہے میں اسے اس کی اوقات یاد دلا کر رکھ

دیتی ہوں۔“

”ویری گڈ، مجھے تم سے یہی امید تھی۔“ وہ مسکرایا تو عالمہ بھی مسکرا دی کافی بن گئی تو اس نے کپ سدید

کو تھما دیا۔

”چلو باہر لان میں چلتے ہیں سنا ہے آج بہت سرد ہوا چل رہی ہے۔“

”جی ہاں بالکل صحیح سنا ہے آپ نے ابھی آفس سے آتے ہوئے میری قلفی جتے جتے رہ گئی تھی۔“

”ادہ یا تھوڑی دیر اور باہر نہیں رہ سکتی تھیں تم ذرا میں بھی تو دیکھتا کہ تم قلفی بنی کیسی لگتی ہو؟“

”کل رک جاؤں گی پھر دیکھ لینا۔“ سدید کی شرارت پر دائیں ہاتھ سے اس کے بال بکھیرتے ہوئے

وہ کچن سے نکل آ گئی۔ کرنل صاحب اپنے دوست کے ساتھ ہی گھر سے باہر نکل گئے تھے اور وہ دونوں سرد موسم

کی پروا کیے بغیر باہر لان میں آ بیٹھے۔

”ایک بات پوچھوں سدید سچ بتاؤ گے۔“

”ہوں پوچھو؟“ کافی کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے خلاف توقع اسے فوری اجازت دی،

تبھی اس نے پوچھا۔

”تمہیں اب اپنی ممدیا نہیں آتیں۔“ سدید کو امید نہیں تھی کہ وہ اس سے یہ سوال کرے گی تبھی مسکرا

کر مالتے ہوئے بولا۔

”نہیں..... کیونکہ تم جیسی بلا کے سامنے ہوتے ہوئے کسی اور کو یاد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”سدید پلیر میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا تو سدید نے ساری کافی ایک

ہی میں اندر اتار لی۔

”تم کیوں میرے زخم ادھیڑنا چاہتی ہو عالمہ؟“

”زخم نہیں ادھیڑ رہی میں ان چنگاریوں سے کھیلنا چاہتی ہوں جو تم نے اپنے سینے میں، ہنسی مذاق کی

راکھ تلے دبا رکھی ہیں سدید۔“

”مگر کیوں؟“

”بس دل چاہ رہا ہے۔“

”کبھی کبھی تم بہت پریشان کرتی ہو عالمہ، جانتی بھی ہو کہ یہ دبی ہوئی چنگاریاں ہوا کی زد میں آئیں تو

میں ساری رات سو نہیں پاؤں گا۔“

”ہوں، جانتی ہوں مگر مجھے تم سے تمہارے گزرے کل کی کہانی سن کر بہت اچھا لگتا ہے ان فیکٹ

مجھے تم سے محبت کا احساس بھی اسی وقت ہوا تھا جب پہلی بار میں نے تمہیں گراؤنڈ میں زمین پر اکیلے بیٹھے روتے

ہوئے دیکھا تھا۔“

”تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں مجھ پر ترس آیا تھا؟“

”نہیں، میں کہنا چاہتی ہوں کہ اس روز میں نے جانا تھا تم کتنے بہادر انسان ہو اندر ڈھیر دوس کرب

چھپائے اوپر سے مطمئن اور خوش رہتے ہو، بالکل سمندر کی طرح۔“ پہلی بار وہ اس کی تعریف کر رہی تھی مگر سدید

خاموش تھا۔ ”کیا اتنے سالوں میں کبھی تمہارا اپنی ممد سے سامنا نہیں ہوا؟“

”ہوا تھا مجھے وہ پچھلی بار عید پر مارکیٹ میں نظر آئی تھیں۔“

”واؤ..... پھر۔“

”وہ پھر کیا، میں دامن بچا کر نکل گیا۔“

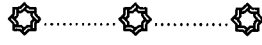
رحلت کے ساتھ ہی میری دنیا برباد ہو گئی تھی۔“ وہ اب بکھر رہا تھا اور عالمہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
کتنے رخنے، کتنی ٹوٹ پھوٹ اور پڑاؤ تھے اس شخص کے اندر..... وہ ابھی شاید کچھ اور بھی شیر کرتا مگر
اس وقت اچانک ہی پھر سے شروع ہونے والی بارش نے اسے درد کی دنیا سے نکال کر پھر سے حقیقت حال میں
لاکھڑا کیا تھا۔

”اودہ نو، یار میں نے اتنی کپڑے تبدیل کیے تھے۔“ وہ فوراً کھڑا ہوا اور عالمہ ہنس دی۔

”اچھا ہوا مجھے تمہارا یہ سوٹ بالکل پسند نہیں۔“

جانتا ہوں ہو بھی کیسے سکتا ہے آخر میری پیاری معصوم سی محبوبہ کا گفٹ جو ہے۔“

’بس، بس بڑی آئی معصوم بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں میں اسے جتنی وہ معصوم ہے۔“ سدید کی
کسی اور کے لیے تعریف نے عالمہ کا خون جلایا اور وہ مسکرا کر اس کی ناک دبا تا جلدی سے اندر کی طرف بڑھ
گیا۔



طویل تر ہے سفر تمہیں کیا؟

میں جی رہا ہوں مگر تمہیں کیا؟

مگر تمہیں کیا کہ تم تو کب سے

میرے ارادے گنوا چکے ہو

جلا کے سارے حروف اپنے میری دعائیں بجھا چکے ہو

میں رات اوڑھوں کہ صبح پہنوں تم اپنی رسیں اٹھا چکے ہو

سنا ہے سب کچھ بھلا چکے ہو

تو اب اس دل پر بھی جبر کیسا؟

یہ دل تو حد سے گزر چکا ہے

خزاں کا موسم ٹھہر چکا ہے

ٹھہر چکا ہے مگر تمہیں کیا

کہ ان خزاں میں، میں جس طرح کے بھی خواب دیکھوں

جس طرح کے بھی خواب دیکھوں، مگر تمہیں کیا؟

رات آدمی سے زیادہ ڈھل چکی تھی اور اوپر آسمان پر ڈھیروں ستاروں کی جھرمٹ میں جگمگاتا چاند،
بادلوں کو شکست دیتا اپنی فتح کا جشن منا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

کروٹ کروٹ بدلتے ہوئے وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے چاند کی بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی دیکھ رہا
تھا۔

کبھی بادلوں کا کوئی ٹکڑا چاند اور ستاروں کی تابناکی کو چھپا لیتا تو کبھی چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل کر
یوں مسکراتا دکھائی دیتا جیسے بادلوں کو پچھاڑنے پر خوش ہو رہا ہو۔

”مگر کیوں، تمہیں ان کا حال احوال تو پوچھنا چاہیے تھا۔“

”کیوں پوچھتا میں ان کا حال احوال، کیا انہوں نے کبھی میرا حال جاننے کی کوشش کی؟ میرے
بارے میں سوچا، میری فکر کی، میرا خیال کیا، نہیں..... انہوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی میرے بارے میں
سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی حالانکہ میں ان کے جگر کا ٹکڑا تھا وہ پہلا بیٹا جسے پورے نو ماہ انہوں نے اپنے وجود
کے اندر رکھا مگر پھر بھی وہ مجھے دنیا کی ٹھوکروں میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلی گئیں کیا وہ نہیں جانتی تھیں کہ دنیا
میں ماں سے بڑھ کر کسی بھی انسان کا کوئی اپنا نہیں ہوتا۔“ اس کے سینے میں دبی چنگاریوں کو ہوا لگ چکی تھی۔
عالمہ نے آہستہ سے اپنا سر دہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ پر رکھا۔

”میرے لیے وہ رات بہت کٹھن تھی جب میرے پاپا کا روڈ ایکسڈنٹ ہوا حالانکہ اس وقت
میں صرف پانچ سال کا تھا میری سوچ اور دنیا بہت محدود تھی مگر پھر بھی میں چپ نہیں ہو رہا تھا صرف اس لیے کہ
پاپا انھ کر میرے ساتھ کھیل کیوں نہیں رہے تھے، وہ تو میری کوئی فرمائش نہیں ٹالتے تھے انہوں نے کبھی میری
آنکھ میں آنسو آنے نہیں دیتے تھے بہت ضروری مینگ میں ہوتے تب بھی میری صرف ایک کال پر گھر بھاگے
آتے..... اور اس وقت..... اس وقت میں انہیں پکار رہا تھا مگر وہ میری پکار نہیں سن رہے تھے دادی، پچھو
مماسب مجھے اپنے اپنے سینے میں بھیج کر رو رہے تھے اور مجھے ان کے یوں رونے سے اور بھی رونا آ رہا تھا۔ نہ
صرف رونا آ رہا تھا بلکہ غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ سب ہمارے گھر آ کر شور کیوں ڈال رہے ہیں۔ مگر پھر بھی اس
رات میں سو گیا تھا ماما کی نرم گرم آغوش نے کب میرے حواس چھینے، پتا ہی نہیں چلا اگلے تین روز کے بعد جب
نانا ابو نے دادی ماں سے یہ کہا کہ وہ اب اپنی بیٹی کو اپنے ساتھ لے جا کر رہیں گے دادی چاہیں تو مجھے یعنی اپنے
اکھوتے بیٹے کی نشانی کو اپنے پاس رکھ سکتی ہیں اور اس پر جو دادی ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے تھے انہیں
دیکھ کر بھی میں رو پڑا تھا۔ مجھے اس وقت پتہ ہی نہیں تھا کہ ماما ایک رئیس باپ کی لاڈلی بیٹی تھی جنہوں نے اپنے
والدین کی مخالفت کر کے میرے غریب باپ سے شادی صرف اس لیے کی کیونکہ وہ ان سے محبت کرتی تھیں۔ پاپا
کا چھوٹا سا گھر جسے نانا ابو پنجرہ کہتے تھے ماما کے لیے محبت کا پنجرہ تھا جس میں وہ اپنی رضا سے قید ہوئی تھیں۔ مگر
پاپا کی رحلت کے ساتھ ہی محبت کے اس پنجرے کا دروازہ بھی کھل گیا تھا اور ماما وہاں بنا کسی کی محبت کسی کے
جذبات کا احساس کیے اپنی عدت کا لحاظ کیے تین دن بھی نہیں ٹھہری تھیں۔ دادی ماں کو روتے بلکتے چھوڑ کر وہ
مجھے اپنے ساتھ لیے نانا ابو کے گھر آ گئیں تھیں وہ گھر جہاں ان کے دو عدد بھائیوں کی فیملیز موجود تھیں۔ پہلی بار
جب بڑے ماموں کے بیٹے کو زور کا چائنا مارا بلکہ ماما کے ساتھ بھی بہت جھگڑا کیا بعد میں نانا ابو اور ماموں
سے الگ ان کی انسلٹ کرائی مگر اسی گھر میں ٹھیک تین سال بعد جب ماما نے جان بوجھ کر میری پیٹھ جلائی تو
وہاں ان سے جھگڑا کرنے کے لیے میری ممانیں تھیں۔ بے قصور جلنے کے باوجود ماما نے مجھے ہی نانا ابو اور
ماموں سے ڈانٹ پڑا کر اپنا پرانا حساب چکنا کیا تھا۔“ سدید کی آنکھوں کے گوشے ہلکے ہلکے سرخ ہو رہے تھے
اور عالمہ سن سی بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

”میں نے سنا تھا دنیا میں جن کی مائیں نہیں رہتیں ان کے لیے سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر میرے
ساتھ حقیقت الٹ ہو گئی تھی میری ماں زندہ تھی دنیا میں موجود تھی مگر پھر بھی میرے لیے سب ختم ہو گیا تھا پاپا کی

مگر چاند اس کا حاصل نہیں تھا..... اس کا حاصل وہ تصور تھا جس نے اب تک اسے بے کل کیا ہوا تھا۔ آج کی شام وقار الحسن کے گھر پارٹی میں جس وقت درکنون نے اس کا ہاتھ تھاما اس کا پورا وجود اس لمحے جیسے سن ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی جسے وہ صرف سوچ سکتا تھا چاہ سکتا تھا مگر پانہیں سکتا تھا اسی لڑکی نے اس کا ہاتھ تھام کر جیسے اسے فریز کر دیا تھا اور پھر پارٹی میں ہر پل وہ اس کے ساتھ ساتھ رہی تھی۔ اس نے معاملے میں اس کے مشورے کو اہم جانا تھا وقت رخصت جب وہ گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا تو درکنون کا دوپٹہ ہوا سے بار بار اس کے بازو کو چھو رہا تھا اور اسے یہ لمحے کتنے اچھے لگ رہے تھے کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کچھ عرصہ قبل تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ جاب کی تلاش میں نکلا تو اسے کتنی جوتیاں چٹخانی پڑی تھیں۔ مسلسل ناکامی نے اس کے حوصلے پست کر دیئے تھے۔

تبھی ایک دوست کے مشورے پر ساری عمر کی جمع پونجی ماں کے خاندانی زیور اور کچھ گھر کا سازو سامان بیچ کر اس نے بیرون ملک ویزے کے لیے اپلائی کر دیا۔ نصیب کی بد نصیبی نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور وہ کمپنی جس کی توسط سے اس نے ویزے کے لیے اپلائی کی تھا فراڈنگلی یوں جو رہا سہا حوصلہ تھا وہ بھی جاتا رہا۔ اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس واقعے کے پندرہ روز تک وہ چار پائی پر بخار میں نڈھال پڑا رہا تھا۔ جب اس کے یونیورسٹی فیلو حنان کو اس کے حالات کا علم ہوا اس نے مریدہ بیگم سے اس کی شرافت، کردار اور ایمان داری کی سفارش کر کے اسے درکنون کا پرسنل سیکرٹری رکھوا دیا۔

تب سے اب تک اس نے اپنا فرض اور ذیوٹی پوری جانفشانی سے نبھانے کی کوشش کی تھی کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں درکنون کے لیے غلط خیال نہیں آیا تھا وہ اپنی جان سے بڑھ کر اس کی عزت کرتا تھا۔

درکنون کا اسٹیشن اور اس کے حالات بھی کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوئے تھے۔ مگر..... وہ دل سے ہار گیا تھا..... درکنون کی خوبیوں اور اس کی منفردی بے حد شاندار شخصیت نے کب اس کے دل کو اپنی گرفت میں دبوچا اسے خبر ہی نہیں ہو سکی۔ اور اب یہ حال تھا کہ اسے ایک دن بھی دیکھے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنے جذبے سب سے چھپا کر رکھے تھے اور وہ مرتے دم تک انہیں چھپا کر ہی رکھنا چاہتا تھا کیونکہ جانتا تھا دولت اور حسن کے دیوانوں میں دل کے سچے جذبوں کی ہمیشہ توہین ہوئی ہے۔ تاہم اسے اپنے انمول جذبوں کی توہین کسی صورت گوارا نہیں تھی..... تبھی وہ چپ تھا۔

اگلے روز کی صبح معمول کے مطابق ہوئی تھی۔ اماں نماز قرآن کی تلاوت سے فارغ ہو کر ابا کی تیمارداری میں لگ گئیں جبکہ عشرت ناشتہ بنانے میں مصروف تھی شگفتہ نے جھاڑو پکڑ رکھی تھی اور وہ روز کی مانند اس ٹونے پھونٹے کرائے کے گھر کو چمکانے میں مصروف تھی۔

وہ اٹھ کر سب پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بعد واش روم کی طرف بڑھ گیا جس میں موجود واحد نل پچھلے دنوں سے لیک کر رہا تھا مگر اسے اتنی فرصت ہی میسر نہیں تھی کہ وہ اسے ٹھیک کر سکتا۔ فریش ہو کر آیا تو عشرت نے اس کا ناشتہ لاکر چار پائی پر رکھ دیا۔

صیام کو ناشتے میں پراٹھا پسند تھا مگر پچھلے تین چار ماہ سے جو گھر کے حالات چل رہے تھے وہاں وہ یہ عیاشی نہیں کر سکتا تھا۔ عشرت کو اس کی پسند کا علم تھا تبھی کچھ روز تک وہ ہاندی کا گھی بچا بچا کر اسے روزانہ ایک پراٹھا بنا کر دیتی رہی تھی مگر اب یہ بھی محال ہو گیا تھا۔ تبھی اس نے پراٹھا چھوڑ دیا۔ وہ ناشتے کے لیے بیٹھا تو اماں بھی اس کے قریب آئیں۔

”صیام پتر رات بہت دیر کر دی تھی تو نے گھر واپسی میں میرا دل بہت ڈولتا رہا، اپنی مالکن سے کہنا ذرا جلدی چھٹی دے دیا کرے آج کل حالات اچھے نہیں ہیں۔“

”مجبوری ہے اماں میری نوکری ہی ایسی ہے کہ ہر پل میڈم کے ساتھ رہنا پڑتا ہے اب وہ وہاں پارٹی میں تھیں میں انہیں اکیلا چھوڑ کیسے آسکتا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پتر، مگر ماں کا دل ان سب باتوں کو نہیں سمجھتا، اوپر سے تیری بانیگ بھی ٹھیک نہیں، کبھی بھی کہیں بھی خراب ہو جاتی ہے۔“

”اللہ مالک ہے اماں جب میں گھر سے باہر ہوتا ہوں تو آپ کی دعائیں کسی حصار کی صورت میرے ارد گرد رہتی ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں پلیز۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں پتر، ایک تو ہی تو میرے جینے کا واحد سہارا ہے کل پھر شگفتہ کی ساس کا فون آیا تھا تاریخ مانگ رہی تھی شادی کی، میں نے کہا میں نے اپنے بیٹے کو بتا دیا ہے وہی تاریخ طے کرے گا۔“

”ہوں آپ انہیں تاریخ دے دیں اماں، میں آفس میں حنان سے بات کرتا ہوں اسی کی سفارش پر یہ جاب ملی تھی۔ اب امید ہے وہ سفارش کرے گا تو کچھ قرض بھی مل جائے گا۔“

”قرض تو ابھی پہلے والا بھی نہیں اترتا پتر۔“

”جانتا ہوں مگر مجبور ہوں اماں۔ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے ابھی ایک دوست سے میں نے ایک کام کے لیے کہا ہے دعا کرنا بات بن جائے روزانہ کے دو تین سو تو مل ہی جائیں گے۔“

ٹھیک ہے پتر مگر ورکشاپ پر کام مل گیا تو پھر جلدی گھر کیسے آؤ گے ہمارے گاؤں کا تو راستہ بھی بہت خطرناک اور سنسان ہے۔“

کوئی بات نہیں اماں اب گھر کا واحد کفیل ہوں تو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا ناں، اللہ کرم کرنے والا ہے۔ وہی ہم سب کا محافظ ہے آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ تجھے سلامت رکھے میرے پتر، تیرے ہوتے بھلا میں کیسے پریشان رہ سکتی ہوں۔“ ماں جی اس کی تسلی پر دعائیں دیتی اٹھ گئی تھی۔

صیام جلدی جلدی ناشتہ ختم کر کے آفس کے لیے نکل گیا تھا۔



درکنون میننگ میں بیٹھی تھی۔

آج کل نئے پروجیکٹ پر وہ کام کر رہی تھی اس میں دو تین لوگ اس کے مددگار تھے انہی دو تین لوگوں میں سے ایک اجزا سکندر تھا جو درکنون کی ٹکر کا برنس مین تھا اور پورے دل و جان سے اس پر فدا تھا۔

صیام اس کی نظروں کی گہرائی پہنچاتا تھا تبھی اسے اترار سکندر سے سخت چڑھتی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اسے کہیں غائب کر دیتا۔

اس وقت میٹنگ میں بھی وہ درمکنوں کے مقابل بیٹھا اور اس کی نظریں بار بار درمکنوں کے چہرے اور دوپٹے کے بغیر دعوت نگارہ دیتے کھلے گریبان پر پھسل رہی تھی۔ درمکنوں اس کی طرف متوجہ نہیں تھی تبھی اسے پتا نہیں چل سکا تاہم صیام کی نظریں اسی پر تھیں۔ ہرگز رتے پل کے ساتھ اس کا خون جیسے کھول رہا تھا۔ وہاں میٹنگ میں کون کیا بول رہا ہے نہ اسے سنائی دے رہا تھا نہ کوئی کچھ دکھائی دے رہا تھا کافی دیر ضبط کے بعد وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور ایکسکوز کرتا میٹنگ چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

درمکنوں جب میٹنگ سے فارغ ہو کر آئی وہ گاڑی میں بیٹھا جانے کن سوچوں میں گم تھا۔

”کیا ہوا میٹنگ چھوڑ کر کیوں آگئے آپ؟“ وہ متفکر بھی تھی اور برہم بھی۔

صیام نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

”میری طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی ایم سوری۔“

”اوہ اب کیسا فیل کر رہے ہیں آپ؟“

”اب ٹھیک ہوں۔“ وہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ پھر درمکنوں گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہے ناں؟“

”نہیں.....!“ وہ گاڑی اشارت کر رہا تھا۔ درمکنوں نے کسی کو کال ملائی۔

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے بعد اس کی کال ختم ہوئی تو صیام بول اٹھا۔

”ایک بات کہوں اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”ہوں کہیے۔“ وہ اب اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

صیام نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بمشکل لب کھولے۔

”میری نظر میں آپ بہت اچھی لڑکی ہیں میڈم، آپ جیسی لڑکیاں بے حجاب اچھی نہیں لگتیں۔“

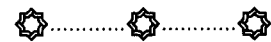
”کیا مطلب کیا آپ کو میں کہیں سے عریاں نظر آ رہی ہوں۔“

”میرا وہ مطلب نہیں ہے، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ یہاں کچھ لوگوں کی نظریں بہت گندی اور

اسی لیے اگر آپ دوپٹا استعمال کریں تو بہت اچھی لگیں گی۔“ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ دھیمے لہجے میں بول کر درمکنوں اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ شخص اسکا شوہر نہیں تھا، باپ اور بھائی بھی نہیں تھا پھر..... پھر اسے اس کی عزت کی اتنی پروا کیوں تھی؟ وہ صرف ملازم تھا اسے صرف اپنی تنخواہ سے مطلب ہونا چاہیے تھا پھر وہ اس کی عزت اس کے حجاب کی بات کیوں کر رہا تھا وہ سوچتی رہ گئی تھی۔

صیام اپنے دھڑکتے دل کی منتشر دھڑکنوں پر قابو پاتا گاڑی آگے بڑھالے گیا۔



اس روز زاویار مارکیٹ آیا تھا۔

سندے کی چھٹی تھی اور پرہیان اس کے ساتھ تھی۔ اسی کی ضد اور خوشی کے لیے وہ اپنے تمام ضروری کام پس انداز کر کے مارکیٹ آیا تھا کیونکہ پرہیان کو اسی کے ساتھ اپنی شادی کی شاپنگ کرنی تھی۔

صمد صاحب آج کل بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔

وہ تقریباً تین گھنٹے اس کے ساتھ مختلف شاپنگ کر رہی تھی۔ مگر وہ چونکا تھا جب ایک بوتیک میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر عائلمہ علوی پر پڑی۔

پرہیان کی نظر اب بھی اس پر نہیں پڑی تھی وہ اپنے ہی ملبوسات کی پسند ناپسند کے چکر میں الجھی ہوئی تھی۔

زاویار کے اندر تک کڑواہٹ کھل گئی اور عائلمہ سیلز مین سے کہہ رہی تھی۔

”مجھے یہ شرٹ بہت پسند ہے مگر اس کی قیمت بہت زیادہ ہے میں انورڈ نہیں کر سکتی اس لیے آپ پلیز وہ بلیک والی ہی پیک کر دیں۔“

”جی میم۔“ سیلز مین اس کی ہدایت پر پلٹ تو زاویار نے نظریں پھیر لیں۔

اسے اب اس لڑکی پر غصہ آ رہا تھا وہ کیوں ہر جگہ مظلومیت اور غربت کا اشتہار بننے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ اگر پیسے نہیں تھے تو اتنے مہنگے بوتیک میں گھسنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آخر وہ لڑکی اپنی اوقات میں کیوں خوش نہیں رہتی تھی۔ اور پتا نہیں وہ بھی کون تھا جس کے لیے وہ اتنی مہنگی شرٹ خریدنے کی خواہش رکھتی تھی وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا جب اچانک پرہیان نے اسے دیکھ لیا۔

”ارے عائلمہ تم یہاں..... اس کی پکار پر عائلمہ بھی فوراً پلٹی تھی۔

”ہوں اور تم یہاں کیسے؟“

”میں بھیا کے ساتھ شاپنگ کے لیے آئی تھی اور تم؟“

”میں اکیلی آئی ہوں بابا کی طبیعت ٹھیک نہیں اور سید کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا۔

ابھی پرسوں اس کا برتھ ڈے ہے میں اسے اچھے طریقے سے وش کر کے سر پر انڈ دینا چاہتی ہوں۔“

”ہوں اسے وش نہیں کروں گی اور کسے کرو گی۔ اس کے لیے تمہارا بس چلے تو پوری کائنات اٹھا کر لے جاؤ چیزیں تو بہت معمولی معنی رکھتی ہیں۔

”بالکل صحیح کہا تم نے اچھا بتاؤ تم نے اپنے لیے کیا خریدا۔“

”ابھی تو کچھ بھی پسند نہیں آیا چند ڈریسز دیکھے ہیں مگر سمجھ نہیں آ رہی کہ کون سا مجھ پر زیادہ سوٹ

کرے۔ میری ہیلپ کرو۔“ وہ عائلمہ کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھی پھر اس سے پہلے کہ زاویار کچھ کہتا وہ عائلمہ کو جلدی سے سائیڈ پر لے گئی جہاں اس نے اپنی پسند کے چند ڈریسز نگلوائے تھے۔

”واؤ یار! تمہاری چوائس تو بہت اچھی ہے۔ یہ ریڈ والا سوٹ بہت اچھا لگے گا تم پر سچ میں۔“

”مگر یار یہ بہت ہیوی ہے۔“

”تو کیا ہوا تم نے شادی کے بعد ہی پہننا ہے ناں بلکہ میں تو کہتی ہوں ویسے والے دن پہننا بہت

پیاری لگے گی۔“ وہ اپنی رائے دے رہی تو پرہیان نے اس کی پسند کا سوٹ اوکے کر دیا۔

”یہ بلیک والا دیکھو کیسا رہے گا۔“

”بے حد خوب صورت ابھی تین روز پہلے میں نے یہ ڈریس دیکھا تھا اور ساری رات یہی ڈریس میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہا پلیز تم یہ لازمی لو۔“

”تم نے کیوں نہیں لیا۔“

”میں پینتالیس ہزار افورڈ نہیں کر سکتی تھی تم تو جانتی ہو بابا کی بیماری اور سدید کی تعلیم پر بہت زیادہ پیسے خرچ ہوئے ہیں ایسے میں ایسی عیاشی کیسے افورڈ کر سکتی ہوں۔“ وہی اس کا پرانا رونا، زاویار کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اسے اچھی خاصی سنا دے جب پرہیان بول اٹھی۔

”پاگل ہو تم عائلہ تم مجھے تو بتاتیں ایک بار، پاپا کھڑے کھڑے ایسے دس سوٹ لے کر دے دیتے تمہیں، خیر اب یہ سوٹ میں تمہیں گفت کر رہی ہوں اور تم یہ میری شادی میں پہنو گی، آئی سمجھ۔“

”نہیں یار میں ہرگز یہ سوٹ نہیں لے سکتی۔“

”عائلہ پلیز، میں آج بہت خوش ہوں، لہذا پلیز میرا موڈ خراب مت کرو، بھیا کا بہت وقت برباد کیا ہے میں نے تھوڑی بھی دیر مزید ہوئی تو وہ غصہ کرنا شروع کر دیں گے۔ لہذا پلیز چپ رہو۔“

”مگر.....!“

”کچھ اگر مگر نہیں بس چپ۔“ وہ بضد رہی تو عائلہ نے ہار مان لی۔

زاویار کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ اس وقت وہاں بوتیک میں کوئی بھی تماشا کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا تبھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

پرہیان نے شاپنگ مکمل کی اور وہ بل پے کر کے بوتیک سے باہر نکل آیا۔

”چلو بچہ کرتے ہیں یار بہت بھوک لگی ہے۔“

”نہیں مجھے گھر پہنچنا ہے بابا انتظار کر رہے ہوں گے۔“ عائلہ نے عذر پیش کیا جسے پرہیان نے رد کر دیا۔

”مجھے کوئی بہانہ نہیں سننا پلیز،“ وہ آج ضد کے موڈ میں اور عائلہ کو ہتھیار بھینکنے ہی پڑے تھے۔

زاویار گاڑی میں بیٹھ رہا تھا جب پرہیان نے اس سے کہا۔

”بھیا مجھے بھوک لگی ہے اگر آپ غصہ نہ ہوں تو پلیز کسی اچھے سے ریسٹوران میں لے چلیے پلیز۔“

پرہیان کے عائلہ کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑے تھے مگر وہ جانتا تھا اگر ابھی اس نے اپنے اندر کا غبار نکالنا شروع کیا تو ان کھانا نہیں کھائے گی اور کچھ شک نہیں کہ وہ شدید ہرٹ بھی ہو جائے۔ تبھی خود پر جبر کرتا چپ چاپ اثبات میں سر ہلا گیا۔

صرف عائلہ کی وجہ سے اس نے دانستہ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی تھی۔

وجہ صرف علوی کو اس کی اوقات یاد کرنا تھی ورنہ وہ کبھی بھی اپنی فیملی کے ساتھ ایسے ہوٹلوں میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ پرہیان نے بھی یہ بات محسوس کی تھی مگر چپ ہی رہی تھی اور عائلہ نے اپنے لیے رائس پسند کیے تھے۔

زاویار بے نیاز بنا بیٹھا رہا، یہ الگ بات تھی کہ اس کے اندر طوفان اٹھ رہے تھے۔

کھانے کے دوران جب عائلہ نے چیخ کی بجائے ہاتھوں سے چادل کھانے شروع کیے تو چاہ کر بھی وہ خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔

”ایکسکیوز می مس علوی یہ آپ کا گھر نہیں ایک پبلک پلس ہے یہاں کھانا کھانے کے کچھ میز ہیں بہتر ہوگا اگر آپ یہاں اپنی اوقات بھول کر ان میز کا خیال رکھیں۔“ اس کا لہجہ انگارے چبار ہا تھا اور عائلہ کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ تھم گیا۔

”ایم سوری، مگر میں اسی طرح کھانے کی عادی ہوں میری اوقات جو بھی ہو مگر یہ طریقہ میرے نبی ﷺ کی سنت ہے، اس پیارے نبی ﷺ کی جو ساری مخلوق کے ہادی ہیں اگر آپ کو میرے اس طرح کھانے سے اپنی شان پر ضرب لگتی محسوس ہو رہی ہے تو میں اٹھ کر چلی جاتی ہوں۔“

”عائلہ پلیز بھیا کا وہ مطلب نہیں ہے اور بھیا پلیز ہم یہاں مفت کھانا نہیں کھا رہے جو کوئی اعتراض کرے گا پلیز کول ڈاؤن۔“ وہ جھگڑا نہیں چاہتی تھی اور زاویار کو برداشت کرنا پڑا مگر گھر آتے ہی وہ غصے سے پھٹ پڑا تھا۔

”حد ہوتی ہے پری بے وقوفی اور خدا ترسی کی بھی کوئی ایسے کرتا ہے بھلا جیسے تم نے کیا۔ مجھے بتاؤ بھلا ہم نے کوئی ایڈی سینٹر کھول رکھا ہے کہ کوئی بھی فرمائش کرے گا اور ہم بنا اپنے اخراجات کی پروا کیے اس کی فرمائش پوری کرتے رہیں گے۔“

”بھیا پلیز ایک سوٹ ہی تو لے کر دیا ہے اسے ہم نے کون سے قارون کے خزانے تمہا دیے ہیں جو آپ ایسے ری ایکٹ کر رہے ہیں۔“

”کیوں لے کر دوں میں اسے سوٹ کیا لگتی ہے وہ میری؟“

”آپ کی نہیں لگتی ہوگی مگر پاپا اسے اپنی دوسری بیٹی ہی سمجھتے اور مانتے ہیں۔“

”تو جب پاپا ساتھ ہوں اس وقت اس کے ناز اٹھالیا کرو مجھے وہ لڑکی سخت ناپسند ہے۔ دوبارہ میرے ساتھ اگر تم نے بھی بھی اسے یوں اس کی اوقات سے بڑھ کر اہمیت دی تو سچ کہتا ہوں پری میں کچھ بیٹھوں گا اپنے ساتھ۔“

سخت الفاظ میں انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتا وہ فوراً اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا جبکہ پرہیان دونوں ہاتھوں پر سر گرا کر وہیں لاؤنچ میں صوفے پر ڈھس گئی۔

شام میں اس کے موبائل پر ساویز کی بہن درپہ کی کال آئی تھی۔

پرہیان جو اپنے کپڑے پر پلس کر رہی تھی سیل کی اسکرین پر درپہ کا نام دیکھ کر خوش ہو گئی۔

”السلام علیکم درپہ کیسی ہو؟“

”میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟“ درپہ کا لہجہ بجا بجا سا تھا پرہیان چونک اٹھی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں تم اتنی اداس کیوں ہو؟“

”ساویز بھائی کی وجہ سے پچھلے کچھ دنوں سے وہ بہت چپ چپ رہنے لگے ہیں بہت اداس بھی ابھی ت لے کھر جاتے ہوئے چھوٹا سا ایکسڈنٹ بھی ہوا ہے ان کا آج صبح اسپتال سے ڈسچارج ہوئے ہیں پتا

حکم تیرا ہے تو تعمیل کیے دیتے ہیں
زندگی ہجر میں تحلیل کیے دیتے ہیں
تو وصل کی خواہش پر بگڑتا کیوں ہے
راہ ہی ہے چلو تبدیل کیے دیتے ہیں



اداسی کچھ تو بولوناں
بھلا تم آج کیوں دل میں
بنا دستک بنا آہٹ سائی ہو
اداسی چار سو تم ہو
نجانے پھر بھی کیوں گم ہو
بھلا ڈھونڈو کہاں تم کو
کسی اک سمت میں ہوتی تو تم کو ڈھونڈ ہی لیتی
تمہارے کان میں چپکے سے بس اتنا ہی کہہ دیتی
اداسی تم چلی جاؤ ابھی شام باقی ہے
اندھیرا شام کا چھا جائے تو
میری پلکوں پہ سارے درد رکھ جانا
اداسی تم کہاں ہو میں کہاں ڈھونڈو تمہیں بولو؟
مجھے لگتا ہے کہ تم دل کے
بدلتے موسموں کے بچ بھری ہو
تبھی تو اتنی گہری ہو.....!!



بیل اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر جا گرا۔ وہ ساکت و جامد سی چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئی۔
”یہ کیا کہا تھا ساویز نے اس سے کہ وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا مگر کیوں؟ ایسا کیا قصور سرزد ہو گیا
لہ وہ شادی سے فقط چند دن قبل اس کو اپنے راستے ہی الگ کر رہا تھا وہ ساویز جسے اس سے بات کیے بغیر نیند ہی

نہیں کیا پر اہلم ہے ان کے ساتھ؟“ بہت اداس لہجے میں وہ کہہ رہی تھی۔

پر ہیان کا دل زور سے دھڑکا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے ساویز کا رویہ اس کے ساتھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا وہ بہت
بے رخی سے بات کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وہ اسے بہت الجھا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جانے اسے کیا الجھن تھی؟
دریہ کی کال ختم ہونے کے فوراً بعد اس نے ساویز کا نمبر ملایا اور اس کی کال تیسری بیل پر پک ہو گئی
تھی۔

”ہیلو کیسے ہو ساویز؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ شاید سو کر اٹھا تھا تبھی اس کا لہجہ بھاری تھا اور پر ہیان کے اندر پریشانی بکھر گئی۔

”مجھے تمہارا لہجہ ٹھیک نہیں لگ رہا..... کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“

”نہیں۔“

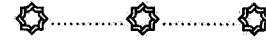
”تو پھر پہلے کی طرف بات کیوں نہیں کرتے کہاں غائب رہتے ہو اب تو ہماری شادی بھی قریب

ہے۔“

”ایم سوری پری، میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میری طرف سے یہ رشتہ ختم سمجھو۔“ کوئی قدموں

تلے سے زمین کیسے نکالتا ہے پر ہیان کو اس وقت پتا چلا تھا۔

اسکے ہاتھ سے بیل چھوٹ کر زمین پر جا گرا تھا۔



نہیں آتی تھی جو یونیورسٹی پیریڈ میں پروانوں کی طرح اس کے گرد منڈلایا کرتا تھا۔ جسے کسی بھی پل سوائے پرہیان کے اور کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا تھا..... وہی تھا جس نے اپنے گھر والوں کے ساتھ لڑکر پرہیان سے مگنی کا بندھن قائم کیا تھا۔

زندگی میں کئی بار وہ لڑے تھے کئی کئی دن ایک دوسرے سے ناراض بھی رہے تھے..... مگر تب بھی اس نے کبھی اپنا راستہ الگ کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا..... تو پھر اب کیا ہو گیا تھا؟

بہت سوچنے سے بھی اسے اپنا کوئی قصور، کوئی خطا یاد نہیں آ رہی تھی تو پھر وہ ایک دم سے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیسے کر سکتا تھا۔ ماؤف ذہن کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اس نے اسے کال بیک کی مگر اس بار ساویز نے اس کی کال پک نہیں کی۔

اس کی شرٹ جل گئی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ جلتے ہوئے دل کی تکلیف، قیمتی شرٹ کے جلنے سے کہیں زیادہ تھی۔ بار بار وہ اسے کال کر رہی تھی مگر وہ پک نہیں کر رہا تھا تبھی مجبور ہو کر وہ اسی حلیے میں گاڑی لے کر اس کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

”اگر وہ اس کے ساتھ مذاق کر رہا تھا تو بے حد بھونڈا مذاق تھا۔“ سارہ بیگم، صمدی صاحب اور زاویار میں سے کوئی بھی گھر پر نہیں تھا وہ بے دردی سے آنسو بہاتی تیز ڈرائیو کرتی رہی۔

ساویز کے گھر پہنچ کر اسے پتا چلا کہ وہ گھر پر نہیں تھا۔ دریاہ اسے روتے دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ دریاہ کو اس کے ہارن پر گھر سے باہر آنا پڑا تھا۔

”کیا ہوا پری، تم رو کیوں رہی ہو، سب ٹھیک تو ہے ناں؟“

”پتا نہیں، ساویز کہاں ہے؟“

”وہ تو گھر پر نہیں ہے، کیوں کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے پلیز تم اسے کال کر کے گھر بلاؤ۔“

”اوکے مگر تم اندر تو آؤ۔“

”نہیں مجھے اندر نہیں آنا، پلیز پہلے تم اسے یہاں بلاؤ۔“

”پری بات کیا ہے یار، تم مجھے پریشان کر رہی ہو؟“

”پریشان ساویز کر رہا ہے دریاہ وہ مجھ سے رشتہ ختم کرنا چاہتا ہے مگر میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

”وہاٹ..... کیا یہ تم سے کہا اس نے؟“

”ہاں۔“

”مگر وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے وہ تو تم سے بے حد پیار کرتا ہے پری۔“

”یہی میں بھی جانتا چاہتی ہوں کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟“ وہ ابھی بھی رو رہی تھی۔

دریاہ اس پر سے نظریں ہٹا کر ساویز کو کال ملانے لگی مگر اس کا نمبر اب پاور آف مل رہا تھا۔

”اس کا نمبر بند جا رہا ہے پری مگر تم ٹینشن مت لو، میں اس سے بات کروں گی بلکہ ماما اور پاپا بھی

اس کی کلاس لیں گے وہ اتنا بڑا فیصلہ یوں اکیلے نہیں کر سکتا۔“ کھڑکی پر جھکی وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔ پرہیان نے آنسو پونچھ کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گاڑی ریورس کر لی۔

”پری اندر آؤ پلیز۔“

”نہیں ابھی نہیں آ سکتی، پلیز تم اس سے رابطہ کر کے مجھے کال ضرور کرنا۔“

”اوکے۔“ دریاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ پرہیان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔



ساویز جس وقت گھر واپس لوٹا شب کے تقریباً ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت سب اس کے انتظار میں منتظر بیٹھے ہوں گے وگرنہ شاید وہ صبح ہی گھر واپس آتا۔

دریاہ اور مسز آفندی لاؤنج میں بیٹھی اسی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ گاڑی گیراج میں پارک کرنے کے بعد جیسے ہی لاؤنج میں آیا مسز آفندی اور دریاہ کو وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! کہاں تھے اب تک؟“ مسز آفندی کا موڈ غصیلا تھا۔ ساویز نے نظر انداز کرتے ہوئے فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔

”ایک دوست کے ساتھ تھا، کچھ ضروری کام کے سلسلے میں۔“

”کیسا ضروری کام؟“

”بتا دوں گا جب ہو جائے گا۔“

”ساویز تم بہت غلط کر رہے ہو، مجھے بتاؤ کن ضروری کاموں کے چکر میں پڑے ہوئے ہو تم۔“

”باہر جا رہا ہوں اسی سلسلے میں ویزہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”وہاٹ..... مگر تمہیں بیٹھے بیٹھائے باہر جانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی وہ بھی اس وقت جب

تمہاری شادی میں بمشکل چند دن رہ گئے ہیں..... مگر کیوں؟“

”صبح بتاؤں گا، ابھی بہت تھکا ہوا ہوں پلیز سونے دیں۔“ بیزار کن لہجے میں کہتا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

مسز آفندی اور دریاہ اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

اگلے روز ناشتے کی میز پر وہ معمول کی مانند موجود تھا۔ احمد آفندی صاحب اور مسز آفندی دونوں اسی کا

انتظار کر رہے تھے جبکہ دریاہ اپنی نشست پر خاموش بیٹھی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔“ احمد آفندی صاحب نے جواب دیا وہ چپ چاپ بیٹھ گیا۔ تبھی احمد صاحب

”اہا تمہارے اور پرہیان بیٹی کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے۔“

”ہاں۔“

فورا پہنچی تھی۔

ساویز نے دیکھا صرف ایک ہی روز میں وہ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی مانند کملا کر رہ گئی تھی۔ وہ اسے دکھ نہیں دینا چاہتا تھا مگر مجبور تھا۔ وہ سامنے آ کر بیٹھی تو اس نے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔
”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس کا لہجہ بھی بھرایا ہوا تھا۔ ساویز کو دل پتھر کرنا پڑا۔

”آئی ایم سوری! میں تمہیں دکھی کرنا نہیں چاہتا تھا مگر یہ بھی سچ ہے پری کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“ پہلے اس نے تابوت میں دفن کیا اور اب باہر نکالنے کی بجائے آخری کیل ٹھونک رہا تھا۔ وہ فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”کیوں، میں نے کیا کیا ہے ایسا؟“

”تم نے نہیں کیا مگر تمہاری ممانے ضرور کیا ہے۔“

”کیا کیا ہے میری ممانے؟“ وہ روہانسی ہوئی۔ ساویز نے نظریں پھیر لیں۔

”یہ تم انہی سے پوچھو تو زیادہ بہتر ہے۔“

”ان سے کیوں پوچھوں تم رشتہ ختم کر رہے ہو تم سے کیوں نہ پوچھوں۔“ وہ چلائی۔

راستوران میں ارد گرد بیٹھے لوگ بے ساختہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ ساویز نے حد درجہ خفت محسوس

کی۔

”آہستہ بولو، یہ ریسٹوران ہے تمہارا گھر نہیں۔“

”تم جسے سمار کر رہے ہو وہ بھی میرا دل ہے کوئی مکان نہیں ہے۔“ وہ اب رو رہی تھی۔ ساویز نے

لب بھینچ لیے۔

”تم مجھے پبلک پلیس پر تماشا بنا رہی ہو پری۔“

”اور تم..... تم میرے ساتھ کیا کر رہے ہو؟“

”میں کچھ نہیں کر رہا تمہارے ساتھ۔“

”کچھ نہیں کر رہے تو مجھے بتاؤ میں لوگوں کو کیا بتاؤ گی کہ شادی سے فقط چند روز قبل میرے ہونے

والے شوہر نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔“

”ہماری منگنی ہوئی تھی نکاح نہیں ہوا تھا، جو لوگوں کو بتانا نہ سکو، منگنیاں ٹوٹتی رہتی ہیں۔“

”اور اعتبار؟“

”میں نے تمہارا اعتبار نہیں توڑا اعتبار تم نے میرا توڑا ہے۔“

”کیسے، کیا کیا ہے میں نے؟“

”تم نے مجھ سے سچ چھپایا ہے تم جانتی تھیں کہ تم صمد انکل کی سگی بیٹی نہیں ہو، پھر بھی تم نے خود کو ہمیشہ

ان کی بیٹی ظاہر کیا۔ حالانکہ حقیقت میں تمہارا کوئی وجود ہی نہیں، نہ کوئی پہچان ہے۔“ بڑی سفاکی سے وہ اسے

اچھا لگا رہا تھا۔

”نہیں تو پھر رشتہ کیوں ختم کر رہے ہو اس سے؟ تمہیں پتا ہے صمد حسن صاحب کا کتنا نام ہے اس شہر میں، شہر کے چند معززین میں شمار ہوتا ہے ان کا اور تم انہی کی بیٹی کے ساتھ شادی سے انکار کر رہے ہو، پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم؟“ احمد صاحب غصہ ہوئے۔ ساویز نے بے نیازی سے بریڈ پر نیم لگانا شروع کر دیا۔

”پر ہیان صمد حسن صاحب کی بیٹی نہیں ہے پاپا۔“

”وہاٹ..... یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“

”بکواس نہیں کر رہا پاپا سچ کہہ رہا ہوں، صمد حسن صاحب کی صرف ایک ہی بیٹی ہے، درمکون صمد پر ہیان ان کی بیٹی نہیں ہے یہ سارہ آئی کی بیٹی ہے وہ بھی ناجائز۔“

”کیا.....؟“

”جی پاپا، یہی سچ ہے۔“

”تم سے کس نے کہا یہ سب؟“

”صمد انکل کی سگی بیٹی درمکون میری دوست ہے اسے نہیں پتا کہ میری انجمنٹ صمد انکل کی ہی لے پالک بیٹی سے ہوئی ہے۔ ابھی چند روز قبل یونہی باتوں باتوں میں، میں نے اس سے اس کے پاپا کا پوچھا تو اس نے صمد انکل کی تصویر دکھا دی۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس کے پاپا نے اس کی وفا شعار ماں کو ایک ایسی عورت کے لیے چھوڑ دیا جو شادی سے پہلے ہی ماں بن گئی تھی اور اب وہ اسی عورت اور اس کی بیٹی کے ساتھ رہتے ہیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے پاپا کہ یہ سچ جاننے کے بعد میں کتنا ٹوٹا تھا، کیسے کیسے خواب نہیں سجا لیے تھے میں نے اپنی آنکھوں میں پر ہیان کے لیے مگر ایک پل میں ہی سارے خواب ٹوٹ گئے۔“ وہ بہت دکھی لگ رہا تھا۔

احمد صاحب اور مسز آفندی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہیں؟ در یہ خود ساکت و جاہل بیٹھی تھی۔

پر ہیان نے زندگی کا اتنا بڑا سچ اس سے کیسے چھپایا؟ کچھ لحوں کی خاموشی کے بعد مسز آفندی بولیں۔

”ہو سکتا ہے وہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہو۔“

”وہ ایسی لڑکی نہیں ہے ماما، میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں اسے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر..... اب صمد صاحب سے کیا کہیں گے۔“

”اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں خود پر ہیان سے کل صاف لفظوں میں ساری بات کلیئر کر دوں

گا۔“

”کل کیوں، آج ہی کیوں نہیں؟“

”آج تھوڑا مصروف ہوں اس لیے۔“

”مصروفیت کو سائیڈ پر رکھو، وہ لڑکی بہت پریشان ہے کم از کم اسے پتا تو چلے کہ اسے کیوں رنجش کیا

جارہا ہے؟“ مسز آفندی کے لہجے میں غصہ اور ملال تھا۔ ساویز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆.....☆.....☆

پر ہیان بخار میں مبتلا تھی مگر ساویز کی صرف ایک فون کال پر وہ اس کے بتائے گئے ریسٹوران میں

پر ہیان کو لگا جیسے اس کا وجود ایک دم سے بلاست ہو گیا ہو۔ یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ اس کی آنکھیں جیسے ساکت رہ گئی تھیں۔

”ک..... کیا مطلب؟“

”مطلب تمہیں سارا آنٹی بتائیں گی میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ جب صمد انکل نے تمہاری ماما کے ساتھ شادی کی اس وقت وہ امید سے تھیں۔ صمد انکل کے ساتھ شادی کے ٹھیک چھ ماہ بعد تم نے ان کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ یہ صمد انکل کی عظمت تھی کہ انہوں نے نہ صرف سارہ آنٹی کو اپنا نام دیا بلکہ تمہیں بھی کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، اس روز جب مجھے یہ پتا چلا کہ تم پر ہیان صمد نہیں پر ہیان عذیر ہو تو میں سمجھا شاید سارہ آنٹی نے صمد انکل سے پہلے بھی کسی کے ساتھ شادی کی تھی مگر مجھے یہ جان کر بہت تکلیف ہوئی کہ سارہ آنٹی کی پہلی شادی صمد انکل کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ میں کوئی بہت اعلیٰ ظرف انسان نہیں ہوں پری، ایک معمولی سا روایتی مرد ہوں۔ تم سے لاکھ محبت سہی مگر آنکھوں دیکھی کبھی نہیں نکل سکتا، تم سمجھ سکتی ہو میری مجبوری۔“

کوئی کس حد تک سفاک ہو سکتا ہے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی، ساویر نے لفظوں کے تیر پھینکنے بند نہیں کیے۔

”میں اپنی اولاد کے لیے کوئی رسک نہیں لینا چاہتا، میں نہیں چاہتا کہ تم سے شادی کے بعد میں ساری زندگی لوگوں سے نظریں جھکا کر ملتا رہوں، میرے بچے جب اپنی ماں کی حقیقت سے آشنا ہوں تو انہیں کوئے کھدروں میں منہ چھپا کر رونا پڑے، تم چاہے مجھے جتنا بھی خود غرض کہو مگر میں واقعی ایک ایسی لڑکی کو اپنا ہم سفر بنانا پسند کروں گا جو عزت دار، شریف گھرانے سے تعلق رکھنے والی ایک معزز لڑکی ہو، ان فیکٹ مجھ میں ساری عمر سر جھکا کر زندگی گزارنے کا حوصلہ نہیں۔“ وہ شخص صرف خود غرض نہیں بے رحم بھی تھا۔

پر ہیان کو لگا جیسے پہلی بار اس کے وجود سے ناقابل برداشت بدبو آ رہی ہو۔ اتنی زیادہ کہ اسے لگا جیسے ارد گرد بیٹھے لوگ اٹھ کر اسے پتھر مارنا شروع ہو جائیں گے؟

بھلا ابھی ابھی ساویر نے جو برسائے تھے کیا وہ پتھر نہیں تھے؟ بے حد نوکیلے اور بھاری پتھر..... وہ ابھی اور بے ساختہ لڑکھا کر رہ گئی تھی۔

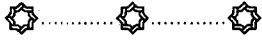
اس نے زندگی میں دانستہ کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ کبھی کسی کی دل آزاری بھی نہیں کی تھی۔ پھر بھی اس کے وجود کو کانٹوں پر گھسیٹا گیا تھا..... کیوں؟ اس کا کیا قصور تھا؟ وہ تو قدرت کی جائز پیداوار تھی۔

اس کا جنم بھی لاکھوں جائز بچوں کی طرح ہوا تھا۔ ساری زندگی اس نے اپنے کردار کو بے حد شفاف رکھا تھا پھر بھی وہ گناہ گارہ ٹھہرائی گئی تھی؟ بغیر کوئی خطا کیے اگر وہ گناہ گار تھی تو پھر اس کا خدا کون تھا جو اسے معاف کر کے اس کی پیشانی پر جی سیاہی صاف کر دیتا۔

اس کی دنیا کون سی دنیا تھی جہاں وہ ایک معزز ہستی کے طور پر پہچانی جاتی؟ یہ کیسے اندھیرے تھے، وہ جن میں اب تک جی رہی تھی۔

ذہن تو ماؤف ہوا ہی تھا قدم بھی جیسے بے جان ہو گئے تھے، اس وقت وہ ریستوران میں اپنا سب کچھ گنوا کر وہاں سے کیسے نکلی تھی صرف اس کا خدا اور اس کا دل ہی جان سکتا تھا۔ ہر طرف آوازوں کا شور تھا اور

وہ اکیلی پیدل چل رہی تھی۔



”زاویار.....!“ وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا جب صمد حسن صاحب کی پکار نے اس کے تیزی سے بڑھتے قدم روک لیے۔

”جی پاپا۔“

”صبح ایک کام کہا تھا تم سے ابھی تک ہوا کہ نہیں؟“ وہ لاؤنج میں کھڑے تھے۔ سارہ بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ وہ پلٹ کر نیچے اتر آیا۔

”جی پاپا ابھی وہیں سے فارغ ہو کر آ رہا ہوں صبح آفس سے سیدھا گاؤں کی طرف نکل گیا تھا پوری حویلی کی صفائی کرادی ہے۔ سارے انتظامات بھی دیکھ آیا ہوں پری بھی کیا یاد کرے گی کتنے ڈیزسٹ بھائی سے پالا پڑا ہے اس کا۔“

”ہوں اس میں تو کوئی شک نہیں، بھائی تو واقعی بہت پیارا دیا ہے اللہ نے اسے۔“ سارہ بیگم مسکرائی تھیں۔ وہ کن اکیوں سے زاویار کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں تو صمد صاحب بھی مسکرا دیے۔

”بھائی کی بہن بھی بہت پیاری ہے۔ جن دنوں تم ابروڑ ہوتے ہو، پاگل بنی رہتی ہے تمہارے لیے۔“

”آہم..... مگر وہ ہے کہاں..... صبح سے دکھائی نہیں دی۔“

”اپنے کمرے میں ہے شاید سو رہی ہے، میں نے دو تین بار آواز دی ہے مگر اس نے رسپانس نہیں دیا شاید گہری نیند سو رہی ہے۔“

”واؤ یعنی یہاں میں اس کی خوشیوں کے لیے صبح سے خوار ہو رہا ہوں اور وہ شہزادی صاحبہ مزے سے گہری نیند سو رہی ہیں۔ ابھی خبر لیتا ہوں اس کی۔“ سارہ بیگم کی اطلاع پر دل جلے سے لہجے میں کہتا وہ پھر سے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ تبھی صمد صاحب نے سارہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

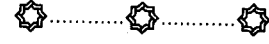
”میں جانتا ہوں کہ سارہ کی پری یہ حقیقت جاننے کے بعد کہ وہ میری سگی بیٹی نہیں ہے، بہت چپ چپ سی اداس رہنے لگی ہے مگر میرا خدا جانتا ہے، میں نے کبھی ایک لمحے کے لیے یہ تصور نہیں کیا کہ وہ میری سگی بیٹی نہیں۔ میں نے ہمیشہ اس کی معصوم صورت میں درمکنوں کا چہرہ دیکھا ہے۔ زندگی میں جب جب اس نے مجھے پاپا کہا ہے میرے کانوں میں اس کی آواز، درمکنوں کی آواز کی پرچھائی بن کر امرت کی صورت اتری ہے۔ پیدائش کے بعد جب اس کا ننھا سا وجود میرے ہاتھوں میں تھمایا گیا تو میرے اندر سکون کی گہری لہر اتر گئی تھی۔ اس وقت سے لے کر آج تک میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ وہ میری سگی بیٹی نہیں۔“

”میں سمجھتی ہوں صمد! بے شک درمکنوں اور پر ہیان دنیا کی سب سے خوش نصیب بیٹیاں ہیں آج کل کے دور کی کہ جنہیں آپ جیسا محبت کرنے والا آئیڈیل باپ ملا۔“ سارہ بیگم کی پلکیں نم تھیں۔ صمد صاحب وہیں لاؤنج میں صوفے پر نکل گئے۔

”کیا واقعی وہ درمکنوں کے آئیڈیل باپ تھے؟“ کبھی کبھی انسان کو بے چین کرنے کے لیے صرف

ایک لمحہ ہی بہت ہوتا ہے۔

پاس کھڑی سارہ بیگم ان کے اضطراب سے بے خبر آنے والے دنوں کا سوچ کر خوش ہو رہی تھیں۔ انہیں لگا جیسے انہیں اپنی تمام تر ریاضتوں کا صلہ مل گیا ہو۔ وہ سفر جو بہت سال پہلے انہوں نے آبلہ پا، صمد حسن صاحب کے ساتھ شروع کیا تھا اس سفر کی تمام تر اذیتوں کو مرہم مل گیا ہو۔



صیام کو ورکشاپ میں ملازمت مل گئی تھی۔ وہ ماہر موٹر مکینک تھا۔ ہر قسم کے انجن کی خرابی چیک کر کے چند گھنٹوں میں دور کر دیتا مگر اس نے اس کام کو بطور پروفیشن نہیں اپنایا تھا۔ وہ پڑھا لکھا، مخنتی تھا اس کے پاس تعلیمی ڈگریاں تھیں اسی لیے اسے یہ کام اپنے شایان شان نہیں لگتا تھا مگر حالات کی ستم ظریفی کہ اب اسے پارٹ ٹائم جاب میں یہی کام کرنا پڑ رہا تھا۔

صبح سے شام پانچ بجے تک اس کی آفس میں ڈیوٹی ہوتی اور پانچ سے سات بجے تک وہ ورکشاپ پر کام کرتا اور پھر سات بجے کے بعد تھکن سے نڈھال گھر کی راہ لیتا۔ مسلسل محنت اور ناسازگار حالات کی وجہ سے اس کی صحت بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اس روز اس نے دفتر میں حنان سے قرض کے لیے بات کی تھی جب وہ بولا۔ ”ابھی قرض ملنا مشکل ہے صیام، کیونکہ کمپنی ابھی کچھ نئے پروجیکٹس شروع کر رہی ہے پھر ابھی پچھلے مہینے میں نے ڈیڑھ لاکھ کا قرض لیا ہے ایسے میں پھر سے میڈم سے قرض کی بات کرنا وہ بھی اس وقت جبکہ تیری جاب کو ابھی زیادہ ٹائم نہیں ہوا بہت مشکل ہے۔“

”میں ان ساری باتوں سے واقف ہوں مگر میرے حالات میرے بس میں نہیں ہیں یار۔“

”وہ تو ٹھیک ہے میں سمجھتا ہوں مگر اس جاب کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں یار، بہتر ہوگا اگر تم اپنے طور پر میڈم سے قرض کی بات کر لو۔“

”مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو تجھ سے کیوں کہتا۔“

”پھر اب کیا ہو سکتا ہے۔“

”پتا نہیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں؟“

”تم پریشان مت ہو اللہ کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالے گا۔“

”ہوں۔“ اثبات میں سر ہلا کر وہ حنان کے پاس سے اٹھ آیا تھا۔

اس روز درمکنون آفس آئی تو اس کے گلے میں دوپٹہ تھا جو اس نے سینے پر پھیلایا ہوا تھا۔ صیام کو بے پناہ خوشی ہوئی۔ وہ اسے دن بھر کے پروگرامز سے آگاہ کر رہا تھا جب وہ بولی۔

”شام والا سائٹ وزٹ کینسل کر دیں کیونکہ شام میں مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے میری بہت

کلوز فرینڈ کی سالگرہ ہے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“

”اور آپ کے گھر میں سب ٹھیک ہیں۔“

”جی الحمد للہ۔“

”چلیں ٹھیک ہے حنان صاحب کو بھیجیں اندر پلیز۔“ اس کا لہجہ ہمیشہ بہت نارمل سا ہوتا تھا اس کے باوجود وہ اسے چاہنے سے باز نہ رہ سکا۔

درمکنون اس روز مکمل بلیٹ سوٹ میں ملبوس بے حد پیاری لگ رہی تھی صیام ضبط کی ہزار کوششوں کے باوجود اپنی نظروں کو بار بار اس کی طرف اٹھنے سے نہ روک پارہا تھا۔ شام میں جب وہ آفس سے نکل رہا تھا درمکنون نے اسے بلا لیا۔

”مسٹر صیام، پلیز گاڑی نکالیں، مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے۔ بہت لیٹ ہو گئی ہوں۔“ وہ اسے کہنا چاہتا تھا کہ آفس ٹائم ختم ہو گیا ہے اسے اب پارٹ ٹائم جاب کے لیے ورکشاپ پر جانا ہے مگر نہ کہہ سکا۔ جس وقت وہ گاڑی نکال رہا تھا ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ درمکنون موبائل فون پر کسی سے بات کرتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ صیام جس وقت گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا اس نے اسے کہتے ہوئے سنا تھا۔

”اُوہ میری پیاری ماں، آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں، میں شاپنگ میں زیادہ وقت نہیں لگاؤں گی، جلدی گھر بھیج دوں گی اسے مجھے بھی پتا ہے کہ موسم کے تیور ٹھیک نہیں، اتنی ظالم باس نہیں ہوں میں جتنی آپ مجھے سمجھتی ہیں۔“ شاید وہ اسی کے بارے میں بات کر رہی تھی۔

صیام چپ چاپ ڈرائیو کرتا رہا۔ مارکیٹ پہنچنے تک ہلکی بوند باندی تیز بارش میں بدل گئی تھی۔ صیام کو ورکشاپ کے مالک کی فکر لگی رہی پتا نہیں وہ کتنا ناراض ہو رہا ہوگا۔ درمکنون جیسے ہی گاڑی سے نکلی تھی کسی سے ٹکرا گئی۔

”سوری۔“ پلٹ کر سوری کرتے ہوئے اس نے جیسے ہی مقابل کو دیکھا تو خوش ہو گئی۔

”ارے سادیز تم یہاں وہ بھی اتنی بارش میں؟“ مقابل کھڑے نوجوان کے لیے اس کی اتنی خوشی صیام کی سمجھ سے باہر تھی جبکہ نوجوان مسکرا رہا تھا۔

”ہوں، تم نے سنا نہیں بارش میں کیڑے مکوڑے زیادہ نکلتے ہیں۔“ درمکنون کھل کر ہنسی۔

صیام کا خون جل کر راکھ ہو گیا۔ مگر وہ پرواہ کیے بغیر اس کی طرف بھکی تھی۔

”موسم خراب ہے آپ پلیز گھر چلے جائیں میرا فرینڈ مل گیا ہے میں اس کے ساتھ گھر چلی جاؤں گی۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

صیام اپنے اندر کی ہلچل پر قابو پاتے اس کے حکم پر چپ چاپ گاڑی سے باہر نکل آیا۔ مارکیٹ سے ٹیکسی لے کر جس وقت وہ ورکشاپ پہنچا ورکشاپ بند ہو چکی تھی۔ اس کی بایک آفس میں کھڑی تھی۔ ورکشاپ سے آفس پہنچنے میں مزید پانچ سو روپے ٹیکسی کے کرائے کی مد میں خرچ ہو گئے۔

اس روز دفتر سے گھر پہنچنے تک وہ بہت بری طرح بھیگ چکا تھا اتنا کہ اگلے دن تیز بخار نے اسے اپنے دھار میں لے لیا۔ بخار اتنا تھا کہ اس سے آنکھیں بھی نہیں کھولی جا رہی تھیں۔

درمکنون اگلے روز آفس آئی تو صیام کی غیر حاضری کی درخواست منہ چڑا رہی تھی۔ وہ جی بھر کر اپ

یٹ ہوئی۔

آج ہی اسے وہ تمام اہم امور نمٹانے تھے جو کل شاپنگ کی وجہ سے ادھورے رہ گئے مگر..... آج ہی

صیام نے چھٹی کر لی تھی۔ حنان البتہ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ درمکنوں نے اسے طلب کر لیا۔

”جی میڈم۔“

”مسٹر حنان، مسٹر صیام کو فون کریں مجھے آج بہت اہم وزٹ پر جانا ہے۔“ قدرے مصروف انداز میں اس نے حکم دیا تھا۔

حنان کی نظریں کی بورڈ پر تیزی سے حرکت کرتیں اس کی مخروطی مومی انگلیوں پر جم گئیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میڈم کل بارش میں بہت زیادہ بھیگنے کی وجہ سے اسے بہت تیز بخار ہے میں نے صبح کال کی تھی ان کے گھر وہ بے ہوش پڑا ہے۔“

”مگر اسے بارش میں اتنا بھیگنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ذرا کی ذرا اس نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

حنان نے جلدی سے نظروں کا زاویہ بدل لیا۔

”میری اس کی ماں جی سے بات ہوئی تھی وہ بتا رہی تھیں کہ وہ آفس سے بہت لیٹ گھر پہنچا تھا شاید اسی لیے بارش میں بھیگتا رہا۔“

”مگر میں نے تو اسے بہت جلدی بھیج دیا تھا خیر آپ جاسکتے ہیں۔“

”جی میم۔“ اثبات میں سر ہلا کر وہ پلٹا تھا کہ پھر رک گیا۔

”ایکسکیوز میم مجھے صیام کے بارے میں آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔“

”جی کہیں۔“ پھر ذرا نظریں اٹھا کر اس نے حنان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ قدرے نرم ہو گیا۔

”وہ بات دراصل یہ ہے کہ صیام کے حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں مطلب گھر کے حالات اس کے والد صاحب بستر پر پڑے ہیں۔ ان کی آنکھ کا آپریشن ہونا ہے اور کڈنی کا بھی اوپر سے چھوٹی بہن کے سسرال والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں مگر گھر کی یہ حالت ہے کہ ایک ٹائم کھانا پکتا ہے دوسرے ٹائم کا پتا نہیں ہوتا۔ ایسے میں وہ چاہ رہا ہے کہ اگر کمپنی کی طرف سے اسے کچھ قرض مل جائے تو اس کے مسائل تھوڑے کم ہو سکتے ہیں۔“

”ایم سوری مسٹر حنان کمپنی اس وقت کسی بھی ورکر کو قرض دینے کی پوزیشن میں نہیں۔“

”مگر وہ بہت زیادہ کی ڈیمانڈ نہیں کر رہا میم۔“ درمکنوں کے صفا چٹ جواب پر حنان نے ہلکا سا

احتجاج کیا تھا جب وہ خفگی سے بولی۔

”پینوں کی ضرورت انہیں ہے اور وکیل بن کر آپ میرے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں کیا ان کے منہ میں زبان نہیں ہے، دوسری بات، ممانے جتنا لٹانا تھا لٹا دیا، میں اس کمپنی میں ترقی کے لئے آئی ہوں ایسے ہر روز ہر دور کی ضرورتوں پر کان دھرتی رہی تو ہو گیا بزنس اب آپ جائیں پلیز مجھے بہت کام ہے۔“ تلخ لہجے میں بات مکمل کرتے ہی اس کی انگلیاں پھر حرکت میں آ گئی تھیں۔

حنان بے حد شکستہ دلی کے ساتھ اس کے آفس سے باہر آیا تھا۔ اسی شام ساویز کے ساتھ اس کا ڈر تھا وہ ملک سے باہر جا رہا تھا تبھی درمکنوں نے اسے ڈنر کی پیشکش کی جسے اس نے خندہ پیشانی سے قبول بھی کر لی

تھی۔

ساویز وائٹ کاٹن کے کرتا شلوار میں ملبوس جبکہ درمکنوں نے مکمل بلیک شلوار قمیض زیب تن کر رکھی تھی۔ ہلکے میک اپ کے باوجود اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ساویز جب اس کے سامنے آ کر بیٹھا تھا تو چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا تھا۔ ڈنر آرڈر کرنے کے بعد درمکنوں نے اس سے پوچھا تھا۔

”تمہاری تو شادی ہونے والی تھی ساویز پھر یہ اچانک سے دربدری کا بھوت کیوں سوار ہو گیا تمہارے سر پر۔“

”بس یار میں اس سے شادی نہیں کر رہا۔“

”مگر کیوں، تمہاری تو محبت کی شادی ہو رہی تھی۔“

”ہو رہی تھی نا پر اب نہیں ہو رہی۔“

”وہی تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اب کیوں نہیں ہو رہی؟“

”تم پوچھ کر کیا کرو گی؟“

”تمہیں سمجھاؤں گی اگر تم غلط ہوئے تو۔“

”میں غلط نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے تو پھر مجھے ساری بات بتاؤ، آخر چند دنوں میں ایسا کیا ہوا ہے جو تم شادی کے ساتھ ساتھ اپنی محبت سے بھی منکر ہو گئے ہو۔“ وہ جاننے کے لیے بضد تھی۔ ساویز نے نظریں اس کے خوبصورت چہرے سے ہٹالیں۔

”وہ میرے قابل نہیں ہے دری، ان فیکٹ میری بیوی بننے کے قابل نہیں ہے وہ۔“

”مگر کیوں؟“

”کیونکہ..... کیونکہ وہ ایک ایسی ماں کی بیٹی ہے جو شادی سے پہلے ہی ماں بن گئی تھی۔“

’وہاٹ.....؟‘

”ہوں..... وہ اسی عورت کی بیٹی ہے جس نے مریرہ آنٹی سے ان کا محبوب شوہر اور تم سے تمہارا محبوب باپ چھین لیا تھا۔“ ساویز کے الفاظ نہیں تھے کوئی ہم تھا جو اس کی سماعتوں پر گرا تھا۔ بھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”سچ کہہ رہا ہوں اس نے آج تک کبھی مجھے اپنی حقیقت نہیں بتائی اس روز میں تمہارے پرانے گھر گیا تھا تم سے ملنے مگر وہاں پہنچ کر خبر ہوئی کہ تم لوگ اپنا گھر تبدیل کر چکے ہو پانچ سال دیار غیر میں گزارنے کے سبب مجھے پتا ہی نہیں چل سکا کہ پیچھے کیا کیا تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ یونیورسٹی میں بھی تم مجھ سے ایک کلاس آگے تھیں اسی لیے کبھی کھل کر تمہاری زندگی پر بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مگر اس روز تمہارے گھر تمہارے پاپا کی تصویر مریرہ آنٹی کے ساتھ دیکھ کر میری آنکھیں حیران رہ گئی تھیں۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم سیدہ انکل کی حقیقی بیٹی ہو سکتی ہو میں تو پری کو ہی ان کی حقیقی بیٹی سمجھتا تھا اور اسی لیے میں نے اسے ایک لائف

پارٹنر کی حیثیت سے پسند کیا تھا مگر بعد میں بغیر کچھ جانے جب تم نے مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی اور انکل آنٹی کی دوری کی اصل وجہ بھی میرے سامنے لائیں تب میرے پیروں تلے سے زمین نکلی تھی بھلا میں سوچ بھی کیسے سکتا تھا کہ جس لڑکی کو اس کی عزت بچانے کے لئے مجبوراً صمید انکل نے اپنا نام دیا وہ لڑکی کوئی اور نہیں پر بیان کی سگی ماں سارہ آنٹی ہوں گی۔ میں بہت رویا تھا اس رات، اپنے ساتھ ہوئے تقدیر کے عجیب مذاق پر بہت گلے شکوے بھی کیے پوری رات دماغ اور دل کی جنگ میں الجھتا رہا اور بلا خرد دماغ جیت گیا۔ میں ایک ایسی لڑکی کو کسی طور پر اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا جس کا حوالہ ہی میرے لیے بے حد شرمندگی کا باعث ہو، محبت اپنی جگہ مگر میں اتنا اعلیٰ ظرف نہیں ہوں کہ اتنی بڑی بات نظر انداز کر دوں۔ میں اس مشرقی معاشرے کا عزت دار، مغزز شہری ہوں درہی، ایک داغدار لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے بھلا میں اپنی پوری زندگی داغدار کیسے کر سکتا ہوں۔“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ درمکنون گم صم اسے دیکھتی رہی۔ تبھی وہ پھر بولا تھا۔

”وہ میرے قابل نہیں ہے درہی، اسی لیے تمہارے پاس آیا ہوں، کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“ اب کے وہ چونکی تھی۔

”وہاں تم..... میں کیسے کر سکتی ہوں تم سے۔“

”کیوں، تم کیوں شادی نہیں کر سکتیں مجھ سے، مجھ میں کس چیز کی کمی ہے۔“

”بات کمی کی نہیں ہے ساویر، بات دل کی ہے میں نے تمہارے لیے کبھی کچھ خاص محسوس نہیں کیا اپنے دل میں۔“

”جانتا ہوں مگر یہ سب اس لیے تھا کیونکہ اس وقت میں کسی اور سے منسوب تھا۔ اب ایسی کوئی بات نہیں ہے لہذا تم ٹھنڈے دل و دماغ سے میرے بارے میں سوچ سکتی ہو، جتنا تم کہو گی انتظار کر لوں گا۔“

”ٹھیک ہے مگر ابھی میں گھر جانا چاہوں گی میرے سر میں اچانک سے بہت شدید درد شروع ہو گیا ہے۔“

”اوکے، چلو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“

”نہیں تم کھانا کھاؤ پلینز، میں تھوڑی دیر سڑکیں ناپتی ہوئی گھر جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“ وہ اس کے مزاج سے واقف تھا تبھی اس نے بحث کرنا مناسب

نہیں سمجھا۔

درمکنون الجھے دل و دماغ کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی۔

مریہ بیگم رات بہت دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی تھیں۔ وہ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے گھر آئی تو تھکن سے بے حال تھی تبھی مریہ بیگم نے اس کی کلاس لینے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ بنا کھانا کھائے وہ اپنے کمرے میں آ کر فوراً بستر میں دبک گئی تھی۔

اس وقت خنکی موسم میں نہیں اس کے وجود میں اتری ہوئی تھی۔ وہ عورت جس نے اس کی ماں کی زندگی اجاڑ کر رکھ دی تھی اس کی بیٹی آج بھی کتنی شان کے ساتھ اسی کے سگے باپ کی لخت جگر بن کر عیش کر رہی تھی۔ جو حق اس کا تھا وہ حق وہ استعمال کر رہی تھی۔ جائز اولاد ہو کر بھی اس کے حصے میں صرف محرومیاں آئی

تھیں جبکہ وہ ماں اور باپ کے ساتھ ساتھ اسی کے بھائی کے پیار کی بھی زندہ مثال بنی ہوئی تھی۔ کیوں؟ اس نے اپنے اندر ٹٹول کر دیکھا وہاں ساویر سمیت کسی مرد کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نے یونیورسٹی میں ساویر کے ساتھ ایک سال گزار کر بھی کبھی دل میں اس کے لیے کوئی خاص جذبہ محسوس نہیں کیا تھا۔

زاویار جیسے لڑکیوں سے الگ تھا بالکل ویسے ہی وہ مردوں سے شدید الگ تھی۔ پچیس سال اپنی ماں کی آنکھوں میں درد کی پرچھائیں دیکھنے کے بعد اس کے دل میں کسی مرد کے لیے کوئی نرم گوشہ پیدا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

مگر..... وہ پھر بھی ساویر کے لیے سوچ رہی تھی۔ کوئی جذبہ کوئی دلچسپی نہ ہونے کے باوجود وہ اس کے پر پوزل پر غور کر رہی تھی۔

پچیس سال پہلے جس عورت نے اس کی بے مثال ماں سے ان کا محبوب شوہر چھینا تھا آج اسی عورت کی بیٹی سے وہ اس کا ہونے والا محبوب شوہر چھین کر اپنے اندر سلگتی آگ کو بجھانے کا سوچ رہی تھی بے شک اسی میں اس کی جیت تھی۔



پانیوں پہ مت لکھو

پانیوں پر لکھنے کی عادتیں نہیں اچھی

ان پہ جو بھی لکھو گے

وصل ہو کہ فرقت ہو

درد ہو کہ لذت ہو

دانگی نہیں ہوتا

پانیوں کی تحریریں بے ثبات ہوتی ہیں

خوش گمان کرتی ہیں

بے نشان کرتی ہیں

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی جب زاویار گھر واپس آیا۔ لان کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ گاڑی پارک کرنے کے بعد باہر نکلا تو نظر سیدھی لان کی سیڑھیوں پر گھنٹوں پر سرنگائے بیٹھی پر بیان پر جا پڑی۔ وہ پونٹ اٹھا۔

بھلا رات کے تین بجے وہ وہاں بیٹھی کیا کر رہی تھی جبکہ اس نے آج تک اسے کبھی تہجد پڑھتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کی سمت بڑھا اور پھر چپکے سے اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔

”السلام علیکم! یہ دن بھر سونا اور رات میں آخری پہر تک جاگ کرتا رہے گنا کب سے شروع کر دیا۔“ وہ مانو بی بی نے۔ ”وہ تھکا ہوا تھا مگر اس نے اپنی تھکن اس پر ظاہر نہیں کی تھی۔ پر بیان نے اس کے قریب بیٹھنے پر اپنے آواز اندر اتار لیا۔“

”نہیں نہیں آ رہی تھی بھائی، اسی لیے یہاں آ کر بیٹھ گئی۔“

”آہم..... اب نیند بھلا آ بھی کیسے سکتی ہے شادی میں صرف ایک ہفتہ جو رہ گیا ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیسی بات ہے بتاؤ مجھے یہ تمہاری آنکھیں کیوں سوچی ہوئی ہیں کیا تم روتی رہی ہو پری؟“

”نہیں۔“

”جھوٹ مت بولو مجھے بتاؤ شاباش کیا بات ہے۔“ وہ بھند ہوا۔

پرہیان کے ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ آنسوؤں کا جوطوفان اس نے اب تک روک رکھا تھا وہ ایک

دم سے ابل پڑا۔

زاویار کے کندھے سے ٹیک لگاتے ہوئے وہ بلک بلک کر روئی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔

”پری، کیا ہوا، کسی نے کچھ کہا ہے سب ٹھیک تو ہے؟“ پرہیان میں اس کی جان تھی اور اس وقت اس

کے آنسوؤں نے اس کی جان پر بنا کر رکھ دی تھی۔ مگر وہ پروا کیے بغیر دل کھول کر روتی رہی یوں جیسے وہ مہربان کندھا پھر ملے گا ہی نہیں۔ زاویار چند لمحوں تک اس کی سسکیاں سنتا رہا پھر اس نے نرمی سے اس کا سر پکڑ کر اسے

خو سے الگ کیا۔

”مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ وہ اب سنجیدہ تھا۔

پرہیان نے نظریں پھیر لیں، اس کی آنکھیں جیسے جل رہی تھیں۔ عجیب بات تھی کہ وہ اس کو نہ اصل

حقیقت بتا سکتی تھی نہ کچھ چھپا سکتی تھی۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے ٹوٹے پھوٹے شکستہ لہجے میں بولی۔

”میں ساویز آفندی کے ساتھ شادی نہیں کر رہی بھائی۔“

”وہاٹ..... مگر کیوں تم تو اسے پسند کرتی ہو۔“

”ہوں مگر وہ مجھے پسند نہیں کرتا بھائی، اس نے آج تک مجھے دھوکے میں رکھا، جھوٹ کہا مجھ سے کہ وہ

مجھ سے پیار کرتا ہے حقیقت میں اسے میری ذات سے کوئی پیار نہیں تھا وہ جسٹ اس لیے مجھ سے شادی کرنا

چاہتا تھا کیونکہ میں ایک رئیس باپ کی اکلوتی بیٹی تھی اس کی نظر میں مگر جب اسے لگا کہ میں پاپا سے کچھ نہیں لوں

گی اس نے خود اپنے منہ سے مجھے ساری سچائی بتا دی۔ وہ بہت لالچی شخص ثابت ہوا بھائی مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا

کہ میں کیوں اتنے سالوں تک اس کے اندر کی بات نہیں جان پائی کیوں کھلونا بنی رہی میں اس کے ہاتھوں میں

کیوں یہ سمجھتی رہی کہ پیار ہی اس دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے جبکہ حقیقت میں پیار جیسی بے مول اور سستی

چیز دوسری کوئی نہیں۔“

”ایسا نہیں ہے تم نے کیوں کہا اس سے کہ تم پاپا سے کچھ نہیں لو گی؟“

”بس بوئہی اس کی محبت کی حقیقت جاننا چاہتی تھی اور اسی حقیقت نے مجھے منہ کے بل گرا دیا۔“

”نہیں، تمہیں رونے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں ابھی اپنے کمرے میں جا کر تھوڑا فریش

ہو کر بات کرتا ہوں اس سے۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”میں نہیں جانتا مگر میں اس رشتے کو ایسے ٹوٹے نہیں دوں گا۔“

”رشتہ ٹوٹ چکا ہے بھائی، میرے لیے اب دنیا میں ساویز آفندی نام کا کوئی شخص زندہ نہیں اب اس

شخص سے شادی میرے لیے موت کا دوسرا نام ہے۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو پری؟“

”ہاں۔“

”مگر میں تمہیں پاگل نہیں بننے دوں گا میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں گا اگر اس کی وجہ

سے دوبارہ ایک آنسو بھی آیا تمہاری آنکھوں میں۔“

”اب اس کی بھی ضرورت نہیں ہے بھائی، میں نے اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔“

”مگر میں اسے نہیں چھوڑوں گا تم کمرے میں جاؤ ابھی میں اسے کال کرتا ہوں شادی کوئی بچوں کا

کھیل نہیں، وہ بھی اس وقت جب سارے رشتہ داروں میں شادی کے کارڈز بٹ چکے ہیں۔“ وہ برہم تھا پرہیان

باکس ہاتھ کی ہتھیلی سے اپنی نم آنکھوں کو رگڑتی رہی۔

زاویار نے فریش ہونے کے بعد ساویز کا نمبر ملایا تو وہ بند جا رہا تھا اس کے گھر کال کرنے پر پتا چلا

کہ وہ تو ملک ہی چھوڑ گیا ہے بھی وہ پتھر ہو گیا تھا۔ بھلا دنیا میں یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی شخص اس کی اکلوتی لاڈلی

بہن اور صمد حسن جیسے کامیاب آئیڈیل انسان کی پیاری بیٹی کو یوں آسانی سے رد کر کے چلا جائے۔ انہونی سی

انہونی تھی۔

اگلے روز صبح ناشتے کی میز پر سارہ بیگم اور صمد صاحب کو بھی اس انہونی کی خبر ہو گئی تھی۔ دونوں اپنی

اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ بھلا ساویز ان کی بیٹی کے ساتھ ایسا کیسے کر سکتا تھا جبکہ ساویز کے باپ کا ہاتھ پکڑ کر

انہیں بزنس کی دنیا میں متعارف کرانے والے خود صمد حسن تھے اور یہ سب انہوں نے صرف اور صرف اپنی بیٹی

کی خوشیوں کے لیے کیا تھا جو ساویز کو یونیورسٹی لائف سے ہی پسند کر رہی تھی وہ سمجھتے تھے کہ پرہیان کو دنیا کی ہر

خوشی دے کر وہ درمکنوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا کفارہ کر لیں گے مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے مقصد

میں ناکام رہے تھے۔

پرہیان تیز بخار میں پھنک رہی تھی اور وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر فوراً ساویز کے گھر کی طرف نکل آئے

تھے۔ بھلا ایک دم سے ایسی کیا بات ہو گئی تھی جو شادی سے محض ایک ہفتہ قبل ساویز نے رشتہ ہی ختم کر دیا تھا۔

پورے رستے یہ سوال ان کے ذہن میں گونجتا رہا تھا۔ ایسے میں کب گاڑی ساویز کے گھر کے سامنے رکی انہیں

مطلق خبر نہ ہو سکی۔ ڈرائیور نے ہی انہیں مطلع کیا تھا۔

”آفندی صاحب کا گھر آ گیا ہے صاحب۔“ وہ چونکے اور پھر فوراً اثبات میں سر ہلاتے ہوئے

گاڑی سے نکل آئے۔

احمد آفندی صاحب طبیعت کی ناسازی کے باعث پچھلے تین چار روز سے گھر پر ہی آرام کر رہے تھے

تبھی ان کا استقبال خود آفندی صاحب نے کیا تھا۔ مسز سعدیہ آفندی بھی گھر پر ہی تھیں۔ صمد صاحب ڈرائنگ

روم لے جاتے وہیں اوڈنچ میں ٹک گئے۔

”آپ لوگ یقیناً حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں بنا اطلاع کیے یوں صبح ہی صبح کیسے نازل ہو گیا۔ مگر بات ہی کچھ ایسی تھی کہ میں خود کو روک نہیں پایا۔“ انہوں نے تمہید باندھی تبھی مسز آفندی بول اٹھیں۔

”جی نہیں، آپ کا اپنا گھر ہے آپ جب، جس وقت چاہیں یہاں آ سکتے ہیں ان شاء اللہ ہمارے گھر کے دروازے آپ کو ہمیشہ کھلے ملیں گے۔“

”میں جانتا ہوں شاید اسی لیے میں نے اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ اس گھر سے جوڑا تھا مگر ابھی جو بات میں سن کر آیا ہوں میرا دل اسے کسی طور تسلیم نہیں کر رہا۔“

”دل تو ہمارا بھی تسلیم نہیں کر رہا تھا جب ہم نے ساویز کے منہ سے انکار سنا تھا مگر اس نے جواز ہی اتنا مضبوط پیش کیا ہم چاہتے ہوئے بھی اس کے فیصلے کی مخالفت نہ کر سکے۔“ اس بار پھر مسز آفندی نے جواب دیا تھا۔ صمد صاحب کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔

”کیسا جواز؟“

”ہم بیان کر کے آپ کی بے عزتی نہیں کرنا چاہتے مگر چپ رہ کر آپ کی نظروں میں اپنا مقام بھی نہیں گرا سکتے اس لیے میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ سے معذرت کرنا چاہتا تھا۔“

”کیسی بے عزتی، آپ پلیر کھل کر بتائیں کیا معاملہ ہے۔“ احمد صاحب کے لب کھولنے پر وہ مزید بے چین ہوئے تبھی انہوں نے بتایا۔

”اس میں کوئی شک نہیں کہ پرہیان بہت اچھی بچی ہے مگر ہم اس رشتے سے اس لیے بے حد خوش تھے کیونکہ یہ ہمارے بیٹے کی خوشی تھی اس نے زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا تھا اسی لیے ہم سوالی بن کر آ کے گھر آ گئے مگر اس وقت ہم قطعی یہ نہیں جانتے تھے کہ پرہیان آپ کی سگی بیٹی نہیں، بلکہ کسی اور کا گناہ ہے، ساویز کو جانے کیسے یہ ساری کہانی پتا چل گئی کہ آپ نے اپنی بیوی اور سگی بیٹی کے حقوق سے منہ موڑ کر ایک داغدار عورت کو اپنا نام دیا اور معاشرے میں عزت دلائی، مگر حقیقتاً وہ عزت کے لائق نہیں تھی۔ اسی لیے ساویز نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے معاف کیجیے گا صمد صاحب ہم خود بھی ایسی لڑکی کو اپنے گھر کی زینت نہیں بنا سکتے جس کا وجود ایک سوالیہ نشان ہو۔“

”بس..... اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کروں گا۔“ احمد آفندی صاحب کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے صمد صاحب بوڑھے شیر کی مانند دھاڑے تھے۔

”میری بیٹی کا وجود گناہ نہیں ہے، نہ ہی کوئی سوالیہ نشان ہے، اس کی ماں ایک پاک باز عورت تھی اور ہے، میری زوجیت میں آنے سے پہلے ان کا نکاح ہو چکا تھا مگر یہ ان کی بد نصیبی تھی کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی غلطی کا شکار ہو کر بے نام و نشان رہ گئیں۔ ان کے سابق شوہر نے ان کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف ان کی پاکیزگی کو چیلنج کیا بلکہ بعد میں ایک چھوٹی سی بے بنیاد بات کا ایٹو بنا کر انہیں خود سے الگ کر دیا تبھی مجبوراً مجھے اپنا نام دینا پڑا انہیں، مگر یہ بات کسی طور پر درست نہیں کہ میں نے اپنی سگی بیٹی یا اس کی ماں کے ساتھ کوئی زیادتی کی تھی وہ خود مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔“ وہ بتانا نہیں چاہتے تھے مگر جذبات میں آ کر بتا گئے تھے۔ احمد آفندی صاحب اور مسز آفندی کا منہ دیکھنے والا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”وہی جو سچ ہے مگر اب مجھے کسی قیمت پر آپ لوگوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھنا میری بیٹی اتنی بے مول نہیں ہے کہ کوئی بھی اس کے وجود پر انگلیاں اٹھاتا پھرے اور میں چپ چاپ برداشت کرتا رہوں۔“ سخت خفگی سے کہتے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سے پہلے کہ آفندی صاحب یا ان کی بیگم ان سے کچھ کہہ پاتے وہ واپس پلٹ گئے تھے۔



زاویار گھر پر نہیں تھا۔ سارہ بیگم بھیگی پلکوں کے ساتھ لاؤنج سے اٹھ کر پرہیان کے کمرے میں چلی آئیں جو تکیوں کے سہارے بیڈ پر بیٹھی، ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر ان کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا تھا۔

”پری۔“ تڑپ کر اسے پکارتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی تھیں۔ پرہیان نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

”پری.....!“ وہ اب قریب آ کر بیٹھی تھی تبھی پرہیان نے آنکھیں کھول دیں۔

”کون پری ماما، ساری زندگی آپ مجھے پری پری کہہ کر دھوکہ دیتی رہیں اور میں، میں نے آپ کے لفظوں کے قریب میں آ کر واقعی خود کو ایک پری سمجھنا شروع کر دیا ایک ایسی پری جو محبت کے جادو کی چھڑی گھما کر کچھ بھی حاصل کر سکتی ہے مگر حقیقت یہ نہیں تھی حقیقت وہ تھی جو دنیا نے مجھے بتائی نہیں، بلکہ کسی طمانچے کی صورت میرے منہ پر ماری اور میں تڑپ کر رہ گئی۔“

”کیسی حقیقت۔“ سارہ بیگم کی آنکھیں نم تھیں مگر پرہیان نے ان کی آنکھوں میں دیکھنے کی بجائے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔

”خدا کا واسطہ ہے ماما میرے سامنے ایسی اداکاری مت کیا کریں جیسے آپ کو کسی حقیقت سے آشنائی ہی نہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کس حقیقت کی بات کر رہی ہوں، سالوں پہلے آپ نے دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان دراڑ پیدا کی ان کی زندگیوں میں زہر گھولا ایک عورت ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی جیسی ایک عورت کا گھر برباد کیا نہ صرف گھر برباد کیا بلکہ اس کے معصوم بچوں کو بھی تقسیم کر دیا ایک باپ کی محبت سے محروم ہوا تو دوسرا ماں کی کیوں صرف اپنا گناہ چھپانے کے لیے اپنی ناجائز اولاد کو ایک جائز نام دینے کے لیے۔“

”پرہیان۔“ اب تک خاموش بیٹھی سارہ بیگم اچانک دھاڑی مگر پرہیان نے پروا نہیں کی اس کی آنکھوں سے بہت روانی کے ساتھ آنسو بہہ رہے تھے۔

”دھاڑیں مت کیونکہ آپ کے دھاڑنے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی آپ کا کردار بدل نہیں جائے گا۔ آپ نے وہ کیا ہے ماما کہ مجھے آج آپ کو ماں کہتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔ ساری عمر اپنا گناہ چھپا کر اپنی ہی سگی اولاد سے جھوٹ بولتی رہی وہ میری ماں ہے جس کا کردار میرے لیے کسی گالی سے کم نہیں، وہ نہ ہی ماں ہے، آج جس کے حوالے نے مجھ سے میری پانچ سالہ محبت کو چھین کر مجھے اندھیروں کے سپرد کر دیا

ہے وہ میری ماں ہے، نفرت محسوس ہو رہی ہے مجھے آج آپ سے، خود اپنے آپ سے بار بار ہاتھ لے کر بھی میں اپنے وجود سے اٹھتی بساںد سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پار رہی یہ کس عذاب میں ڈال دیا آپ نے ماما کہ نہ جی پار رہی ہوں نہ مر رہی ہوں۔“ وہ بہت اذیت میں تھی۔ سارہ بیگم کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ساتھ ٹوٹ کر گر پڑے۔

”حقیقت وہ نہیں ہے جو تم جانتی ہو۔“

”ماما پلیر، بس کریں اب، مت بولیں کوئی اور جھوٹ مجھ سے سارے پردے اٹھ گئے ہیں اب اور کب تک مجھے بچی سمجھ کر بہلاتی رہیں گی آپ، میں جان گئی ہوں کہ کیوں آپ اور پاپا ایک ہی بیدروم میں نہیں رہتے، میں سب جان گئی ہوں ماما اب آپ کچھ بھی کہیں، جتنی قسمیں بھی کھائیں میں زندگی بھر کبھی آپ کی کسی بات کا اعتبار نہیں کر سکوں گی۔ نفرت محسوس ہو رہی ہے مجھے آپ سمیت ان تمام عورتوں سے جو صرف اپنی خوشی اور خواہش پر محض چند لمحوں کی راحت کے لیے ننھے ننھے معصوم پھولوں کو، دنیا کے اس بازار میں نمائش بنا کر رکھ دیتی ہیں، کبھی ان کا دل یہ سوچ کر نہیں پھٹتا کہ ان کے چند لمحوں کی لغزش ان کے وجود سے جنم لینے والے بچے کے لیے ساری عمر کا عذاب بن جائے گی۔ حالانکہ بچوں کا تو کوئی قصور نہیں ہوتا، وہ تو قدرت کے جائز طریقوں پر ہی دنیا میں آنکھ کھولتے ہیں، مگر پھر بھی ساری عمر کی سنگ باری ان کا مقدر بن جاتی ہے، پاپا تو اعلیٰ ظرف ہیں مگر زاویار بھائی..... کیا میری حقیقت جاننے کے بعد وہ مجھ سے پیار کریں گے۔ کبھی نہیں، جو بھائی آج مجھ پر جان چڑھتا ہے کل وہی میری اصلیت جاننے کے بعد مجھ پر تھوڑو کرے گا۔ کتنی عزت کرتا ہے وہ آپ کی مگر کل جب اسے پتا چلے گا کہ آپ اس کی سگی ماں نہیں ہیں بلکہ ان کی سگی ماں سے ان کا حق چھین کر انہیں زمانے میں در بدر کرنے والی ہیں تب سوچیں وہ آپ کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، آپ نے کسی کے ساتھ بھی اچھا نہیں کیا ماما، کسی کے ساتھ بھی.....!“ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روتے ہوئے اس نے اپنے اندر کی ساری بھڑاس نکالی تھی جبکہ اس کے مقابل بیٹھی سارہ بیگم کے آنسو جیسے برف ہو گئے تھے۔

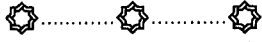
اس درجہ بدگمان ہوئی بیٹی کے سامنے بھلا ماضی کی کتاب گرد آلود اوراق پلٹنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟ وہ چاہتے ہوئے بھی اس وقت اپنی صفائی پیش کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔

زاویار جو ابھی کچھ منٹ پہلے ہی گھر واپس لوٹا تھا اور اپنے ساتھ پر ہیان کے بھی انگلیٹ کے سفر کے کاغذات مکمل کروا کر لایا تھا اس کے کمرے کی دہلیز پر ہی ساکت ہو گیا۔ یہ کیسی حقیقت تھی جس کا انکشاف پر ہیان صمد کر رہی تھی؟ یہ کیسا سچ تھا جس نے اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے تو آج تک یہی جانا تھا کہ دنیا میں اس کی ایک مہربان ماں اور ایک بہت پیاری سی بہن ہے جو کہ سارہ بیگم اور پر ہیان کی شکل میں اس کے سامنے تھیں مگر پر ہیان یہ کیوں کہہ رہی تھی کہ وہ سچ نہیں تھا۔ سچ وہ تھا جسے جاننے کے بعد وہ سارہ بیگم اور پر ہیان کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتا ایسا کون سا سچ تھا؟ اگر تھا تو اب تک وہ اس سے بے خبر کیوں تھا؟

صمد حسن کے علاوہ دوسرا کون تھا جو گزرے ہوئے ماضی کے گرد آلود اوراق پلٹ کر اسے اصل حقیقت بتا سکتا تھا؟ کیونکہ وہ جانتا تھا صمد حسن صاحب اسے کبھی وہ سچ نہیں بتائیں گے جو اس کے لیے جاننا اب بے حد

ضروری ہو گیا تھا۔ تبھی پتھر ہوئے اعصاب کے ساتھ وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا تھا۔



اس روز سنڈے تھا۔ عالمہ نے کچن کے چند ضروری کاموں سے فراغت کے بعد مشین لگالی۔

کرنل صاحب کی طبیعت اب پہلے سے کافی بہتر تھی تبھی سدید اپنے کسی ضروری کام کے سلسلے میں شہر سے باہر چلا گیا تھا۔ اس روز کافی دنوں کے بعد تھوڑی سی دھوپ نکلی تھی اور عالمہ نے اسی دھوپ کا فائدہ اٹھایا مگر وہ ابھی آدھے کپڑے بھی نہیں دھوپائی تھی کہ اچانک پھر آسمان پر گھنے بادلوں کا راج ہو گا تھا۔ سردی کی شدت میں بھی قدرے اضافہ ہوا تھا۔

تبھی اس کے ہاتھ مزید پھرتی سے چلتے ہوئے کپڑوں کے ساتھ دیگر کام بھی پنپانے لگے تھے۔ کرنل صاحب اس کی پھرتیاں دیکھ رہے تھے جانے کیوں کبھی کبھی اسے دیکھتے ہوئے انہیں مریرہ رحمان بہت شدت سے یاد آتی تھی۔ روزمرہ زندگی کے بہت سے معاملات میں عالمہ ہو بہو مریرہ کی کاپی تھی اس کی شخصیت میں بہت کچھ مریرہ سے ملتا جلتا تھا اس کی گفتگو کا انداز، اس کی سوچ، اس کے گھریلو کام پنپانے کے طریقے، اس کی چال سب میں مریرہ کا عکس تھا۔ انہیں لگتا تھا جیسے عالمہ کی صورت میں وہ اس گھر میں واپس لوٹ آئی ہو، بارش اچانک شروع ہو گئی تھی۔

چند روز قبل سدید قیمتی کبوتروں کا جوڑا لایا تھا وہ بھی اس وقت صحن میں رکھے چھوٹے سے پنجرے میں بھیگتے ہوئے پھڑ پھڑا رہے تھے مگر عالمہ کو فی الوقت ان پر توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ پور پور بارش میں بھیگی، بنا اپنے حلیے پر توجہ کیے وہ پھرتی سے اپنے کام پنپانے میں مصروف تھی جب اچانک بیرونی گیٹ پر ہونے والی دستک نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

وہ چونکہ گیٹ کے قریب تھی تبھی کرنل صاحب کو انھنے کی زحمت دیے بغیر اس نے فوراً آگے بڑھ کر خود ہی گیٹ کھول دیا۔ وہ جانتی تھی اس وقت سوائے سدید کے گیٹ پر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا مگر اس کا قیاس غلط ثابت ہوا تھا۔

گیٹ پر اس وقت سدید علوی کی بجائے زاویار حسن کھڑا تھا لائٹ گرے ڈریس پینٹ پر بلیک چیک دار شرٹ زیب تن کیے وہ خود بھی محض چند لمحوں میں ہی عالمہ کی طرح بارش میں بھیگ گیا تھا۔ وہ جہاں کی تہاں کھڑی اسے دیکھتی رہی تھی۔ بھلا وہ شخص جس کی گردن میں سریا فٹ تھا وہ اس کے گھر کی دہلیز پر کھڑا کیا کر رہا تھا؟ عالمہ نے دیکھا اس کی آنکھیں صاف دھول اڑاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

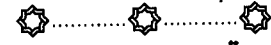
”کرنل صاحب ہیں گھر پر؟“ بنا دعا سلام کے قدرے خشک لہجے میں اس کے حلیے پر توجہ دیے بغیر وہ پوچھ رہا تھا۔ عالمہ نے فوری خود کو سنبھال لیا۔

”جی..... جی ہاں۔“

”مجھے ان سے ضروری کام ہے، کیا ابھی ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”شیوور۔“ وہ اس مغرور شخص کا اپنے گھر کی دہلیز تک چلے آنا ہی ہضم نہیں کر پار رہی تھی کہ کجا کہ اس کا لزل صاحب سے ضروری کام۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

تاہم اس نے خود کو گیٹ کے دائیں طرف سے سمٹتے ہوئے اسے اندر آنے کا راستہ دیا تھا۔ باہر اس وقت جتنی بھی تیز بارش برس رہی تھی زاویار حسن کے اندر برستی بارش سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتی تھی۔



”السلام علیکم۔“ عائکہ کی حیرانی کو قطعی کوئی اہمیت دیے وہ کرنل صاحب کے قریب آیا جو برآمدے میں بیٹھے باہر صحن میں ہونے والی بارش کا جائزہ لے رہے تھے۔ زاویار کے سلام پر انہوں نے قدرے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا جب عائکہ فوراً قریب چلی آئی۔

”یہ زاویار ہے بابا، صمید انکل کے بیٹے، برسوں بیرون ملک میں زندگی گزارنے کے بعد ابھی چند ہی روز پہلے پاکستان آئے ہیں مریرہ آئنی سے یقیناً ان کے بیٹے کا نام تو سنا ہوگا آپ نے۔“ عائکہ کے تفصیلی تعارف پر آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہوں نے زاویار کا بڑھا ہوا ہاتھ تھاما تھا۔
”وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو، کیسے آنا ہوا؟“

”کچھ ضروری کام تھا آپ سے۔“ کرنل صاحب کے مقابل کین کی کرسی سنبھالتے ہوئے اس نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔ کرنل صاحب نے آنکھ کے اشارے سے عائکہ کو وہاں سے رخصتی کا پیغام دے دیا۔
”ہوں کہو۔“ عائکہ کے جانے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

زاویار کا دماغ اس حد تک الجھا ہوا تھا کہ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی کہ وہ جو پوچھنا چاہتا ہے اس کی تمہید کیسے باندھے؟ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بالا خراس نے لب ہلائے تھے۔

”میں آپ کو اس موسم میں تکلیف دینے کے لیے معذرت چاہتا ہوں مگر حقیقت میں اس وقت میں اتنا پریشان ہوں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آپ کے سوا اور کس کے پاس جاؤں۔ اصل میں، میں نے ہمیشہ اپنے پاپا کے لبوں پر آپ کا ہی ذکر سنا ہے۔ آپ کے احسانوں کی وجہ سے وہ عائکہ کے ساتھ بھی بالکل حقیقی بیٹیوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں، میں جانا چاہتا ہوں کہ آپ ان کی زندگی کے بارے میں کتنا جانتے ہیں؟“
”یہ سوال تو تم اپنے باپ سے بھی کر سکتے تھے برخوردار۔“

”نہیں، ان سے اگر کر سکتا تو اتنے خراب موسم میں یہاں آنے کی خواری کبھی نہ اٹھاتا۔“ وہ واقعی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ کرنل صاحب نے اپنا وجود کرسی پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”کیا جانا چاہتے ہو صمید حسن کی زندگی کے بارے میں۔“

”سب کچھ، وہ ابتدا سے کیسے انسان ہیں آپ کے ساتھ ان کا کیا تعلق ہے۔ انہوں نے کتنی شادیاں کیں اور ان کے کتنے بچے ہیں سب؟“ وہ بے چین تھایوں جیسے اسے ہر حقیقت سے بے خبر رکھا گیا ہو۔ تبھی وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

”جتنا میں جانتا ہوں صمید شروع سے ایک نیک شریف فرماں بردار اور ایمان دار شخص ہے اس نے زندگی میں کبھی کسی معاملے میں بددیانتی نہیں کی وہ بہت کم عمر تھا جب اس کے ماں باپ کی رحلت کے بعد میں اسے یہاں اپنے گھر لایا تھا اپنا بیٹا بنا کر کیونکہ میرا اپنا سگا بیٹا عائکہ کا باپ یہاں سے کوسوں دور دیار غیر کی خاک چھان رہا تھا صمید کی نیکی اور شرافت نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں نے اپنی حقیقی بیٹی مریرہ رحمان کی شادی اس

کے ساتھ کر دی اسی کے لطن سے تم نے اور درمکنوں نے جنم لیا تھا مگر اس وقت وہ دونوں یہاں نہیں رہتے تھے صمید نے نیا نیا کاروبار شروع کیا تھا اور وہ مریرہ کو تمہاری پیدائش سے پہلے ہی یہاں سے لے کر چلا گیا۔“
”پھر۔“ اس کی بے چینی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ کرنل صاحب نے چند لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا۔

”پھر پتا ہی نہیں چلا کہ ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں نے جنم لینا شروع کر دیا وہ جو سانس بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر لیتے تھے دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئے میں ان دنوں اپنے بیٹے سکندر کے پاس تھا پاکستان واپسی پر مجھے پتا چلا تھا کہ صمید نے دوسری شادی کر لی اور مریرہ اسے چھوڑ کر جانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں گم ہو گئی اور تم بہت چھوٹے تھے ان دنوں وہ تمہیں ساتھ لے کر جانا چاہتی تھی مگر صمید نے تمہیں اس کے ساتھ نہیں جانے دیا وہ تمہاری وجہ سے اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں رکی، اس نے پلٹ کر کسی رشتے کی طرف نہیں دیکھا نہ میری طرف نہ تمہارے باپ کی طرف۔“

”اس کا مطلب میں مریرہ رحمان کا بیٹا ہوں، سارہ صمید حسن کا نہیں۔“ اس کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں۔ کرنل صاحب نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہوں تمہارے باپ کی دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔“
”تھینک یو، میں چلتا ہوں اب۔“ فوراً ہی اس نے اٹھنے کے لیے پرتو لے تھے جب کرنل صاحب بولے۔

”نہیں تم اس گھر میں پہلی بار آئے ہو چائے پیے بغیر میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دوں گا۔“
”ایم سوری کرنل صاحب میں اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں آپ کی چائے ادھار رہی مجھ پر، ابھی میرا جانا بہت ضروری ہے پلیز۔“ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتا وہ واقعی بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ کرنل صاحب نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

زاویار عائکہ کے گھر سے نکلا تو اس کی آنکھوں سے جیسے لہو نیک رہا تھا وہ دن اس نے جیسے پورا کیا تھا صرف وہی جانتا تھا۔ اگلے روز کی پہلی فلائٹ کے ساتھ اس نے پاکستان چھوڑ دیا۔ بنا کسی کو بتائے بنا کسی کو مطلع کیے۔ اپنا سیل بھی اس نے آف کر دیا تھا۔

صمید صاحب ایک اذیت سے نکلے نہیں تھے کہ دوسری گلے آ پڑی تھی۔ بار بار زاویار کے سیل پر کال کرنے کے بعد مایوس ہو کر انہوں نے عائکہ کو کال ملائی تھی جو گھر سے آفس کے لیے نکل چکی تھی۔

”السلام علیکم۔“ تیسری بیل پر ان کی کال پک ہوئی تھی۔
”وعلیکم السلام کیسی ہو بیٹا؟“

”میں فائن انکل آپ سنائیں۔“
”میں بھی ٹھیک ہوں اصل میں پچھلے دنوں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے مجھے گھر چکر لگانے کی فرصت ہی نہیں مل سکی۔ زاویار ٹھیک ہے ناب تمہارے ساتھ۔“

”جی انکل اس روز کے بعد دوبارہ انہوں نے مجھے پریشان نہیں کیا ویسے کل وہ خود کافی پریشان دکھائی

دے رہے تھے۔

”کل کب؟“

”کل جب وہ بارش میں پہلی بار ہمارے گھر آئے تھے بابا سے ملنے۔“

”بابا سے ملنے۔“

”جی انکل انہیں بابا سے کوئی بہت ضروری بات کرنی تھی وہ بہت ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ واپسی پر میں نے دیکھا ان کی آنکھوں سے جیسے ہونٹک رہا تھا۔“

”وہاٹ؟“

”جی انکل جو میں نے محسوس کیا وہ یہی ہے وہ شاید کسی بات پر بہت دل برداشتہ تھے۔“

”کرنل صاحب سے کیا بات ہوئی اس کی؟“

”پتا نہی، بابا نے مجھے وہاں ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔“

”اوکے اس وقت وہ کہاں ہوں گے؟“

”اپنے کسی ریٹائرڈ دوست کی طرف نکلے ہیں سیل بھی گھر پر ہی چھوڑ گئے۔“

”ٹھیک ہے میں شام میں چکر لگاؤں گا۔“

”شیور۔“

”اپنا خیال رکھنا خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ زاویار کی طرح عائکہ کو وہ بھی کافی پریشان لگ رہے تھے مگر وہ چاہتے ہوئے بھی ان

سے ان کی پریشانی کا سبب نہیں پوچھ سکتی تھی۔

زاویار اس روز آفس نہیں آیا تھا عائکہ کو بے حد مایوسی ہوئی۔ جانے کیوں وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی شاید صمد انکل کی وجہ سے یا شاید ان کی پریشانی کی وجہ سے۔ کچھ بھی تھا وہ کم از کم صمد حسن کو زندگی میں کبھی بھی پریشان نہیں دیکھنا چاہتی تھی اگر انہوں نے شام میں گھر چکر لگانے کا عندیہ نہ دیا ہوتا تو اب تک وہ ان کے گھر پہنچ چکی ہوتی۔ صمد حسن کی ذات کے ساتھ اس کی عقیدت کچھ اس قسم کی تھی۔

اس روز پہلی بار وہ پورے دن آفس میں خود کو زاویار حسن کا انتظار کرنے اور اپنی سیٹ سے اٹھنے تک اس کے بازے میں سوچنے سے باز نہیں رکھ سکی تھی۔



شام ڈھل چکی تھی۔ سدید گھر واپس آیا تو بے حد تھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ عائکہ کچن میں تھی اور کرنل صاحب صمد حسن صاحب کے ساتھ باہر لان میں نشست سنبھالے بیٹھے تھے۔ وہ کچھ دیر ان کے پاس رک کر کچن میں چلا آیا تھا۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام، آگئی گھر کی یاد؟“

”ہوں۔“

”بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو، پیدل چل کر آئے ہو کیا؟“

”ہوں یہی سمجھ لو، دونوں بازو سینے پر باندھے ہوئے اس نے سلیب سے ٹیک لگائی تھی۔ عائکہ نے چائے کپوں میں انڈیلی۔“

”چائے پیو گے؟“

”ہوں، مگر پہلے ہاتھ لوں گا، بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“

”ٹھیک ہے تم پہلے ہاتھ لے لو میں تب تک روٹی ڈال لیتی ہوں پھر مل کر ڈنر کرتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم کھانا لگاؤ میں آتا ہوں ابھی فریش ہو کر۔“ تھکے تھکے سے لہجے میں کہتا وہ انہی قدموں پر واپس پلٹ گیا تھا۔

عائکہ چائے کے ساتھ شامی کباب اور چکن رول لے کر باہر لان میں چلی آئی۔ کرنل صاحب اور صمد حسن نے جونہی اسے آتے دیکھا فوراً چپ سادھ لی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ دونوں اس کے سامنے کوئی بات نہیں کرنا چاہتے تبھی چائے سرو کر کے وہاں بیٹھنے کی بجائے فوراً واپس پلٹ آئی تھی۔ صمد حسن اب کرنل صاحب سے کہہ رہے تھے۔

”آپ جانتے ہیں میں پہلے بھی غلط نہیں تھا پھر بھی وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اب وہی کہانی اس کا بیٹا دہرا رہا ہے۔“

”اس کا قصور نہیں ہے تم نے ایک بار پھر غلطی کی ہے صمد، اتنے سال اسے حقیقت سے بے خبر رکھ کر یہی غلطی تم نے مریرہ کے معاملے میں کی تھی۔“

”میں مجبور تھا انکل، تب بھی مجھے یہی خوف تھا کہ سچ جاننے کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر نہ چلی جائے اور اس نے یہی کیا۔ زاویار کے معاملے میں بھی میں اسی خوف کا شکار تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی حقیقی ماں کے بارے میں جانے اور پھر اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہو، میں مریرہ رحمان کی واحد نشانی کو کسی طور خود سے دور ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔“

”غلط سوچ تھی تمہاری، تم جانتے ہو سچ کبھی چھپتا نہیں ہے۔“

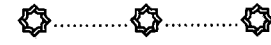
”جی میں جانتا ہوں اور میں نے سوچ رکھا تھا جیسے ہی پری کی شادی ہو جائے گی میں اسے خود سب سچ بتا دوں گا۔ وہ مجھے تھوڑی مہلت تو دیتا۔“

”اب کیا کیا جا سکتا ہے جو سچ تم نے برسوں اس سے چھپایا وہ اسے پتا لگ گیا کسی بھی ذریعے سے مجھ سے تو وہ صرف تصدیق کے لیے پوچھنے آیا تھا اور میں نے تصدیق کر دی۔“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میں زندگی میں ہمیشہ جس چیز کو کھونے سے ڈرتا ہوں وہی چیز مجھ سے کھو جاتی ہے۔ جس نقصان سے بچ کر چلنا چاہتا ہوں وہی نقصان ہو جاتا ہے۔“ صمد صاحب کا لہجہ بے حد آزرہ محسوس ہو رہا تھا۔ عائکہ ملول سی کچن میں چلی آئی۔

تو یہ وجہ تھی صمد حسن اور زاویار صمد حسن کے پریشان ہونے کی؟ باہر لان میں کرنل صاحب اب صمد صاحب کو تسلی دے رہے تھے وہ کچن میں کھڑی کتنی ہی دیر تک ان کی آزمائشیں ختم ہونے کے

دعا کرتی رہی۔



بارشوں کے موسم میں وہ جو اپنے کمرے کی
کھڑکیوں کو بند کر کے

بادلوں کے جانے کا انتظار کرتے ہیں
وہ بھی اک زمانے میں

بارشوں کی بوندوں سے کھیلنے رہے ہوں گے
چودھویں کی راتوں میں جلد سونے والوں کی

چاندنی سے ماضی میں دوستی رہی ہوگی
حسن و عشق کی باتیں آج واسطے جن کے

کچھ وقعت نہیں رکھتیں۔
بھولے بسرے لمحوں میں

ٹوٹ کر کسی کو وہ چاہتے رہے ہوں گے
وہ جو اپنے غم پہ بھی آنکھ نم نہیں کرتے

کل کسی کی خاطر وہ خوب رو چکے ہوں گے
درد آشنا ہو کر اشک کھو چکے ہوں گے۔

”کل زاور یار آیا تھا ہمارے گھر۔“ سدید شاور لے کر آیا تو عائکہ نے کچن میں ٹیبل پر کھانا سیٹ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ کرنل صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لہذا وہ صمد حسن صاحب کے رخصت ہوتے ہی اپنے کمرے میں سونے چلے گئے تھے۔ سدید ایک دم سے چونکا۔

”دہاٹ؟“

”ہوں بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ کہہ رہا تھا بابا سے ضروری کام ہے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا بابا گھر پر تھے وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ مجھے بابا نے پاس بیٹھنے نہیں دیا۔“

”اچھا کیا، تمہارا پاس بیٹھنا بنتا بھی نہیں تھا۔“ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ عائکہ خاموشی سے اسے کھانا ڈال کر دیتی رہی۔

”ویسے بابا سے بھلا کیا ضروری کام ہو سکتا ہے اسے؟“ پہلا نوالہ توڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

”میں جانتی ہوں۔“

”کیا؟“

”کل تک نہیں جانتی تھی مگر آج صمد انکل کی باتوں سے پتا چلا کہ انہوں نے اب تک زاور سے یہ

بات چھپا رکھی تھی کہ وہ مریرہ پھوپھو کا بیٹا ہے پتا نہیں کہاں سے اسے اس بات کا پتا لگ گیا، تبھی وہ پاپا سے تصدیق کرنے آیا تھا اور بابا نے اسے سب سچ بتا دیا۔ یقین کرو سدید، جب وہ واپس جا رہا تھا اس کی آنکھیں جیسے لہو پٹکا رہی تھیں۔“

”ہوں، انسان جب اس طرح کے حادثات سے گزرتا ہے تو یونہی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے اندر۔“

”شاید تم صحیح کہہ رہے ہو، اسی لیے وہ آج آفس بھی نہیں آیا۔“

”تم نے ویٹ کیا تھا؟“

”ہاں۔“ قطعی بے خبری میں وہ کہہ گئی تھی۔

سدید نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔

”کیا تمہیں اب اس سے ہمدردی ہو رہی ہے؟“

”نہیں۔“ فوراً سے پیشتر وہ سنبھلی تھی۔ سدید خاموش ہو گیا۔

”تم جانتے ہو میرا دل بہت چھوٹا ہے میں کسی کو بھی دکھی نہیں دیکھ سکتی اسپیشلی ماں کے لیے کیونکہ میں جانتی ہوں بہت چھوٹی سی عمر میں ماں کو کھونے کا درد کیا ہوتا ہے؟“

”مجھ سے بہتر نہیں جان سکتیں۔ تمہیں پتا ہے جس روز میں اسکول جاتے ہوئے ماموں کے گھر سے

بھاگا تھا تب میرے ذہن میں ایک ہی پلان تھا نہر میں کود کر مر جانے کا تاکہ میری ماما کو خبر ملتی تو وہ مجھے کھودینے

پر روتی۔ ان دنوں میرا ایک دوست نہر میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ میں نے اس کی ماں کو دیکھا تھا وہ بہت اذیت

میں تھیں۔ بہت رو رہی تھیں میں چاہتا تھا میری ماں بھی روئے یونہی روئے اگر اس روز میرا کرنل صاحب کی

گاڑی سے ایکسیڈنٹ نہ ہوتا اور وہ مجھے اپنے ساتھ یہاں گھر نہ لاتے تو جانے میں کب کا کچھ نہ کچھ کر کے مر

چکا ہوتا۔“

”جانتی ہوں یہاں آنے کے بعد بھی بابا کے لاکھ سمجھانے کے باوجود تم خودکشی کے مختلف طریقوں

پر سوچتے رہتے تھے۔ وہ تو شکر ہے ہماری آپس میں دوستی ہو گئی اور ہم دونوں ہی کسی حد تک اپنا اپنا غم بھول گئے

وگر نہ پتا نہیں اب تک کیا ہو گیا ہوتا۔“

”ہوں ٹھیک کہا تم نے۔“ اس گئی بھوک ختم ہو چکی تھی وہ اب چائے پی رہا تھا عائکہ سامنے بیٹھی میز کی

سطح کھرتی رہی۔

”میری چھٹی ختم ہو گئی ہے اگلے تین دنوں کے بعد مجھے جاب پر واپس جانا ہے۔“ کچھ ہی لمحوں کے

بعد اس نے موضوع بدلا تھا۔ عائکہ نے فوراً اسے دیکھا۔

”اتنی جلدی؟“

”ہوں، اوپر سے کال آ گئی ہے بابا چاہتے ہیں کہ جانے سے پہلے میں تمہیں اپنے نام کی رنگ پہنا

کر جاؤں۔“

”اور تم کیا چاہتے ہو؟“

”وہی جو تم چاہو گی۔“

”آہم..... پھر میں تو چاہتی ہوں کہ تم نکاح کر کے جاؤ۔“

”ریلی۔“ وہ حیران ہوا تھا عالمہ نے مسکرا کر شرارت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ہوں ریلی۔“

”پھر میں رخصتی بھی ساتھ کراؤں گا۔“ وہ اس کی شرارت سمجھ گیا تھا عالمہ کھل کر ہنس دی۔

”تم سے یہی امید ہے مجھے۔“

”ہونی بھی چاہیے تم جانتی ہو میری زندگی میں تمہاری کیا اہمیت ہے بہر حال یہ رنگ دیکھو کیسی ہے بہت تھکا ہوں آج اس مشن پر مگر کوئی دل کو چھو ہی نہیں رہی تھی۔“ اس کا موڈ تبدیل ہو چکا تھا عالمہ نے سکون کا سانس لیا۔

سدید کے ہاتھ میں گولڈ کی نفیس سی رنگ تھی جس کے درمیان میں دو دل بنے ہوئے تھے اور ان دلوں کے اندر بہت چھوٹے چھوٹے سے دھڑکنے پیرے جڑے تھے۔ عالمہ سدید کی پسند پر عیش عیش کر رہی تھی۔

”واؤ، یہ تو بہت خوبصورت ہے۔“

”ہوں، مگر تمہارے ہاتھوں سے زیادہ نہیں۔“ وہ بہت پر شوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ عالمہ کا دل بہت تیزی سے دھڑک اٹھا۔

اس وقت سدید کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنے خوبصورت رنگ چھلک رہے تھے کہ وہ ایک سرسری سی نظر سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکی تھی۔

وقت کروٹ لے رہا تھا، کردار بدل رہے تھے۔ محبت پھر درد کا چولا پہن کر اس گھر کی دلیلیز پر آ بیٹھی تھی کہ جہاں کبھی انہی در و دیوار نے صمد حسن اور مریرہ رحمان کے درمیان خوبصورت جذبات کو پروان چڑھتے دیکھا تھا۔



شام ڈھل چکی تھی۔ سامنے لگے سکھ چین کے پیڑ پر موجود پرندوں نے سورج کی دھم ہوتی کرنوں کے ساتھ ہی اپنے اپنے گھونسلوں میں واپسی کا سفر شروع کر دیا تھا۔

مریرہ نماز سے فارغ ہوئی تو لاؤنج میں ٹیبل پر دھرے سیل نے اچانک زور و شور سے بجنا شروع کر دیا۔ اسے پہلا گمان یہی گزرا کہ درمکنوں کی کال ہوگی مگر اسکرین پر عمر کا لنگ جلاگا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ وقت عمر کی بے حد مصروفیت کا تھا اس کے باوجود اگر اس نے کال کی تھی تو یقیناً کوئی بہت ضروری بات تھی۔ تبھی اس نے فوراً سے پیشتر کال پک کی تھی۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔“

”کیسی ہو؟“

”ویسی ہی جیسی بیس پچیس سال پہلے تھی۔“

”جانتا ہوں تم کبھی بدل نہیں سکتیں۔“

”تم کیوں چاہتے ہو کہ میں بدل جاؤں۔“

”بس یونہی کبھی کبھی دل میں خواہش اٹھتی ہے کہ تمہیں ہنستا مسکراتا آباد دیکھوں۔“

”یہ خواہش تو سالوں سے میرے اندر بھی تمہارے لیے سرخ رہی ہے۔ مگر تم نے کبھی میری خواہش پر کان نہیں دھرے۔“

”ایسی بات نہیں ہے مریرہ۔“

”پھر کیسی بات ہے، کیا مجھے تمہاری زندگی کے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں۔“

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو کیا میں نے کبھی ایسا کہا؟“

”نہیں مگر تم نے میری خواہش کو تکمیل بھی نہیں بخشی۔“

”تمہاری اور میری خواہش میں بہت فرق ہے مریرہ۔“

”ایسا صرف تم سوچتے ہو مگر نہ حقیقت میں تم بھی جانتے ہو کہ ایسا نہیں ہے بہر حال کیسے یاد کیا اس وقت۔“

”تم جانتی ہو تمہیں یاد کرنے کے لیے وقت کا حساب کتاب نہیں رکھتا۔“

”ہوں جانتی ہوں مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ وقت تمہارے لیے بے حد مصروفیت کا وقت ہوتا ہے

غالباً اس وقت تمہارے ہوٹل پر کسٹرز کا زیادہ رش ہوتا ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میں نے تم پر کبھی مصروفیت کو اہمیت نہیں دی۔“

”جانتی ہوں مگر یہ بھی سچ ہے کہ تم نے ہمیشہ بہت ضروری بات کے علاوہ کبھی گپ شپ کے لیے فون نہیں کیا۔“

”ہوں یہ تو ہے، کیا کروں تم سے اور تمہارے غصے سے ڈر جو لگتا ہے۔“

”بس رہنے دو اب بتاؤ پلیز کیا بات ہے؟“

”تم بور ہو رہی ہو؟“

”نہیں۔“

”بور ہو بھی رہی ہوتی تو مجھے فرق نہیں پڑتا کیونکہ تم بہت اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میرا تم پر کتنا حق ہے بہر حال میں جانتا ہوں تم سے سسپنس برداشت نہیں ہوتا، پیٹ کی اور صبر کی بہت ہلکی ہو تم۔“

”آج کے لیے اتنی تعریف کافی ہے۔“ عمر کے الفاظ نے اسے چڑایا تھا وہ کھل کر ہنس دی۔

”او کے اچھا غور سے سنو قمر بھائی کی بیٹی شہرہ پاکستان آ رہی ہے اسے حویلی اور گاؤں کے بارے میں جاننے کا بہت شوق ہے۔ ویسے تو بھابی نے اسے ساری کہانی بنا رکھی ہے مگر وہ پھر بھی حویلی جانا چاہتی ہے۔

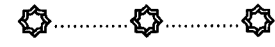
میں نے اپنے طور پر اسے سمجھانے اور وہاں جانے سے باز رکھنے کے لیے بہت کوشش کی ہے مگر وہ کچھ بھی سمجھنے اور ماننے کو تیار نہیں اسے حویلی کے اندر دفن کردار بہت بے چین رکھتے ہیں۔ تبھی اس کے جنون کو دیکھتے ہوئے

میں نے اسے حویلی اور قمر کے کمرے کی چابی دے دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہاں حویلی سے قریب ہی اس کی کوئی دوست ہادیہ اور اس کی فیملی قیام پذیر ہے۔ وہ وہاں انہی کے گھر رہ لے گی۔ بھابی اسے اس کے لیے

اجازت نہیں دے رہی تھیں مگر میری سفارش پر وہ مان گئی ہیں۔ شاید وہ خود بھی شہزاد کے ساتھ ہی پاکستان آئیں۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کیونکہ تم خود بھی آج کل پاکستان میں ہو، ان کا بہتر خیال رکھ سکتی ہو۔“

”ہوں تم فکر نہ کرو، وہ جیسے ہی پاکستان پہنچیں گی میں انہیں جوائن کر لوں گی۔“
”شکریہ، گڈ گرل۔“

”گڈ گرل، اب عمر رسیدہ خاتون میں ڈھل چکی ہے جناب۔“
”ڈھل گئی ہوگی مگر میرے تصور کی دنیا میں تم ہمیشہ الہز میا رہی رہو گی۔“ وہ سنجیدہ ہوا تھا۔ مریرہ نے سر آہ بھرتے ہوئے چپکے سے کال کاٹ دی۔
پرانے زخموں کو کریدنے اور کرید کرید کر ہوا دینے کا اب کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔



وسیع حویلی کا بڑا کشادہ سا گیٹ کھلا تھا۔ اس نے حسرت زدہ سی ایک نظر سامنے شان سے سر اٹھائے کھڑی پرانی عمارت پر ڈالی اور قدم آگے بڑھا دیے۔
زرد خشک پتوں سے اٹا حویلی کا بڑا سا صحن اپنی بربادی کا ماتم مناتا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صحن کے بیچوں بیچ کھڑا برگد کا بوڑھا درخت اب جیسے سالوں کی ویرانی سے ہراساں ہو کر ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔
اس کی آنکھوں سے کئی آنسو ایک ساتھ ٹپک پڑے۔ یہ اس کی بزرگوں کی جاگیر تھی۔ وہ جاگیر..... جس نے اس خاندان کے بہت سے قیمتی افراد کو موت کی گہری نیند سلا دیا تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے ”عمر عباس“ سے اس حویلی میں قیام کی اجازت طلب کی تھی۔ صرف چند روزہ قیام..... اس سے زیادہ شاید وہ حویلی کسی کو اس بھی نہیں آتی تھی۔

سارا صحن خشک پتوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ برگد کے پیڑ کے تنے کے ساتھ ٹپک لگاتی، بنا اپنے شفاف کپڑوں کی پرواہ کیے وہیں نیچے زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ کبھی وہاں اس صحن میں کتنی رونق ہوتی ہوگی۔
بچپن میں اس پر مشتمل اس حویلی کے کلین وہاں کتنے خوش باش رہتے ہوں گے۔ کیا کیا نہیں ہوتا ہو گا ان کے درمیان..... شادی بیاہ..... تہوار..... رسم و رواج..... آتے جاتے موسموں کی خوبصورت بہاریں.....
کیا انہوں نے کبھی سوچا ہوتا کہ ایک دن یہ آشیانہ یوں بکھر جائے گا۔ پرانی یادگار بن جائے گا۔ شاید نہیں..... انہیں تو اس کا گمان بھی نہیں ہوگا۔

عمر عباس ان سے بڑے خضر عباس..... پھر اس کے بابا قمر عباس..... کتنے مضبوط ستون ہوں گے وہ اس حویلی کے مگر وقت کی آندھی نے بہت بے دردی سے ان مضبوط ستونوں کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ ایسا طوفان آیا تھا اس حویلی کے مکینوں کی زندگی میں کہ سب کچھ بکھر کر رہ گیا تھا کچھ بھی سلامت نہیں بچا تھا۔

اظہار عباس صاحب اور زلیخا بی بی کے کردار محبت سے گندھے تھے۔
تقسیم ہند سے پہلے زلیخا بی بی جو اپنے والد کی اکلوتی اولاد اور صاحب جائیداد تھیں، اظہار صاحب کی پسند پر حویلی کی چھوٹی بہو بن کر وہاں آ گئی تھیں۔ اس وقت حویلی میں اظہار صاحب کے بڑے بھائی

وقار عباس اور چھوٹی بہن زبیدہ بی بی بی قیام پذیر تھے۔ وقار عباس کو خدا نے بیٹی جیسی رحمت سے محروم رکھا تھا۔ وہ صرف چار بیٹوں کے باپ تھے اور بیٹی کے لیے زلیخا بی بی کے ساتھ شادی کے خواب دیکھ رہے تھے مگر زلیخا بی بی کے والد نے وقار عباس کی بجائے اظہار عباس کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا تھا جس کا وقار عباس کو بے حد ملال تھا۔ انہوں نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا کر زلیخا بی بی کے والد کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے بھائی اظہار کے لیے بھی دل میں کینہ اور بغض پالنا شروع کر دیا۔

اظہار صاحب کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹوں خضر عباس، نظر عباس، عمر عباس اور قمر عباس کے ساتھ ساتھ ایک عدد بیٹی شگفتہ سے بھی نوازا تھا۔ خضر عباس اور نظر عباس کی شادی خاندان میں ہی ہوئی تھی۔ دونوں کے ایک ایک بیٹا اور ایک ایک بیٹی تھی۔

عمر مریرہ رحمان میں انٹرنل تھا۔ مریرہ کی شادی سے پہلے ہی وہ اپنی تعلیم کے سلسلے میں ملک سے باہر چلا گیا تھا اور پھر مریرہ کی شادی کے بعد ہی اس کی گاؤں واپسی ہوئی تھی۔ خضر عباس اور نظر عباس دونوں اظہار صاحب کے ساتھ کھیتی باڑی میں دلچسپی رکھتے تھے۔ دونوں بے حد سادہ اور مزاج کے شریف تھے۔

عمر تھوڑا جذباتی اور غصے والا تھا جبکہ قمر بے حد شوخ اور اپنے سارے رشتوں سے ٹوٹ کر محبت کرنے والا انسان تھا۔ اس کی نسبت بچپن سے ہی اس کی اکلوتی چھوٹی زبیدہ کی بیٹی نورین کے ساتھ ملے تھے۔ نورین، زبیدہ بی بی کی اکلوتی بیٹی تھی اور اس کا مزاج بے حد گرم اور غصیلا تھا تاہم وہ بچپن سے ہی قمر پر فدا تھی اسی لیے زبیدہ بی بی نے خود اپنے بھائی کے سامنے جھولی پھیلا کر قمر کو ان سے مانگ لیا۔ قمر کی منگنی کے بعد اظہار صاحب نے عمر کی بات بھی طے کر دی۔

وہ ابھی پڑھ رہا تھا جب انہوں نے بغیر اس سے اس کی مرضی پوچھے اس کی بات خضر عباس کی چھوٹی سالی شاہدہ عرف شادو کے ساتھ طے کر دی۔ نورین کی طرح وہ بھی عمر پر جان دیتی تھی اور عمر اس کی اس دیوانگی پر چڑھتا تھا۔

شگفتہ کی شادی اظہار صاحب نے وقار عباس کے سب سے چھوٹے بیٹے ریاض کے ساتھ طے کر دی تھی۔ ریاض شگفتہ کی بجائے نورین پر عاشق تھا جو اس کی اکلوتی چھوٹی بیٹی اور کئی مربعوں کی اکیلی وارث تھی۔ مگر زبیدہ بی بی نے اسے اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے پسند نہیں کیا اور اسے اسی بات کا رنج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قمر کی منگنی کے بعد وقار صاحب نے اپنی زمینیں اظہار صاحب کے حصے کی زمینوں سے الگ کر لی تھیں۔

جن دنوں اظہار صاحب کے والد بیمار تھے وقار صاحب کی بیوی نے ان کی بہت خدمت کی تھی تبھی وہ ان سے بہت خوش تھے مگر اپنی جائیداد کی تقسیم میں انہوں نے اپنی کسی اولاد کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی۔

یہ الگ بات تھی کہ ان کی زندگی میں حویلی کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ وقار صاحب چاہتے تھے کہ چونکہ ان کی بیوی نے ان کے والد کے آخری دنوں میں ان کی بہت خدمت کی تھی اسی لیے اس حویلی پر صرف ان کا حق تھا مگر اظہار صاحب کی رائے تھی کہ اگر ان کے والد نے اپنی زندگی میں اس حویلی کا فیصلہ صرف وقار صاحب کے حق میں نہیں کیا تو وہ قانونی طور پر اپنے والد کی اس جاگیر میں برابر کے حصے دار ہیں۔ زبیدہ بی بی بھی انہیں کے موقف کی حامی تھیں۔ یوں ان دونوں بھائیوں کے درمیان ایک اور دیوار کھڑی ہو گئی۔

اپنی نفرت اور حسد میں وقار صاحب ہمیشہ اپنے بھائی کو نیچا دکھانے کی کوششوں میں مصروف رہتے تھے۔ کئی بار جب ان کی فصل اچھی نہیں ہوتی تھی تو وہ اپنے بیٹوں کو کہہ کر اظہار صاحب کی تیار کھڑی فصل میں آگ لگوا دیتے اور اگلی صبح ہمدرد بن کر افسوس کرنے چلے جاتے۔ اظہار صاحب کے بیٹوں کو اپنے تایا کی ساری مکروہ حرکتوں کا علم تھا مگر وہ صرف جھگڑے سے بچنے کے لیے خاموش رہتے تھے۔ وقار صاحب کے چاروں بیٹے جتنے غصیلے اور جھگڑالو تھے اظہار صاحب کے چاروں بیٹے اتنے ہی شریف اور صلح جو تھے۔

زمینوں کی تقسیم کے بعد وقار صاحب نے رہائش بھی نئی حویلی میں رکھ لی تھی۔ مگر اپنے بھائی کی بربادی اور انہیں دھول چٹانے کی خواہش کبھی ان کے دل سے ختم نہیں ہو سکی تھی اور بالآخر ان کی اس خواہش نے سب کچھ راہ کر دیا تھا۔

پرانی حویلی اجڑ گئی تھی۔ وہاں حویلی کے مکین ماضی کا حصہ بن گئے تھے۔

شہر زاد کی آنکھوں سے خاموش آنسو نکلے تو پھر بہتے چلے گئے تبھی ہادیہ (جو اس کی عزیز از جان دوست تھی) نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔

”بس کرو شہر و گزرے ہوئے لمحوں پر رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“

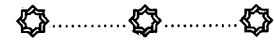
”جانتی ہوں مگر یہ میرے بس میں نہیں ہے۔“ بائیں ہاتھ کی تھیلی سے آنسو رگڑے ہوئے وہ کھڑی ہو گئی۔

”یہ بیڑ دیکھو ہادیہ یہ دادی نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا بہت پیار تھا دادی کو اس پیڑ سے..... ان کا کہنا اور ماننا تھا کہ یہ درخت اور اس پر بیٹھنے والے پرندے اس گھر میں خیر و برکت کا باعث ہیں وہ اپنا زیادہ تر وقت اسی پیڑ کے نیچے قرآن پاک پڑھنے یا حویلی کے صحن میں پھدکتے پرندوں کو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ڈالنے میں صرف کیا کرتی تھیں۔“ شہر زاد کی بھیگی آنکھوں کے آنسو کسی جگہ کی مانند ہی دکھائی دے رہے تھے۔ ہادیہ نے آگے بڑھ کر کافی سارے خشک پتے مٹھی میں سمیٹ لیے۔

”شام سر پر آرہی ہے شہر، بہتر ہوگا اگر ہم مغرب سے پہلے پہلے حویلی کی صفائی کر لیں تمام کمرے تو لاکھ ہیں۔ صرف قمر انکل کے کمرے کا دروازہ ان لاک ہے وہ بھی شاید عمر انکل کے استعمال میں رہا ہوگا بہر حال جب تک انٹی نانو کے پاس بیٹھی ہیں ہم جلدی جلدی سارے پتے اور گرد سمیٹ لیتے ہیں۔“

”ہوں۔“ ہادیہ کی ہدایت پر شہر زاد فوراً آنسو خشک کرتی آگے بڑھ گئی تھی۔

یہ مٹی کی محبت تھی جو ایک مدت کے بعد اسے دیار غیر سے کھینچ کر اس حویلی میں گھسیٹ لائی تھی۔ کون جانتا تھا کہ آزاد فضاؤں میں پرورش پانے والی وہ لڑکی یوں سالوں بعد اپنی ماں کے ساتھ انہی فضاؤں میں بسنے کے لیے آجائے گی۔



کبھی مشکلوں کا تھا سامنا کبھی راحتوں میں گزر گئے
وہ جو دن تھے میرے شباب کے تیری چاہتوں میں گزر گئے
کبھی رازداں نے ستم کیا کبھی خود رقیب سے جا ملے
وہ جو لمحے تھے میرے پیار کے وہ رقابتوں میں گزر گئے



در پہچوں سے کبھی بے ساختہ جھانکوں
بنا آہٹ کے دروازوں کو کھولوں
کبھی یوں ہی پلٹ کر راہ دیکھوں
کہ جیسے کوئی پیچھے آ رہا ہے
میرے چاروں طرف سرگوشیاں ہیں
جھلک دیتی ہوئی کتنی شب ہیں
میرے آگے میرے پیچھے سے گزریں
میں چونکوں، سانس روکوں کانپ جاؤں
مگر اگلے ہی پل چاروں طرف سے
حقیقت کے اندھیرے لوٹ آئیں
مجھے جھنجھوڑ کر باد کر آئیں
ادھر تو دور تک کوئی نہیں ہے
ابھی آہٹ تو ابھری تھی شجر سے
کوئی پنچھی تھا دروازے کے پیچھے
زمین پر رنگ برسے تھے گھٹا سے
کسی تتلی کے پر اُلجھے ہوئے تھے
در تپے سے کوئی جھانکا تھا تارا
یہاں کب کوئی آیا تھا ہمارا؟

یہاں کب کوئی آیا تھا ہمارا؟



اس رات حویلی میں کیا ہوا تھا؟

رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی مگر شہر زاد کو نیند نہیں آ رہی تھی تبھی وہ باہر لان میں چلی آئی تو مجبوراً ہادیہ کو بھی اس کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر آنا پڑا۔ شب کی خاموش فضا میں سبک روی سے چلتی ہوئیں اسے کپکپانے پر مجبور کر رہی تھیں مگر شہر زاد کے خیال سے وہ پتھر بنی، بنا سردی کی پروا کیے اس کے پہلو میں بیٹھی رہی۔ اسی دوران اس نے شہر زاد سے پوچھا تھا۔

”اس رات حویلی میں کیا ہوا تھا شہر زاد؟ کیا تھا اس رات میں ایسا کہ جس پر تمہارے خاندان کا کوئی فرد کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں۔“ وہ یہ سوال پہلے بھی کئی بار پوچھ چکی تھی مگر شہر زاد نے اسے جواب نہیں دیا تھا۔ وہ جواب دیتی بھی کیسے اس کی ماں نے کبھی اسے اس رات کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا۔ اب تک اپنی ماں سے اس نے حویلی اور حویلی کے مکینوں کی جتنی کہانی سنی تھی وہ بس ایک طوفانی رات پر آخر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک ایسی رات جس میں تباہی ہی تباہی تھی مگر کوئی بھی اسے اس رات کی حقیقت بتانے کو تیار نہیں تھا نہ اس کی ماں شہر بانو اور نہ ہی تایا عمر عباس..... تبھی اس کی روح بے چین تھی۔

ہادیہ کے نیٹ پر ملنے سے قبل اس کی کسی سے بھی دوستی نہیں تھی، وہ زیادہ وقت اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی یا پھر بے مصرف سوچوں میں..... وہ سوچیں جو صرف پاکستان میں موجود پرانی حویلی کے گرد طواف کرتی تھیں، وہ پرانی حویلی جو اس کے بزرگوں کی جاگیر تھی اور جس سے ملحقہ احاطے میں اس حویلی کے تمام مکینوں کی آخری آرام گاہیں بھی تھیں۔

اس کے دادا اظہار ملک، دادی زلیخا بی بی، بڑے تایا خضر عباس، چھوٹے تایا نظر عباس، اس کے بابا قمر عباس سب ایک ساتھ ابدی نیند سو رہے تھے۔ اس حویلی کی نشانیوں میں سے اگر کوئی باقی بچا تھا تو وہ صرف عمر عباس تھا جسے مریدہ رحمن کے عشق کے بعد اس حویلی کے اجڑنے کا درد برباد کر گیا تھا۔

ایک ٹانگ میں ہلکی سی معذوری کے بعد جس میں وقت سے لڑنے کی ہمت ہی ختم ہو گئی تھی۔ کشادہ حویلی سے ملحقہ احاطے میں اس کی اکلوتی پھوپھو شگفتہ بی بی کی آخری آرام گاہ بھی تھی۔ کبھی بھری جوانی میں راہِ عدم کو سدھار گئے تھے۔ وہ درد سے سمار نہ ہوتی تو اور کیا کرتی؟

”پلیز بتاؤ نا شہر زاد! اس رات حویلی میں کیا ہوا تھا؟“

”پتا نہیں، مجھے اس رات سے آگے کی کوئی بات بتانے کو تیار نہیں، اسی لیے میں یہاں آئی ہوں۔ یہاں کوئی تو ایسا ہوگا جسے حویلی کی کہانی معلوم ہوگی جو حویلی پر اچانک سے ٹوٹنے والی قیامت کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا۔“

”ممکن ہے ایسا ہو لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو؟“

”نہ ہوا تب بھی میں کہانی ادھوری چھوڑ کر پاکستان سے نہیں جاؤں گی، میں جان کر رہوں گی کہ میرے بزرگوں کے ساتھ کیا ہوا تھا؟“

”ہوں، مجھے اس مشن میں ہمیشہ تم اپنے ساتھ پاؤ گی۔“

”شکریہ ہادی! میں واقعی نہیں جانتی تھی کہ انٹرنیٹ پر مجھے تم جیسی پیاری، مخلص دوست مل جائے گی۔“

”ہوں جانتی تو میں بھی نہیں تھی کہ ہوا کے دوش پر جس لڑکی کی دکھی شاعری سن سن کر میں اس کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہوں وہ ایک روز واقعی یوں حقیقت بن کر مجھ سے سچ سچ آن ملے گی۔ قسم سے شہرہ میں اتنی خوش ہوں تمہیں حقیقت میں دیکھ کر کہ تم میری خوشی کا صحیح اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔“ وہ واقعی بے حد مسرور تھی، شہر زاد زیر لب مسکرا دی۔

کالج لائف کے دوران ہی اس پر شاعری کے دورے پڑنے شروع ہوئے تھے اور یوں اس نے اپنے اندر کے غبار کو لفظوں کے پیرہن میں لپیٹ کر مختلف ریڈیو اسٹیشنز کی خصوصی نشریات کی زینت بنانا شروع کر دیا۔ یہیں ریڈیو ڈونچے ویلے جرمنی کے ایک پروگرام میں اس کی ہادیہ سے دعا سلام ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ دعا سلام گہری دوستی میں بدل گئی۔ ہادیہ کے دل کو شہر زاد کے نام اور اس کی شاعری میں چھپے عجیب سے درد نے بے حد متاثر کیا تھا۔ سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اس کے لبوں پر بس ایک ہی نام ہوتا تھا ”شہر زاد۔“

گھر والے شہر زاد نامی لڑکی سے اس کی اتنی محبت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکے تھے اور گھر میں لوگ ہی کتنے تھے۔ ایک بڑے بھائی عاشر جن میں ہادیہ کی جان تھی، ایک ان کی بیوی حائقہ، جن کے ساتھ ان کے جان سے پیارے بھائی نے پسند کی شادی کی تھی۔ ایک ان کی تین سال بیٹی عرشہ، جو ہادیہ سے بے حد کلوز تھی۔ ایک چھوٹا بھائی عشارب جو حال ہی میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا اور جس کی اپنی ہی ایک علیحدہ دنیا تھی اور سب سے آخر میں بے حد مشفق اور پیار کرنے والی نانو، جنہوں نے ان تینوں بہن بھائیوں کو ماں بن کر پالا تھا اور کبھی حقیقی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی۔

گھر کے یہ ٹوٹل چار افراد ہی ہادیہ کی پوری کائنات تھے کیونکہ وہاں پیار تھا، محبت تھی، امن تھا اور سب سے بڑھ کر گھر میں ہادیہ کو بے حد اہمیت دی جاتی تھی، بے حد چاہا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے نیٹ پر ملنے والی اپنی عزیز دوست شہر زاد کو سمندر پار سے اپنے گھر بلوا لیا تھا۔ وال کلاک اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہا تھا جب ہادیہ نے بمشکل جمائی روکتے ہوئے شہر زاد سے پوچھا۔

”کیا آج تمہیں نیند نہیں آ رہی؟“

”نہیں، کیا تمہیں آ رہی ہے؟“

”ہوں، مگر تمہیں یوں چھوڑ کر میں نہیں سو سکتی۔“

”تم پاگل ہو ہادیہ! اور کچھ نہیں۔“

”وہ تو میں ہوں۔“ شہر زاد کے مسکرا کر اٹھ کھڑے ہونے پر وہ بھی مسکرا دی اور پھر دونوں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔



اگلی صبح خاصی روشن تھی، بہت دنوں کے بعد پھیلی ہلکی ہلکی سی دھوپ نے جیسے ہر چیز کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ ہادیہ اور شہر زاد ابھی ناشتے سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ مریدہ ان سے کال پر ایڈریس لے کر وہاں پہنچ گئی تھی۔

عشارب گھر پر نہیں تھا جبکہ ہادیہ کی بھابی بھی اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر والوں سے ملنے گئی ہوئی تھی تبھی مریدہ کی ملاقات وہاں ہادیہ کی نانو سے ہوئی تھی۔ ہادیہ کی نانو کے حویلی والوں سے ماضی میں بہت اچھے تعلقات رہے تھے، اسوشلی وہ شہزاد کی دادی زلیخا بی بی کی بہت اچھی جاننے والوں میں سے نکل آئی تھیں تبھی قمر عباس کی بیوی کے ساتھ ساتھ انہیں مریدہ سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔

مریدہ شہر بانو اور شہزاد کو لینے آئی تھی، شہزاد کی خواہش حویلی میں قیام کی تھی مگر مریدہ نے اس کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دیا۔ وہ شام ڈھلنے سے پہلے ہی انہیں ہادیہ کے گھر سے لے کر نکل آئی تھی۔ گاڑی وسیع روڈ پر فل اسپید کے ساتھ بھاگ رہی تھی جب شہزاد نے مریدہ سے پوچھا۔

”دری! کیسی ہے مریدہ پھوپھو؟“

”ٹھیک ہے، اکثر تمہارا پوچھتی ہے، تمہیں یاد کرتی ہے۔“ یکسوئی سے ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے شہزاد کو جواب دیا تھا۔ شہر بانو چپ چاپ گاڑی کے باہر کے مناظر میں کھوئی رہیں۔

”میں بھی اسے بہت یاد کرتی ہوں، آفٹر آل وہ میری بچپن کی بہترین دوست ہے۔“ شہزاد کے چہک کر کہنے پر اس کے لبوں نے چند ساعتوں کے لیے بے ساختہ خاموشی اختیار کی تھی۔

”عمر بتا رہا تھا تم پاکستان اور حویلی میں انٹرسٹڈ ہو۔“

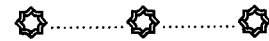
”جی پھوپھو! میں نے بہت پہلے سے سوچا ہوا تھا کہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان ضرور آؤں گی اور پھر وہیں رہوں گی اپنی پرانی حویلی میں۔ اس حویلی میں جہاں میرے بزرگوں کی آرام گاہیں ہیں، جہاں میرے بابا کو عین عالم شباب میں موت کی نیند سلا کر مٹی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ میں جانا چاہتی ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا تھا حویلی میں جس نے میرے خونی رشتوں کے سارے چراغ بجھا ڈالے۔ میرے دادا، دادی، میرے تایا، میری پھوپھو سب کو ابدی نیند سلا دیا، آخر ان کا کیا قصور تھا؟ اگر کوئی قصور تھا تو پھر میرے بابا کی پہلی بیوی کو کیوں کچھ نہیں کہا گیا، وہ کہاں گئیں؟“

”تم یہ سب جان کر کیا کرو گی؟“

”کچھ نہیں، صرف بدلہ لوں گی جن لوگوں نے میرا خاندان تباہ کیا میں انہیں پھانسی کے پھندے تک لے جاؤں گی۔“

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے شہر! تمہیں کیا لگتا ہے تمہارے عمر اکل نے کچھ نہیں کیا ہوگا؟“

”کیا ہوگا، مگر وہ انصاف کے حصول میں کامیاب نہیں ہوئے، میں آپ کو کامیاب ہو کر دکھاؤں گی، ان شاء اللہ۔“ وہ صرف جذباتی نہیں بزم بھی تھی۔ مریدہ نے اس بار خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ پرانی حویلی کے رازوں کو حل کرنا بھلا اتنا آسان کہاں تھا۔



آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ شہزاد کے شہر کوچ کرنے کے بعد ہادیہ کی زندگی پھر سے پرانی روٹیں پر آ گئی تھی۔ صبح سے شام تک کلوہو کے نیل کی طرح گھر کے کام کاج میں جتے رہتا اور رات میں تھک ہار کر سو جاتا۔

عمر کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ پچھلے چار پانچ سال سے سعودیہ میں مقیم تھا اور اکیلا سارے گھر کی کفالت کا بوجھ اٹھا رہا تھا کیونکہ تعلیم مکمل کرنے کے باوجود عشارب کو ابھی کوئی اچھی جاب نہیں ملی تھی۔ اس رات اس کی سعودیہ رواجی کی فلائٹ تھی تبھی ہادیہ بے حد اداس تھی۔ رات دیر تک وہ تینوں بہن بھائی نانو کے پاس بیٹھے، گزرے ہوئے وقت کی باتیں دہراتے رہے تھے۔ عمر نے والدین کی وفات کے بعد عشارب اور ہادیہ کو کبھی ماں باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ اپنی مشکلات کی پروا کیے بغیر اس نے ان دونوں کی ہر خواہش کو پورا کیا تھا تبھی دونوں بہن بھائی اس سے بے حد اُلجھ تھے۔

اس کی محبت کی وجہ سے اس گھر میں اس کی بیوی کی حیثیت کسی مالکن سے کم نہیں تھی۔ اپنے بہن بھائیوں اور نانو کی طرح عمر اپنی بیوی اور بیٹی پر بھی جان چھڑکتا تھا، اور کیوں نہ چھڑکتا، جیسے بہن بھائیوں کے ساتھ اس کا خون کا رشتہ تھا بالکل ایسے ہی بیوی بھی اس کی پسند کی تھی جس کے ساتھ اس کا دل جڑا ہوا تھا۔ عمر کی بے تحاشا دیوانگی اور سپورٹ نے ہی اسے بہت زیادہ ڈھیل دے رکھی تھی۔ وہ گھر میں عمر کے علاوہ اور کسی کو بھی منہ نہیں لگاتی تھی، زیادہ وقت اس کا اپنے کمرے میں ہی گزرتا البتہ عمر کی عدم موجودگی میں عشارب اس کے سارے کام سرانجام دینے کی ڈیوٹی سنبھالتا اور کیوں نہ سنبھالتا آخر اس کی چھوٹی بہن تانیہ میں اس کی جان جو اٹکی ہوئی تھی۔ عشارب نے بھائی کی شادی پر ہی اسے دیکھا تھا اور بس تب سے ہی دل ہی دل میں وہ اسے پسند کرنے لگا تھا مگر نانو اور ہادیہ ابھی اس سے بے خبر تھیں۔

عمر کی فلائٹ کا ٹائم ہو گیا تھا، وہ عشارب اور ہادیہ کو ہمیشہ کی طرح ڈھیروں نصیحتیں کر کے، نانو کا خیال رکھنے کی تلقین کرتا ایر پورٹ کے لیے نکل گیا تھا، عشارب بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ہادیہ اس رات بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔



تھکن حد سے سواتھی۔ جاب کی تلاش میں جو تیاں چنچلتے یہ اسے دوسرا ہفتہ تھا مگر منزل تھی کہ ملنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اوپر سے پچھلے تین روز سے اس کی بایک خراب تھی جس کی وجہ سے وہ پبلک ٹرانسپورٹ سے سفر کر رہا تھا۔

صبح سے ہلکی ہلکی ہوتی پھوار نے اس کے آفس سے نکلتے ہی اچانک تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا، عشارب کی پریشانی مزید بڑھ گئی۔ تیز بارش میں ایک دوا سٹاپ بدل کر جس وقت وہ گھر پہنچا اس کے کپڑے پور پور بارش میں بھگ چکے تھے۔

ہادیہ بچن میں تھی۔ وہ سرسری سی ایک نظر اس پر ڈالتا نانو کے کمرے کی طرف چلا آیا جو حسب معمول مغرب کی نماز کے بعد ذکر و اذکار میں مصروف تھیں۔ عشارب بھیکے جوتوں اور کپڑوں کی پروا کیے بغیر سیدھا جا کر ان کی گود میں لیٹ گیا۔

”آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں نانو؟“

”ہوں، تمہاری گھر واپسی کا انتظار کر رہی تھی، آج لیٹ ہو گئے؟“

”جی نانو، بارش کی وجہ سے بس نہیں مل رہی تھی

”واقعی، کہاں وہ ناکس لڑکی اور کہاں یہ گندے کبوتر۔“

”نانو دیکھ رہی ہیں آپ اسے؟“ وہ تپا، نانو نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”تم دونوں کبھی سدھرو گے یا میں یہ حسرت لے کر ہی دنیا سے چلی جاؤں گی۔“

”دنیا سے جانے سے پہلے اسے تھوڑی سی تمیز سکھا جائے گا نہیں تو سسرال میں جو تیاں کھائے گی۔“

”تم اپنا اخلاق بہتر کرو، میری فکر میں کڑھ کڑھ کر دبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”شکل دیکھو اپنی جا کر آئینے میں۔“

”عشارب! تمیز سے بات کرو، بڑی ہے وہ تم سے۔“ اس بار نانو نے ڈپٹا، وہ سلگ اٹھا۔

”بس آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتی رہنا، اسی لیے تو اتنی سرچڑھی ہوئی ہے یہ، جنگلی بلی کہیں کی۔“

خفگی سے کہتا وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، پیچھے نانو تا سرف سے اسے دیکھتی رہ گئیں۔



بہت دنوں کے بعد ہلکی ہلکی دھوپ بکھری تھی، کرنل صاحب نے لان میں کرسیاں لگوا لیں۔ عائلہ گھر پر نہیں تھی وہ مارکیٹ گئی ہوئی تھی، سدید فریش ہونے کے بعد لان میں ہی چلا آیا۔

”کیسے ہو برخوردار!“ سدید پر نظر پڑتے ہی انہوں نے سامنے پھیلا اخبار سمیٹ کر سائیڈ پر رکھا۔ سدید نے ان کے سامنے والی کرسی سنبھال لی۔

”ٹھیک ہوں بابا! بس تھوڑی سی تھکن فیل ہو رہی تھی تو دیر تک سو یا رہا، عائلہ کہاں ہے؟“

”مارکیٹ گئی ہے گھر کی کچھ ضروری چیزیں لانی تھیں اسی لیے آفس سے چھٹی کر لی۔ تم نے منگنی کی

بات کی اس ہے؟“

”جی بابا بہت خوش ہو رہی تھی۔“

”بہت اچھی بیٹی ہے عائلہ!“ کرنل صاحب کے لبوں پر صرف ایک پل کے لیے ہلکی سی مسکان آئی پھر سمٹ گئی۔

”تم نے اپنے مشن کے بارے میں بتایا اسے؟“

”نہیں بابا! وہ بہت حساس ہے میں فی الحال اس سے کچھ بھی شیئر نہیں کرنا چاہتا۔ اسے ابھی یہی پتا

ہے کہ میں آئی ایس آئی جوائن کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہوں، یہ راہ بہت کٹھن ہے سدید! اس راستے پر آبلہ پا چلنے والوں کے نشان کبھی کبھی صحرا کی اڑتی ریت کے ذروں سے ملتے ہیں۔“

”جانتا ہوں بابا! مگر میرے حوصلے کمزور نہیں، اپنے وطن اور اپنے دین کی سربلندی کے لیے اگر میرا

جسم خاک کے ذروں کی نذر بھی ہو جائے، ٹکڑوں میں بھی بٹ جائے تب بھی میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ یہ حق کا

راستہ ہے اور میں راہ حق کا مسافر..... شہادت میری منزل ہے بابا پھر منزل کی طرف بڑھنے کا خوف کیسا۔“

”راہ حق کے مسافروں کو خطرات کا خوف نہیں ہوتا میرے بچے۔“

”ٹھیک کہا آپ نے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے میری ایک ہی خواہش ہے اپنے وطن اور

پریشان نہ ہوں۔“

”ہوں بتایا تھا مگر بچے چاہے جتنے بھی بڑے اور سمجھدار ہو جائیں، ماؤں کے دل ان کی فکر میں دھڑکنے کبھی نہیں بھولتے۔“

”بالکل صحیح کہا آپ نے، بھابی کہاں ہیں؟“ وہ اب سائیڈ پر بیٹھ کر بھیکے جوتے اتار رہا تھا۔ نانو کی انگلیاں جو تیج کے دانے گرا رہی تھیں ایک دم سے ختم گئیں۔

”عاشر کے ساتھ باہر کھانا کھانے گئی ہے۔“

”کیوں..... آج گھر میں دال پکی ہے کیا؟“

”نہیں، مٹن پلاؤ اور کوٹھے پکائے ہیں ہادیہ نے مگر اس کا موڈ نہیں تھا گھر کھانا کھانے کا۔“

”چلیں کوئی بات نہیں، ان کی حالت بھی تو ایسی ہے کہ گھر میں گھٹن محسوس ہوتی ہوگی پھر عاشر بھائی بھی تو کل جاب پر واپس چلے جائیں گے، آپ ایویں ان کی طرف سے دل خراب نہ کیا کریں۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے اس کی طرف سے دل خراب کرنے کی جو اسے اور اس کے شوہر کو اچھا لگے کرتے پھریں، میری بلا سے۔“ نانو کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی، وہ مسکرا دیا۔

”ہادیہ کی دوست کا چلہ پورا ہوا کہ نہیں؟“ اٹھتے اٹھتے اس نے یونہی سرسری سا پوچھ لیا تھا، جیسی وہ دوپٹے سے گیلے ہاتھ خشک کرتی وہیں چلی آئی۔

”کتنی بار کہا ہے تمہیں میری دوست کا ذکر احترام سے کیا کرو۔“

”کیوں؟ تمہاری دوست کیا کسی ملک کی وزیر خارجہ ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”ہونہہ..... شکل دیکھی ہے اس کی وزیر خارجہ والی؟“

”دیکھی ہے، تم سے تو ہزار گنا زیادہ پیاری ہے۔“

”بس..... یہی خوش فہمی اور بدزبانی تم لڑکیوں کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔“ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی، نانو نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔

”تم کہاں کے مولانا صاحب ہو، صرف تمہاری وجہ سے

اپنے دین کی سر بلندی، یہ زندگی تو اللہ نے جنت کے بدلے خرید لی ہے بابا! بس مجھے دکھ ہوتا ہے جب میں غیر مسلموں سے یہ سنتا ہوں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو دہشت گردی کی تعلیم دیتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ان بد بختوں کو تاریخ کے اوراق پلٹ کر دکھاؤں جب فتح مکہ کے موقع پر ہمارے پیارے آقا حضرت محمد ﷺ نے تمام بدترین کافروں کے لیے عام معافی کا اعلان فرمایا، نہ صرف عام معافی کا اعلان فرمایا بلکہ اپنے بدترین دشمنوں کو اپنی جان سے پیاری ہستیوں کے قتل بھی معاف کر دیئے حالانکہ وہ دن بدلہ لینے اور گردنیں کاٹنے کا دن تھا بالکل ویسے ہی جیسے کافر مسلمانوں کے ساتھ کرتے تھے مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اپنی کورس کی کتابوں میں مسلمان بادشاہوں کی تاریخ پڑھی ہے بابا کہ کیسے ہزاروں سال مختلف خطوں پر حکمرانی کے باوجود انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ بہترین انسانیت کا سلوک روا رکھا۔ ان کے حقوق کو اہمیت دی۔ امن اور انصاف کی بہترین مثالیں رہتی دنیا تک کے لیے قائم کیں مگر یہ ہمارے اندر کا نفاق اس نے ہمیں کہیں کانہیں چھوڑا بابا! ہمارے شاندار ماضی کو خاک میں ملانے والے ہم خود ہیں، آپ دیکھیں ہم نے خود اپنے بچوں کے کورس کی کتابوں سے مسلمانوں کی تاریخ، پاکستان کی ابتداء کی کہانی، ارض وطن کے نئے خطے کے بانیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور مظالم کے اسباق اتنی ہوشیاری اور آسانی سے اڑا دیئے کہ کسی کو بڑے پیمانے پر اتنی بڑی رونما ہونے والی تبدیلی محسوس ہی نہیں ہوئی۔ ہم نے اپنے بچوں کو اپنی شاندار تاریخ اور اپنے ساتھ ماضی میں ہونے والی زیادتیوں سے محروم کر دیا۔ ہمیشہ کے لیے بے خبری کی برزخ میں دھکیل دیا اور آپ جانتے ہیں ہم نے ایسا کیوں کیا؟ اپنے دشمنوں کو خوش کرنے کے لیے ان کی خوشنودی کے لیے۔“ وہ خاصا دلبر داشتہ تھا، کرنل صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

”مجھے ساری دنیا میں امن و سلامتی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے امریکہ اور اس کے حامیوں کی کھلم کھلا دہشت گردی کا دکھ نہیں ہے بابا! مجھے دکھ ہے تو اپنوں کی غلامی کا، اپنوں کی غداري کا، آپ دیکھیں گیارہ ستمبر 2009ء کو تباہ ہونے والے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کا نقصان امریکہ کا نقصان تھا اس ملک کا جو کبھی ہمارا خیر خواہ اور وفادار نہیں رہا جس نے ہمیشہ ہمارے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑا کر ہمیں عظیم ترین نقصانات سے دوچار کیا جس نے ہمیشہ ہماری مجبور یوں سے فائدہ اٹھا کر ہمارے مقابلے میں ہمارے دشمن کی مدد کی مگر ہم نے کیا کیا بابا! اسی امریکہ کو خوش کرنے کے لیے ہم نے اللہ اور اللہ کے پیارے رسول محمد ﷺ کے نام لیواؤں پر زندگی اور انسانیت کے دروازے بند کر دیئے۔ مہمان ملک کے سفیر سمیت ہم نے چوزوں کی طرح شب کے اندھیروں میں اپنے ہی شہری پکڑ پکڑ کر ان کی بولی لگا دی اور ایک ایک فرد، ایک ایک جان کے دام وصول کر لیے۔ ہم نے کیوں نہیں سوچا کہ حاکم اعلیٰ اللہ رب العزت کی پاک ذات ہے، امریکہ نہیں۔ ہم نے کیوں اپنی سرحدیں خود اپنے ہی ملک کی تباہی اور نقصان کے لیے استعمال ہونے دیں؟ وہ جنگ ہماری جنگ تو نہیں تھی پھر ہم نے اپنوں کو اس کا ایندھن کیوں بنا دیا؟ جس کام کے ذمہ دار محض چند لوگ یا کوئی ایک گروہ تھا اس کی سزا پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کو کیوں ملی؟ کیوں ہم نے غیر دشمن ممالک کی ایجنسیوں کو اپنے ملک میں گھسنے دیا، اسی وقت پکڑ کر سر کیوں نہیں کچلا ان کا؟“ وہ اب روہانسا ہو رہا تھا، کرنل صاحب کے اندر کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔

”جب میں نے فوج جوائن کی تھی تو میرے بھی اس وطن کی مٹی کے لیے ایسے ہی جذبات تھے،

سدید! میرے خون میں اتنی ہی گرمی تھی جو قربانیاں اسلام کے لیے برصغیر کے لٹے پٹے مسلمانوں نے دیں، اس کے بعد قائد اعظم کو پختہ یقین تھا کہ ان کا جہاز جب ارض وطن پر لینڈ کرے گا تو جہاز میں سوار تمام افسران سرزمین پاکستان پر قدم رکھتے ہی اللہ رب العزت کے حضور سجدے میں گر پڑیں گے مگر ان کا یقین چوٹ کھا گیا نئی سرزمین پر نئے خواب اور نئی توقعات لے کر اترنے والے تمام افسران سجدے میں گر کر اپنے پاک رب کا شکر ادا کرنے کی بجائے اپنے اپنے حصے میں آنے والی اراضیوں کے پیچھے دوڑ پڑے۔ تبھی قائد نے فرمایا تھا کہ ”افسوس میرے حصے میں سارے کھوٹے سکے ہی آئے ہیں۔“ انہی کھوٹے سکوں نے بعد میں اس عظیم انسان کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی ارض وطن کے کونے کونے میں اپنے ایمانوں کی منڈیاں لگا لیں۔ 1948ء میں گورداسپور، ناگ منی اور مقبوضہ جموں کشمیر کے ساتھ ملحقہ جو علاقے کے حصے میں آئے تھے، ہندوستان نے واپس چھین لیے۔ مجھ سے پوچھو میرے کیا جذبات تھے اس وقت صرف اسی سانچے نے مجھے فوج میں بھرتی ہونے پر اکسایا تھا، بس نہیں چلتا تھا کہ دشمن کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دوں۔ ظلم اور نا انصافی کا سر کچل دوں مگر میں بے بس تھا، وہ رات جب قدرت اللہ شہاب کو چینی حکومت کی طرف سے فون آیا کہ ان کی فوج بھارت سے اپنے کچھ علاقے واپس لینے میں فتح یاب ٹھہری ہے اگر پاکستان بھی اپنے مقبوضہ علاقے چھڑوانا چاہتا ہے تو اسے بتائے اس رات وہ شخص تین بار صدر مملکت جنرل ایوب خان کو جگانے اور صورتحال سے آگاہ کرنے گیا مگر ملک کے صدر نے اپنی نیند کی قربانی نہیں دی، محض پانچ منٹ کے لیے بھی اٹھ کر فون سننے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس وقت جب مجھے اس بات کا پتا چلا میں خود کو اتنا ہی بے بس محسوس کر رہا تھا جتنا آج تم خود کو کر رہے ہو۔ 1971ء کے حالات اور ملک کے دو ٹکڑے ہونے تک میں اپنی ایک ٹانگ اور ایک بازو گنوا چکا تھا، تبھی فوج نے وقت سے پہلے ہی ریٹائرڈ کر دیا، تم سوچ سکتے ہو اس وقت میری بے بسی کا؟“ بھیگی آنکھوں کے ساتھ انہوں نے سدید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جس کی اپنی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”یہ جو حالات تم ابھی دیکھ رہے ہو یہ نئے نہیں ہیں، بہت پرانی داغ بیل ڈالی گئی ہے ان کی۔ بہت راز چھپے ہیں تاریخ کے پنوں پر، کھول کر پڑھنے کی کوشش میں اپنا ابو جلاؤ گے تو کھوٹے سکوں کے ہاتھوں یا تو مار دیئے جاؤ گے یا مر جاؤ گے۔ تم نے سیاچن اور کارگل کے برف سے ڈھکے پہاڑوں کی چینی نہیں سنی، میں نے سنی ہیں۔ تم نے برف تلے دبی لاشوں کا کرب نہیں دیکھا، میں نے دیکھا ہے۔ میں گزرے ایک ایک لمحے کا خاموش گواہ ہوں جس کا جرم آشنائی ہے اور تمہیں پتا ہے انسانوں کی بولی لگنے والے اس ملک میں آ

رسول ﷺ کے نام پر وجود میں آنے والے اس ملک میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے پیارے بندوں پر دہشت گردی کا لیل لگا کر ان پر زندگی کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں جبکہ اقبال نے کہا تھا ”ان مکتبوں اور مدرسوں کو اسی حال میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہی مدارس میں پڑھنے دو، اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہو گا؟ جو کچھ ہو گا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر برصغیر کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح ہو گا جس طرح اندلس میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈرات اور الحمراء کے نشانات کے سوا وہاں اسلام کے پیرو اور اسلامی تہذیب کے آثار کوئی نقش نہیں ملتا۔ جو اس ملک کی جڑوں میں دشمن ایک تیر سے دو شکار کر رہا ہے، ایک طرف بارودی سرنگیں بچھا کر وطن عزیز کا نقصان کرتا ہے تو دوسری طرف اپنی حرکتوں کو مور والزام اللہ کے نیک بندوں کو ٹھہرا کر ان کا سوا نگ رچا کر اسلام اور اسلامی روایات کو مٹانے کی کوشش کر رہا ہے، تم کس کس نقصان کا دکھ کرو گے؟“ وہ سچے محبت وطن تھے تبھی ان کے لہجے میں درد تھا، سدید نے اپنی آنکھوں کے گوشے سختی سے دبا لیے۔

”آپ میرے لیے دعا کرنا بابا! میں پھر سے وطن عزیز کی عوام کو پاک فوج کے لیے ایک مٹھی کی طرح متحد کرنے میں کامیاب ہو جاؤں، آپ دعا کرنا بابا! میں اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اپنے افسران کو ایسا پیغام دے جاؤں کہ وہ ہمیشہ میرے کردار پر فخر کریں۔ اس وطن کی مائیں جب جیالوں کی سرفروشی کے لیے ہاتھ اٹھائیں تو ان کے تصور میں ماضی کا کوئی جنرل اپنے بڑے تاثر کے ساتھ نہ ابھرے بلکہ برف کے پہاڑوں پر بیٹھے وہ شہزادے نظر کے سامنے آئیں کہ جن کے سونے جیسے رنگ سردی کی شدت نے سنولا دیئے ہیں۔“

”ان شاء اللہ ایسا ہی ہو گا۔“ کرنل صاحب نے اس کی پیٹھ چھپائی تھی۔
”تمہیں میرے ادھر سے خواہوں کو پورا کرنا ہے سدید! چور راستوں کا پتا لگانا ہے تم نے ان راہزنوں کا پتا لگانا ہے جو دشمن کی رہنمائی کرتے ہیں۔“
”سب کروں گا بابا! بس آپ میری کامیابی کے لیے دعا کیجیے گا۔“
”اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو میرے بچے۔“ کرنل صاحب نے دعا دی اور اس نے ان کا ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا لیا۔



دور جا کے روتے ہیں

سخت جان لوگوں کے

دکھ عجیب ہوتے ہیں

آسمان جگمگاتے ستاروں سے خوب روشن تھا۔ کرنل صاحب نے عائلہ اور سدید کی منگنی کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب منعقد کی تھی جس میں صمد حسن سمیت چند خاص خاص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ مختصر سی اس تقریب کے اختتام پر پر تکلف کھانے کا انتظام تھا۔ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے کرنل صاحب تمام مہمانوں کو رخصت کر کے اپنے کمرے میں آگئے تھے۔

عائلہ بہت خوش تھی، آج اس نے وہ ڈریس زیب تن کیا تھا جو پر ہیان نے اس کی پسند پر پورے

پینتیس ہزار کا خریدا تھا جبکہ سدید آف وائٹ کرتا شلوار میں ملبوس بے حد پیارا لگ رہا تھا۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد عائلہ اور سدید فریش ہو کر لاؤنج میں آچکے تھے۔

”ایک بات کہوں عائلہ!“ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہوں..... کہو۔“ وہ فوراً متوجہ ہوئی۔

”تم آج بہت پیاری لگ رہی ہو، قسم سے..... پتا نہیں دلہن بن کر کتنا روپ آئے گا تم پر۔“ وہ سنجیدہ

تھا۔ عائلہ شرارت سے مسکرا دی۔

”شکر ہے تمہیں میں بھی پیاری لگی ورنہ تو اس گرل فرینڈ کا بخار ہی نہیں اتر رہا تھا۔“

”تم نے بہت زیادتی کی ہے اس کے ساتھ، دیکھ لو اس روز کے بعد نہیں آئی وہ۔“

”تو تمہارا دل کیوں جل رہا ہے، اچھا ہے ناں خس کم جہاں پاک۔“

”دل تو جلے گا ہی جیسے ہی میں گھر آتا ہوں اور اسے یہ خبر ملتی ہے سدید بارش یا دھوپ کی پروا کیے

بغیر ایک منٹ سے پہلے بالکونی میں آ جاتی ہے، تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ اسے دھوپ میں جلتے دیکھ کر مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“

”یہ تکلیف تو ساری عمر دینی ہے اب کیونکہ جب اسے ہماری منگنی کا پتا چلے گا ساری عمر جلے گی بے

چاری۔“

”تم بہت ظالم اور بے حس ہو عائلہ! سچ میں۔“

”شکر یہ اس عزت افزائی کے لیے۔“ اس کے ناپک پر بنا جلتے وہ مزے لے رہی تھی۔ سدید کتنی ہی

دیر تک اسے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

”کیا ہوا آج ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟“

”بس ایسے ہی، تمہیں بُرا لگ رہا ہے۔“

”نہیں، بس مجھے تم کچھ الجھے الجھے سے لگ رہے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، اچھا یہ بتاؤ تم خوش ہونا؟“

”ہوں کوئی شک؟“

”نہیں۔“ وہ اب بھی اسے ویسے ہی پُرشوق لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”جب میں چلا جاؤں گا تو تم مس کرو گی؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے پاگل۔“

”اچھا میرے لیے دعا کرو گی؟“

”کیسی دعا؟“

”یہی کہ میں اپنے ہر مشن میں کامیاب رہوں۔“

”ان شاء اللہ ضرور کروں گی۔“

”اچھا فرض کرو اگر میں واپس نہ آ سکا تو تم کیا کرو گی؟“

”تمہارا سر توڑ دوں گی وہاں آ کر اور کیا کرنا ہے۔“ وہ تپتی تھی، سدید مسکرا دیا۔ اسے اس سے ایسے ہی دل جلے جواب کی توقع تھی۔

”میرا سر توڑنے کے علاوہ دوسرا آپشن کون سا ہے تمہارے پاس؟“

”اپنے گلے میں پھندا ڈال کر مرنے کا۔“

”ہا ہا ہا، تو یہ طے ہوا کہ تم میرے سوال کو سنجیدہ نہیں لو گی؟“

”کیوں سنجیدہ لوں، تمہیں مسئلہ کیا ہے تم کیوں مجھ سے ایسے فضول سوال کر رہے ہو؟“

”جسٹ فرض کرنے کو کہہ رہا ہوں یا؟“

”مگر کیوں..... میں ایسی فضول اور بے تکی بات فرض بھی کیوں کروں؟“

”ٹھیک ہے مت کرو فرض“

”ہاں نہیں کرنا فرض۔“

”مار کھانی ہے؟“ وہ اب پرانے انداز میں پوچھ رہا تھا، عائدہ اسے غصے سے گھور کر رہ گئی۔

”تم سے یہی امید ہے مجھے، آج کے دن بھی کوئی اچھی بات منہ سے نہیں نکال سکتے تم۔“

”اوہ میں تو بھول ہی گیا آج تو ہماری منگنی ہوئی ہے۔“

”شکر ہے بہت جلدی یاد آ گیا۔“

”اچھا بتاؤ، کیا سننا چاہتی ہو آج؟“

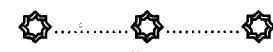
”کچھ نہیں۔“

”سوچ لو، یہ نہ ہو کہ تمہیں ان حسین لمحوں کو کھونے پر پچھتانا پڑے۔“ وہ موڈ میں تھا۔ عائدہ نے فحش

بھری ایک کمراری نظر اس پر ڈالی پھر جھٹکے سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی اور دروازہ زور سے بند کر لیا۔

بیدید اس کے اس بچکانہ انداز پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ ابھی وہ بالوں میں ہاتھ پھیرتا ایک نظر عائدہ

کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتا اگلے ہی پل اٹھ کھڑا ہوا تھا۔



پر ہیان کی انگلیٹ کے لیے ٹکٹ کنفرم ہو گئی تھی۔ صمید صاحب اور سارا بیگم دونوں نے ہی اسے

سمجھانے اور روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ تو کوئی بات سننے کو تیار تھی، نہ سمجھنے کے لیے۔ اسے اپنا آپ قطعی بے معنی

اور حقیر لگ رہا تھا، تبھی اس نے پاکستان سے فوری کوچ کا فیصلہ کیا تھا۔

رات میں جب کبھی اچانک اس کی آنکھ کھل جاتی تو پھر وہ کروٹیں بدل بدل کر تھک جاتی مگر دوبارہ

نیند آنے کا نام نہ لیتی۔ کبھی کبھی اسے یہ سوچ کر خود سے گھن آتی تھی کہ اس کی ماں ایک باکردار عورت نہیں تھی۔

وہ ایک ایسی عورت تھی جس نے کسی کا بسا بسایا گھر اجاڑا تھا۔ نہ صرف گھر بلکہ دو دل اجاڑے تھے۔ دو انسانوں

کی زندگی میں درد کی راتیں اتار دی تھیں، اندھیرے بکھیر دیئے تھے۔

اس کی ماں وہ عورت تھی جس نے کسی سے اس کا پیار، اس کا سناٹا چھین کر اسے ساری عمر کے لیے

در بدر بھٹکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کیا وہ اس عورت اور اس کی بیٹی کا سامنا کر سکتی تھی کہ جن کی خوشیاں ہی اس کی ماں

نے لوٹ لی تھیں۔ نیند آتی بھی تو کیسے؟ اسے تو آج کل اپنا سانس بھی گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

آنسو تھے کہ کسی پل آنکھوں کا ساتھ چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے، کیا ساویز آفندی کو کھو کر جینا

آسان تھا۔ وہ شخص جو اس کا خواب تھا جو اس کے دکھ اور سکھ کے ہر موسم کا ساتھی تھا جس کے ساتھ مل کر اس نے

مستقبل کے ہزاروں خواب آنکھوں میں سجائے تھے کیا اس شخص سے دستبردار ہونا آسان تھا؟

نہیں..... وہ جتنی بھی کوشش کرتی اس شخص کو بھلانا اس کے بغیر خوش رہنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔

لندن ایئر پورٹ پر جس وقت وہ اپنا سامان کلیئر کروا کر باہر نکلی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری

تھیں، شدید سرد موسم میں ہر طرف پھیلی دھند کو اس نے رفتہ رفتہ اپنے اندر اترتے محسوس کیا تھا۔

”تمہیں اس وقت اس طرح سے پاکستان چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے تھا زی!“ پورے سات ماہ کے بعد

وہ اپنے دوستوں جولی رابرٹ اور ایک کے درمیان بیٹھا ڈرنک کر رہا تھا، جب جولی نے اپنا پیک خالی کرتے

ہوئے اس سے کہا۔

”حالت جنگ کے وقت میدان خالی چھوڑ کر بھاگ آنا بہادر نہیں بزدل لوگوں کا کام ہے۔“

”تو کیا کرتا میں؟ وہاں رہ کر اس باپ کی دن رات پرستش کرتا جس نے میری ماں کے ساتھ دھوکہ

میں رکھ جاؤ گا اپنی دھڑکیں اس خالی کمرے میں
خاموشی میں کبھی سننا نہیں تحریر کر لینا
ہو اجب کھڑکیوں پر دستکیں دے روشنی جھانکے
کسی کا غر پر میری یاد کو تحریر کر لینا
یہ سارے کام مشکل ہیں سنو تم کرنے پاؤ گی
تو یوں کرنا.....

کہ میرے پیار کو دل ہی دل میں یونہی زنجیر کر لینا
اڑا دینا میری سب دھڑکنوں کو کھول کر کھڑکی
نکل جانا کہیں باہر.....
کسی بازار میں، لوگوں کے ریلے میں
جہاں بس شور ہو، ہنگامہ ہو
اک بھیڑ ہو بے قابو لوگوں کی
یہ کمر چھوڑ جانا اور.....
میری یادوں کے اس آسب جنگل میں
کبھی واپس نہ آنا

اگلے روز صیام بخار کے باوجود آفس چلا آیا تھا، حنان نے اسے فون پر درمکنوں کی ناراضگی سے متعلق
بتایا تھا تبھی ماں جی اور بہنوں کے روکنے کے باوجود اس نے ایک اور چھٹی کرنے کی حماقت نہیں کی تھی۔ چھٹی
کرنے کا فائدہ بھی نہیں تھا، درمکنوں کو دیکھے بغیر نہ اسے چین مل سکتا تھا نہ شفا۔ اس روز وہ مکمل وائٹ کائن کے
سوٹ میں ملبوس تھا جبکہ صیام نے بھی اتفاق سے وائٹ کائن کی شرٹ ہی زیب تن کر رکھی تھی۔ بخار کی وجہ سے
اس کا چہرہ ہلکا ہلکا سرخ ہو رہا تھا۔ درمکنوں نے پروا نہیں کی۔

اپنے کمرے میں طلب کرنے کے بعد وہ اسے نان اسٹاپ ہدایات ہی دیتی رہی تھی، اسی دوران کسی
نقطے پر بات کرتے ہوئے اس کا ہاتھ ذرا سا صیام کے ہاتھوں کے ساتھ ٹچ ہوا تو وہ چونک اٹھی۔

”ارے آپ کو تو بہت تیز بخار ہے لازمی سر میں درد بھی ہو رہا ہوگا۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ وہ پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور اداس دکھائی دے رہا تھا۔ درمکنوں نے چاہتے
ہوئے بھی خود کو غور سے اس کی طرف دیکھنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔

”میں نہیں آپ، میں چائے منگواتی ہوں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے، میں واقعی ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔“

”اوکے مگر طبیعت زیادہ خراب ہو تو آپ گھر جاسکتے ہیں۔“

”جی۔“

”اب آپ جاسکتے ہیں۔“ اس کا لہجہ ابھی بھی بے حد فائل اور خالصتاً حاکمانہ تھا مگر صیام کے لیے

اس کی اتنی توجہ اور فکر ہی بہت تھی تبھی وہ اس کے روم سے نکلا تو خود کو بے حد ہلکا محسوس کر رہا تھا۔
”السلام علیکم مسٹر صیام! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“ یہ شرہ تھی اس کی کولیگ اور ضرورت سے
زیادہ اس پر مہربان، صیام ہمیشہ اس سے دور دور رہنے اور صرف ضرورت کی حد تک دعا سلام رکھنے کی کوشش کرتا
تھا کیونکہ وہ اس کی خالہ کی بیٹی کلثوم کی بے حد قریبی دوست تھی اور صیام کو ہمیشہ یہی فکر گھیرے رہتی کہ کہیں اس
کی ذرا سی بے پروائی سے بات کا بنگلہ نہ بن جائے۔

اس کی خالہ بہت چرب زبان اور قدرے فتنہ پرور عورت تھی، رائی کا پہاڑ بنانے میں انہیں ویسے ہی
کمال درجہ حاصل تھا۔ عشرت کی طلاق میں بھی بڑا ہاتھ خالہ کی کارستانیوں کا تھا تبھی وہ کوشش کرتا تھا کہ خالہ اور
اس کی بیٹیوں کو کوئی بھی بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ ویسے بھی خالہ جانے کب سے اسے اپنے داماد کے روپ
میں دیکھنے کی خواہش دل میں پالے ہوئے تھیں۔ اس کی بھولی ماں بہن کے شاطر پن کو نہیں سمجھتی تھیں، تبھی صیام
کے بچپن میں ہی اس کی منگنی کا فریضہ بھی سرانجام دے دیا تھا اور اب خالہ اس کی لاکھ کنارہ کشی اور ٹال مٹول کے
باوجود اپنی بیٹی کو اس کے آس پر بوڑھی کر رہی تھیں مگر صیام کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں کئی
بار خالہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اس کی آس پر اپنی بیٹی کا مستقبل داؤ پر مت لگائیں۔ اس پر بھی ابھی بہت ذمہ
داریاں ہیں۔ وہ اگلے کئی سال تک شادی انور ڈنہیں کر سکتا مگر خالہ کی ثابت قدمی عروج پر تھی۔ وہ اس کے لیے
اگلے دس سال تک بھی اپنی بیٹی کو کنواری رکھ سکتی تھیں۔

ابھی وہ اس الجھن سے نکلا نہیں تھا کہ منگیتر صاحبہ کی سہیلی جیسے ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس
وقت بھی اس کے ایک دم سے سامنے آنے پر وہ خاصا جڑبڑ ہوا تھا۔

”ٹھیک ہوں، ایکسکوز می مجھے کچھ کام ہے۔“

”وہ تو ہر وقت ہی ہوتا ہے آج میں آپ کے لیے آپیشل آلو کے پراٹھے لائی ہوں اپنے ہاتھوں سے
پکار کر پلیز آج لنچ میرے ساتھ کرنے میں کوئی بہانہ مت کیجئے گا۔“ وہ مسکرائی اور اس کی فرمائش نے صیام کی
پیشانی کے بلوں میں اضافہ کر دیا تھا۔

”سوری! میری طبیعت ابھی اتنی بہتر نہیں ہوئی کہ میں آپ کے ساتھ آلو کے پراٹھے کھا سکوں، اس
بار قدرے خشک لہجے میں کہہ کر وہ حنان کے کیمین کی طرف بڑھ گیا، شرہ اس کی اس ادا پر بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ
سکتی تھی۔



اس روز وہ آفس سے جلد نکل آیا تھا وجہ درکشاپ پر نئی نئی شروع ہونے والی جاب تھی جبکہ وہ کل
درکشاپ کے مالک کو بتائے بغیر چھٹی کرنے کا تصور وار بھی تھا۔ جب وہ درکشاپ پر پہنچا، درکشاپ کا ملک
موجود نہیں تھا البتہ اس کے بھانجے نے بتایا تھا کہ کل سے درکشاپ مالک کے اکلوتے بیٹے کی طبیعت بہت
خراب ہے اسی وجہ سے کل درکشاپ بھی بند رہی۔ آج بھی درکشاپ کا مالک دکان کھول کر سارے معاملات
اپنے بھانجے کے سپرد کر کے گھر چلا گیا تھا۔

کی اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کی ڈرینگ، شاندار پرسنلٹی اور کچھ پڑھا لکھا ہونے کی وجہ سے ورکشاپ مالک سمیت وہاں کام کرنے والے سبھی لڑکے اس کی بے حد عزت کرتے تھے اور یہی بہت تھا۔ درمکنوں کو اپنی کسی دوست کی طرف جانا تھا۔

آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد مریرہ بیگم کو بتا کر وہ اپنی دوست کی طرف نکل گئی تھی۔ واپسی کے سفر میں اس کی دوست اس کے ساتھ آئی تھی کیونکہ اس کی گاڑی خراب تھی اور اسے قریبی ورکشاپ سے گاڑی واپس لینا تھی۔

جس ورکشاپ پر اس کی گاڑی موجود تھی درمکنوں نے ٹھیک اسی ورکشاپ کے سامنے بریک لگائی تھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہاں اسے صیام ورکشاپ میں کام کرتا ہوا دکھائے دے جائے گا۔ اس کی دوست کی گاڑی مکمل تیار تھی مگر وہ شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کیے کسی اور گاڑی پر کام کر رہا تھا، درمکنوں بالکل سن سی اسے دیکھ گئی تھی۔

پہلی بار اس شخص نے اس کی توجہ حاصل کی تھی، تیز بخار کے باوجود وہ آفس چھوڑ کر کہیں اور جا کر رہا تھا۔ اس نے اسی وقت حنان کو کال کر کے اس کی چاب کی تصدیق بھی کر لی۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنے کردار پر بے حد شرمندگی محسوس ہوئی، اس کی ماں ایک عظیم انسان دوست شخصیت تھی جس نے کبھی اپنے مرتبے اور عہدے کا غور نہیں کیا تھا۔ مگر وہ کتنی بے حس تھی کہ اس نے ہمہ وقت خدمت گزار رہنے والے ضرورت مند شخص کی معمولی سی مدد کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔ اس روز گھر واپسی پر بھی بار بار گاڑی پر جھکا صیام اس کے تصور میں جھلکتا رہا تھا۔

اگلے روز اسے ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ وہ اس میں لگ کر صیام کی پارٹ ٹائم جاب والا معاملہ یکسر بھول گئی۔ صیام اس روز صبح سے چور گھر واپس آیا تو اپنے باپ کو بے حد تکلیف میں مبتلا پایا۔ عشرت اور شگفتہ رورہی تھیں جبکہ ماں کا چہرہ بھی بے حد پریشان تھا۔

صیام کی طبیعت ابھی تک خود نہیں سنبھلی تھی اس کے باوجود اس نے حنان کو فون کیا اور اگلے ایک گھنٹے میں اپنے باپ کو سرکاری ہسپتال میں داخل کروا دیا، جو تکلیف انہوں نے گھر پر پڑے رہ کر برداشت کرنی تھی، وہاں چلو کچھ نہ کچھ تو آرام ملتا۔ سرکار کے نام پر ایک عدد بوتل یاد رکھ کر گولی تو مل ہی جاتی تھی پھر گھروالوں کو بھی تسلی ہوتی کہ چلو علاج ہو رہا ہے۔ رات میں اپنے ایک دوست کو ابا کے پاس چھوڑ کر گھر آیا تو سب بھوکے پیاسے منتظر بیٹھے اسی کا انتظار کر رہے تھے وہ منہ ہاتھ دھو کر صحن میں امّاں کے پاس آ بیٹھا۔

پچھلے مہینے تین ماہ کا بجلی کا بل جمع نہ کروانے پر ان کی بجلی کٹ گئی تھی۔ صیام نے ساتھ والے ہمسائے سے درخواست کر کے اس سے عارضی طور پر بجلی کی تار ادھار لے لی تھی۔ اب پندرہ ہزار کا بل آنے پر وہ بھی رقم کا مطالبہ کر رہا تھا اوپر سے گلی میں پھیلے تعفن کی وجہ سے عشرت کے چھوٹے بیٹے کو چمچروں نے اتنا کاٹا کہ وہ معصوم تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ امّاں نے اپنے طور پر قریبی ڈاکٹر سے دوا لے کر بچے کو کھلائی تھی مگر بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پریشانی ہی پریشانی تھی۔ وہ امّاں کے پاس آ کر بیٹھا تو عشرت اور شگفتہ بھی قریب چلی آئیں۔

”اب کیسی طبیعت ہے ابا کی؟“

”پہلے سے بہتر ہیں، ڈاکٹر نے سکون کا انجکشن دے دیا تھا، سو رہے تھے میں اپنے ایک دوست کو ان کے پاس بٹھا کر آیا ہوں۔“

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”کچھ نہیں معمولی سی تکلیف ہے انشاء اللہ آپریشن ہوگا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اور آپریشن کب ہوگا؟“ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا مگر پھر بھی وہ اپنی بہنوں کو تسلی دیتے ہوئے بولا تھا۔

”بہت جلد، میں نے ایک دوست سے قرض کے لیے بات کی ہے تم لوگ دعا کرنا قرض مل جائے تو پہلی فرصت میں یہی کام سرانجام دوں گا۔“

”ان شاء اللہ“ عشرت نے کہا اور سر جھکا لیا تھا، ابھی اس نے پوچھا۔

”کھانا کھایا تم لوگوں نے؟“

”نہیں بھائی، ابا کی پریشانی میں بھوک ہی نہیں تھی۔“

”ابا اب بالکل ٹھیک ہیں، چلو اٹھو کھانا کھاؤ شاباش اور امّاں کو بھی لا کر دو، دیکھو چند ہی دنوں میں کتنی کمزور ہو گئی ہیں ہماری امّاں۔“ ماں کو ہانپوں کے حلقے میں لیتے ہوئے اس نے لاڈ سے کہا۔ جواب میں عشرت اور شگفتہ نے اس سے بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

”کیا پکایا ہے آج؟“ وہ ان کے نظریں چرانے سے سمجھ گیا تھا کہ یقینی گھر میں سبزی نہیں آئی تھی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ چونکہ بیمار تھا تو اس کی ماں سبزی والے پیسوں سے اس کے لیے گوشت خرید لائی تھیں تاکہ اسے بخنی پلا سکیں۔

صیام کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا، اس کی غلافی آنکھوں کے گوشے ہلکے سے نم ہوئے تھے تاہم اس نے لہجے کو ٹوٹے نہیں دیا۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں امّاں اور آج میٹنگ کے بعد آفس میں شاندار ڈنر بھی کیا ہے میں نے، آپ لوگ پلیز اس گوشت کا سالن بنائیں اور یہاں میرے سامنے بیٹھ کر کھائیں۔ پرسوں تک انشاء اللہ مجھے تنخواہ مل جائے گی تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

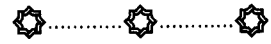
”غریبوں کے مسئلے کبھی حل نہیں ہوتے میرے بچے! ایک مسئلہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا سر اٹھا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ گھر کے حالات تمہارے سامنے ہیں، اس پر ش

مجھے تو کوئی اور ہی معاملہ لگ رہا ہے۔“

”ہوں، آپ پریشان نہ ہوں جو بھی معاملہ ہے میں پتا لگا لوں گا۔ میری بہن اتنی گری پڑی نہیں ہے جتنی ان لوگوں نے سمجھ لی ہے، آپ لوگ کھانا کھائیں پلیز تب تک میں اسد کے لیے دودھ اور کچھ دوا لے کر آتا ہوں۔“ مضبوط لہجے میں کہتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پھر گھر سے باہر آتے ہی خوب دل کا غبار نکالا۔ بے بسی سی بے بسی تھی کہ اس کے سارے رشتے تکلیف میں تھے اور وہ چاہتے ہوئے بھی ان کے لیے کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ تازہ دودھ، کیک اور بخار کا مہنگا سیرپ لے کر گھر آیا تو شگفتہ سالن تیار کر چکی تھی، روٹی پہلے پکا رکھی تھی۔ عشرت نے اپنے بیٹے کو گود میں لے رکھا تھا اور اماں اس پر مختلف قرآنی آیات پڑھ کر پھونک رہی تھیں۔ اس نے دودھ، کیک اور سیرپ عشرت کے حوالے کیا پھر چار پائیاں سیٹ کر کے پیڈنٹل فین آن کر دیا۔ وہ بھی خراب ہونے کی وجہ سے رک رک کر چلتا تھا اور شارٹ بھی دیتا تھا تبھی اس نے عشرت اور شگفتہ کو اسے چلانے سے سختی سے منع کر رکھا تھا مگر اس وقت چمچروں کی وجہ سے اس کی ضرورت تھی لہذا اس نے احتیاط سے وہ سیٹ کر کے چلا دیا تھوڑی فرصت نصیب ہوتی تو لازمی وہ اسے کھول کر خود ہی ٹھیک کر لیتا۔

عشرت نے اپنے بیٹے کو دودھ کے ساتھ کیک کھلا کر، دوا پلا دی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ سکون سے سو گیا تو اماں، عشرت اور شگفتہ نے مل کر کھانا کھایا۔ صیام تب تک اپنی چلو پائی پر لیٹ چکا تھا۔ تھکن اور بخار کی وجہ سے اس کا پورا جسم درد کر رہا تھا مگر اسے اپنے درد کی پروا نہیں تھی اس کا ذہن ابامیں اٹکا ہوا تھا اگر وہ بروقت ان کا آپریٹ نہیں کرواتا تو کڈنی اور آنکھ دونوں کا ہی زیادہ نقصان ہونے کا خدشہ تھا اور زیادہ نقصان وہ انورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ عجیب بے بسی تھی کہ سوائے اپنے مالک کے حضور مدد کی دعا کے اسے ان مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا کوئی راستہ ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔



اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے مگر

میرے پاس جینے کے سامان بہت ہیں

آنسو ہیں، غم ہیں

نفرتیں ہیں، دھوکے ہیں

اذیتیں ہیں، وحشتیں ہیں

آندھیاں ہیں، طوفان ہیں

سکتے تڑپتے

نیم مردہ سے خواب ہیں

پتھر ہیں، کانٹے ہیں

ہاں خوشی تو نہیں ہے مگر

گمان بہت ہیں

میرے پاس جینے کے سامان بہت ہیں

آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہ لندن ایئر پورٹ سے باہر آئی تھی جب مارتھا اس سے آن

ملی۔

”او..... پرہیان! مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم اتنے سالوں کے بعد انگلینڈ واپس لوٹ آئی ہو۔“ وہ اسے

دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی تبھی اس نے اس کا گال بھی چوما تھا۔ پرہیان نے جلدی سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کیں۔

”تھینک یو، مجھے اندازہ نہیں تھا یہاں اتنی ٹھنڈ ہوگی۔“ مارتھا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے

اپنی سرخ ناک اور بھیگی آنکھوں کی صفائی پیش کی تھی۔ مارتھا نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے اس کا سامان گاڑی کی ڈگی میں رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”نکل آئی اور تمہارا بھائی کیسا ہے؟“ ڈرائیونگ کے دوران اس نے پوچھا تھا۔ پرہیان کے گلے میں جیسے کچھ پھنسنے لگا۔

”ٹھیک ہیں۔“

”تمہارے بھائی کو ابھی چند روز پہلے میں نے یہیں دیکھا تھا ایک بار کلب میں شاید اسے بھی پاکستان راس نہیں آیا۔“

”ایسی بات نہیں ہے، وہ برنس کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں۔“

”اوہ میں سمجھی تھی شاید پاکستان میں دل نہیں لگا۔“

”اچھا یہاں پہنچ کر تم نے اس سے رابطہ کیا؟“

”ہوں کئی بار کال کی ہے مگر اس کا نمبر رسپانس نہیں دے رہا۔“

”اوہ..... کیا تم نے اسے بتایا نہیں تھا کہ تم یہاں پہنچ رہی ہو؟“

”نہیں، میں نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان سے رابطہ نہ ہوا اسی لیے تم سے رابطہ کیا۔“

”پھر اب کیا کروگی؟“

”فی الحال تو تمہارے ساتھ جا رہی ہوں، بعد میں فریش ہو کر ان سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش

کروں گی۔“

”لیکن اگر اس سے رابطہ نہ ہوا تو؟“

”کیوں نہیں ہوگا اگر فون پر نہ ہو سکا تو ہم ایک کے گھر چلیں گے، وہ

”میں سچ کہہ رہی ہوں مارتھا! کچھ پرانے دوستوں کی یاد تھی اور کچھ نیک عزائم۔“

”مائے گاڈ، کہیں تم کوئی دھماکہ کرنے کا پلان لے کر تو نہیں آئیں؟“

”بے فکر رہو، میں ایسی نہیں ہوں۔“

”تھینک گاڈ، میں تو ڈر رہی گئی تھی۔“ ڈرائیو کرتے ہوئے مارتھا نے اس کا دل جلایا تھا، تاہم وہ پروا

کیے بغیر بے نیازی سے باہر دیکھتی رہی۔ کچھ پل گاڑی میں خاموشی رہی تھی پھر مارتھا نے ہی اس خاموشی کا گلہ گھونٹا وہ زیادہ دیر چپ بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔

”ایلی اکثر یاد کرتا ہے تمہیں، پتا ہے اس نے اپنا بہت شاندار گھر بنالیا ہے، ماں باپ سے علیحدگی بھی

ہو گئی۔“

”اوہ، تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟“

”ملنے آیا تھا وہ مجھ سے ایک ویک اینڈ پر، پہلے سے بہت کمزور ہو گیا ہے تم دیکھو گی تو شاید پہچان بھی

نہیں پاؤ۔“

”ایسا کیوں؟“

”وہی ڈرنک کی زیادتی یار!“

”اوہ کیا اس نے شادی نہیں کی؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں وہ اس ٹاپک پر کسی سے بات نہیں کرتا۔“

”ہوں اور اس کی گرل فرینڈ کا کیا بنا جو ہندوستان سے آئی تھی؟“

”چھوڑ دیا اسے وہ واپس ہندوستان چلی گئی۔“

”بہت الجھا ہوا شخص ہے یہ ایلی۔“

”ہوں بالکل تمہارے بھائی کی طرح۔“

”میرا بھائی فلرٹ نہیں ہے۔“

”الجھا ہوا تو ہے۔“

”کہہ سکتی ہو۔“ اس بار اس نے بے نیازی سے کہتے ہوئے رخ پھیرا مارتھا کا اپارٹمنٹ آچکا تھا۔

پرہیان نے گاڑی سے اتر کر اپنا سامان نکالا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تقدیر اس کے ساتھ یہ عجیب

کھیل کھیلے گی۔ وہ جو کسی کی دلہن بن کر زندگی کی خوشیاں سمیٹنے جا رہی تھی کیسے ایک دم سے بے سرو سامان ہو کر رہ گئی تھی۔

الوداع کہے ہوئے گلی کوچوں میں دوبارہ آباد ہونا پڑ گیا تھا۔ مارتھا نے سیزھیاں کر اس کر کے

اپارٹمنٹ کا لاک کھولا تو شراب کی بو کا ایک تیز جھونکا پرہیان کے نھتوں سے ٹکرایا۔ وہ بمشکل اپنی ابکائی روک پائی

تھی۔ دروازہ کھلتے ہی سامنے جو ہال نما کمرہ نظر آیا تھا اس میں جا بجا شراب کے خالی ٹرن، پلیٹوں میں بچا ہوا

حرام گوشت اور کچھ خالی ریپر بکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ پہلے قدم پر ہی ہچکچائی گئی تھی۔

”سوری رات انیل نے جاب ملنے کی خوشی میں پارٹی دی تھی یہ سب اسی کے آثار ہیں آؤ تم آ جاؤ

اندر۔“ مارتھا نے آگے بڑھ کر قالین پر بکھری ہوئی چیزیں تیزی سے سمیٹنا شروع کر دیں پرہیان نے خاصی مجبور

ہو کر اپارٹمنٹ کے اندر قدم رکھا تھا۔



رات کھولے تھے کچھ پرانے خط

پھر محبت دراز میں رکھ دی

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی مگر اس کی آنکھوں سے نیند کو سوں دور تھی۔ عجیب بے سکونی تھی کہ

نیندوں کے سلسلے ہی ٹوٹ گئے تھے۔ اپنے بیڈ پر بیٹھی گھنٹوں پر دھرے بازوؤں پر سر نکائے اس کی سوچوں کے

گھڑے بہت سال پہلے کا سفر طے کر رہے تھے۔

اس رات حویلی میں بہت رونق تھی، شگفتہ اور قمر عباس کی مہندی کا اکٹھا فنکشن رکھا گیا تھا۔ عمر نے اس

کے ساتھ مل کر حویلی کو اتنا خوبصورت سجایا کہ دیکھنے والی ہر آنکھ تعریف کر رہی تھی۔ وہ دونوں صبح سے کام میں

اتنے مصروف تھے کہ کھانے پینے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ عمر کام کر رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ لگی اسے ضرورت کی

مختلف اشیاء پکڑا رہی تھی۔ وہاں گاؤں میں چونکہ سب ہی اس سے واقف تھے لہذا کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا

کہ وہ کیوں عمر کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش ہے۔ بے جی اسے دو تین بار کھانے کے لیے بلا چکی تھیں مگر وہ ہر

بار ”ابھی آئی چاچی“ کہہ کر انہیں ٹال دیتی۔

اظہار ملک صاحب اپنے بڑے بیٹوں کے ساتھ باہر کے کاموں میں مصروف تھے مگر پھر بھی وہ دو تین

بار اسے کام کاج میں مصروف دیکھ کر پیار دے گئے تھے۔ پوری حویلی کو دلہن کی طرح سجانے کے بعد عمر چھت پر

آیا تو مریرہ بھی ساتھ تھی۔ گاؤں کی کھلی فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا شام کے وقت بے حد بھلی محسوس ہوتی تھی۔

شگفتہ، عمر اور مریرہ کو وہیں چھت پر کھانا دے گئی تھی۔

”آج مہندی کا فنکشن ہے مریرہ! مگر ابھی تک تمہارے شوہر نامدار نہیں پہنچے کیا بات ہے کہیں تم

دونوں کے درمیان کوئی ناراضگی تو نہیں ہے، کیونکہ میں نے ان تین چار دنوں میں تمہیں اس سے بات کرتے

ہوئے بھی نہیں دیکھا۔“ ہاتھ دھو کر کھانا شروع کرنے سے پہلے عمر نے خاصے سنجیدہ انداز میں اس سے پوچھا تھا

وہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے یہاں گاؤں میں موبائل فون تو ہے نہیں جو میں ہر وقت اس کا سر کھاتی

رہوں، لینڈ لائن نمبر میں اسے دینا بھول گئی۔“

”تو تم خود کال کر لو اسے۔“

”ضرور کر لیتی اگر اس کا نمبر یاد ہوتا۔“

”آف..... کیسی لڑکی ہو تم یار تمہیں اپنے شوہر کا نمبر یاد نہیں۔“ عمر ہنسا تھا وہ اسے گھور کر رہ گئی تھی۔

”میں ایسی ہی ہوں تم سے بہتر مجھے کوئی نہیں جانتا ہوگا۔“

”میں جھوٹ نہیں بولتی۔“

”جھوٹ نہیں بولتیں تو خوش بھی نظر نہیں آتیں۔“

”میں خوش ہوں عمر! تم ایویں خواہ مخواہ ٹینشن لے رہے ہو۔“

”اوکے مان لیتا ہوں بچوں کے بارے میں کیا سوچا؟“

”کچھ بھی نہیں کیونکہ صمید بچوں کے حق میں نہیں ہیں۔“

”وہاٹ..... یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”سچ کہہ رہی ہوں اس کی ماں کی ڈیوٹی ڈیوٹی ٹائم میں ہو گئی تھی اسی لیے اس کے اندر یہ خوف بڑھ گیا ہے کہ کہیں مجھے کچھ ہونہ جائے۔“

”اس کا مطلب ہے وہ تم سے بہت پیار کرتا ہے۔“

”ہوں کہہ سکتے ہو مگر میں بچوں کے بغیر ادھوری ہوں عمر! میں اپنی خوشی اس کے فضول سے وہم کی بھیئت نہیں چڑھا سکتی۔“ پہلی بار اس نے اس کے سامنے دل کھول دیا، عمر نے ہاتھ میں پکڑا نوالہ دوبارہ چنگیر میں رکھ دیا تھا۔



”ہوں صمید حسن سے شادی کیسے ہوئی تمہاری پسند تھا یا کرٹل انکل نے زبردستی کی؟“ وہ سوال جو اسے کتنے دنوں سے مضطرب کر رہا تھا بالآخر لبوں پر آ گیا تھا۔ مریرہ نے اس سوال پر بے ساختہ نگاہیں چرائی تھیں۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیسے ہوئی یہ شادی؟“ وہ جیسے سب جان لینا چاہتا تھا مریرہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا تھا۔

”صمید میرے اسکول کے باہر ٹھیلا لگاتے تھے ان کے والدین کی وفات ہو چکی تھی اور وہ بالکل اکیلے تھے بڑے ابو کو ان کے حالات کا علم ہوا تو وہ انہیں اپنے گھر لے آئے اپنا بیٹا بنا کر، سکندر بھائی ان دنوں اپنا ماسٹر مکمل کر رہے تھے اور بڑے ابو کو ان کی کمی بہت شدت سے محسوس ہوتی تھی۔“

”پھر؟“

”پھر رفتہ رفتہ صمید اپنی شرافت اور فرماں برداری سے بڑے ابو کے دل میں گھر کرتے گئے انہی دنوں سکندر بھائی پاکستان آئے تو بڑے ابو نے اپنی خراب طبیعت کے پیش نظر ان کی بریرہ سے شادی طے کر دی جبکہ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے ہوتے بھی کیسے؟ وہ تو پہلے ہی وہاں دیارِ غیر میں کسی اور کے ساتھ محبت کی پیٹنگیں بڑھا کر شادی رچا چکے تھے مگر اس وقت بڑے ابو یا ہم میں سے کوئی بھی ان کے اس راز سے آگاہ نہیں تھا۔ خود بریرہ بھی نہیں، تبھی شادی کے بعد وہ فقط چند روز رہ کر واپس ایبروڈ چلے گئے اور دوبارہ پلٹ کر پیچھے کی خبر نہیں لی۔ بریرہ امید سے ہو چکی تھی اس نے سکندر بھائی کو بھی اس بات سے آگاہ کر دیا مگر وہ تب بھی لوٹ کر نہیں آئے بعد میں بابا کی ہدایت پر صمید نے ان کے بارے میں پتا کیا تو ان کی دوسری شادی والی حقیقت علم میں آئی۔ بڑے ابو نے یہ خبر بڑے حوصلے سے سنی تھی مگر بریرہ حوصلہ نہ رکھ سکی وہ اسی دکھ میں ایسی چارپائی سے لگی کہ پھر اٹھ ہی نہ سکی۔ صمید نے تب بھی میرا اور بڑے ابو کا بہت ساتھ دیا تھا حوصلہ بڑھایا بعد میں بریرہ کی موت کے بعد میری حالت بہت خراب رہنے لگی تھی تبھی بڑے ابو نے میری شادی کا فیصلہ کر لیا تاکہ میں بہل جاؤں۔ بریرہ کے دکھ سے نکل آؤں اسی لیے بڑے ابو نے صمید کے ساتھ میری فوری شادی کا فیصلہ کر لیا۔ بعد میں مجھ سے اور صمید سے پوچھا تو ہم دونوں نے بھی ان کی خوشی کے لیے ہاں کر دی۔“

”ہوں اس کا مطلب ہے یہ مکمل طور پر ارٹھ میرج تھی۔“

”ہوں کہہ سکتے ہو۔“ ایک بار پھر اس نے نظریں چراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”تم خوش ہونا اس کے ساتھ؟“

”ہوں.....“

”مگر مجھے نہیں لگتیں۔“

”اپنی آنکھوں کا علاج کرواؤ۔“

”صمید خیال رکھتا ہے تمہارا؟“

”ہوں۔“

”مگر مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو؟“

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، بھوک نہیں ہے۔“

”کیوں صبح سے تم نے کچھ کھایا نہیں، پھر بھوک کیوں نہیں؟“ عمر کے نوالہ چنگیر میں رکھنے پر مریرہ کو حیرت ہوئی تھی، عمر نے رخ پھیر لیا۔

”ویسے ہی، تم نے بھی تو صبح سے کچھ نہیں کھایا۔“

”تو میں کھالوں گی ناں، تم تو کھاؤ۔“

”نہیں بس، مجھے اتنی ہی بھوک تھی۔“

”بہت غلط بات ہے عمر! تم پہلے سے بہت کمزور ہو گئے ہو۔“

”کمزور تو ہونا ہی تھا، پردیس کاٹ کر جو آیا ہوں۔“

”پردیس جا کر لوگ موٹے ہو کر آتے ہیں، کمزور نہیں۔“

”اتنا کمزور نہیں ہوں میں جتنا تمہیں نظر آ رہا ہوں۔“

”میں تم سے بحث میں نہیں جیت سکتی مگر مجھے ایسا کیوں لگتا ہے عمر! جیسے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے تمہیں ایویں الہام ہوتے ہیں۔“

”چلو اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی مگر جو سچ ہے وہ یہی ہے کہ ضرور تمہارے اندر کوئی چیز تمہیں پریشان کر رہی ہے۔“ مریرہ نے کہا اور عین اسی لمحے اسے نیچے صحن سے ظہرہ بھابی کی پکار سنائی دی تھی جو اسے بلا رہی تھیں۔ مریرہ نے وہیں منڈیر سے نیچے جھانکا۔

”جی بھابی!“

”نیچے آؤ جلدی صمید آیا ہے۔“

”آہاہ..... آ گیا میرا ہیرو! عمر صمید آ گیا ہے خبردار جو تم نے اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو۔“ پل کی پل میں اس کے چہرے پر ہزاروں رنگ کھل اٹھے تھے۔ وہ محض اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

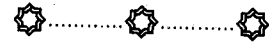
آسمان تاروں سے بھرا تھا، گاؤں کی کھلی فضا میں سرد ہوا کے جھونکے بے حد خوش گواریت پھیلا رہے تھے مگر وہ بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ مریرہ صمید کے آنے کی اطلاع پا کر ایک پل کے لیے بھی وہاں اس کے پاس نہیں ٹھہری تھی، عمر کو لگا جیسے وہ اچانک اندر سے خالی ہو گیا ہو۔

پتا نہیں یہ کیسی تکلیف تھی جو دل کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہی تھی، پتا نہیں یہ کیسا درد تھا جو سانسوں کو بھاری کر رہا تھا۔ جانے کتنے ہی آنسو تھے جو اندر کہیں فریز ہو گئے تھے، پلکوں تک آنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ اس رات کتنی ہی دیر وہ وہاں اکیلا چھت کی منڈیر پر بیٹھا، گزرے ہوئے وقت کی دھول میں حال سے بے حال ہو رہا تھا۔



عمر عباس ان دنوں مڈل ہائی اسکول میں پڑھتا تھا جن دنوں پہلی بار کرنل صاحب مریرہ اور مریرہ کو

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس اک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا



وہ لڑکی جس کی قربت کی تمنا میں
کئی اوجھل مناظر خود کو اس کی بارگاہ میں پیش کرتے تھے
سنا ہے آج کل نزدیک کا چشمہ لگاتی ہے

وہ جس کی مہربانی سے
کبھی اس شہر میں قیمت بڑھا کرتی تھی پھولوں کی
ترس جاتے ہیں اس کے ہاتھ اب گجرے پہننے کو
وہ جس کی بے نیازی سے

کبھی اس شہر کے لوگوں کا کاروبار چلتا تھا
سنا ہے اب وہ اشیاء کی خریداری میں نرخوں پر
دکان داروں سے لمبی بحث کرتی ہے
وہ اک لڑکی جو عکس آلود آئینے سے بھی پرہیز کرتی تھی
سنا ہے اب محلے میں کسی ستے بیوٹی پارلر پر کام کرتی ہے
وہ جس کی خوش کلامی پر

سخن ہوتا تھا شب بھر شہر کے سب قبوہ خانوں میں
سنا ہے خامشی کو آج کل اظہار پر ترجیح دیتی ہے
وہ اک لڑکی جو سرتاپا کبھی پندار کا مینار ہوتی تھی
ذرا سے زلزلے سے ڈھ گئی ہوگی
شفق زادی عجب رنگوں میں ڈھل کر رہ گئی ہوگی



لے کر حویلی آئے تھے۔ کرنل صاحب کا بیٹا سکندر علوی ان دنوں میٹرک کر چکا تھا اور اب اس کی ڈیماڈ تھی کہ چونکہ اس کا ایک جگری دوست ایروڈ جا رہا ہے مزید تعلیم کے لیے تو اسے بھی باہر بھیجا جائے۔ وہ اب مزید پاکستان میں نہیں پڑھے گا۔

کرنل صاحب ان دنوں فوج سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ بھائی اور بھابی کی اچانک رحلت کے بعد بریرہ اور مریرہ کی ذمہ داری ان کے ٹوٹے کاندھوں پر آ پڑی تھی۔ وہ ابھی اس صدمے سے نکلے نہیں تھے کہ اکلوتے بیٹے کی انوکھی فرمائش نے انہیں نئی آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ فی الحال ان کے لیے اپنے اکلوتے بیٹے کی اس انوکھی فرمائش کو پورا کرنا ممکن نہیں تھا لہذا انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ ان کے صاف انکار نے سکندر علوی کو بغاوت پر مجبور کر دیا تھا، کچھ بڑے دوستوں کی صحبت اور سیکھنے کے بھی اپنا اثر دکھایا، نتیجتاً اس نے اپنی ضد پوری کی۔ جس دوست کے لیے وہ ملک سے باہر جانا چاہ رہا تھا اسی دوست کے ساتھ مکمل پلاننگ کر کے اس نے گھر سے اپنی ماں اور چچی کے زیورات چرائے اور ملک سے باہر چلا گیا۔

کرنل صاحب کو آخری وقت تک اس کے ارادوں کی خبر نہ ہو سکی تھی تاہم جب یہ معاملہ کھلا تو وہ جیسے ڈھسے گئے۔ اکلوتے بیٹے کی اس گری ہوئی حرکت نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا وہ بستر سے لگ کر رہ گئے تھے۔ ادھر حویلی میں اظہار صاحب نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں خضر عباس اور نظر عباس کی شادی کی تاریخ رکھ دی تھی۔ دونوں ابھی کم عمر تھے مگر دونوں چونکہ اسکول چھوڑ چکے تھے پھر زمینوں پر کام سنبھالنے میں بھی انہیں خاصی مہارت آ چکی تھی لہذا اظہار صاحب نے یہی بہتر سمجھا کہ ان کی شادی کر دی جائے۔

ان دنوں اظہار صاحب کے والد بھی حیات تھے مگر ان کی صحت تسلی بخش نہیں تھی لہذا اظہار صاحب کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کے والد دنیا سے جانے سے پہلے کم از کم ان کے دونوں بڑے بچوں کی خوشی دیکھ جائیں۔ یہ وجہ تھی کہ انہوں نے آنا فانا ایک ہی گھر میں اپنے دونوں بڑے بچوں کی شادی طے کر دی تھی۔ اظہار صاحب اسی شادی کی دعوت دینے گاؤں سے شہر آئے تھے جب انہیں کرنل صاحب کی بیماری کا پتا چلا۔

وہ ہسپتال میں داخل تھے اور محلے والے ان کی اور ان کی دونوں بھتیجیوں کی دیکھ بھال کر رہے تھے تب ہی وہ بے حد ضد کر کے کرنل صاحب کے ساتھ ساتھ دونوں بچوں کو بھی شہر سے گاؤں لے آئے تھے۔ عمران دنوں نویں کلاس میں تھا جبکہ بریرہ اور مریرہ پرائمری پاس کر چکی تھیں۔ عمر اس روز اسکول سے گھر آیا تو مریرہ اس کے کبوتروں کے بنجرے کے پاس بیٹھی انہیں خاصے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی حویلی میں پہلی بار اس سنہری بالوں والی باربی ڈول سی اجنبی لڑکی کو دیکھ کر حیران ہوا تھا، تب ہی اسکول بیگ سائیڈ پر پھینک کر پھرتی سے اس کے قریب چلا آیا۔

”کون ہوتا ہے؟“ مریرہ اس کے سوال پر قدرے گھبرا گئی تھی۔

”مم..... میں مریرہ.....“

”کون مریرہ..... اور یہاں میرے کبوتروں کے پاس کیا کر رہی ہو؟“

”ک..... کچھ نہیں..... کبوتر دیکھ رہی تھی۔“

”کیوں زندگی میں پہلے کبھی کبوتر نہیں دیکھے کیا؟“ وہ شروع سے غصیلا تھا۔ مریرہ نے چپ چاپ

وہاں سے کھٹکنے میں ہی عافیت جانی۔ شام میں بے جی نے اسے بریرہ اور مریرہ سے متعارف کروایا تھا۔

”عمر پتر! یہ بریرہ ہے“ تیرے شہر والے کرنل چچا کی بھتیجی۔ شہر میں چھٹی جماعت میں پڑھتی ہے اور یہ ساتھ والی مریرہ ہے بریرہ کی چھوٹی بہن، اس نے بھی پانچویں جماعت کے سپرد دیئے ہیں ابھی کچھ دنوں تک یہ یہیں رہیں گی ہماری پاس۔“

”مگر یہ کون ہے بے جی!“ مریرہ نے عمر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی پوچھا تھا جب وہ مسکرا دیں۔

”یہ عمر عباس ہے پتر! تیرے خضر بھاء اور نظر بھاء سے چھوٹا، تیسرے نمبر کا بیٹا ہے ہمارا نویں جماعت میں پڑھ رہا ہے ابھی“ تیرے اظہار انکل کی جان ہے اس میں۔ اسی لیے تھوڑا بگڑا ہوا ہے مگر تم لوگ پریشان مت ہونا“ گھر آئے مہمان کے ساتھ کیسے پیش آنا ہے بخوبی علم ہے اسے“ کیوں عمر پتر! میں صحیح کہہ رہی ہوں ناں؟“

”جی ماں جی!“ اس وقت تابعداری میں سر ہلاتے ہوئے محض یہی کہہ سکا تھا۔

ماں جی خوش ہو گئیں مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ عمر کو حویلی میں ان اجنبی لڑکیوں کی آمد ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔ اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ بریرہ اور مریرہ وہاں حویلی میں شادی میں شرکت کے لیے آئی تھیں یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی تاہم اگلے چند روز میں وہ یہ ضرور جان گیا تھا کہ وہ وہاں کس مقصد کے تحت آئی تھیں۔

بریرہ حویلی کے کینوں کے ساتھ جلد گھل مل گئی تھی مگر مریرہ سبھی اداس رہتی۔ اظہار صاحب کی بیٹی شگفتہ کے ساتھ بھی جو بریرہ کی ہم عمر تھی اس کی خاص دوستی نہیں ہو سکی تھی۔ اظہار صاحب نے فی الوقت ان کا داخلہ وہیں گاؤں کے مڈل اسکول میں کروا دیا تھا۔ خضر بھاء اور نظر بھاء کی شادی کی تقریب میں وہ بولا بولائی سی پھرتی رہی۔ ظہرہ اور کنیز دونوں سگی بہنیں جنھانی، دیورانی بن کر خوب صورت دلہنوں کے روپ میں حویلی آ چکی تھیں۔ چند دنوں بعد عمر کے نویں کے امتحان شروع ہو گئے تو وہ مصروف ہو گیا۔

کرنل صاحب کی صحت اب پہلے سے بہتر تھی پھر بھی اظہار صاحب بچوں کا دل بہلانے کے لیے انہیں اکثر دوپہر کے بعد اپنے آموں والے باغ کی سیر کو لے جاتے تھے جس کے قریب ہی ایک پختہ ٹوب ویل اور دو کچے نالے بہتے تھے جن میں ہمہ وقت ٹھنڈا پانی رواں رہتا تھا۔ مریرہ کو اس بہتے ہوئے قدرے گد لے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھنا بے حد پسند تھا تبھی اس کا اور بریرہ کا دل حویلی میں لگ گیا تھا۔ بہترین خوراک اور صاف ماحول نے نہ صرف ان کی اٹھان اور صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا بلکہ وہ بہت نکھر بھی گئی تھیں۔

اس روز موسم بہت اچھا تھا اظہار صاحب کرنل صاحب کے ساتھ کسی ضروری کام سے کہیں گئے ہوئے تھے تب ہی وہ دونوں بے جی کو بتا کر آموں والے باغ کی طرف چلی آئی تھیں۔ عصر کا وقت تھا۔ بریرہ درخوں کے نیچے مٹی میں کھیل رہی تھی جبکہ مریرہ آم کے پیڑ پر چڑھی کچے آموں کو توڑ توڑ کر زمین پر گرارہی تھی جب عمر وہاں پہنچا تھا۔ اس نے جو مریرہ کو کچے آم خراب کرتے دیکھا تو اس کا پارہ فوراً ہائی ہو گیا۔

درخت کے اوپر چڑھ کر اس نے پہلے مریرہ کی پٹائی کی پھر اس کی ٹانگ کھینچ کر اسے درخت سے نیچے اتار لیا۔ مریرہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس وقت وہاں آ جائے گا، ورنہ وہ اس وقت وہاں کبھی نہ آتی۔ بریرہ اس کا غصہ دیکھ کر فوراً وہاں سے بھاگ گئی تھی مگر مریرہ کے فرار کی ساری راہیں مسدود تھیں کیونکہ اس کا بازو عمر کی گرفت میں تھا۔ درخت سے نیچے اترنے کے بعد عمر نے زمین پر گرے ہوئے تمام کچے آم اٹھا لیے

تھے۔

”کھاؤ انہیں.....“ وہ خشک پتے کی طرح کانپ رہی تھی جب اس نے زور سے اس کے بازو کو جھٹکا

دیا۔

”کھاؤ جلدی نہیں تو آج خیر نہیں تمہاری۔“ وہ غضب ناک ہو رہا تھا، مریرہ نے جلدی سے اس کے ہاتھ میں پکڑا کچا آم کھانا شروع کر دیا۔ عمر نے اس وقت اسے تین کچے آم زبردستی کھلائے تھے نتیجتاً شام میں اسے الٹیاں شروع ہو گئیں اور تیز بخار نے آگھیرا۔ ماں جی کو جب خبر ہوئی کہ سب عمر کی وجہ سے ہوا ہے تو انہوں نے اس کی خوب کلاس لی۔ جس کے بعد عمر کی مریرہ کے لیے رنجش اور بھی بڑھ گئی۔

کرنل صاحب کی طبیعت قدرے سنبھل گئی تھی، ان کا زیادہ وقت چوہدری صاحب کے ساتھ زمینوں پر بسر ہونے لگا، خضر عباس اور نظر عباس دونوں صاحب اولاد ہو گئے تھے ادھر بریرہ اور مریرہ نے اپنی اپنی کلاس میں پورے گاؤں میں ناپ کیا تھا جس کی حویلی میں بہت خوشی منائی گئی تھی۔ ماں جی ناشتے میں بریرہ، مریرہ اور عمر تینوں کو دیسی گھی کی چوری اور ایک بڑا گلاس دودھ کا پلا کر اسکول بھیجتی تھیں۔ تینوں سپارہ پڑھنے گاؤں کے مولوی صاحب کے گھر جاتے۔ عمر چونکہ بڑا تھا اور اس کا قرآن تقریباً مکمل ہونے والا تھا تب ہی بریرہ اور مریرہ کو سبق یاد کروانے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی گھر سے بے جی مریرہ کو جو سبق یاد کروا کر بھیجتی تھیں۔ وہ تو اسے رستے میں ہی بھول جاتا تھا اب مولوی صاحب کے گھر اگر عمر کا موڈ اچھا ہوتا تو اسے سبق بتا دیتا نہیں تو صاف انکار کر دیتا جس کے جواب میں مریرہ کو مولوی صاحب سے اکثر ڈانٹ یا مار پڑتی تھی۔ مولوی صاحب جتنے سخت اور گرم مزاج کے تھے ان کی بیوی اتنی ہی حلیم نیک اور پرہیزگار تھیں۔ اکثر مولوی صاحب کی غیر موجودگی میں وہی بچوں کو درس قرآن پاک دیتی تھیں۔ مریرہ روز دعا کرتی کہ مولوی صاحب گھر پر نہ ہوں اور وہ آج کو سبق سنا کر بھاگ آئے مگر روز ایسا نہیں ہوتا تھا۔

مولوی صاحب اور ان کی بیوی کی شادی کو بیس سال ہو گئے تھے مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔ اسی گلی میں مولوی صاحب کے برابر ترکھانوں کا گھر تھا جس میں ایک عمر رسیدہ بیمار اماں ان کا کبڑا شوہر جسے پورے گاؤں والے ”کبڑا بابا“ کہہ کر بلاتے تھے اور ان کی تین عدد دیہاتی بہنیں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ رہتی تھیں۔

جن دنوں ان کے امتحان چل رہے تھے انہی دنوں اماں کی رحلت ہو گئی تھی۔ گاؤں والوں نے مل کر بڑھیا کے کفن و دفن کا انتظام کیا کیونکہ ان کے بیٹوں بیٹوں نے اس ذمہ داری کو اٹھانے سے صاف ہاتھ کھڑے کر دیے تھے۔ اماں کی رحلت کے بعد بابا بخار کی لپیٹ میں آ گیا۔ روز شام کو اسے بخار چڑھ جاتا اور وہ گھر کے کونے میں اکیلا بے حال پڑا رہتا، تینوں میں سے کسی بہو کو اس کے منہ میں پانی ڈالنے کی فرصت نصیب نہیں تھی۔ بعد ازاں اس کے بیٹوں نے اس کی بیماری سے بچک آ کر اسے گھر سے نکال دیا جس کے بعد وہ گاؤں کی گلیوں میں بھوکا پیاسا روتا پھرتا تھا۔ روز گاؤں میں کوئی نہ کوئی اسے روٹی دے دیتا اور وہ اللہ کا شکر ادا کر کے جہاں جگہ مل جاتی پڑا سویا رتا۔ عمر اور مریرہ اکثر اس بابا جی سے کہیں نہ کہیں ٹکراتے یا حویلی میں بے جی بابا کے لیے جو چیز بناتی وہ دونوں اسے لے کر بابا کو ڈھونڈتے پھرتے اور پھر دعائیں لیتے۔

عمر سن بلوغت میں قدم رکھ چکا تھا تاہم مریرہ ابھی اتنی کھدار نہیں ہوئی تھی۔ اس روز وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مٹی کے گھر بناتے ہوئے کھیل رہی تھی جب عمر کھیتوں سے واپسی کے بعد بے جی کے حکم پر اسے گھر بلانے گیا مگر مریرہ نے اس کی بات نہیں سنی تو وہ زبردستی اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے وہاں سے لے آیا تب ہی غصے میں آ کر اس نے عمر کی کلائی میں اپنے دانت زور سے گاڑ دیئے تھے اتنی زور سے کہ کچھ ہی لمحوں میں خون رسنے لگا تھا، عمر کو اس کی اس حرکت نے چراغ پا کر دیا تھا۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اسے بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے گاؤں کی ایک پرانی عمارت کے کونے میں بند کر دیا۔ مریرہ اندر چینی رہی مگر اس نے پروا نہیں کی۔ شام میں جب وہ حویلی آیا اور بے جی نے اس سے مریرہ کا پوچھا تب اسے پریشانی ہوئی تھی کیونکہ وہ تو دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلنے میں لگ کر بھول ہی چکا تھا کہ اس نے مریرہ کو کہیں قید بھی کیا تھا۔ اس وقت بے جی کو تسلی دے کر وہ انہی قدموں پر واپس پلٹا اور دوڑتے ہوئے اس پرانی عمارت کے قریب پہنچا جس کے ایک بوسیدہ کمرے میں اس نے مریرہ کو پورے دن کے لیے قید کر چھوڑا تھا۔ وہ عمارت کافی عرصے سے غیر آباد تھی۔ گاؤں کے لوگوں کے مطابق وہاں کوئی ڈاکیہ رہتا تھا جس نے بعد میں وہ گھر جو باہر سے دیکھنے میں پرانی حویلی کی طرح تھا اور ہندوؤں کے زمانے کا بنا ہوا تھا شہر میں کسی کو فروخت کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ گھر کھنڈر ہوتا گیا تھا مگر وہاں کوئی آیا نہیں تھا۔

جس وقت عمر نے بوسیدہ ویران کمرے کی کنڈی کھول کر اندر قدم رکھا شام کا ہلکا سا اندھیرا پھیل رہا تھا اور مریرہ وہیں نیچے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ وہ لمحے اس کی زندگی کے واحد لمحے تھے جن میں اس کے پاؤں تلے سے زمین نکلی تھی۔ کتنے جتنوں کے بعد وہ مریرہ کو وہاں سے اٹھا کر آموں کے باغ کی طرف لایا اور پھر اس کے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرتا رہا تھا۔ مریرہ کے ہوش میں آنے کے بعد پہلی بار اس نے اس سے معافی مانگی تھی اور اس کی منت بھی کی تھی کہ وہ یہ بات گھر میں کسی کو نہ بتائے کہ اس نے اسے پرانی حویلی میں بند کیا تھا بلکہ اسے ڈانٹ پھینکا کرے گا نہ مارے گا۔

مریرہ نے اس کی بات مان لی تھی تاہم اگلے دو ہفتوں تک اسے بخار چڑھتا رہا تھا۔ عمر نے اس کے بعد کبھی اس پر ہاتھ نہیں اٹھایا نہ ڈانٹ پھینکا کی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر مریرہ کے لیے محبت پیدا ہو گئی تھی مگر وہ کبھی اس محبت کو نہ سمجھ سکا۔ یہاں تک کہ بریرہ اور مریرہ کے امتحانات کے بعد کرنل صاحب انہیں شہر واپس لے گئے تھے اور وہ اس کے بعد صرف چھٹیوں میں گاؤں آتی تھیں۔

ان دنوں عمر بارہویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا جب بریرہ اور مریرہ کرنل صاحب کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیوں میں حویلی چلی آئیں۔ بریرہ کا اسکول میں آخری سال تھا جبکہ مریرہ نے ابھی نویں جماعت میں داخلہ لیا تھا۔ چڑھتی ہوئی جوانی کے رنگ روپ نے اس کے حسن کو دو آتھہ بنا دیا تھا جو بھی اس کی طرف دیکھتا تھا بس دیکھتا ہی رہ جاتا تھا۔

بریرہ کی عمر عباس کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی مگر مریرہ کے ساتھ اس کی اجنبیت تاحال قائم تھی۔ انہی دنوں عمر کی شادوں کے ساتھ بات پکی ہوئی تھی وہ بھی اس کی مرضی کے قطعی خلاف..... تب ہی وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا تھا۔

بریرہ کی سکندر علوی کے ساتھ بات چلی ہو گئی تھی اور وہ بے حد خوش تھی۔ یہ انہیں دنوں کی بات تھی جب گاؤں میں عمر کی کسی لڑکے کے ساتھ لڑائی ہو گئی تھی۔ جھگڑا اتنا شدید تھا کہ نوبت مار کٹائی تک جا پہنچی اس وقت گاؤں کے کچھ دوسرے لڑکوں نے درمیان میں دخل اندازی کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا تھا مگر عمر نے بات کو جانے نہیں دیا۔ جھگڑے کی اصل وجہ کبوتر بازی تھی اور وہ جاگیرداروں کا بیٹا تھا کسی کی بات سننا یا کسی سے شکست تسلیم کرنا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ اس کے پاس ”بازی“ کے لیے بہترین کبوتر تھے جسے وہ روز میوہ جات وغیرہ کھلاتا تھا اور اس کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔ اس وقت بھی بات بازی کے مقابلے پر ختم ہوئی تھی۔

اس روز جمعرات کو بازی لگنا تھی۔ صرف عمر کو ہی نہیں پورے گاؤں کو یقین تھا کہ عمر مخالف پارٹی کو دھول چٹا دے گا مگر اس کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ بدھ کی شام مریرہ نے غلطی سے وہ کبوتر اڑا دیا تھا پھر اس سے پہلے کہ وہ اڑان بھرتی پاس ہی منڈیر پر گھات لگائے بیٹھی بلی نے اسے اپنا نوالہ بنا لیا۔ عمر کرکٹ میچ سے فارغ ہو کر گھر آیا تو بریرہ کی زبانی اسے اپنے کبوتر کی کہانی پتا چلی چپک کرنے پر اسے یہ شک لگا کہ بلی کا نوالہ بننے والا کبوتر کوئی اور نہیں وہی بازی والا کبوتر تھا۔ تب ہی غصے اور صدمے سے بے حال اس نے مریرہ کے منہ پر تھپڑ رسید کیا تھا مگر اس کے بعد اس نے اپنے سارے کبوتر اڑا دیے تھے۔

جاگیرداروں کا کبھی کسی سے نہ ہارنے والا بیٹا صرف ایک لڑکی کی وجہ سے ہار گیا تھا۔ یہی وہ واقعہ تھا جس کے بعد اس نے ابروڈ جانے کی ٹھانی تھی۔ اسی واقعے کے بعد اس کے دل میں مریرہ رحمان کے لیے محبت کے بیٹھے چشمے پھوٹے تھے، اسی واقعے کے بعد اس کی اور مریرہ کی صلح ہوئی تھی جو بعد میں ان دونوں کو ایک دوسرے کے بے حد قریب لے آئی۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے بے حد مانوس ہو گئے تھے مگر دونوں ہی ایک دوسرے کے دل سے یکسر بے خبر رہے۔ بالآخر اس بے خبری نے ان دونوں کو دریا کے دو کناروں کی مثال بنا دیا تھا۔



موسم خاصا ابر آلود تھا۔ مریرہ گھر سے گاؤں کے لیے نکلی تو بارش کے آثار نہیں تھے تاہم جس وقت وہ شہر زاد اور قمر بھائی کی بیوی شہر بانو کو لے کر گھر واپس پہنچی شدید بارش شروع ہو چکی تھی۔ ساون اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ اس نے دو روز پہلے ہی ان دونوں ماں بیٹی کے لیے الگ سے کمراسیٹ کروا دیا تھا۔ شہر زاد حویلی میں رکنا چاہتی تھی مگر اس کی ماں نے اسے اس کی اجازت نہیں دی تھی خود عمر کا بھی یہی حکم تھا کہ وہ شہر میں مریرہ کے پاس قیام کریں تب ہی وہ کچھ بھی بکھی سی تھی اس وقت رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ ہو رہے تھے۔ درمکنوں اور شہر زاد لان میں تھیں جبکہ مریرہ اور شہر زاد کی ماں شہر بانو لاؤنج میں بیٹھی تھیں اسی دوران باتوں باتوں میں شہر بانو نے مریرہ سے پوچھا تھا۔

”میں تمہیں یہ نہیں کہوں گی مریرہ کہ تم نے جو کیا وہ غلط تھا مگر میں اتنا ضرور پوچھنا چاہوں گی تمہارے ساتھ جو بھی ہوا اس میں کرل چچا کا کوئی قصور نہیں تھا پھر تم نے انہیں کیوں چھوڑا۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی تھے تمہارے سوا دنیا میں ان کا کوئی اپنا بھی نہیں پھر وہ کس کے سہارے زندہ رہے ہوں گے؟“

”ان کا بیٹا سکندر علوی جن دنوں میرے اور صمد کے راستے الگ ہوئے ان دنوں وہ ملک سے باہر

اسی کے پاس رہ رہے تھے بعد میں اس کی کثرت شراب نوشی سے ڈبھ ہو گئی تو وہ اپنی پوتی کو ساتھ لے آئے بہت پیاری اور ذہین بچی ہے عائد! اب تو ایک لڑکا بھی ان کے ساتھ رہتا ہے سدید شاید وہ بھی ان کا کوئی جاننے والا ہے۔“

”تمہیں یہ سب کیسے پتا..... کیا تمہارا رابطہ ہے کرل چچا سے؟“

”نہیں بڑے ابو سے نہیں ہے مگر اسی محلے میں رہنے والی ایک پرانی دوست سے ہے جو بچپن سے میری رازدار ہے اور شادی کے بعد بیوہ ہو کر دوبارہ اپنے میکے آباد ہو گئی وہ پل پل کی خبر دیتی ہے۔“

”ہوں اور بیٹے کا کچھ پتا چلا کیسا ہے؟“

”ہاں عمر نے بتایا تھا شکل و صورت میں بالکل میری کاپی ہے لندن میں ہوتا ہے آج کل۔“

”کبھی دل نہیں چاہا اس سے ملنے کے لیے؟“ اگلا سوال بہت کڑا تھا مریرہ کی آنکھیں پل میں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

”دنیا کی کون سی ایسی ماں ہوگی جس کا دل اپنے برسوں سے پھڑے ہوئے جگر کے ٹکڑے سے ملنے کو نہیں چاہے گا۔“

”پھر؟“

”پھر کیا بانو! دل کی آواز پر کان دھرنا بہت سالوں سے چھوڑ دیا میں نے کیونکہ اس دل نے سوائے درد اور ذلت کے اور کچھ نہیں دیا مجھے۔ میں نے بڑے ابو سے بھی کبھی اسی لیے رابطہ نہیں رکھا کہ ان کی راہیں صمد حسن کی راہوں سے جدا نہیں ہیں۔ میں ان کے پاس رہ کر اس شخص سے دور نہیں جاسکتی تھی یہی معاملہ میرے بیٹے کے ساتھ ہے وہ بھی اسی شخص کی دسترس میں ہے کہ جس تک جانے کا ہر راستہ میں سالوں سے بند کر آئی ہوں۔“

”تمہیں نہیں لگتا مریرہ کہ تم نے زندگی کو بہت مشکل بنا لیا ہے۔“

”نہیں میں نے زندگی کو نہیں زندگی نے مجھے بہت مشکل بنا دیا ہے۔“

”میرے خیال سے تمہیں صمد بھائی سے طلاق لے کر عمر بھائی سے شادی کر لینی چاہیے تھی تم نہیں جانتیں مریرہ! وہ تنہائی میں کتنی تکلیف دہ زندگی گزار رہے ہیں۔“

”مجھے اندازہ ہے مگر میں نے زندگی میں کبھی اس طرح سے نہیں سوچا۔“

”کیا درمکنوں کو تمہارے ماضی کے بارے میں سب معلوم ہے؟“

”ہاں کسی حد تک وہ سب جانتی ہے۔“

”اس نا جائز بچے کے بارے میں بھی؟“

”پتا نہیں۔“

”مجھے کبھی کبھی تم پر بہت ترس آتا ہے مریرہ!“

”مجھے بھی، مگر میں کمزور نہیں ہوں۔“

”ہوں جانتی ہوں۔“ تھکی تھکی سی گہری سانس بھرتے ہوئے شہر بانو نے کہا۔ جواب میں مریرہ نے آہستہ سے پلکیں بند کر کے سر صوفی کی پشت گاہ سے نکا دیا۔

کبھی کبھی تھکن صرف وجود نہیں کاٹتی، روح کو ادھیڑ کر رکھ دیتی ہے اور مریرہ کے ساتھ بھی اس لمحے کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔



”مما میں سادیز سے شادی کر رہی ہوں۔“ اس روز ناشتے کی ماز پر درکنون نے مریرہ کو بتایا، جواب میں وہ چونک اٹھی۔

”سادیز کون؟“

”اُف بتایا تو تھا آپ کو میرا دوست ہے یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا رہا ہے ہزار بار تو اس کی باتیں کر چکی ہوں میں آپ سے۔“

”ہوں مگر وہ تو انگریز ہے۔“

”اب نہیں ہے اس نے وہ منگنی ختم کر دی ہے۔“

”کیوں؟“

”بس تھی کچھ وجہ۔“

”مگر تم اس سے شادی کیوں کرنا چاہ رہی ہو۔“

”کیونکہ وہ مجھے پسند ہے۔“

”کل تک تو نہیں تھا یہ ایک ہی دن میں کون سا منتر پڑھ کر پھونک ڈالا ہے اس نے تم پر۔“

”ایک دن کی بات نہیں ہے ممما! میں کافی دن سے اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں بس آپ کو

آج بتایا ہے ویسے بھی اس نے مجھے پرپوز کیا ہے۔“

”پرپوزل تو اور بھی بہت ہیں پھر خاص سادیز آفندی کا پرپوزل قبول کرنے کی وجہ؟“

”سوری! وجہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔“

”مگر کیوں؟ تم اتنی بڑی کب سے ہو گئی ہو دردی کہ اپنے فیصلے خود کر سکو۔“ اب کے وہ برہم ہوئی تھی

درکنون شرمندہ سی ہو گئی۔

”ایم سوری! میرا مقصد آپ کی دل آزاری کرنا نہیں تھا۔“

”تمہارا مقصد جو بھی ہو مگر میں تمہیں اس شادی کی اجازت کبھی نہیں دوں گی۔“

”مگر کیوں ممما! سادیز بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”ہوگا مگر میں اسے تمہاری حوالے سے پسند نہیں کرتی۔“ مریرہ کے غصے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی

درکنون اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئی۔

”او کے پھر آپ میری بات بھی سن لیں میں سادیز کے علاوہ کسی اور سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔“

”مت کرنا کسی غلط انسان سے شادی کرنے سے بہتر ہے تم کنواری رہو۔“ وہ بھی اس کی ماں تھی

درکنون کے لبوں پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔



اس روز وہ آفس آئی تو صیام پھر لیٹ تھا، درکنون کا پارہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہائی ہو گیا۔ وہ ملازمین کا خیال رکھتی تھی مگر انہیں زیادہ سرچڑھانے کی قائل نہیں تھی۔ حنان اپنی سیٹ پر موجود تھا اسے فی الفور اسے کمرے میں بلا لیا۔

”جی میڈم السلام علیکم!“

”علیکم السلام! مسٹر حنان! مسٹر صیام آئیں تو آپ فوری ان کا حساب کلیئر کر دیں، میری کمپنی کو غیر ذمہ دار لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس کا دو ٹوک لہجہ اور حکم دونوں ہی حنان کی پریشانی کا باعث بنے تھے اوپر سے اس کا موڈ بھی بے حد خراب تھا پھر بھی اس نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

”ایم سوری میڈم! وہ غیر ذمہ دار نہیں ہے بس اس کے حالات.....“

”پلیز اسٹاپ اٹ! یہ آفس ہے یہاں کاروبار ہوتا ہے لوگ یہاں اپنے کام اور وقت کی قیمت وصول کرتے ہیں خیراتی سینٹر نہیں ہے کہ کسی کے بھی حالات دیکھ کر اس کی مدد کرتے رہیں سمجھے آپ۔“ حنان کی بات درمیان میں کاٹتے ہوئے وہ بہت درشت لہجے میں بولی۔

حنان بے حد خفت محسوس کرتا، اثبات میں سر ہلا کر واپس پلٹ گیا عین اسی لمحے شہر زاد نے اس کے آفس میں قدم رکھا تھا۔

”السلام علیکم! کیا بات ہے بہت غصے میں لگ رہی ہو؟“ شہر زاد کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر اس نے خود کو سنبھالا تھا۔

”علیکم السلام! نہیں ایسی کوئی بات نہیں، تم یہاں کیسے؟“

”کیوں! میرے یہاں آنے پر کوئی پابندی ہے؟“ مسکراتے ہوئے وہ اس کے مقابل بیٹھی، درکنون نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”نہیں، تم جب چاہو بنا اطلاع دیئے آ سکتی ہو بلکہ اگر چاہو تو آدھی رات کو بھی آ سکتی ہو۔“

”اچھا؟“

”بالکل۔“

”شکریہ دیے میں گھر میں بور ہو رہی تھی تو مریرہ آنٹی نے کہا تمہارے آفس کا چکر لگا لوں بوریت دور ہو جائے گی مگر مجھے کیا پتا تھا یہاں درجہ حرارت اتنا ہائی فائی ہوگا۔“

”ایسی بات نہیں ہے یار! بس کبھی بھی ملازمین پر رعب جمانا پڑتا ہے ورنہ بہت تنگ کرتے ہیں۔“

”آہم..... یہ تو ہے دیسے ابھی ابھی تمہارے آفس میں داخل ہوتے وقت باہر بیڑھیوں پر میرا ٹکراؤ ایک بہت ہینڈسم سے ڈیشنگ بندے کے ساتھ ہوا اور میں تمہیں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ یہاں کام کرتا ہے تو تمہارے فی میل اسٹاف کی آدھے سے زیادہ لڑکیاں ضرور اس پر جان دیتی ہوں گی۔“

”اچھا..... مگر مجھے تو آج تک ایسا کوئی شاندار بندہ یہاں نظر نہیں آیا۔“ درکنون کو شہر زاد کی تعریف پر حیرت ہوئی تھی جب وہ بولی۔

”ہو سکتا ہے تمہاری قریب کی نظر تھوڑی کمزور ہو یا پھر وہ شخص واقعی یہاں کام نہ کرتا ہو میری طرح

کسی سے ملنے آیا ہو۔“

”ہوں یہ ہو سکتا ہے۔“

”جو بھی ہے مجھے لگتا ہے میں پہلی نظر میں اس کی محبت کی شکار ہو گئی ہوں۔“

”پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟“

”نہیں یا، قسم سے میرا دل ابھی تک اس کے تصور سے دھڑک رہا ہے۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ آپ حسن کی سرزمین سے یہاں اپنے پرکھوں کی تاریخ جاننے نہیں بلکہ یہاں کسی سے پہلی نظر کی محبت کی شکار ہونے آئی تھیں۔“

”کہہ سکتی ہو مگر وہ حویلی اور اس کے رازوں کا تعلق میری روح سے ہے۔ میں اس حویلی اور اس کے رازوں سے کبھی غافل نہیں رہ سکتی۔“ قدرے سنجیدہ لہجے میں اس نے کہا، عین اسی لمحے انٹرکام بجا تھا۔

”میڈم صیام آ گیا ہے آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“

”ٹھیک ہے بھیج دیں اندر۔“ شہزاد کی باتوں کی وجہ سے اس کا تھوڑی دیر پہلے والا غصہ اتر چکا تھا۔

پھر جس وقت صیام نے اس کے آفس میں قدم رکھا، شہزاد بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ یہاں.....؟“

”جی۔“ صیام کے چہرے پر بے حد اذیت اور پریشانی تھی۔ درمکنوں کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ بھی نہ لگا کہ ابھی شہزاد جس چارمگ شخص کے بارے میں بات کر رہی تھی وہ صیام ہی تھا۔

”بیٹھے۔“ اسے دیکھ کر اس کا غصہ پھر سے عود آیا تھا، شہزاد بھی اس کے گھورنے پر چپ چاپ بیٹھ گئی۔

”میں نے مسٹر حنان کو آپ کا حساب کلیئر کرنے کا کہہ دیا ہے، میں ہر روز آپ کا لیٹ آفس آنا افروڈ نہیں کر سکتی۔“ اگلے ہی پل اس نے ترش لہجے میں کہا، صیام نے بے حد اذیت اور ذلت محسوس کی۔

”ایم سوری! میرے والد کی حالت خطرناک حد تک خراب ہو گئی تھی انہیں آئی سی یو میں شفٹ.....“

”ایم سوری مسٹر صیام! میں ہر روز آپ کی ایک ہی کہانی سن سن کر عاجز آ گئی ہوں۔ مجھے آپ سے

ہمدردی ہے مگر سوری آگین میں آپ کو مزید کوئی رعایت دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔“ اس کا لہجہ دو ٹوک تھا، شہزاد نے بے حد بے چینی محسوس کی۔

”دری! تم ان کی پوری بات تو سن لو ہو سکتا ہے واقعی کوئی مجبوری ہو اور پھر اس طرح سے بنا انفارم

کیے تم فوری کسی کو کیسے نکال سکتی ہو۔“ درمکنوں کو اس کا درمیان میں بولنا اور صیام کی حمایت کرنا برا لگا تھا تاہم وہ ضبط کر گئی۔

”میں انہیں بہت پہلے انفارم کر چکی ہوں اور وارن بھی۔“

”اوکے، پلیز میری ریکورڈ پر ایک آخری موقع دے دو، میں یقین سے کہہ سکتی ہوں اس کے بعد

تمہیں شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔“

”ٹھیک ہے آپ جاسکتے ہیں مگر یاد رہے یہ آخری وارننگ ہے۔“

”اوکے، ٹھیک ہو۔“ درمکنوں کی آخری وارننگ پر اس نے سرسری سی ایک نظر اس کے سرخ چہرے پر

ڈالتے ہوئے منمن لہجے میں کہا، در فوراً اس کے آفس سے نکل آیا۔ حنان اسی کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا اسے دیکھتے ہی بے تابی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا بنا؟“

”کچھ نہیں! آخری وارننگ دے کر چھوڑ دیا ہے۔“

”شکر الحمد للہ! میں بہت پریشان ہو گیا تھا، انکل کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”حوصلہ افزا نہیں ہے، بہت تکلیف میں ہیں۔“

”پھر کیا کرو گے اب؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا یا! کاش خود کشی اسلام میں حرام نہ ہوتی۔“ وہ بہت ڈس ہارٹ تھا، حنان نے بے حد دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔

”مایوسی کفر ہے یا! اللہ رب العزت کی پاک ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔“

”میں مایوس نہیں ہوں! بس تھک گیا ہوں حنان! بہت بے بس محسوس کر رہا ہوں میں اس وقت خود کو۔“

ایک طرف پیار باپ ہے، جس کا میں واحد سہارا ہوں تو دوسری طرف میرے حالات اور گھر والے ہیں، چاہوں بھی تو یہ جاب نہیں چھوڑ سکتا میں۔“

”جانتا ہوں یا! اللہ نے چاہا تو جلد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو مگر لگتا نہیں ہے۔“ وہ بہت شکستہ تھا تب ہی کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر پلکیں

موند گیا اندر آفس میں درمکنوں اب شہزاد کی کلاس لے رہی تھی۔

”تم بہت پاگل ہو شہزاد! تمہیں یوں اس کے سامنے اس کی فیور نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید کبھی نہ کرتی مگر میں نے اس کے چہرے پر بہت کرب دیکھا تھا، اس

کی آنکھیں بہت اذیت میں تھیں جیسے ساری رات ایک پل بھی نہ سو سکا ہو۔“

”فارگاڈ سیک یا! یہ شخص روز ایک ہی کہانی سناتا ہے کبھی بائیک چنگر ہو گئی تو کبھی باپ پیار پڑا ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے واقعی یہ مسائل درپیش ہوں۔“

”چلو مان لیا یہ سچ ہے مگر تم بتاؤ میں اگر یونہی ہر روز سے چھوٹ دیتی رہی تو آہستہ آہستہ دوسرے

درکرز بھی یہی سب کرنا شروع ہو جائیں گے اگر ایسا ہوا تو میں اپنی کمپنی اور کاروبار کیسے چلاؤں گی؟“

”تم اپنی جگہ پر غلط نہیں ہو مگر وہ بھی مجھے جھوٹا نہیں لگ رہا، ایک مالک اور نوکر سے ہٹ کر اس کا اور

تمہارا انسانیت کا بھی تعلق ہے ناں دری!“

”اوکے، اب پلیز کوئی لمبا لکچر نہ شروع کر دینا، میرا موڈ آج ویسے ہی بہت خراب ہے۔“

”وہ تو نظر آ رہا ہے چلو کسی اچھے سے ریسٹوران میں چل کر کافی پیتے ہیں۔“

”ہوں، چلو۔“ شہزاد کی آفر پر کچھ سوچتے ہوئے وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی، شہزاد نے سکون کا گہرا

مانس لیا۔



تمہیں بھی تو خبر ہوگی۔

کہ دریا پاس بہتا ہو تو پانی اچھا لگتا ہے۔

کنارے سے جڑی مٹی سے پوچھو روگ چاہت کا

کہ اس پانی کی چاہت میں

کناروں سے بچھڑ کر دور اجنبی دیسوں کو جانا

کتنا مشکل ہے

کنارہ پھر نہیں ملتا

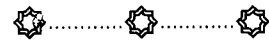
تمہیں بس اتنا کہنا ہے

یہاں جو بھی بچھڑ جائے

دوبارہ پھر نہیں ملتا

کھڑکی کھلی تھی بارش میں بھیگی ہوا کے نم جھونکے پوری سرمستی کے ساتھ کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہے تھے مگر انہیں ٹھنڈا احساس نہیں تھا۔ سارا وجود جیسے ساکت ہو گیا تھا، کیا رہا تھا ان کے پاس؟ کچھ بھی تو نہیں محل جیسا کشادہ، خوبصورت گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ پر ہیان کے ساتھ ساتھ صمد حسن نے اسے بتایا تھا کہ زاویار بھی گھر چھوڑ کر جا چکا ہے کیونکہ وہ بھی حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا مگر وہ کہاں گیا تھا یہ نہ وہ جنتی تھیں نہ صمد حسن..... وقت نے انہیں ہراڈالا تھا اور وہ ہار گئی تھیں، قطعی بے بس ہو گئی تھیں۔

انہیں زاویار سے گلہ نہیں تھا کیونکہ وہ ان کی گودان کی کوکھ سے نہیں جتنا تھا مگر پر ہیان تو ان کی بیٹی تھی۔ اسے تو انہوں نے معاشرے میں باعزت طریقے سے جنم دیا تھا، اس کے لیے تو وہ زندگی کے ہر طوفان سے جنگ کرتی آئی تھیں پھر بھی وہ انہیں گناہ گار ٹھہرا کر چلی گئی تھی۔ گزرے ہوئے تلخ وقت کے کٹھنوں میں کھڑا کر کے چلی گئی تھی۔ بنا اس کی کہانی سننے، اس نے انہیں لفظوں کے پتھروں سے سنگسار کر ڈالا تھا۔ آنسو تھے کہ انمول موتیوں کی طرح نکھرتے جا رہے تھے، انہوں نے تھک کر پلکیں موندتے ہوئے سرکسی کی پشت گاہ سے نکال لیا تھا۔



ان دنوں وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھیں۔ بچپن میں ہی ماں کے وجود سے محرومی کے بعد ان کے باپ نے انہیں بہت لاڈ پیار سے پالا تھا پھر وہ تھیں بھی اکلوتی اور بے حد فرما بردار اسی لیے ان کے ابا ان سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کا گھر جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت چل رہا تھا، جس گھر میں وہ اپنے باپا کے ساتھ رہتی تھیں اسی گھر میں ان کے علاوہ ان کے چچا کی فیملی بھی رہائش پذیر تھی۔ بچپن میں ہی ان کے والد نے ان کا نکاح ان کے چچا کے بڑے بیٹے عذیر ترمذی کے ساتھ کر دیا تھا۔

وہ اپنے بھائی کے ساتھ ہمیشہ جڑے رہنا چاہتے تھے، سارا کوشعور سنبھالنے کے بعد اس بات کا پتا چلا تو وہ عذیر کو سخت ناپسند کرنے کے باوجود صرف اپنے باپا کی خوشی کے لیے چپ سادھ گئیں۔ عذیر بچپن میں ہی بے حد جھگڑالو اور ضدی واقع ہوا تھا۔ آئے روز ان کے گھر محلے والے اس کی شکایت لے کر آتے مگر اس کی

طرح چونکہ وہ بھی اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا اور چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اس لیے اسے کبھی کبھہ نہ کہا جاتا بس پیار سے سمجھا دیا جاتا مگر اس پیار سے سمجھانے کا اس پر کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں پہنچ کر بھی اس کی شخصیت سدھرنے کی بجائے مزید بگڑتی چلی گئی تھی۔

دن بھر محلے کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا وہ آہستہ آہستہ چوری اور نشہ بھی کرنے لگا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے اب سارا کو پریشان کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ کبھی سیڑھیوں پر راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا تو کبھی کچن میں ہاتھ پکڑ لیتا۔ ایک بار گرمیوں میں جب سب لوگ اکٹھے صحن میں سو رہے تھے وہ اپنی چار پائی سے اٹھ کر سارا کی چار پائی پر آ بیٹھا تھا یہ تو سارا کی آنکھ فوری کھل گئی ورنہ نہ جانے اس رات وہ کیا کرتا۔ چچی اس کی حرکتوں کی وجہ سے پریشان جلد از جلد اس کی شادی کا سوچ رہی تھیں کیونکہ انہیں ڈرتا تھا کہیں سارا اس رشتے سے مکر نہ جائے۔ اپنی بیٹیوں سے بھی پہلے وہ اب بیٹے کا گھر آباد دیکھنا چاہتی تھیں مگر سارا کے بابا اس حق میں نہیں تھے۔

وہ چاہتے تھے کہ عذیر پہلے خود کو سدھارے پھر برنس میں اپنے باپ کی جگہ سنبھالے تب ہی وہ اپنی بیٹی کو اس کے ساتھ رخصت کریں گے مگر ایسا نہیں ہو سکا تھا۔ عذیر نے اپنے باپ کو دکھانے کے لیے ماں کے سمجھانے پر بظاہر نوکری کی تلاش شروع کر دی تھی مگر حقیقت میں وہ سارا سارا دن گرلز اسکول اور گرلز کالج کی لڑکیوں کے پیچھے خوار ہوتا رہتا۔

سارا یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تو چچا نے پھر اپنی بیوی کے بہکانے پر رخصتی کا مطالبہ شروع کر دیا مگر اس کے بابا چونکہ ابھی مطمئن نہیں تھے لہذا انہوں نے پھر انکار کر دیا تب ہی غصے میں آ کر انہوں نے اپنا کاروبار الگ کر لیا ناصرف کاروبار الگ کر لیا بلکہ اسی روز مستری بلوا کر انہوں نے گھر کے درمیان میں دیوار بھی کھنچوا دی۔ سارا کے بابا کو اس بات کا بہت صدمہ ہوا تھا مگر سارا نے انہیں سنبھال لیا۔ کچھ عرصے بعد اس کے بابا کی صمد حسن سے بات چیت ہو گئی تو انہوں نے اس کے ساتھ پانٹر شپ شروع کر دی جس پر عذیر اور اس کے چچا کی خفگی مزید بڑھ گئی۔

جن دنوں صمد اور اس کے بابا اپنی نیو فیکٹری کا افتتاح کر رہے تھے انہی دنوں اچانک چچا کی دو بیٹیوں کی آنا فانا شادی ہو گئی تھی۔ چچا نے اس شادی میں اپنے اکلوتے بڑے بھائی کو انوائٹ نہیں کیا تھا جس پر اس کے بابا مزید دکھی ہو گئے تھے۔ انہی دنوں عذیر کسی لڑکی کے ساتھ زیادتی کے کیس میں پکڑا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے بابا نے عدالت میں خلع کا کیس دائر کر دیا۔ وہ اپنی نیک فرماں بردار بیٹی کو کسی طور عذیر جیسے بے پروا اور غیر ذمہ دار شخص کے حوالے نہیں کر سکتے تھے۔

صمد حسن کو بھی ان سارے معاملات کی خبر تھی اور وہ اپنے تئیں اس کے بابا کو تسلی و حوصلہ دیتے رہتے تھے۔ دو ایک بار وہ ان کے گھر بھی آئے تھے اور سارا کے سلیقے نے انہیں واقعی بہت متاثر کیا تھا، وہ بے حد سمجھدار اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔

اس روز بارش بہت ٹوٹ کر برسی تھی۔ شب کے تقریباً آٹھ بجے کا نام تھا وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا آج جلدی گھر نہیں آئیں گے کیونکہ اس روز انہیں صمد کے ساتھ کسی ضروری سیمینار میں شرکت کے لیے جانا تھا یہاں سے ان کی واپسی رات گیارہ بجے سے پہلے ممکن نہیں تھی تب ہی وہ کچن صاف کر کے نماز عشاء سے فارغ

ہونے کے بعد کتاب کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ فارغ اوقات میں مختلف اسلامی کتابوں اور معاشرتی ناولوں کا مطالعہ اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس وقت بھی وہ کتاب کے مطالعے میں غرق تھی جب اچانک اسے صحن میں کسی کے کودنے کی ہلکی سی آواز نے چونکا ڈالا۔ کتاب بند کر کے وہ کمرے سے صحن میں آئی تو اسی وقت عذیر نے پھرتی سے اسے یوں دبوچا کہ وہ چلا بھی نہ سکی۔ صحن سے کمرے میں لا کر اس نے سب سے پہلے اسی کے دوپٹے سے اس کا منہ باندھا پھر اسے گردن سے پکڑ کر بستر پر دھکیل دیا۔

”طلاق لینا چاہتی ہو مجھ سے؟ آج کر دیتا ہوں تمہارا یہ شوق بھی پورا مگر پہلے اپنا حق تو وصول کروں“ گیارہ سال میری بیوی رہی ہو اور آج تک قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا تم نے۔ اتنی بڑی زیادتی وہ بھی اپنے مجازی خدا کے ساتھ میں بھی دیکھتا ہوں کیسے تم کسی اور کے قابل رہتی ہو۔“ وہ شاید نشے میں تھا سارا کو لگا جیسے اس کے بدن سے جان نکل گئی ہو۔

وہ چیخنا چاہتی تھی خود کو بے داغ رکھنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرنا چاہتی تھی مگر بہت دنوں سے گھات لگائے بیٹھے اس درندہ صفت شکاری نے اسے اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔ اس کی زندگی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اچھی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد اس نے اسی حالت میں سارا کو زمین پر دھکیلا پھر اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہوئے ایک طرف تھوک دیا۔

”یہ اوقات ہوتی ہے تم عورتوں کی سمجھی.....! جب چاہیں چیونٹی کی طرح مسل کر پھینک دیں بڑی آئی عدالت سے خلع لینے والی۔ ارے میں خود آزاد کر دیتا ہوں تمہیں ایک بار کہا تو ہوتا مجھ سے اسی روز آزادی کا پروانہ پکڑا دیتا تمہارے ہاتھ میں۔“

کوئی انسانیت کے درجے سے کس حد تک گر سکتا ہے اس روز عذیر ترمذی نے اسے بتایا تھا دروازے سے نکلے ہوئے اس نے تین بار طلاق بھی اس کے منہ پر مار دی تھی جبکہ وہ زمین پر بے حال پڑی تڑپ رہی تھی۔ ساڑھے گیارہ بجے جس وقت اس کے بابا نے گھر کی تیل بجائی وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ بار بار تیل کے باوجود جب دروازہ نہ کھلا تو وہ قدرے پریشان ہوئے تھے اور اسی پریشانی میں انہوں نے فوراً صمد حسن کو کال کر کے بلایا تھا۔ صمد کے آنے کے بعد دروازہ کا لاک توڑا گیا اور جس وقت انہوں نے کمرے میں قدم رکھا وہاں پڑی سارا کی زندہ لاش نے ان کے قدموں تلے سے جیسے زمین کھینچ لی تھی۔

صمد نے آگے بڑھ کر جلدی سے بستر کی چادر اس کے اوپر ڈال دی جبکہ اس کے پیچھے موجود سارا کے بابا کی ناگوں نے جیسے ان کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت جتنی اذیت اور زخم سارا کے چہرے پر دکھائی دے رہے تھے اتنی تکلیف تو اس نے شاید اپنی پوری زندگی میں بھی نہیں اٹھائی ہوتی۔

اگلے پورے تین دن وہ ہسپتال میں ایڈمٹ رہی تھی تب کہیں چوتھے روز اسے ہوش آیا تھا وہ بھی اس حال میں کہ اس کا پورا وجود اور چہرہ داغدار تھا۔ جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں عذیر ترمذی کی درندگی کے نشان نہیں تھے۔ یہ دردِ بے اذیت یہ تکلیف ان کی آنے والی پوری زندگی میں گھل گئی تھی اور ان کی بیٹی سمجھتی تھی کہ وہ گناہ گار ہیں۔ زندگی بھر اذیتیں اٹھا کر بھی ان کے حصے میں کیا آیا تھا؟ فقط تشنگی..... اکیلا پن..... قربانیاں..... محرومیاں..... اور ان کی بیٹی سمجھتی تھی کہ وہ گناہ گار ہیں۔

بیس سال ہو گئے تھے انہیں یہی سوچتے ہوئے کہ آخر ان کا گناہ کیا تھا؟ کیا یہی کہ وہ بچپن میں ہی ماں کے وجود سے محروم ہو گئی تھیں؟ کیا یہ کہ بچپن میں ہی بنا ان کی مرضی پوچھے عذیر جیسے قطعی نا اہل شخص کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا تھا؟ وہ کہاں تصور دار تھیں..... اگر تصور دار تھیں تو وقت نے انہیں سولی کیوں چڑھایا تھا؟ آنسو تھے کہ بہتے چلے جا رہے تھے اور رات تھی کہ لمحہ بالمحہ سرکتی جا رہی تھی۔



مارتھا کا اپارٹمنٹ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ تقریباً سو گز پر مشتمل اس اپارٹمنٹ میں صرف ایک ہی کمرہ تھا جسے مارتھا اور انیل مل کر استعمال کرتے تھے۔ انیل ہندو تھا مگر مارتھا کے ساتھ اس کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ پھر دونوں کا تعلق اچھی فیملیز سے تھا لہذا اب تک انہوں نے وہ اپارٹمنٹ جو نسبتاً درمیانے درجے کے علاقے میں تھا کسی تیسرے فرد کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ ایک کمرے کے علاوہ اس اپارٹمنٹ میں ایک چھوٹا سا کچن اور باتھ بھی تھا جبکہ سامنے کے حصے کو وہ لوگ ہال کمرے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اسی میں کچن باتھ اور کمرے کا دروازہ بھی کھلتا تھا استری اسٹینڈ اور بوسیدہ سے صوفے بھی وہیں دھرے ہوئے تھے۔ ایک سائیڈ پر جگہ بنا کر چھوٹا سا فرنیچر اور ٹیلی وژن رکھا ہوا تھا۔ پر ہیان کا اس سے پہلے وہاں آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا تب ہی اسے وہاں گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

وہ ایسے ماحول میں رہنے کی عادی نہیں تھی مگر اس وقت مجبوراً اسے وہاں رہنا تھا کیونکہ اس کا زاویار سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا اور صمد صاحب سے وہ خود رابطہ کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ وہ ان کی ہر چیز ہر آسائش کے لیے خود کو قطعی حقدار نہیں سمجھتی تھی۔ مارتھا نے اس کی پریشانی سمجھتے ہوئے ہال کمرے سے غیر ضروری سامان سمیٹ دیا۔

”بیٹھو۔“

پری جانی تھی وہاں کے لوگوں میں مروت نہیں تھی مگر مارتھا کے ساتھ اس کی بہت اچھی فرینڈ شپ تھی تب ہی وہ اس کے لیے اتنا کچھ کر رہی تھی۔ پر ہیان پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کے بعد وہیں صوفے پر ٹنگ گئی۔

”آج کی رات تم یہاں اس لاؤنج میں گزارہ کر سکتی ہو مگر کل ہر صورت تمہیں اپنے بھائی سے رابطہ کر کے یہاں سے جانا ہوگا پری! کیونکہ تم انیل کو نہیں جانتی ہو۔ وہ بہت لوز کیریئر ہے شراب پینے کے بعد اس کا خود پر کنٹرول نہیں رہتا اور میں تمہاری اچھی دوست ہونے کی حیثیت سے کبھی یہ نہیں چاہوں گی کہ تمہاری عزت کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں مارتھا! انشاء اللہ کل ضرور میں اپنے بھائی کے پاس چلی جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے اب اگر چاہو تو فریش ہو کر آرام کر سکتی ہو۔“

”تھینک یو مارتھا! مجھے واقعی بہت تھکن فیل ہو رہی ہے انیل کب تک آئے گا؟“

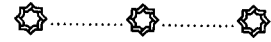
”اس کا کوئی پتا نہیں اس کے ہندوستان سے کچھ فرینڈز آئے ہوئے ہیں انہی کے ساتھ موج مستی

میں لگا ہوا ہے۔ ہیڈ پارک گئے ہوئے ہیں آج وہ سب دیکھو کب تک واپس آتے ہیں۔“
”کیا اس کے دوست بھی واپس نہیں آئیں گے؟“

”نہیں وہ سٹی ہال کے قریب کہیں رہتے ہیں وہ وہیں جائیں گے شاید انیل بھی آج رات وہیں ان کے پاس ٹھہر جائے۔“

”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ زیر لب کہتے ہوئے وہ اٹھ کر ہاتھ کی طرف بڑھ گئی تھی۔

انیل ہات میں بہت لیٹ اپارٹمنٹ میں واپس آیا تھا، پر ہیان سوتے سے جاگ گئی کیونکہ وہ لاؤنج میں میٹرس بچھا کر سو رہی تھی، انیل کے پاس اضافی چابی تھی۔ نشے میں دھت وہ لڑکھڑاتا ہوا لاؤنج سے گزر رہا تھا جب پر ہیان کی ناگوں سے ٹکرا گیا۔ اسی وقت پر ہیان کی آنکھ کھلی تھی مگر صدمہ شکر کہ وہ رکنا نہیں تھا کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا، پر ہیان کو اس کے بعد نیند نہیں آئی۔ صبح تک مارتھا انیل کو پر ہیان کے بارے میں بتا چکی تھی۔



”یہ پر ہیان ہے زاویار حسن کی بہن!“ وہ ناشتا کر رہی تھی جب مارتھا نے انیل کو بتایا۔

انیل چھ فٹ سے نکلنے قد کا، گندمی رنگت والا پُرکشش نوجوان تھا تاہم اس کا حلیہ اور آنکھیں اس کے آوارہ ہونے کی واضح دلیل تھیں۔ پر ہیان نے صرف ایک بار کے علاوہ دوبارہ نظر اٹھا کر اسے نہیں دیکھا تھا کیونکہ اسے اس کی نظروں میں تیرتی آوارگی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مارتھا کے تعارف پر اس نے ذل چپ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دہشت کا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔

”ہائے.....“ پر ہیان نے بنا نظر اٹھائے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔

”ہائے ایم سوری میں میلو کے ساتھ ٹھیک پہنڈ نہیں کرتی۔“

”اوکے۔“ بناؤر امانے انیل نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا۔

”آپ چاہیں تو یہاں اس اپارٹمنٹ میں ہمارے ساتھ شیز کر سکتی ہیں۔“ وہ اس پر جھکا جا رہا تھا۔ پر ہیان نے اس آفر پر بے ساختہ مارتھا کی طرف دیکھا جو نفی میں سر ہلا رہی تھی تب ہی اس نے

ایکسکیوز کیا تھا۔

”نہیں شکریہ میں اپنے بھائی کے ساتھ رہوں گی۔“

”اوکے۔“ انیل نے کندھے اچکائے مگر نظریں اس کے چہرے سے نہیں ہٹائیں۔ پر ہیان کو اب اس کی موجودگی سے الجھن ہونے لگی تھی تب ہی اس نے انیل سے نظریں ہٹا کر مارتھا کی طرف دیکھا تھا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اب نکلنا چاہیے مارتھا!“

”ہوں میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“ مارتھا کی نظریں بھی اسی پر تھیں وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو تم لوگ؟“ انیل نے مارتھا سے پوچھا جب وہ اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔

”کہیں نہیں ایک کی طرف جا رہے ہیں زاویار پری کا فون انینڈ نہیں کر رہا۔ وہ انیل کو زاویار کا فون بند ہونے اور پر ہیان کا اب تک اس سے رابطہ نہ ہونے والا سچ نہیں بتا سکتی تھی تب ہی جھوٹ کا سہارا لیا مگر انیل پھر بھی اٹھ کھڑا تھا۔“

”چلو میں چھوڑ دیتا ہوں ایک کی طرف۔“

”نہیں اس کے بھائی کو اچھا نہیں لگے گا، تم تو جانتے ہو پاکستانی غیرت کے معاملے میں کتنے خود کفیل ہوتے ہیں، بہتر یہی ہے تم یہیں رکو، ہم چلے جائیں گے۔“

”اوکے جیسی تمہاری مرضی۔“ انیل مایوس ہوا، مارتھا نے توجہ پر ہیان کی جانب کر لی۔

”تمہارے پاس کچھ پیسے ہوں گے پر ہیان! ہم پوائنٹ سے جائیں گے مگر میرے پاس کرایہ نہیں ہے۔“

”ہاں، میرے پاس پیسے ہیں تو چلو۔“ وہ جلد از جلد وہاں سے نکلنا چاہتی تھی، مارتھا نے بھی تاخیر نہیں کی۔ انیل کے ارادے اسے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، پر ہیان نے جلدی سے اپنا سامان سمیٹ لیا۔



سدید کی پیننگ مکمل ہو گئی تھی، عائشہ اداس تھی رو بھی چکی تھی مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ وطن کی سرحدوں کے محافظ جیالوں کو بھلا روکا بھی کہاں جاسکتا ہے۔

سدید اس روز قدرے اداس تھا، اس کے ساتھ سنگلاخ پہاڑوں میں اپنے فرائض سرانجام دینے والا اس کا جگری یار شبیر ملک کی سرحدوں کے اندر ہی جاری جنگ میں یونٹ واپسی پر زندگی کی بازی ہار کر شہادت کے عظیم مرتبے کو پا گیا تھا۔ وہ اور شبیر کئی ماہ تک لیاری سیکٹر پر اکٹھے رہے تھے، شبیر اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔ اپنے بوڑھے ماں باپ، دو چھوٹے بھائیوں اور تین جوان بہنوں کا، اللہ رب العزت کے بعد واحد سہارا، ابھی دو سال قبل شادی ہوئی تھی اس کی، ایک سال کی چھوٹی سی معصوم بچی تھی۔ سدید اور وہ اکثر اکٹھے ہی اپنی ڈیوٹی کے فرائض سرانجام دیتے رہے تھے۔ شبیر کی سب سے بڑی خواہش، بیرون ملک دشمنوں سے لڑ کر مرنا تھا، اکثر وہ دونوں کھانا کھا رہے ہوتے تو وہ مسکرا کر کہتا:

”دیکھو ناں یار! ہمارے سیاست دان کہتے ہیں فوج اسی فیصد بجٹ کھا جاتی ہے حالانکہ ان کی اپنی لوٹ مار کوئی حساب اور شمار ہی نہیں۔ یہ ہے ہمارا اسی فیصد بجٹ، ایک بوتل پانی، ایک پلیٹ دال گوشت اور دو روٹیاں۔“ اور سدید اس کی اس بات پر ہمیشہ بے نیاز انداز اپناتے ہوئے کہتا تھا۔

”چھوڑ یار! ہم سیاست دانوں کے لیے تھوڑی لڑتے ہیں، یہ سنگلاخ جو ہمارا مسکن ہیں، یہ شدید گرمی میں تپتی ریت جو ہماری قیام گاہ ہے، شدید سردیوں میں یہ برف سے ڈھکے سیکٹر جو ہمارا پڑاؤ ہیں۔ یہ سب اس وردی کے مہون منت ہیں یار! پوری قوم کی امیدیں لگی ہوئی ہیں ہم پر، ہم جاگ کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر وطن کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں تو قوم بے فکری سے اپنے گھروں میں سوتی ہے۔“

”ہوں یہ تو ہے بھلے چند گندی مچھلیوں نے عوام کی نظروں میں فوج کے مقام کو نقصان پہنچایا ہو مگر حقیقت یہی ہے کہ اس قوم کے بچے کا دل آج بھی ہمارے قدموں کی دھک اور اللہ اکبر کی لکار کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ آج بھی ہماری سلامتی اور کامیابی کے لیے اس قوم کی ماؤں اور بہنوں کے ہاتھ دعا میں اٹھتے ہیں۔ دشمن کے عقوبت خانوں میں ہمارے اپنوں کی غداری کے سبب جو تشدد ہوتا ہے اس کا درد یہ پوری قوم محسوس کرتی ہے۔“

”بے شک۔“ ابھی چند روز پہلے جب وہ چھٹی پر گھر آ رہا تھا تو شبیر نے اس سے کہا تھا۔

”دعا کرنا یا را! میں جوانی میں ہی شہادت کے مرتبے کو پالوں۔“ جواب میں اس نے مسکراتے ہوئے

کہا تھا۔

”کروں گا دعا، مگر ابھی نہیں ابھی تیری بیٹی بہت چھوٹی ہے پھر ابھی وطن کی مٹی کو تیری ضرورت بھی بہت ہے۔ ابھی سکون سے چپ چاپ خاک میں سونے کا وقت نہیں ہے تیرا۔“ اور سدید کی اس بات پر شبیر نے اسے ایک زبردست دھپ رسید کی تھی۔ کیسا ایمان دار صلح جو محبت وطن تھا وہ کہ اس نے اس کی واپسی کا بھی انتظار نہیں کیا اور امر ہو گیا تھا۔

عائکہ کمرے میں آئی تو وہ آنکھوں پر بازو دھرے سو رہا تھا۔

”سدید.....“

”ہوں۔“

”کیا سو رہے ہو؟“

”نہیں، یونہی لیٹا ہوا تھا، کیوں؟“

”کچھ نہیں، بس ویسے ہی دل اداس ہو رہا تھا، بابا بھی نہیں ہیں گھر پر۔“

”بابا کہاں گئے ہیں؟“

”پتا نہیں، میں مارکیٹ سے آئی تو وہ گھر پر نہیں تھے۔“

”ہوں اور..... دل کیوں اداس ہو رہا تھا؟“

”یہ بھی نہیں پتا، بس اتنے دن تم ساتھ رہے ہو تو اب تمہارے جانے کا سوچ کر عجیب سی اداسی ہو رہی ہے۔ اوپر سے سنا ہے ہمارے ہمسایوں کو پھر جنگ کا شوق چڑھا ہے یقیناً سرحدوں کے حالات کشیدہ ہوں گے۔“

”سو دہاٹ میری جان! سرحدوں کے حالات کتنے بھی کشیدہ ہوں یہ سینے ہمہ وقت دشمن کی گولیوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوں گے، تم نے یہ شعر نہیں سنا.....“

ہم جو تلوار کے قبضے میں کلائی دیں گے

تیرے اجداد بھی قبروں سے دہائی دیں گے

”سنا ہے مگر ان کے اجداد قبروں میں ہوں گے تو دہائی دیں گے ناں، وہ تو دنیا میں ہی جہنم کی آگ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ہاں امریکن فوج یا اسرائیل کے لیے یہ شعر فٹ ہے۔“

”چلو جہاں بھی ہوتا ہے فٹ کر لو مگر میں تمہیں ایک بات بتا دوں! پاکستانی فوج اس وقت دو محاذوں پر لڑ رہی ہے ایک اندرون ملک غدار دشمنوں سے اور دوسرا بیرون ملک مکار دشمنوں سے۔ بہتر طاقت اور اسٹیمنا ہے اس بہادر فوج کے اندر، تم ایویں پریشان نہ ہوا کرو، جب تک ہم ہیں تب تک دشمن کی گولیاں اور میزائل تمہارے جسموں کو نہیں چھو سکتے۔“

”جانتی ہوں سدید! مگر میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔“

”میں کہیں نہیں کھورہا، پلیز تم ایسی فضول بزدلانہ سی باتوں سے دماغ خراب نہ کیا کرو۔“

”ایم سوری مگر.....“

”کوئی اگر مگر نہیں، مت بھولو تم بھی اسی قوم کی بیٹی ہو جس نے کبھی تلواروں سے نہیں ہمیشہ جذبول سے جنگ لڑی ہے اور ہمیشہ دشمن پر فتح حاصل کی ہے۔ تم جانتی ہو پاکستان اسلامی دنیا کی واحد ایٹمی طاقت ہے جس نے تین بار اپنے بڑے بے حد طاقت ور ملک کو تاریخی شکست سے دوچار کیا جس نے 1957ء میں اسرائیل کے دس طیارے مار گرائے، تم تاریخ دیکھو آزاد ذرائع کے مطابق 1965ء کی جنگ میں بھارت کے تقریباً 95000 فوجی ہلاک ہوئے جبکہ پاک فوج کے صرف 1033 فوجی شہید ہوئے۔ اسی جنگ میں بھارت کے جنگی جنوں نے 11000 فوجیوں کو زخمی کروایا جبکہ پاکستان کے 2171 فوجی زخمی ہوئے۔ بھارت کے تقریباً 1700 فوجی لاپتہ ہوئے جبکہ پاکستان کے 630 شیروں کا نام لاپتہ فوجیوں کی لسٹ میں آیا۔ پاکستانی فوج نے بنا ایٹمی طاقت ہوئے بے حد محدود وسائل کے باوجود بھارت کے 516 ٹینک تباہ کیے جبکہ پاکستان کے محض 165 ٹینک تباہ ہوئے۔ اسی جنگ میں بھارت نے 110 طیارے تباہ کروائے جبکہ پاکستان کے صرف 14 طیارے تباہ ہوئے اور پتا ہے جب جنگ بند ہوئی تو پاکستان کے قبضے میں بھارت کا 1617 مربع میل کا علاقہ تھا جبکہ بھارت کے قبضے میں صرف 466 مربع میل کا علاقہ آیا اب خود ہی بتاؤ کون فاتح ٹھہرا، حق یا باطل؟“ سدید کا پسندیدہ موضوع چھڑ گیا تھا تب ہی وہ بے حد پر جوش تھا۔ عائکہ چپ چاپ اسے دیکھتے ہوئے سنتی رہی۔

”1971ء کی جنگ لے لو، تم سمیت شاید ساری قوم یہی سمجھتی ہے کہ ہم نے اس جنگ میں شکست اٹھائی مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے کیوں؟ یہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ وہ لیٹا لیٹا ایک دم اٹھ بیٹھا تھا۔

”1971ء میں جب پاک بھارت جنگ لڑی گئی تو وہ جنگ درحقیقت بنگالی عوام اور پنجاب کے زمینداروں کی جنگ تھی مگر آرمی اور اردو بولنے والے خواخواہ درمیان میں پھنس گئے اور اپنی عزت خراب کر لی اس وقت بنگالی عوام نے جو پاکستان کے تقریباً 56 فیصد تھے پنجاب کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ کوئی بھی اس وقت اس علیحدگی کو نہیں روک سکتا تھا کیونکہ اس وقت بھی ہم ایسے ہی حالات کا شکار تھے۔ ایک طرف اندرون ملک سازشیں اور غدار تھی تو دوسری طرف تقسیم کی آگ میں جلتا ہمارا مکار دشمن اپنے دانت تیز کیے بیٹھا تھا۔ آج جو آگ بے مقصد بلوچستان میں بھڑکائی جا رہی ہے وہی آگ اس وقت ہمارے بنگال میں بھڑکائی گئی تھی، مقصد صرف پاکستان کو تقسیم کرنا تھا۔ دشمن اس وقت اپنا ہوم ورک مکمل کر چکا تھا، مگر ہم نے اس بات کو سمجھ بغیر فضول میں اپنے 69000 جوان شہید کر دئے حالانکہ ہمیں سمجھنا چاہیے تھا کہ وہ ملک جو 2500 کلومیٹر کے فاصلے پر ہوں ایک غریب ملک کے لیے اس کا قائم رکھنا قطعی ناممکن تھا۔ اگر بابائے قائد اس نقطے کو سمجھ لیتے تو شاید پہلے ہی اس کا تدارک ہو جاتا تم دیکھو اس جنگ میں پاک فوج کو لڑایا ہی نہیں گیا۔“

”تمہاری معلومات بہت وسیع ہیں سدید! مجھے واقعی آج تک اس حقیقت کا نہیں پتا تھا۔“ عائکہ اس سے متاثر ہوئی تھی جب وہ پچیسکی سی مسکان لبوں پر پھیلاتے ہوئے بولا۔

”تمہارا قصور نہیں ہے یہ اس ملک کی قیادت کا قصور ہے جنہوں نے ہماری تاریخ کے سنہری اوراق کو

گئے کہ ان کے تابوتوں کو جلانے کے لیے جنگل کی لکڑیاں ختم ہو گئیں بعد میں انڈین آرمی چیف کا بیان آیا کہ امریکہ نے ہمیں بچا لیا ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے اور ایسا اس نے اس لیے کہا کیونکہ ہم نے عین فتح کے قریب یہ جنگ امریکہ کے ساتھ ڈائلاگ کی میز پر ہار کر اپنے شیر جوانوں کو پسپائی کا حکم دے دیا تھا جس کے نتیجے میں ہماری ماؤں نے اپنے وہ لعل گنوائے جو کارگل سیکٹر پر فتح کا جھنڈا گاڑنے کی خوشی دیکھنے کے قریب تھے۔“

”اوہ! یہ تو بہت بُرا ہوا سدید!“

”اس ملک کے غداروں نے کچھ بھی اچھا کہاں ہونے دیا ہے ہمارے ساتھ۔ جہاں بھی ہم اپنے لہو سے چراغ جلاتے ہیں وہیں مک کا کر کے یہ ہماری آرزوؤں اور خوابوں کا خون کر دیتے ہیں۔“ سدید دگھی تھا، عائکہ کی آنکھوں میں بھی اداسی بکھر گئی۔

”تم دل چھوٹا مت کرو سدید! ایک دن آئے گا جب اس ملک کے ساتھ غداری کرنے والے سارے بد بختوں کا احتساب ہو گا۔ کوئی تو آئے گا ایسا جوان آستین میں چھپے سانپوں کا زہر نکال کر انہیں ان کے انجام تک پہنچائے گا۔ تم جانتے ہو راہ حق میں بے خون کی قربانیاں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں، اللہ کی جنت جتنی مہنگی ہے دوزخ اتنی ہی بڑی ہے اور بے شک فیصلے کا دن دور نہیں ہے۔“

”بے شک۔“ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سدید نے کہا۔

”عین اسی لمحے باہر بیرونی دروازے پر دستک کی صدا ابھری تھی، سدید اٹھ کر گہری سانس بھرتا بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔



ہماری آنے والی نسلوں سے شیر ہی نہیں کیا۔ اتنے لغو اور فضول اسباق پڑھائے جا رہے ہیں کہ حد نہیں۔ کل کو یہ نونہال بھی یونہی اپنی تاریخ سے بے خبر وطن کے لیے ہر جذبے سے غیر آشنا ہوں گے۔ ان کا خون رگوں میں جوش نہیں مارے گا یہ دوستوں میں چھپے دشمن کی کبھی پہچان نہیں کر پائیں گے۔“

”صحیح کہہ رہے ہو تم، بے شک ہمارا میڈیا اور ہمارا نظام تعلیم قوم کے لیے بہترین پلیٹ فارم ہوتا ہے آگاہی کا، خود شناسی کا مگر بد قسمتی سے ہم دونوں میں ہی فیل ہیں۔ میں اکثر سنتی ہوں کہ پڑوسی ملک میں شاید ہی کوئی اسکول ایسا ہو جہاں بچوں کو پاکستان اور مسلمانوں سے نفرت کا درس نہ دیا جاتا ہو، ان کا میڈیا ایک معمولی سی بات کو بڑی طرح کھینچ کر کئی کئی دن چرچا کیے رکھتا ہے مگر ہم ہر وقت اسی لغو اور فضول باتوں میں پڑے رہتے ہیں کہ جن کی کوئی حد تک پتا نہیں۔ ہمارے اندر وہ احساس کیوں نہیں ہے، ہم اپنی ذمہ داریوں کا صحیح حق ادا کیوں نہیں کرتے۔“

”فضول کی بحث ہے یہ عائکہ! اس کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔“

”صحیح کہتے ہو اگر قائد کو ہمارے کرتوتوں کا الہام ہو جاتا تو شاید وہ ہمارے لیے اتنی عظیم جنگ لڑنے

سے پہلے سو بار سوچتے۔“

”واقعی اصل مسئلہ یہ ہے کہ بھارت نے آج تک پاکستان کے علیحدہ وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ 1947ء کی تقسیم بھارت کے لیے انا کا مسئلہ بنی ہوئی ہے اب وہ دوبارہ زمین کے اس خطے پر حکمرانی تو نہیں کر سکتا تب ہی اس کی شدید خواہش ہے کہ کسی طرح اسے توڑ پھوڑ دیا جائے، چھین لیا جائے اسی لیے کبھی اس کے سر پر جنگ کا بھوت سوار ہو جاتا ہے تو کبھی وہ عالمی طاقتوں کے ذریعے پاکستان کے اندرونی معاملات میں ٹانگ اڑا کر ہمارا نقصان کرتا ہے۔ کبھی بے وجہ سرحدوں پر فائرنگ کر کے ہمارے معصوم شہریوں کی جان لیتا ہے تو کبھی اپنے جاسوس بھیج کر ملک کی قیمتی املاک اور شہریوں کی قیمتی جانوں کو نقصان پہنچاتا ہے حالانکہ تقسیم تو ہم بھی ہوئے ہیں مگر آج تک ہم نے کبھی اس تقسیم کو غیرت کا مسئلہ نہیں بنایا، ہماری قوم کے دل آج بھی بنگالی قوم کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔“

”بالکل۔“

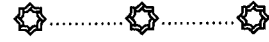
”تمہیں پتا ہے عائکہ! بابا اکثر برف پوش پہاڑوں کے رونے کا ذکر کیوں کرتے ہیں؟“

”نہیں.....“

”میں بتاتا ہوں۔“ اس نے تکیہ اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

”کچھ سال پہلے کی بات ہے ہندوستان کے وزیر اعظم کے آفس میں تمام اعلیٰ افسران کے ساتھ ایک انتہائی خفیہ میٹنگ میں سیانچن کے ساتھ ساتھ کارگل کو بھی ہتھیانے کا پروگرام بنایا گیا اب آئی ایس آئی کا ایک کشمیری جاسوس اس خفیہ میٹنگ میں شریک تھا۔ ہائی پاورڈ ٹرانسمیٹر کو اس کشمیری جاسوس نے عین میٹنگ کے وسط میں پہنچا دیا، اس ٹرانسمیٹر سے ڈائریکٹ آئی ایس آئی کے افسران نے میٹنگ کے شرکاء کی باتیں سنیں جب ہماری انجینیئرنگ کو انڈیا کی کارگل کے بارے میں سازش کا پتا چلا کہ اس سے پہلے کہ انڈیا کچھ کرتا ہمارے اعلیٰ افسران نے کارگل آپریشن کر دیا۔ آزاد ذرائع کے مطابق اس آپریشن میں انڈین آرمی کے اتنے لوگ مارے

سردیوں کا موسم ہے بریلی ہوائیں ہیں
سال نو آ چکا، جنوری کی شامیں ہیں
اداسیوں میں لیے ہوئے ماہ و سال گزرے ہیں
چلے آؤ کہ صدیوں سے ترسی ہوئی نگاہیں ہیں



مجھے تم بھول جاؤ گے کہا تھا ایک دن میں نے

وہ بھولا ہونے نہیں سکتا

تجھے میں کھونہیں سکتا

کہ میری جان تجھ میں ہے

میرا ارمان تجھ میں ہے

تجھے جس دن نہ دکھوں میں

میں اس شب سو نہیں سکتا

تجھے میں کھونہیں سکتا

ملا ہے خط جسے پڑھ کر لبو سا رو دیا میں نے

لکھا ہے اس نے یہ خط میں

کہ مجھ کو بھول جاؤ تم کہ تم کو کھودیا میں نے

دروازے پر دستک جاری تھی۔ سدید نے اٹھ کر دروازہ کھولا، باہر کرنل شیر علی تھکن زدہ چہرہ لیے

کھڑے تھے۔ وہ سائیڈ پر ہو گیا۔

”السلام علیکم! آپ کہاں چلے گئے تھے صبح صبح؟“

”علیکم السلام۔“ کرنل شیر علی نے صرف اس کے سلام کا جواب دیا تھا، اس کا سوال وہ گول کر گئے

تھے۔ سدید متفکر سا ان کے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا۔

”کیا بات ہے بابا! آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے

پوچھا۔ کرنل شیر علی نے جواب میں سرسری سی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے بس تھوڑا تھک گیا ہوں۔ پہلے ایک دوست کی طرف نکل گیا تھا پھر قبرستان چلا گیا تھا۔“

”قبرستان کیوں؟“

”بریرہ کی قبر پر گیا تھا، آج بری ہے اس کی اور آج کی دن ہی سالوں پہلے مریرہ نے میری گود میں آنکھ کھولی تھی۔“

”اوہ.....“ سدید نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”کیا آپ کو ان کی یاد آ رہی ہے؟“

”پتا نہیں۔“ سدید جانتا تھا وہ اس ناپک پر بات نہیں کریں گے چاہے جتنا بھی کریدا جائے اور یہی ہوا تھا وہ صاف ٹال گئے تھے۔ عائدہ تھوڑی دیر میں تین کپ چائے لے آئی تو وہ بستر میں دبک گئے۔

”پیننگ مکمل ہو گئی تمہاری؟“

”جی بابا۔“

”تمہیں پتا ہے سدید! پندرہ سال پہلے جب تم اپنے ماموں کے گھر سے بھاگے تھے، میں نے اپنے دو بچوں کو ایک ساتھ کھویا تھا سکندر اور مریرہ..... دونوں مجھے چھوڑ کر چلے گئے مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ مجھے لگا قدرت نے مجھے سکندر علوی کی جگہ تمہیں دے دیا ہے بالکل ویسے ہی جیسے مریرہ کی جگہ عائدہ میری گود میں ڈال دی تھی اس نے۔ میں اس وقت تمہاری کہانی سے واقف نہیں تھا، تم میری گاڑی سے ٹکرائے پورے دو سال کوہ میں رہے اور میں ان دو سالوں میں پل پل اذیت کی سولی پر لٹکا رہا۔“ سدید کے جواب پر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے بولنا شروع کیا۔

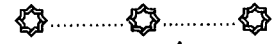
”میں اس شہر کے راستوں سے واقف نہیں تھا صرف مریرہ کی تلاش مجھے وہاں لے گئی تھی کیونکہ اس کا بیٹا بہت بیمار تھا۔ اس وقت پہلی بار میں نے صمد حسن کو بے بسی کے ساتھ روتے دیکھا تھا، بلند حوصلے والے صمد کو مگر مریرہ نہیں ملی، تم مل گئے۔ پورے دو سال میں تمہارے گھر والوں سے کوئی رابطہ نہ کر سکا۔ بعد میں جب خدا نے تمہیں زندگی بخشی اور تم نے بتایا کہ تمہارا دنیا میں کوئی نہیں ہے تب مجھے لگا تم سکندر علوی نہیں صمد حسن ہو۔ وقت ایک مرتبہ پھر روپ بدل کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا مگر..... تمہیں پتا ہے آج میں اس عورت سے ملا ہوں جو تمہاری ماں ہے جس کے وجود سے تم نے جنم لیا ہے جو کسی بے بس پرندے کی طرح تمہیں صرف ایک نظر دیکھنے کو ترپ رہی ہے۔“ اپنی دانست میں کرنل صاحب نے دھماکہ کیا تھا، ان کی اداسی کی اصل وجہ سامنے آ گئی تھی مگر سدید کے چہرے کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ جیسے اس حقیقت سے پہلے ہی واقف تھا۔

”کہاں ملی وہ عورت آپ کو؟“ قطعی سپاٹ لہجے میں اس نے پوچھا، جیسے اپنی ماں کے بارے میں نہیں کسی اجنبی عورت کے بارے میں بات کر رہا ہو۔ کرنل صاحب کے ساتھ ساتھ عائدہ کو بھی بے حد حیرانی ہوئی۔

”صمد حسن کے گھر پر۔“

”میرا اب اس عورت کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں ہے بابا! وہ عورت میری ماں نہیں ہے کیونکہ ماں صرف جنم نہیں دیتی اپنا لبو پلا کر زمانے کی ساری سختیاں سہہ کر پالتی بھی ہے۔ بہر حال میں آج رات چلا جاؤں

گا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ اس عورت کو میرا کوئی سراغ نہیں دیں گے ورنہ میں سچ کہہ رہا ہوں بابا! میں لوٹ کر نہیں آؤں گا بالکل مریرہ آنی کی طرح۔“ قدرے خشک لہجے میں اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرا نہیں تھا پیچھے کرل صاحب اور عائکہ کتنے ہی پل حیرانی میں ڈوبے رہے تھے۔



ہم تپتی تھے، ہم جگنو تھے، ہم رنگ برنگے پنچھی تھے
کبھی ماہ و سال کی جنت میں، ماں ہم دونوں بھی ساجھی تھے

میں چھوٹا سا اک بچہ تھا
تیری انگلی تھام کے چلتا تھا
تُو دور نظر سے ہوتی تھی
میں آنسو آنسو روتا تھا

اک خواب کا روشن بستہ تُو ہر روز مجھے پہناتی تھی
جب ڈرجاتا میں راتوں کو.....

تُو اپنے ساتھ سلاتی تھی
ماں تُو نے اتنے برسوں تک

اس پھول کو سینچا ہاتھوں سے

جیون کے گہرے بھیدوں کو، میں سمجھا تیری باتوں سے

میں تیرے ہاتھ کے تکیے پر

ماں اب بھی رات کو سوتا ہوں

ماں میں اک چھوٹا سا بچہ ہوں تیری یاد میں اب بھی روتا ہوں

شب کی خاموش گھڑیاں دھیرے دھیرے اپنا سفر مکمل کر رہی تھیں۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا، ہر جگہ عجیب سی وحشت ڈیرہ جمائے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ کروڑوں کی مالیت سے بنے اس گھر میں بھی ان کے لیے کہیں سکون نہیں تھا۔ آج پھر ان پر دورہ پڑا تھا۔

اپنے لخت جگر، محبوب بیٹے سدید علوی کی محبت کا دورہ، جسے زندگی کی عیش و عشرت کے لیے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے گنوا دیا تھا۔ وہ سدید علوی جو ان کے پہلے محبوب شوہر کی نشانی تھا مگر وہ اسے اپنے بھائیوں کے سپرد کر کے خود دنیا کی ٹھوکروں میں رلنے کے لیے چھوڑ آئی تھیں۔ نئی منزلوں کی چاہت میں پرانے درتچے بند کر آئی تھیں مگر کیا ہوا تھا؟ ان پرانے درتچوں کے بند ہوتے ہی ان کی سانس گھٹنے لگی تھی۔ آج کیا نہیں تھا ان کے پاس؟ مگر پھر بھی وہ نیند کا گولیوں کا سہارا لے کر چند گھڑیاں آرام کرتی تھیں اور پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی تھیں۔ کبھی کبھی انسان سب کچھ پا کر بھی بالکل تہی دست رہ جاتا ہے وہ بھی رہ گئی تھیں۔

نیا شوہر، شاندار گھر، کروڑوں کا بینک بیلنس، قیمتی گاڑیاں، نوکر چاکر سب کچھ پا کر بھی ان کا دامن بالکل خالی تھا۔ ان کے رئیس باپ اور بھائیوں نے انہیں سب کچھ دیا تھا سوائے سکون کے اور وہ کتنی سفاک تھیں

کہ اپنا سکون انہی لوگوں کے پاس چھوڑ آئی تھیں جو ان کے بچے کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے تھے، اس کے گھر سے بھاگنے کے باوجود بجائے انہیں انفارم کرنے کے ”سب ٹھیک ہے“ کی رپورٹ دیتے رہے تھے۔ سوسائٹی میں بے حد شہرت اور اونچا نام..... پا کر بھی وہ بے سکون تھیں۔ آج زندگی ان کی من پسند تھی، اس کے باوجود انہیں اپنا آپ خالی لگتا تھا۔

ساویز آفندی جیسا بے حد ذہین اور قابل بیٹا، در یہ جیسی بے حد حسین اور فرماں بردار بیٹی پا کر بھی ان کے اندر کہیں تشنگی بین کرتی رہتی تھی۔ کہاں کی تھی؟ انہوں نے زندگی میں جو کھویا تھا اپنی مرضی سے کھویا اور جو پایا تھا وہ بھی اپنی مرضی سے پایا تھا تو پھر یہ بے سکونی کیوں تھی؟ یہ اندر کا خالی پن کیوں ہر پل انہیں بے کل کیے رکھتا تھا؟ وہ اچھی بیٹی نہیں تھیں، انہوں نے اپنی پہلی شادی اپنے ماں باپ کا دل دکھا کر، ان کی مرضی کے خلاف کی تھی۔ اس وقت ان کا خیال تھا کہ محبت کے بغیر زندگی بے کار ہوتی ہے مگر بعد میں اسی محبت کی آزمائشوں نے انہیں تھکا ڈالا تب بھی کیا نہیں تھا ان کے پاس؟ جان سے بڑھ کر پیار کرنے والا، بے حد خیال رکھنے والا آئیڈیل شوہر..... چھوٹا سا مگر بے حد صاف ستھرا علیحدہ گھر..... سدید جیسا بے حد خوبصورت حساس بیٹا..... محبت کی اس چھوٹی سی ریاست میں ان کا مقام ہرگز کسی ملکہ سے کم نہیں تھا مگر اس وقت وہ بے سکون نہیں ناخوش تھیں۔ ان دنوں شاندار گھر اے سی، قیمتی گاڑی، عمدہ ملبوسات ان کی خواہشات کی فہرست میں پہلے نمبر پر تھے۔ انہیں محبت اور دنیاوی آسائشات ساتھ ساتھ درکار تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی جس نے شادی کے محض دو سال بعد ہی ان کے محبوب شوہر کو پریشان رکھنا شروع کر دیا تھا۔

صرف انہیں ہر خوشی دینے کے لیے وہ تین تین جگہ جاب کرتے تھے جس روز ان کا ایکسٹنٹ ہوا اس روز بھی وہ ایک جاب سے فارغ ہو کر دوسری جاب کے لیے نکل رہے تھے۔ زندگی میں ایک طوفان آیا اور پھر تھم گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کی شدتیں کمزور پڑنے لگی تھیں۔ مٹی کے اس ڈھیر تلے صرف ان کے محبوب شوہر کی تدفین ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی محبت ان کے جذبات، ہر مشکل کو صبر سے برداشت کرنے کے ارادے سب دفن ہو گئے تھے۔

ان کے والد صاحب ان سے سخت ناراض تھے مگر جس وقت انہوں نے خودفون کر کے انہیں روتے ہوئے اپنے بیوہ ہونے کی اطلاع دی تھی وہ فوراً انہیں لینے آ گئے تھے اور ان میں ایک مرتبہ پھر اپنے باپ کا دل دکھانے اور ان کی نافرمانی کرنے کا حوصلہ نہیں تھا تبھی وہ اپنے محبوب شوہر کے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی آئیں۔ دوسری شادی ان کی خواہش نہیں تھی مگر وقت نے انہیں مجبور کر دیا تھا۔ احمد آفندی صاحب کے والد ان کے والد کے ناصر گہرے دوست تھے بلکہ بزنس پارٹنر بھی تھے تبھی کسی ذیل کی طرح ان کی شادی فائل ہو گئی اور وہ صرف اپنے باپ بھائیوں کی عزت کے لیے بالکل خاموشی سے مسز آفندی بن گئیں۔ انہیں احساس تھا کہ اس ساری ذیل میں ان کے لاڈلے بیٹے سدید علوی کا نقصان ہوا ہے مگر اس وقت انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ اس ساری ذیل کے سبب آنے والے وقت میں خود ان کی اپنی ذات کا کتنا نقصان ہونے والا ہے۔

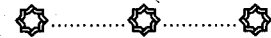
احمد آفندی صاحب ایک بے حد شکی اور قدرے خشک مزاج رکھنے والے انسان تھے۔ شادی کے محض ایک سال بعد ہی اس نے انہیں دن میں تارے دکھانا شروع کر دیے تھے۔ ہر بات میں شک اور کتہ چینی، ہر عمل

میں طنز اور تضحیک ان کے مزاج کا حصہ تھا لہذا وہ جنہوں نے شوہر کا صرف پیار ہی پیار دیکھا تھا بہت جلد بکھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ انہیں لگتا تھا جیسے انہیں اپنے معصوم بیٹے کی آہ لگی ہے جسے وہ نئے سفر کے آغاز پر اپنے بھائی بھائیوں کے سپرد کر کے چلی آئی تھیں۔ وہ روز گھر فون کر کے اس کی خیریت پوچھتی اور ان کی بھائیاں روز انہیں سب ٹھیک ہے کا سگنل دے کر مطمئن کر دیتیں۔

ان کے والد اور بھائی ہر ملاقات پر انہیں تسلی دیتے کہ ان کے بیٹے کا مستقبل بہت روشن ہے، وہ اس کا بہت خیال رکھ رہے ہیں۔ اس کی بہترین تعلیم کے لیے اسے ملک سے باہر بھجوا رہے ہیں اور وہ بس اسی پر مطمئن ہو گئی تھیں۔ انہیں خبر ہی نہیں ہو سکی کہ ان کا بٹا گھر سے بھاگ بھی سکتا ہے وہ کسی مشکل، کسی انہونی کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ خبر ہوتی بھی کیسے؟ انہی دنوں تو ساویز ان کی گود میں آ گیا تھا اور وہ جوشوہر کے رویے پر حد درجہ تکلیف میں رہتی تھیں، ایک ننھے سے وجود کا آسرا پا کر بالکل بچوں کی طرح بہل گئیں۔ ساویز کے بعد دریا کی پیدائش نے انہیں اور بھی مصروف کر دیا، ایسے میں وہ صرف تھوڑے سے وقت کے لیے میکے آتی تھیں اور سید کے بیرون ملک بہترین تعلیمی کارکردگی کا سن کر خوشی خوشی واپس لوٹ جاتی تھیں۔

اس وقت انہیں کسک تھی کہ ان کا بیٹا ان سے مل کر کیوں نہیں گیا؟ وہ بس ایک بار ان کے پاس ہسپتال آیا تھا جب انہوں نے ساویز کو آپریشن سے جنم دیا تھا مگر اس وقت بھی آفندی صاحب کی موجودگی کے سبب نہ وہ اسے پاس بلا سکی تھیں نہ پیار کر سکی تھیں۔ انہیں اجازت ہی نہیں تھی۔ ان کے والد اور بھائیوں نے احمد آفندی اور ان کے والد کو صرف ان کی ناکام شادی کا بتایا تھا، ایک عدد بیٹے کا نہیں بتایا تھا تبھی وہ میکے بھی نہیں جاتی تھیں کہ کہیں آفندی صاحب کے سامنے ان کا بیٹا، ان کے باپ کے جھوٹ کا پول نہ کھول دے۔ وہ اپنے بیٹے کی گناہگار تھیں مگر اس گناہ کی سزا کتنی سنگین ہوگی یہ وہ نہیں جانتی تھیں۔ انہیں بہت بعد میں ان کے گھر والوں نے بتایا تھا کہ ان کا بیٹا ملک سے باہر نہیں گیا تھا بلکہ گھر سے بھاگ گیا تھا جب وہ لوگ اسے ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کر کے تھک گئے تو انہیں سب سچ بتا دیا اور بس اسی دن سے ان کی سزا شروع ہو گئی تھی۔

انہیں وقتاً فوقتاً دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ ہر پل خاموش رہنے لگی تھیں انہوں نے احمد صاحب کی پروا کرنا اور ان کی باتوں پر کڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنے گھر والوں سے بھی نہیں ملتی تھیں، ساویز اور دریا پر بھی ان کی توجہ میں کمی آئی تھی۔ بہت سے سال اسی جنون کی نذر ہو گئے تھے مگر ان کے اندر کے جنون میں کوئی کمی نہیں آئی۔ صرف ایک نظر اپنے محبوب شوہر کی واحد نشانی کو دیکھنے کے لیے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی تھی انہوں نے، ہر دربار پر منت مانگتیں، ہر مزار پر چادر چڑھاتیں، مسجدوں میں، اجتماع میں، ہر کہیں دعا کرتاں مگر وہ جو دنیا کی بیٹھڑ میں کھو گیا تھا وہ انہیں پھر دوبارہ نہیں ملا اور ملا بھی تو یوں کہ نظر اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہیں تھا اور اب..... اب ان کے دوسرے بیٹے کی زندگی کی کہانی شروع ہو گئی تھی۔ اب وہ تنکا تنکا بکھرنا شروع ہو رہا تھا اور کون جانتا تھا کہ تنکا تنکا ہو کر بکھرنے کا یہ کھیل کب تک جاری رہنا تھا۔



صیام کے والد کی رحلت ہو گئی تھی، عبداللہ ان آفس آیا تھا مگر جلد ہی ہاف لیو پر چلا گیا۔ درکنون کو اسٹاف میں سے ہی کسی نے خبر دی تھی، شہزاد بھی اس روز اس کے ساتھ ہی آفس آئی تھی اور بے حد دکھی تھی۔

”دیکھا..... میں نے کہا تھا ناں، ضرور اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے مگر تم نے حد کر دی، اس کی غربت اور مجبوری کو گالی بنا دیا تم نے۔“

”فارگا ڈسک یار..... یہ پاکستان ہے یہاں سارے لوگ اپنے ملازمین کے ساتھ ایسے ہی پیش آتے ہیں۔“

”کیا ضروری ہے دریا کہ ہر اخلاق سوز کام صرف پاکستان میں ہی ہو۔“

”صرف پاکستان میں نہیں یار! بھارت، بنگلہ دیش اور جانے کتنے ملک ہیں دنیا میں جہاں ملازمین کو ایسے ہی ان کی اوقات پر رکھا جاتا ہے۔“

”مگر کیوں؟ وہ محنت کرتے ہیں اور اپنی محنت کے پیسے لیتے ہیں۔ بھیک تو نہیں لیتے ناں پھر یہ تحقیر یہ ذلالت کیوں؟“

”تم جذباتی ہو رہی ہو شہزاد! یہ اس معاشرے کی ریت ہے جسے بدلائیں جا سکتا۔ تم دیکھو کوئی بھی قاتل جو قتل کرتا ہے، کسی کو موت دیتا ہے، بدلے میں اسے بھی بدترین موت دینا پڑتا ہے ناں مگر اس کے باوجود موت کے بدلے موت پانے کے باوجود جیل کی کال کوٹھڑی میں پچیس پچیس تیس سال جو ظلم، جو درندگی وہ برداشت کرتا ہے تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ وہ بھی تو انسان ہوتے ہیں مگر یہ اس معاشرے کا دستور ہے ان کے ساتھ خواہ کتنا ہی برا کر لیں، کوئی ان کی فیور نہیں کرتا ان کے لیے انسانیت کا درس یاد نہیں رکھتا۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ دنیا اتنی بے حس کیوں ہے، ہمارے مذہب میں تو کہیں امیری غریبی کی تفریق نہیں۔ باندیوں کے بھی حقوق ہیں، غلاموں کو اللہ کی رضا کے لیے آزاد کرنے پر بھی ثواب ہے۔ کسی انسان کو ایسے مار چر کرنے اور پچیس پچیس تیس سال قید کرنے کے بعد موت دینے کا تصور بھی نہیں ہے۔“

”ہاں اسلام ایسی باتوں کی نفی کرتا ہے مگر ہم اسلام پر چلیں تب ناں۔ ابھی پچھلے دنوں میں ایک ویب سائٹ پر دیکھ رہی تھی کہ ایک ہندو خاندان نے انسانی تفریق اور درجہ بندی سے تنگ آ کر اسلام قبول کر لیا بہر حال تم چھوڑو اس بحث کو مجھے ابھی بہت سارے کام پنپنا ہے۔“

”کوئی کام نہیں پنپنا تم نے، تم ابھی میرے ساتھ صیام کے گھر چل رہی ہو اس کے فادر کی تعزیت کرنے۔“

”کیا..... تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟“

”اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے، وہ تمہارا پرسنل سیکرٹری ہے، تمہارا فرض بنتا ہے تم دکھ کی اس گھڑی میں اس کا غم بانٹو۔“

”فون پر بانٹ لوں گی یار! مجھے ایسے اچھا نہیں لگتا کسی ملازم کے گھر جانا۔“

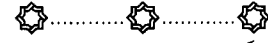
”وہ ملازم بعد میں ہے، پہلے ایک انسان ہے اور میری اس کے لیے جو فینکٹو ہیں اس کے مطابق وہ تمہارا مستقبل کا برادر ان لاء بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو شہزاد!“

”ہاں ہو گئی ہوں مگر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے اب چلو پلیز۔“ اس سے پہلے کہ درمکنوں اسے کچھ کہتی وہ زبردستی اس کا ہاتھ تھام کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ آئی۔

”مجھے اس کے گاؤں اور گھر کا کوئی آئیڈیا نہیں۔“ گاڑی کا ڈور کھولتے ہوئے اس نے خفگی سے کہا مگر شہر زاد نے کان نہیں دھرے۔

”کوئی بات نہیں، کسی سے پوچھ لیں گے۔“ اس کے لہجے میں بے نیازی تھی اور پھر اسی بے نیازی کے ساتھ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔



صیام کے گھر میں عجیب سا سناٹا کھڑا تھا۔ رشتے دار کوئی خاص تھا نہیں اور جو محلے کے چند لوگ تھے وہ تھوڑی تھوڑی دیر تک کرا فوس کرنے کے بعد دوبارہ اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تھے۔ باہر مردانے میں بھی اس وقت صرف اس کے دوست ہی اس کے پاس بیٹھے پُرسہ دے رہے تھے۔ کتنی تکلیف سہی تھی اس کے باپ نے مگر وہ ایسا بد نصیب بیٹا تھا جو نہ اپنے مہربان باپ کا علاج کروا سکا نہ آخری باران سے کوئی بات کر سکا۔ وہ آفس میں تھا جب ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ وہاں موجود اس کے دوست نے اسے فوری کال بھی کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بار بار اسے بلارہے ہیں مگر وہ اس وقت میٹنگ میں تھا سو چاہتے ہوئے بھی دوڑ کر ہسپتال نہ پہنچ سکا۔ آفس ٹائمنگ کے بعد اس نے بائیک ہسپتال کی طرف بھگائی تھی مگر جس وقت اس نے کمرے کی دہلیز پر پہلا قدم رکھا عین اسی لمحے اس کے غریب باپ نے اس کے انتظار سے تھک کر ہمیشہ کے لیے پلکیں موند لی تھیں۔ صام کو لگا تھا جیسے وہ اس لمحے پتھر کا ہو گیا ہو۔

وہ ہار گیا تھا۔ اس کی غربت اور حالات نے بالآخر اسے شکست دے ڈالی تھی۔ اس کے ایک طرف باپ کا علاج اور اس کی تیمارداری تھی تو دوسری طرف گھر والوں کا بوجھ تھا اس نے گھر والوں کے لیے ذمہ داری نبھائی تھی اور باپ کو ہار دیا تھا۔

درمکنوں عبدالحمنان سے اس کے گاؤں اور گھر کا پتا پوچھ کر تقریباً چالیس منٹ میں وہاں پہنچی تھی۔ صیام جو باپ کو دفنانے کے بعد ابھی دوستوں کے درمیان بیٹھا اپنے آنسو اپنے اندر اتار رہا تھا، کچی سڑک پر اڑتی ہوئی دھول میں اس کی بلیک ٹیونا کرولا دیکھ کر چونک اٹھا۔ گاڑی سے پہلے شہر زاد باہر نکلی پھر درمکنوں۔ وہ حیران حیران سا اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی شہر زاد آگے بڑھی تھی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! آپ یہاں.....“

”جی! آپ کے والد صاحب کی رحلت کا پتا چلا تھا ابھی آفس میں، بہت افسوس ہوا۔“ شہر زاد کے اظہار افسوس پر آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ فوری انہیں گھر کے اندر لے آیا۔

درمکنوں خاموش تھی مگر اس نے دیکھا تھا کہ صیام کی آنکھیں بے حد سرخ اور سو جھی ہوئی تھیں۔ وہ اتنا بکھرا ہوا اور شکستہ لگ رہا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا نہیں پائی تھی۔ کل جو کپڑے پہن کر وہ آفس آیا تھا اس وقت بھی انہی کپڑوں میں ملبوس تھا مگر اب وہ کپڑے بے حد حرف دکھائی

دے رہے تھے۔ چہرے پر پچھلے دنوں کی بڑھی ہوئی ہلکی ہلکی شیو میں اس وقت جیسے زردی گھلی تھی۔ پہلی بار وہ اسے بہت توجہ سے دیکھ رہی تھی اور تبھی صیام نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ کیا نہیں تھا اس نظر میں..... درد..... کسک..... گلہ..... عجیب نظر تھی جو اسے اندر تک کاٹ رہی تھی مگر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ شہر زاد اس کے گھر والوں سے مل رہی تھی مگر وہ..... صرف ایک نظر کے حصار میں بندھ کر جیسے ہلنے جلنے کی سکت بھی کھو بیٹھی تھی۔

تقریباً تین چار منٹ تک اسی کیفیت میں رہنے کے بعد بمشکل اس نے صیام کی نظروں سے نظریں چرا کر اس کی بوڑھی ماں کی طرف دیکھا، جس کی گود میں عشرت کا تین سالہ بیٹا بخار میں پھنک رہا تھا مگر اس کی ماں روتے ہوئے اسے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

گھر کی حالت زار ایسی تھی کہ دیکھ کر رونا آتا تھا۔ چار مرلے پر مشتمل اس ٹوٹے پھوٹے سے مکان میں فرنٹ پر دو کچے کمرے تھے جن کے اندر دھوپ برآمدہ نہ ہونے کی وجہ سے سیدھی اندر جاتی تھی۔ ایک رف چھوٹا سامٹی سے بنا کچن تھا جبکہ باہر بیرونی دروازے کے ساتھ ایک چھوٹا سا باتھ روم تھا جسے وہ لوگ غسل خانے کے طور پر بھی استعمال کر لیتے تھے۔ چھوٹے سے اس کچے گھر میں ایک تو سہولت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اوپر سے بجلی کا کنکشن بھی منقطع تھا جس کی وجہ سے گرمی اور جس کا احساس ہو رہا تھا۔ صیام باہر جا چکا تھا جبکہ وہ اب اس کی ماں بہنوں کے پاس بیٹھی انہیں تسلی دے رہی تھی۔ وہ شخص جو اپنی پرسنائی اور حلیے سے بے حد شاندار دکھائی دیتا تھا، ایسے تکلیف دہ حالات کا شکار ہو گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس کی سادہ لوح ماں اب اپنے قابل بیٹے کی باس سے اس کی مشکلات اور پریشانیاں شیر کر رہی تھی۔ انہی سے اسے پتا چلا تھا کہ ساتھ والے ہمسایوں نے بجلی کے بل کے پیسے نہ ملنے کے سبب نہ صرف ان کا بجلی کا کنکشن منقطع کر دیا تھا بلکہ اس رنج میں وہ اس کے باپ کا افسوس کرنے بھی نہیں آئے تھے۔ وہ جیسے جیسے اس سے حالات شیر کر رہی تھیں، درمکنوں کے اندر احساس ندامت بڑھتا جا رہا تھا۔ زندگی بھلا اتنی تلخ بھی ہوتی ہے؟ اور وہ خود..... وہ خود کیا تھی؟ ایک بے حسن، سنگ دل باس جسے صرف اپنی کمپنی کے مفاد سے مطلب تھا۔ وہ اتنی خود غرض تو کبھی نہیں رہی تھی، اسے تو راہ چلتے فقیروں پر بھی ترس آ جاتا تھا کہ اس کی تربیت مریرہ نے ایسے ہی کی تھی مگر وہ تو اس کا در کرتھا۔ در کر بھی ایسا کہ جس کی قابلیت اور ذہانت نے اس کے کئی قیمتی ٹیئرز پاس کروائے تھے جس کی شرافت اور محنت کی وہ خود قدردان تھی۔ بے ساختہ اسے وہ لمحہ یاد آیا جب اس نے صیام کو ورکشاپ پر کام کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

تو یہ حالات تھے جن کی وجہ سے وہ اتنی مشکل زندگی گزار رہا تھا۔ ندامت سی ندامت تھی۔ عشرت کے بیٹے کا بخار بڑھتا جا رہا تھا اور وہ سوائے رونے کے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی تبھی شہر زاد نے اس سے کہا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم یہاں ایزی فیل نہیں کر رہی ہو، اسی لیے آؤ تمہیں گھر چھوڑ دیتی ہوں۔ ساتھ میں عشرت اور اس کے بیٹے کو بھی لے چلتے ہیں بہت تیز بخار ہو رہا ہے اسے۔ صیام تو فارغ نہیں ہے۔“

”ہوں، چلو۔“ جتنا اس وقت اس کے اندر شور تھا وہاں رک بھی نہیں سکتی تھی۔ عشرت نے اس قطعی غیر متوقع اقدام پر بے یقینی سے شہر زاد کو دیکھا تھا۔

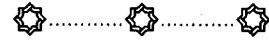
”آپ..... میرے بیٹے کی بات کر رہی ہیں؟“

”ہوں، آپ بھی چلیں ساتھ یہاں شگفتہ اور صیام ہیں سب سنبھال لیں گے۔ آپ فی الوقت ہمارے ساتھ شہر چلیں، آپ کے بیٹے کا بخار خطرناک حد تک بڑھتا جا رہا ہے۔“

”مگر بھائی نہیں مانیں گے وہ بہت خوددار ہیں۔“

”جانتی ہوں، میں ان سے بات کر لوں گی، آپ چلیں پلیز۔ مزید تاخیر نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔“ شہزادان میں گھل مل گئی تھی یوں جیسے برسوں کی آشنا ہو۔

درکنون صیام کی ماں اور اس کی بہن شگفتہ کو تسلی دے کر تھکے تھکے قدموں کے ساتھ گھر سے باہر نکل آئی۔ صیام اب باہر موجود نہیں تھا، وہ شکر کا کلمہ پڑھتی گاڑی میں آ بیٹھی۔



آدھی رات کا وقت تھا جب وہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ اس کے کمرے کا اے سی چل رہا تھا وہاں اچھی خاصی ٹھنڈ تھی مگر اس کے باوجود اس کا پورا وجود پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی وہ بیڈ پر اٹھ بیٹھی تھی۔ ابھی ابھی جو خواب اس نے دیکھا تھا وہ اس کا دل بڑی طرح سے دھڑکا رہا تھا۔ اس نے بے ساختہ سامنے والے کلاک پر نظر ڈالی، رات کے ڈھائی بج رہے تھے اور اس کے سائیڈ ٹیبل پر دھڑکے کی اسکرین بھی روشن تھی۔ درکنون نے ہاتھ بڑھا کر سیل اٹھایا تو وہاں شہزاد کا منیج تھا جو اس نے ہسپتال سے گھر واپس آتے ہوئے کیا تھا۔ درکنون نے اسے کال بیک کی، جو اس نے تیسری ہی بیل پر پک کر لی۔

”تم اتنی لیٹ گھر واپس آئی ہو دماغ ٹھک ہے تمہارا؟“

”ہوں، دماغ تو ٹھیک ہے مگر دل ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ مائی سویٹ ہارٹ کہ عشرت کے بیٹے کا بخار عام بخار نہیں تھا بلکہ ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ اسی لیے مختلف ٹیسٹ کروانے کے بعد اسے ہسپتال میں ایڈمٹ کروانے تک مجھے وہیں رکنا پڑا۔ بعد میں صیام آیا تو چاہتے ہوئے بھی وہاں سے آنے کو دل نہیں چاہا۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں کیں میں نے اس کے ساتھ، عشرت اور اس کے بیٹے کے لیے تسلی بھی دی۔ بہت شرمندہ ہو رہا تھا اور مشکور بھی، عشرت کے بیٹے کی حالت تھوڑی تسلی بخش ہوئی تو میں نے اسے اور صیام کو اس کے لاکھ انکار کے باوجود اس کے گھر ڈراپ کر دیا کیونکہ پیچھے اس کی ماں اور بہن اکیلی تھیں پھر پریشان بھی، اسی لیے اتنی دیر ہو گئی۔“

”تم واقعی پاگل ہو شہزاد! پتا نہیں کیا بنے گا تمہارا۔“

”کیا بننا ہے یار! جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، سسی پنوں کے مشہور قصے بنے ہیں اسی طرح میرا بھی ایک قصہ بن جائے گا۔“

”اوکے، اب سو جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے، صبح صیام آفس نہیں آئے گا میں نے اسے کہہ دیا ہے۔“

”اوکے، شب بخیر۔“

”شب بخیر۔“ کال منقطع ہو گئی تھی۔

درکنون نے سیل واپس اس کی جگہ پر رکھ کر اے سی کی کونگ بڑھادی۔ لیٹ کر آنکھوں پر بازو رکھتے ہوئے ابھی تھوڑی دیر پہلے کا خواب پھر اس کے ذہن میں تازہ ہو گیا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں وہ ننگے پاؤں بھاگ رہی تھی اور اس کے پیچھے بہت سے شکاری کتے لگے ہوئے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی، مدد کے لیے پکار رہی تھی مگر وہاں اس سسنان جنگل میں کوئی بھی اس کی پکار نہیں سن رہا تھا تبھی بھاگتے بھاگتے اسے ایک بوسیدہ سا پرانا مکان نظر آیا تھا اور وہ بھاگ کر دیوانوں کی طرح اس کے دروازے پر دستک دینے لگی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بہت قریب آ گئی تھیں جب اس کی مسلسل دستک کے جواب میں وہ دروازہ کھلا تھا اور اندر سے صیام کو باہر آتے دیکھ کر وہ مارے خوف کے اس کے سینے سے لگ کر زار و قطار رونا شروع ہو گئی تھی۔ صیام نے اس کے رونے پر اس کی ڈھارس بندھائی تھی پھر اس کی پیشانی چومتے ہوئے وہ اسے اسی مکان کے اندر لے گیا تھا۔ اندر لے جا کر اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے زخمی پاؤں کی مرہم پٹی کی تھی جبکہ دروازے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں مزید تیز ہو گئی تھیں اور یہیں اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

کیسا عجیب سا الجھا ہوا خواب تھا، پہلی بار وہ بے حد ڈسٹرب ہوئی تھی۔ سہ پہر میں صیام کے گھر سے واپس آنے کے بعد اسے ایک پل کے لیے بھی سکون نہیں ملا تھا۔ وہ پانی پی رہی ہوتی تو صیام کی کاٹ دار نگاہیں اس کے سامنے آ جاتیں۔ وہ ٹی وی دیکھ رہی تھی تو اس کی وہی نگاہیں ٹی وی پر اُبھر آتیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹی تو وہ پھر سامنے آ کھڑا ہوتا۔ تنگ آ کر اس نے سارکمرہ الٹ پلٹ دیا مگر وہ باز نہیں آیا تھا اور اب..... زندگی میں پہلی بار وہ اس کے خواب میں بھی موجود تھا۔ اسے بے حد غصہ آ رہا تھا کہ کیوں وہ شہزاد کے ہاتھوں ٹریپ ہو کر صیام کے گھر گئی؟ کیوں وہ اس کے سامنے رکی؟ اس نے کیوں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

کتنے سارے کیوں سوال بن کر اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے اور وہ چاہتے ہوئے بھی ان سوالوں کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہی تھی۔ سارا کمرہ الٹ پلٹ کرنے کے بعد وہ اب گھٹنوں میں منہ چھپائے چپ چاپ آنسو بہا رہی تھی۔ زندگی میں کچھ الجھنیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں سلجھاتے سلجھاتے انسان خود بہت دیر تک اُون کے گولے کی مانند ادھر تا چلا جاتا ہے۔ وہ بھی اُون کا گولا بن گئی تھی۔



چاندنی رات تھی۔ عائلہ عشاء کی نماز کے بعد کشادہ صحن میں چار پائی بچھائے تیج پڑھ رہی تھی جب سدید اپنی تیاری کو حتمی شکل دے کر اس کے پاس چلا آیا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو عائلہ! ٹھنڈ لگ جائے گی۔“ عائلہ نے اس کے محبت بھرے اپنائیتی لہجے پر فوراً اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”مجھے ٹھنڈا اچھی لگتی ہے سدید!“

”ہوں، جانتا ہوں پھر بیمار پڑنا بھی اچھا لگتا ہے تمہیں، ہے ناں مگر محترمہ آپ کی اطلاع کے لیے

عرض ہے کہ میں ابھی دو گھنٹے کے بعد جا رہا ہوں، لہذا آپ کی تیمارداری کے لیے یہ غلام اب دستیاب نہیں ہو گا۔“ اس کا وہی شوخ لہجہ تھا، عائدہ کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔

”مجھے ایسا کیوں لگتا ہے سدید! جیسے اس بار تم پلٹ کر واپس نہیں آؤ گے۔“ وہ رو رہی تھی سدید کا دل اس کے قیاس پر بے ساختہ دھڑک اٹھا بھلا وہ یہ راز کیسے پا گئی تھی؟

”تم رو رہی ہو عائدہ؟“ اندر کی کشش سے بے نیاز وہ پریشان ہوا تھا۔ عائدہ کے آنسوؤں میں مزید روانی آ گئی۔

”نہیں، میں رو نہیں رہی سدید! مگر نجانے کیوں میری آنکھیں خود بخود بھیگ رہی ہیں۔ میرا دل ایسی سلطنت کی مانند ہو رہا ہے جسے اجاڑ دیا گیا ہو، پتا نہیں کیوں ایسا ہو رہا ہے حالانکہ پہلے بھی تو تم جاتے رہے ہو مگر پہلے کبھی یہ کیفیات نہیں تھیں۔“ وہ رو بھی رہی تھی اور اسے پتا بھی رہی تھی۔ سدید نے لب بھینچ لیے۔

”میں آؤں گا عائدہ! تم خواص خواص و فضول و ہم کا شکار ہو کر مجھے اور خود کو اذیت دے رہی ہو حالانکہ اب تو میں نے تمہیں اپنے نام کی انگوٹھی بھی پہنا دی ہے۔“

”فضول کا وہم نہیں ہے یہ سدید! مجھے لگتا ہے جیسے کوئی چیز مجھے اندر سے کاٹ رہی ہے۔ میرا سانس گھٹ رہا ہے، مجھ سے کھل کر رویا بھی نہیں جا رہا۔“ اب اس نے دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیے تھے۔ سدید وہیں اس کے پہلو میں بیٹھ گیا تھا۔

”تم میرے حوصلے کمزور کر رہی ہو عائدہ! تمہیں پتا ہے شہیدوں اور غازیوں کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے دل کتنے بڑے ہوتے ہیں۔ ان پتھر ہوئی آنکھوں کی شفاف جھیلوں میں آنسو قطرہ بن کر نہیں برف بن کر ٹھہر جاتے ہیں۔ اگر تم اپنے اندر ان جیسا حوصلہ پیدا نہیں کرو گی تو مجھے بہت دکھ اور مایوسی ہو گی۔“ وہ اب قدرے مایوس لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عائدہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

”شاباش، تمہیں پتا ہے جس رات صحابی رسول ﷺ حضرت ہنزلا کی شادی مبارک کی پہلی رات تھی اسی رات انہیں جنگ میں شرکت کے لیے بلا لیا گیا تھا مگر ان کی صابرنیک بیوی نے اُف تک نہیں کی، یہاں تک کہ وہ راہِ حق میں شہادت کا اعلیٰ مقام پا گئے۔ راہِ حق کے مسافروں کے لیے زندگی بس اتنی ہی معنی رکھتی ہے عائدہ! دینِ حق کے شہیدوں اور غازیوں کو جذبات کی بیڑیاں نہیں روک سکتیں، یہاں درجنوں ایسے فوجی ہیں جو اپنی بیویوں کو رخصت کروا کر گھر لاتے ہیں مگر انہیں ان کا چہرہ تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتا کہ وہ جنگ کے لیے طلب کر لیے جاتے ہیں۔ ہماری تو ابھی صرف منگنی ہوئی ہے۔“ وہ بہت شوخ، لوگ اور کیرنگ تھا مگر وطن کے لیے اس کی محبت کی شدت عائدہ کی محبت سے کہیں بڑھ کر تھی اور یہ بات عائدہ جانتی تھی تبھی اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی سدید!“ کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا، سدید مسکرا دیا۔

”تھینک یو۔“ عائدہ کے پلکوں پر لرزتا آنسو اس نے انگلی کی پور پر پختہ ہوئے مسکرا کر کہا پھر وہ آنسو چوم کر اپنی شرٹ کی پاکٹ میں ڈال دیا۔ عائدہ بس دھندلی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔



سامنے تھی ندی اور کوئی تشنہ لب اس کو تکتا رہا اور پیسا سا رہا۔ ایک لمحے میں سمجھ گئی یہ داستان کس کو معلوم تھا تم ملو گے مجھے اس طرح بدگماں کس کو معلوم تھا؟

ایک کی آنکھ مسلسل دستک کی آواز سے کھلی تھی۔ زاویار نیچے کارپٹ پر ہی اس کے ساتھ سو رہا تھا۔ اس نے ایک نظر گہری نیند میں سوئے زاویار صمد حسن کو دیکھا پھر کبل ہٹا کر بستر سے نکل آیا۔

دن خاصا روشن تھا، کل رات والی خنکی کا اثر بہت حد تک ختم ہو چکا تھا۔ رات وہ اور زاویار بہت دیر تک مودی دیکھتے ہوئے ڈرنک کرتے رہے تھے تبھی اس وقت جب ہلکی ہلکی چمکیلی دھوپ سڑکوں پر بکھر رہی تھی۔ وہ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سوئے ہوئے تھے۔ کافی دیر آنکھیں ممل کر انگوڑائی لینے کے بعد وہ دروازے کی طرف آیا اور فٹ سے دنوں پٹ وا کر دیے۔ باہر مارتھا کے ساتھ ایک چاکلیٹ کمر کے بالوں والی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پٹ سے کھل گئی تھیں۔

”ہائے۔“ مارتھا نے دروازہ کھلتے ہی ہاتھ ہلایا، جواب میں ایک نے سر کے اشارے سے اس کے پہلو کا جواب دیتے ہوئے دروازہ پورا کھول دیا۔

مارتھا پر ہیان کا ہاتھ تھام کر آرام سے اس کے اپارٹمنٹ کے اندر چلی آئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ان کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ مارتھا نے اس کے قریب بیٹھتے ہی پر ہیان کا تعارف کروایا۔

”یہ پری ہے زاویار کی بہن! یہاں لندن میں کسی ضروری کام کے سلسلے میں آئی ہے مگر زاویار سے اس کا رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ کیا تم ہمیں بتا سکتے ہو کہ زاویار اس وقت کہاں ہے؟“

”نہیں۔“ اس کا مدعا سننے کے بعد ایک نے صاف نفی میں سر ہلایا۔

”کیوں؟ کیا وہ تمہارا بہترین دوست نہیں ہے؟“

”ہے..... مگر مجھے اس کے نیو اپارٹمنٹ کا نہیں پتا۔“

”تم ملتے تو ہو گے اس سے؟“

”ہوں، مگر اس نے وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دیا ہے جو اس کے باپ کی ملکیت تھا۔“

”وہاٹ..... مگر کیوں؟“

”یہ تو وہی بتا سکتا ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر پری کا زاویار سے ملنا بہت ضروری ہے، اس کا یہاں پر کوئی بھی ٹھکانہ نہیں ہے اگر زاویار سے اس کا رابطہ نہ ہو تو یہ کہاں رہے گی؟“

”یہ اسے سوچنا چاہیے تھا یہاں آنے سے پہلے کیونکہ زاویار آج کل خود کسی دوست کے ساتھ اپارٹمنٹ شیئر کر رہا ہے، وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”وہ کرے گا مدد یہ اس کی بہن ہے۔“

”ہوں، ایسی بہن جس کی ماں اس کی ماں نہیں ہے اور جس کا باپ اس کا باپ نہیں۔“ وہ تحقیر جو ساویز آفندی کے لہجے میں تھی بالکل ویسی ہی نفرت اور تحقیر اس وقت اس سامنے بیٹھے شخص کے لب و لہجے سے

جھلک رہی تھی۔ پر ہیان کو لگا جیسے اس کے وجود کی دھجیاں اڑ گئی ہوں جبکہ مارتھا خود حیران رہ گئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”وہی جو سچ ہے، یہ زاویار کی بہن نہیں ہے اس کی ماں نے صرف زاویار کے ڈیڈ کی دولت ہتھیانے کے لیے اس کی سگی ماں کو ان کے گھر سے بے دخل کر دیا جبکہ وہ حاملہ تھیں۔ بہتر ہوگا اگر تم اس لڑکی کے ساتھ اس سے نہ ملو کیونکہ ابھی وہ بہت ڈسٹرب ہے۔ ہو سکتا ہے اگر یہ اس کے سامنے آئی تو وہ اسے نقصان پہنچا دے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اسے واپس اس کی ماں کے پاس بھجوا دو۔“ وہ لفظ جو انگاروں کی طرح اس شخص کے لبوں سے پھسل رہے تھے ان لفظ نما انگاروں نے محض چند لمحوں میں پر ہیان کے سارے وجود کو جلا کر رکھ کر ڈالتا تھا تو کیا اس کی بد نصیبی اور بربادی کی داستان یہاں بھی پہنچ گئی تھی۔

کیا زاویار حسن اس بد نما حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا؟ کیا پاکستان سے اس کے چپ چاپ فرار کی یہی وجہ تھی؟ اس لمحے پر ہیان کو بے ساختہ عالمہ علوی سے اس کی نفرت یاد آئی۔ وہ عالمہ علوی جس نے کبھی اس کا کوئی ذاتی نقصان نہیں کیا تھا بس وہ صرف اس کے باپ اور فیملی کی چہیتی تھی اس کا باپ اسے محبت اور اہمیت دیتا تھا مگر..... یہ اتنی سی بات بھی اسے گوارہ نہیں تھی۔

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اس دھان پان سی لڑکی کو مسل کر رکھ دے مگر..... وہ تو اس کی گناہ گار تھی۔ اس کی غاصب ماں نے تو اس کی ماں کا حق چھینا تھا اور خود وہ..... اس نے کوئی حق نہ ہوتے ہوئے اس کی سگی بہن کی جگہ لی تھی۔ اس نے اور اس کی ماں نے سالوں تک اسے اندھیرے میں رکھ کر دھوکا دیا تھا پھر بھلا وہ اسے کیسے معاف کر سکتا تھا؟ یلکھت اس کے ہونٹ اور پورا وجود کپکپایا تھا اور وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”چلو مارتھا مجھے یہاں کسی سے نہیں ملنا۔“ کہتے ہی وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اپارٹمنٹ سے باہر نکل گئی تو مجبوراً مارتھا کو بھی اس کے پیچھے آنا پڑا۔ پر ہیان ہانپ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟ اور وہ ایک کیا کہہ رہا ہے میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ پریشان تھی مجبوراً پر ہیان کو اسے ساری بات ان شارٹ بتانی پڑی۔

”اوہ، یہ تو بہت برا ہوا، اب کیا ہوگا؟“

”پتا نہیں۔“

”تمہیں ابھی ان حالات میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا پری!“

”تو کیا کرتی، وہاں رہتی تو گھٹ گھٹ کر مر جاتی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اب تم رہو گی کہاں؟ انیل کی فطرت کو تم نے دیکھ لیا ہے کوئی بھی حسین لڑکی سامنے پا کر اس کے منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے اور کسی پر مجھے اتنا بھروسہ نہیں ہے کہ وہ تمہاری عزت کی حفاظت کر سکے۔ اب بتاؤ بھلا میں کیا کروں؟“

”تم انیل سے معذرت کر لو جتنا کراہیہ وہ دیتا ہے میں جاب کر کے دے دیا کروں گی۔“

”یقیناً میں ایسا ہی کرتی اگر یہ اپارٹمنٹ انیل نے ہائیر نہ کیا ہوتا، اس کے نام پر ایگریمنٹ سائن کیا ہوا ہے۔ وہ مجھے کسی بھی وقت باہر کر سکتا ہے میں نہیں اور پھر اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا ہے۔ میں اپنی

کوکھ میں اس کا بچہ پال رہی ہوں تبھی تو اسے برداشت کرنا میری مجبوری ہے۔“ پر ہیان کے فوری حل پر اس نے صاف لفظوں میں اپنی معذوری ظاہر کی تھی، وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

”اب کیا کروں؟ میں کسی صورت پاکستان واپس نہیں جاسکتی۔“

”ہوں، ایک حل ہے اگر تم مانو تو؟“

”کیا؟“

”ایلی.....“ مارتھا کی آنکھیں چمکی تھیں۔ پر ہیان نے خاصی الجھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو چمک رہے تھے۔

”ایلی؟“

”ہاں ایلی..... یہاں سے کچھ ہی میل کی مسافت پر اس کا اپنا ذاتی فلیٹ ہے جہاں وہ اپنی آیا کے ساتھ اکیلا رہتا ہے۔ اصل میں ایلی کا باپ مسلمان تھا مگر ماں انگریز، ایلی کی پیدائش کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ اپنے وطن واپس چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہیں آیا اسی لیے ایلی کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ بہر حال مجھے یقین ہے وہاں ایلی کے گھر میں تمہاری عزت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر.....“

”اگر مگر کو چھوڑو یا! یہ لندن ہے پاکستان نہیں ہے جہاں مروت میں کوئی تمہارے لیے کچھ بھی کر گزرے۔ مت بھولو کہ تم ابھی مشکل کی شکار ہو اور فی الحال یہاں اس ملک اس شہر میں کوئی بھی تمہارا اپنا نہیں۔ وہ زاویار حسن بھی نہیں جسے تم بڑے دھڑلے سے بھائی کہتی پھرتی تھیں، صرف میں ہوں جو تمہاری دوستی میں خوار ہوتی پھر رہی ہوں۔ تم میری جگہ ہوتیں تو شاید یہ سب کچھ نہ کرتیں۔“ اس بار مارتھا کا لہجہ تھوڑا خشک ہوا تھا۔ پر ہیان نے فوراً سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟ تم میرے ملک میرے شہر میں ہوتیں تو شاید میں ہمیشہ کی طرح اس سے بھی بڑھ کر کرتی تمہارے لیے۔“

”او کم آن پری، پلیز یہ لفظوں کے گھوڑے دوڑانا بند کرو۔“

”لفظوں کے گھوڑے نہیں ہیں یہ، حقیقت ہے۔“

”حقیقت نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ تم مسلمان ہم انگریزوں کے کبھی اچھے دوست نہیں بن سکتے۔ وہاں تمہارے ملک میں لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔ ہمیں غاصب سمجھتے ہیں، تمہارے ملک کا بچہ بچہ ہماری بربادی کے خواب دیکھتا ہے جہاں موقع ملتا ہے تم لوگ ہمارے اندر گھس کر ہمیں نقصان پہنچانے سے باز نہیں آتے مگر یہ پھر بھی ہمارا ظرف ہے کہ ہم تمہیں اپنے ملک آنے کا ویزہ دیتے ہیں یہاں اپنی بہترین تعلیم گاہوں میں تعلیم دیتے ہیں۔ روزگار مہیا کرتے ہیں، رہنے کو رہائش دیتے ہیں، کھانا دیتے ہیں۔“ پر ہیان نے پہلی بار مارتھا کا یہ روپ دیکھا تھا۔ وہ محبت وطن تھی اور اپنے وطن کے لیے اس کی سوچ بے حد جذباتی تھی۔

”کیا نہیں دیتے ہم لوگ تم مسلمانوں کو، پاکستانیوں کو مگر پھر بھی بدلے میں تم لوگ ہمیں ذلیل کرتے ہو، بدنام کرتے ہو۔ ہمارے خلاف دہشت گردی کے پلان بناتے ہو، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی زیادہ پرانی بات نہیں

ہے۔“ وہ لڑکی جولندن میں اس کی واحد بہترین دوست تھی اس وقت ایک مختلف روپ میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پر ہیان بے حد آزرده نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

وہ بہت زیادہ محبت وطن نہیں تھی مگر پھر بھی اس وقت مارتھا کے الفاظ نے اسے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے بہت شکستہ لہجے میں اسے کہا تھا۔

”تم صحیح کہتی ہو یار! ہم پاکستانی مسلمان واقعی تمہارے اچھے دوست نہیں بن سکتے۔ ہم دوست ہو بھی کیسے سکتے ہیں۔ ہم تو تمہارے غلام ہیں مارتھا! ہماری جمہوریت کے کشکول میں تمہارے ڈالر گرتے ہیں تو وہاں میرے ملک کے غریب محنت کشوں کو روزگار ملتا ہے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد ہم نے کبھی بھولے سے بھی یہ کوشش نہیں کہ خود کو تمہارا ہم پلہ بنا سکیں۔“ مارتھا نے اس کے شکستہ لہجے پر بے نیازی سے نظریں پھیری تھیں۔ پر ہیان نے آنکھوں میں آئی نمی انگلی کی پور سے صاف کر لی۔

”تم صحیح کہتی ہو ہم دہشت گرد ہیں، ہم نے تمہارا دلڈرڈیڈ سینئر تباہ کیا۔ تمہارے چند سو شہریوں کی قیمتی زندگیاں گل کر دیں مگر تم تو مہذب قوم ہونا مارتھا! تم تو ساری دنیا کو امن کا پیغام دیتے نہیں تھکتے۔ انسانی حقوق کے لیے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر بولنے والے تم ہی ہوتے ہو۔ تمہیں تو دہشت گرد کہنے کی جرأت بھی نہیں کسی میں پھر بھی..... پھر بھی تم نے اپنے چند سو شہریوں کی ہلاکت کے انتقام میں سالوں سے بے بسائے اپنے مسلمان شہری، انسانیت کے گرے ہوئے درجے پر لا کر ملک بدر کر دیئے۔ وہ مسلمان شہری جو اپنے بہترین دماغوں کے ساتھ اپنا ملک، اپنا شہر، اپنے رشتے دار، اپنی پہچان، اپنے وطن کا مفاد سب بھلا کر، ترک کر کے صرف تم لوگوں کی وفاداری میں یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے وہ سب دہشت گرد نہیں تھے تمہارے غلام تھے اور غلام کبھی اپنے آقا سے غداری نہیں کیا کرتے۔ سنا تم نے؟ ساری دنیا میں انسانی حقوق کا شور مچانے والے تم لوگوں کی انسانیت اس وقت کہاں جا سوئی تھی جب تم نے محض چند سو امریکیوں کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے جانے کتنے ہی اسلامی ملک ادھیڑ ڈالے۔ تم تو دہشت گرد نہیں تھے ناں، تمہیں تو انسانی حقوق کا ادراک تھا پھر کیوں تم نے پورے افغانستان پر قہر برسایا؟ داڑھی والوں کے سر کاٹ کاٹ کر ان میں پیڑول بھرا، آگ لگائی اور ساتھ میں قہقہے لگا کر ان کی بے بسی کا مذاق اڑایا۔ کیا وہ انسان نہیں تھے؟ کیا وہ سب دہشت گرد تھے؟ ان کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے جو تم نے گولیوں سے بھون ڈالے کیا ان کے کوئی حقوق نہیں تھے؟ کہاں جا سوئی تھی تمہاری انسانیت اس وقت جب تم نے کئی کئی سو افراد کو شدید گرمی میں ایک کنٹینر میں بند کر کے وہ کنٹینر افغانستان کے صحراؤں میں چلوائے اور انہیں فرعون سے بھی بدتر موت دی۔ کیوں عراقیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے؟ شب کے اندھیروں میں ان کی پاک باز ماؤں بہنوں، بیٹیوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں بند کیا۔ ان کے نازک جسموں پر بے بہا تشدد کیا نہ صرف تشدد کیا بلکہ ایک ایک دن میں پچیس پچیس بار ان کی عصمت دری کر کے انہیں جیل کی سلاخوں سے سرنگرا کر مرنے پر مجبور کر دیا۔ تمہارے مذہب نے تو تمہیں دہشت گردی کی تعلیم نہیں دی تھی ناں پھر بھی تم نے گوانتا مو بے، ابو غریب، مگرام قندھار اور شبرغان کے علاوہ سینکڑوں تاریک عقوبت خانوں میں انسانیت کی دھجیاں اڑا دیں۔ ہم جو ایٹمی طاقت تھے پوری دنیا میں واحد ایٹمی طاقت، وہ

ایٹمی طاقت جس کا وجود ہی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے نام پر وجود میں آیا تھا اسی ایٹمی طاقت میں اللہ والوں کی بولیاں لگوا دیں تم نے۔ جن چن کر یوں قہر برسایا ان پر کہ ملک میں کوئی حق کی بات کھلم کھلا کرنے والا ہی نہیں رہا، ڈالروں میں انسان خرید لیے تم نے۔“

”ہم نے نہیں خریدے، تمہارے حکمرانوں کی بھوک نے خود ہمارے حوالے کیے۔ ایک ایک فرد کے ڈالر وصول کیے۔“

”ہاں کیے، انہوں نے جو کیا اس کا بدلہ وہ آخرت میں پالیں گے۔ کچھ عجب نہیں کہ اللہ رب العزت فرعون کی طرح دنیا میں ہی انہیں دوسرے ظالم انسانوں کے لیے عبرت بنا دے مگر تم تو مہذب تھے ناں۔ تمہارا مسئلہ تو بھوک نہیں تھا۔ تمہیں تو ریاست کے عوام کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری کا پتا تھا پھر تم نے کیوں ڈالروں میں انسان خریدے؟ وہ انسان بھی خرید لیے تم نے کہ جن کے جرم کا خود تمہیں بھی پتا نہیں تھا۔ تم مہذب دنیا کے لوگ ہونا۔ اس لیے تمہیں وہ چیخیں سنائی نہیں دیتیں جو شب کے اندھیروں میں تمہارے عقوبت خانوں کی دیواروں کے اندر گونجتی ہیں۔ تمہیں وہ تپتے سنان صحرا دکھائی نہیں دیتے جہاں سے آج تمہاری فوجوں کے انخلاء کے بعد بھی انسانی لاشیں نکلتی ہیں۔ صرف تم مہذب اور امن پسند لوگوں کو اپنی دوستی کا یقین دلانے کے لیے ہم نے کئی سال تک اپنی سرحدوں کے اندر، اپنے بے قصور شہری، تمہارے ڈرون حملوں کی نذر کیے بے شمار ہمارے چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو تمہارا ڈرون نکل گیا۔ صرف تم مہذب لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ہم نے اپنی اسلامی درس گاہیں گولیوں اور بارود کی آگ میں جھونک دیں۔ اپنی سرحدوں کے اندر بیسیوں دشمن ایجنسیز کے ایجنٹ گھسالیے جنہوں نے کئی سالوں تک بم دھماکوں اور خودکش حملوں میں ہمارے ہزاروں لوگ مروائے صرف تمہاری نظروں میں معتبر ہونے کے لیے ہم نے جہاد فی سبیل اللہ جو ہمارے ایمان کا سب سے لازمی جز ہے کو گالی بنا دیا۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کرنے والوں پر اپنی ہی سرزمین میں آزادی سے جینا محال کر دیا پھر بھی تم کہتی ہو ہم کبھی تمہارے دوست نہیں بن سکتے؟ اپنا سب کچھ تم پر تمہاری دوستی، خوشنودی پر قربان کر کے بھی ہمارے نیلی وژن چینل تمہاری اور پاکستانی عوام کی دوستی کے اشتہار چلاتے نہیں تھکتے پھر بھی تم کہتی ہو ہم تمہارے دوست نہیں ہیں۔“ بولتے بولتے وہ اب ہانپنے لگی تھی، مارتھا نے بے نیازی سے نظریں پھیر لیں۔

”یہ سب تمہارے آپسی مسائل ہیں۔ ہم نے نہیں کہا کہ تم اپنی سرزمین اپنے مذہب کے لوگوں کے لیے تنگ کر دو۔“

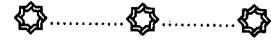
”میں نے کب کہا کہ تم نے ایسا کہا، تم لوگ کچھ بھی کہتے کہاں ہو صرف آرڈر کرتے ہو وہ جس پر عمل کرنا ہماری مجبوری بن جاتا ہے۔“

”ہاں تو بھیک کھانے والی ریاستوں میں ایسا ہی تو ہوتا ہے۔ عادت پڑی ہوئی ہے تم لوگوں کو بھیک کھانے کی ورنہ کیا نہیں ہے تمہارے پاس۔ بہترین دماغ، بہترین اجناس، بہترین خطہ ارض، بہترین معدنیات۔ تم لوگ اگر چاہو تو خود دوسروں کو بھیک دے سکتے ہو۔ بھیک کے لیے اپنی باعصمت بیٹیاں نہ دو۔“

ایک اور تیر..... ایک اور طعنہ..... پر ہیجان کو لگا اس کی سانس رکنے لگی، بہت دیر خاموشی کے بعد وہ بولی تھی۔
 ”کیا کریں ہم مہذب جو نہیں ہیں وگرنہ تمہارے رائیڈ ڈیوٹ کو سرعام پانچ قتل کرنے پر تمہیں واپس کرتے؟ ہماری عدالتیں بھی ہماری بیٹی عافیہ کے ساتھ ہونے والی بدترین زیادتی کا بدلہ لیتیں اور پورے پچاس سال سے زائد سزا سناتیں تمہارے شہری کو حالانکہ وہ تو گلٹی تھے۔ دن دیہاڑے سینکڑوں لوگوں کے بچے ہمارے بے قصور نہتے شہری کچلے تھے اس نے جبکہ عافیہ پر تو محض بندوق اٹھانے کا الزام تھا اس کے ہاتھوں اور دماغ سے تو کسی کا قتل بھی نہیں ہوا پھر بھی وہ اپنوں کی بے حسی اور تمہاری امن پسندی و تہذیب کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کسی عدالت، کسی پلیٹ فارم، کسی میننگ میں اس پر ہونے والے قطعی غیر اخلاقی و غیر آئینی ظلم کا سد باب نہیں ہوا نہ ہم نے تم سے اپنے سفارتی تعلقات ختم کیے نہ اس کی واپسی کے لیے کوئی بڑا مطالبہ کیا پھر بھی تم کہتی ہو ہم تمہارے دوست نہیں بن سکتے؟“ وہ اب رو رہی تھی، مارتھا اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔

”ایم سوری، میرا مقصد تمہیں ڈس ہارٹ کرنا نہیں تھا۔“

”اُس او کے ہم پاکستانیوں کے اندر اتنی برف جم گئی ہے کہ ہم ڈس ہارٹ نہیں ہوتے نہ ہی احتجاج کرتے ہیں۔ خواہ کتنا بڑا پہاڑ ہی سر پر کیوں نہ گر پڑے۔“ نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اس نے ایک نظر مارتھا پر ڈالی پھر قدم آگے بڑھا دیئے۔ مارتھا اس کے گالوں پر نکھرتے گرم آنسوؤں کو مزید نہیں دیکھ سکتی تھی۔



دسمبر اب کے آؤ تو.....

تم اس شہر تنہا کی خبر لانا

کہ جس میں جگنوؤں کی کہکشا میں جھللاتی ہیں

جہاں تلی کے رنگوں سے فضا میں مسکراتی ہیں

جہاں چاروں طرف رقصاں وفا کی پیاری خوشبو ہے

دسمبر اب کے آؤ تو تم اس شہر وفا کی خبر لانا

جہاں پر ریت کے ڈرے ستارے ہیں

گل و لعل، ماہ و انجم، وفا کے استعارے ہیں

جہاں وہ دل سمندر ہے کئی جس کے کنارے ہیں

جہاں قسمت کی دیوی مٹھیوں میں جگمگاتی ہے

جہاں دھڑکن کی لے پر بے خودی نغمے سناتی ہے

دسمبر ہم سے مت پوچھو ہمارے شہر کی بابت

یہاں آنکھوں میں گزرے کارواں کی گرد دھہری ہے

محبت برف جیسی ہے یہاں اور دھوپ کے کھیتوں میں اگتی ہے

یہاں جب صبح آتی ہے

تو شب کے سارے سپنے راکھ کے اک ڈھیر کی صورت بدلتے ہیں

یہاں جذبوں کی ٹوٹی کرچیاں آنکوں میں چھپتی ہیں

یہاں دل کے لہو میں اپنی پلکوں کو ڈبو کر ہم

سنہری خواب بننے ہیں

پھر ان خوابوں میں جیتے ہیں انہی خوابوں میں مرتے ہیں

دریدہ روح کو لفظوں سے سینا گونہیں ممکن

مگر پھر بھی.....

دسمبر اب کے آؤ تو تم اس شہر تنہا کی خبر لانا

اس رات لندن شہر میں بہت برف باری ہوئی تھی۔ پر ہیجان دوبارہ مارتھا سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی

تھی مگر پھر بھی یہ اس کی مجبوری تھی کہ وہ اسے اس وقت لات نہیں مار سکتی تھی، بالکل اپنی ریاست کی طرح وہ بھی

مجبور تھی۔ ٹھنڈ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ایللی اس روز انہیں اپنے فلیٹ پر نہیں ملا تھا وہ پیرس گیا ہوا تھا کسی

ضروری کام سے جبکہ اس کی آیا بھی گھر پر نہیں تھی۔

پر ہیجان کو مجبوراً وہ رات پھر مارتھا اور انیل کے اپارٹمنٹ پر گزارنی پڑی۔ رات کے کھانے کے نام پر

اس نے صرف فرائی آلو لیے تھے جبکہ مارتھا اور انیل نے بھرپور پیٹ پوجا کے بعد جی بھر کے شراب نوشی بھی کی

تھی۔ پر ہیجان کو نماز قرآن وغیرہ کی عادت نہیں تھی، ایک مسلم ریاست میں پکی مسلمان ہونے کے باوجود اس کا

طرز زندگی زاویار کی طرح غیر مسلمانہ ہی تھا۔ وہ اگر ٹی وی دیکھ رہی ہوتی اور چینل تبدیلی کے دوران کوئی اسلامی

چینل سامنے آ جاتا تو ایک لمحے سے بھی پہلے وہ چینل بدل دیتی تھی۔ کبھی کبھی اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی

کہ انڈین تمام چینل اپنے ہر پروگرام، فلم اور ہر ڈرامے کی ہر قسط میں کیسے بڑھ چڑھ کر اپنے مذہب کا پرچار

کر رہے تھے کیا ان کے لوگ اس سے بے زار نہیں ہوتے تھے جبکہ پاکستانی ڈراموں میں تو ضرورتاً بھی ایسے

سینز کو سنسر کر دیا جاتا تھا جو مذہب سے متعلق ہوتے حالانکہ اسلام کی تبلیغ تو ہر مسلمان پر فرض تھی۔

اس رات جب اپارٹمنٹ کی بیرونی کھڑکی کے اس پار وہ آسمان سے زمین پر گرتی برف کو انہماک

سے دیکھنے میں مصروف تھی اس کا دل قرآن پاک کی تلاوت کے لیے چل اٹھا۔ مارتھا اور انیل نشے میں دھت

ہونے کے بعد کمرانشین ہو گئے تھے جبکہ وہ لاؤنج میں بیرونی کھڑکی کے قریب کھڑی باہر برف کو گرتے ہوئے

دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی آئندہ زندگی کی فکر میں بھی کھوئی تھی۔ گزرتے ہر لمحے کے ساتھ خنکی کا احساس

بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کافی دیر بیرونی کھڑکی کے اس پار گرتی روئی کے گالوں جیسی برف کو دیکھنے کے بعد اپنے بستر

میں آدبی۔ اگلے پندرہ بیس منٹ تک پہلی بار درود پاک کا ورد کرتے ہوئے اس کی آنکھ لگی تھی اور ابھی اسے

سوئے ہوئے بمشکل گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے پاؤں پر پنڈلی کے پاس کسی چیز کے ریگنے کے احساس

نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ بے حد گھبرا کر اس نے جونہی آنکھ کھولی، سامنے نشے میں دھت آنیل بیٹھا اپنی سرخ سرخ

آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پر ہیجان کے سارے وجود میں جیسے سناٹا اتر گیا۔ ایک لمحے سے بھی قبل پاؤں

سمیٹتے ہوئے وہ فوراً اٹھ بیٹھی تھی۔

”سوری! میں پانی پینے کے لیے اٹھا تھا۔ اندھیرے میں پتا ہی نہیں چلا کہ تم یہاں سو رہی ہو۔“ اپنی وہاں موجودگی کا جواز دیتے ہوئے اس نے پھر اسے چھونا چاہا تھا جب پرہیز نے نفرت سے اسے پرے دھکیل دیا۔

”دور ہو مجھ سے۔“

”کیوں؟ تم کوئی اچھوت ہو؟“ وہ ڈھٹائی پر آمادہ تھا۔ پرہیز کا دل زور سے دھڑکا۔

”کیا بدتمیزی ہے یہ؟ اپنی حد میں رہو میں مارتھا نہیں ہوں۔“ وہ چلائی تھی مگر انیل پر اس کے چلانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ مارتھا تاحال نشے میں دھت خرائے لے رہی تھی تبھی وہ مسکرایا۔

”جانتا ہوں اسی لیے تو آیا ہوں۔ سنا ہے پاکستانی لڑکیوں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ۔“ اس بار وہ حلق کے بل چلائی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا یا کوئی حرکت کرتا وہ بھاگ کر اندر مارتھا کے پاس چلی آئی۔

”مارتھا..... مارتھا اٹھو پلیز۔“ اسے بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ انیل اس کے پیچھے ہی کمرے میں چلا آیا۔ پرہیز کو لگا جیسے وہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ہے۔

”مارتھا.....“ اس بار اسے جھنجھوڑتے ہوئے پرہیز نے اسے پکڑ کر بٹھا دیا تھا تبھی وہ جاگی تھی۔

”کیا ہوا؟“ انیل مارتھا کے جاگنے پر کمرے کا دروازہ لاک کرتے کرتے رک گیا جبکہ پرہیز اس سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑی۔

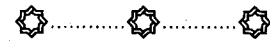
”کیا ہوا ہے؟“ مارتھا کا نشہ اسے بری طرح روتے دیکھ کر فوراً ہرن ہوا تھا تب ہی انیل بول اٹھا۔

”سو تے میں ڈر گئی ہے شاید۔“

”تم نے کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟“ وہ اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھی تب ہی اس کی وضاحت پر مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو وہ بدک اٹھا۔

”بکواس بند کرو۔ میں ایسا لگتا ہوں تمہیں؟ یہاں رہنا ہے تو رہو نہیں تو اسی وقت اپنی اس نام نہاد دوست کو لے کر نکل جاؤ یہاں سے۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔“ وہ نشے میں تھا اور نشے میں اس کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا تھا تبھی مارتھا نے اس سے الجھا مناسب نہیں سمجھا۔

پرہیز نے وہ رات مارتھا کے ساتھ مکمل جاگ کر گزاری تھی۔ وہ جیسی بھی تھی اس وقت اس کے لیے ڈھال تھی۔



ایک دروازہ بند کر کے کمرے میں واپس آیا تو زوایا جاگ رہا تھا۔

”کون تھا باہر جس کے ساتھ بلند آواز میں بحث کر رہے تھے تم؟“ اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا، ایک نے نظریں چرائیں۔

”مارتھا آئی تھی اپنی ایک فرینڈ کے ساتھ۔“

”کیا کہہ رہی تھی؟“

”کچھ نہیں تمہارا پوچھ رہی تھی ساتھ میں یہ بھی کہہ رہی تھی کہ تمہارا سیل نمبر مسلسل بند جا رہا ہے تمہاری بہن پرہیز اس کی دوست ہے شاید وہی اس سے تمہارا رابطہ نمبر مانگ رہی ہو۔“

”میری کوئی بہن نہیں ہے اور نہ ہی تمہیں مارتھا کو میرا نمبر دینے کی ضرورت ہے۔“

”میں نے نہیں دیا۔ میں جانتا تھا تم یہ پسند نہیں کرو گے اسی لیے میں نے منع کر دیا۔“

”اوکے۔“

”کل ہوزان ملی تھی وہ بھی تمہارا پوچھ رہی تھی۔“

”کیوں؟“

”پتا نہیں بہت پریشان لگ رہی تھی شاید اس کی ماں بہت بیمار ہے۔“

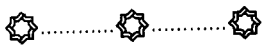
”سو واٹ یار..... اس کی ماں بیمار ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”کچھ نہیں، کم از کم اس کی ماں کا حال تو پوچھ ہی سکتے ہو۔“

”مگر کیوں، کیا لگتی ہے وہ میری جو میں اس کی ماں کا حال پوچھتا پھروں۔“ زوایا کا موڈ بری طرح آف ہو گیا تھا، ایک نے کندھے اچکا دیئے۔

”انسانیت کے ناطے کہہ رہا تھا وہ اس وقت رہائش میں تمہاری مدد کر سکتی ہے۔“

”مجھے اس کی یا کسی کی بھی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی بہت پیسے ہیں میرے ذاتی اکاؤنٹ میں جب ختم ہو گئے پھر سوچوں گا کس کس کا حال پوچھنا ہے۔“ لحاف ایک طرف پھینکتے ہوئے وہ بستر سے نکل آیا تھا۔ ایک نے سرسری سی ایک نظر اس کے وجہہ سراپے پر ڈالی پھر دوبارہ سے کبل تان کر سو گیا۔



مارتھا ماموڈ آف تھا جبکہ انیل صبح دیر تک نشے میں مست بے حال پڑا سوتا رہا۔ پرہیز کو ایل کی رہائش گاہ کا پتا تھا کل وہ مارتھا کے ساتھ آ کر اس کا ٹھکانہ دیکھ آئی تھی تبھی اس صبح بنا مارتھا کی مدد کے وہ اپنا سامان اٹھا کر اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آئی تھی۔ شدید دھند میں اس کے آنسو جیسے آنکھوں کے اندر ہی جم گئے تھے۔ جس وقت وہ ایل کی گھر کے سامنے پہنچی، لندن کے وقت کے مطابق دن کے گیارہ بج رہے تھے مگر چونکہ چھٹی کا دن تھا لہذا ایل اس وقت اسے گھر پر ہی مل گیا تھا۔ پرہیز کی دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے والا وہی تھا۔

”ہائے۔“ بہت مدہم لہجے میں پرہیز نے اسے مخاطب کیا، جواب میں وہ قدرے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”پری تم یہاں؟“

”ہوں، مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے ایل۔“

”شیور، اندر آ جاؤ۔“ وہ خوش تھا بے پناہ خوش حالانکہ اس کے چہرے پر بڑھی ہوئی ہلکی ہلکی شیور اس کے اندر کی بے سکونی کا واضح پتا دے رہی تھی۔ پرہیان نے اس کی تقلید میں قدم آگے بڑھا دیئے۔

ایلی کی شخصیت کے قطعی برعکس اس کا گھر بے حد صاف ستھرا اور نفیس تھا۔ ہر چیز سلیقے اور قرینے سے لگی اپنی امارت کا پتا دے رہی تھی۔ وہ بیگ دروازے کے قریب چھوڑ کر ڈری ڈری سی ایلی کی ہمراہی میں گھر کے اندر چلی آئی۔

”بیٹھو۔“ ہال نما کشادہ کمرے میں کاؤچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے پرہیان سے کہا، اسے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

”کچھ لوگی؟“

”نہیں، شکریہ۔“

”اوکے پھر بتاؤ لندن کیسے آنا ہوا، مار تھا بتا رہی تھی کہ تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔“ وہ بھی اس سے قدرے فاصلے پر وہیں ٹک گیا تھا۔ پرہیان نے نظریں اپنی گود میں دھرے ہاتھوں پر جمادیں۔

”ہوں شادی طے ہو گئی تھی مگر..... تین روز پہلے ٹوٹ گئی۔“

”وہاٹ..... مگر کیوں؟“

”اسے لگا شاید میں اس کے قابل نہیں ہوں۔“

”اوہ..... مگر یہ بات اسے منگنی ہونے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔“

”ایم سوری ایلی! مگر میں اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

”اوکے، میری مدد کیوں چاہیے تمہیں؟“

”مجھے رہائش کا مسئلہ ہے فی الحال میرے پاس یہاں کوئی جاب بھی نہیں ہے۔ مار تھا کہہ رہی تھی کہ تم یہاں اپنی آیا کے ساتھ اکیلے رہتے ہو اور یہ بھی کہ فی الحال رینٹ پر مجھے ٹھہرنے میں فیور بھی دے سکتے ہو۔“

”ہوں، تم یہاں رہ سکتی ہو پری! مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے مگر میری جوائیکٹیویٹیز ہیں، شوق ہیں وہ شاید تمہیں زیادہ دن یہاں ٹکنے نہ دیں۔“

”میں سمجھی نہیں؟“

”میں سمجھا دیتا ہوں۔“ پرہیان کی الجھن پر اس نے پھر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

”مجھے شراب اور شباب کی بہت بُری لت ہے پری! آئے روز یہاں محفلیں جی رہتی ہیں، کبھی کبھی میں تین تین دن گھر نہیں آتا۔ نشے کی حالت میں میرا مزاج بھی بہت بگڑ جاتا ہے، بہت نقصان کرتا ہوں میں اپنا، تم کہاں یہ سب برداشت کر پاؤ گی؟“ وہ اسے اپنی حقیقت بتا رہا تھا۔ پرہیان بے حد مایوس ہوئی۔

”میں ایڈجسٹ کر لوں گی۔“ کل رات انیل نے اس کے ساتھ جو کیا تھا اسکے بعد وہ دوبارہ مار تھا کے اپارٹمنٹ جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی تبھی اس نے بے حد دل گرفتگی کے باوجود وہاں رہنا قبول کیا تھا۔ ایلی نے اس کے جواب پر آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے اگر تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے تو تم یہاں رہ سکتی ہو۔ آؤ میں تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دوں۔“ اس کا موڈ بے حد فریش تھا، پرہیان نے اپنے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔



ایلی کا فلیٹ خاصا لکڑی تھا، بے حد خوبصورت اور کشادہ..... دو بیڈروم، ایک ڈرائنگ روم، کچن، لاونج، اٹیچڈ باٹھ، مختصر سی گیلری جس کے آخر میں ونڈو لگی ہوئی تھی جو باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی۔ اسی ونڈو سے ٹھنڈی ہوا اور کبھی ہلکی دھوپ گیلری کے در و دیوار کو چھو کر کمروں کو روشن کرتی تھی۔ گیلری کے شروع میں ایلی کی آیا کا کمرہ تھا جو معذور تھیں۔ کمرے میں ایک عدد سنگل بیڈ، بیڈ کے دائیں طرف پرانی کتابوں کی ایک چھوٹی سی الماری ایک طرف دو عدد کرسیاں اور کونے میں آتش دان تھا جو شدید سردی یا برف باری کے موسم میں جلانے کے کام آتا تھا۔ پرہیان کو یہ سادہ سا کمرہ بے حد پسند آیا۔ ایلی کی آیا مصری خاتون تھیں، پچیس سال پہلے کسی برطانوی شہری کیساتھ شادی رچا کر لندن آئی تھیں بعد ازاں شوہر کی وفات کے بعد ایلی کی موم کے پاس ٹھہر گئیں اور یوں پیدائش کے کچھ ہی ہفتوں بعد ایلی ان کی گود میں آ گیا جسے بعد میں انہوں نے اس کی سگی ماں سے بڑھ کر پالا اور پیار دیا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی معذوری کے دنوں میں بھی ایلی نے انہیں کسی اولد ہوم کے سپرد نہیں کیا تھا۔ ایلی کا کمرہ ان کے بغل میں ہی تھا اور بے شک وہ ایک شاندار کمرہ تھا۔

پرہیان کے لیے اس نے ڈرائنگ روم وقف کیا تھا جو بے حد خوبصورت اور صاف ستھرا تھا اور عین ایلی کے بیڈروم کے مقابل تھا۔ پرہیان کو اس کا فلیٹ اور اپنا کمرہ دونوں ہی بے حد پسند آئے۔ وہ کمرہ دیکھ رہی تھی جب ایلی کافی کے دوگ اٹھائے اس کے قریب چلا آیا۔

”تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو تمہاری مہمان نوازی میرا فرض ہے۔“ پرہیان اس کی بات پر پلٹی اور پھر بے ساختہ مسکرا دی۔

”شکریہ ایلی!“ مشکور لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کپ تھام لیا۔

”تمہاری آیا نظر نہیں آ رہیں، کیا وہ کہیں گئی ہوئی ہیں؟“

”ہوں، لاسٹ ویک سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں نے ہسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا ہے، کل پرسوں تک آ جائیں گی۔“

”مار تھا بتا رہی تھی تمہیں بہت اچھی جاب مل گئی ہے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”کیا مطلب؟“

”جہاں جاب ملی ہے میں وہاں خود اپنا کام شروع کرنا چاہتا ہوں، میرے ڈیڈ مرنے سے پہلے

میرے نام پر بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔“

”اوہ..... کیا تمہاری ممی انڈین ہیں ایلی؟“

”ہوں، انڈین تھیں مگر اب خالص برطانوی لگتی ہیں۔“

”کیا تم ملتے ہو اپنی ممی سے؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”بس یونہی۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”انہیں وقت نہیں ملتا، مجھے فرصت نہیں ملتی۔“

”مارتھا بتا رہی تھی تمہاری گرل فرینڈ بھی انڈیا واپس چلی گئی۔“

”ہوں، ممی کی سگی بھتیجی تھی وہ۔“

”کیا تم اس میں انٹرسٹڈ تھے؟“

”پتا نہیں۔“

”مجھے ایسا کیوں لگتا ہے ایلی! جیسے تمہارے اندر کوئی بہت گہرا راز ہے، جسے تم سب سے چھپانے کی

کوشش کرتے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ ایلی نے رخ پھیرا، پھر یونہی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”تم یہاں لندن میں کب تک ہو؟“

”پتا نہیں شاید اس بار مجھے کافی سال لگ جائیں۔“

”کیا تم اپنے گھر والوں سے ناراض ہو کر آئی ہو؟“

”کیا.....؟“

”بتاؤ گی ایلی! مگر ابھی نہیں۔“ اس کی آنکھیں ہلکی سی نم ہوئی تھیں۔ ایلی چاہنے کے باوجود اس کے

چہرے سے نظر نہ ہٹا سکا۔

”کیا تم اپنی شادی ٹوٹنے سے پریشان ہو؟“

”نہیں۔“

”مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے پری! جیسے تم بھی مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو۔“

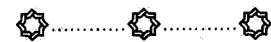
”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے اب ریٹ کرو، میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں۔ شام میں ملاقات ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا۔“

”تم بھی۔“ ایک مسکراتی نظر اس پر ڈالنے کے بعد وہ واپس پلٹ گیا تھا، پر ہیان کتنی ہی دیر گم صم سی

وہیں کھڑی رہی۔



اس کی باتوں کو بھلا دیں یہ ممکن ہی نہیں ہے
اس نے جو بھی کہا، رونما ہونے کو ہے
اس کے چہرے کی اداسی سے ہی ظاہر ہے محسن
جیسے وہ ایک بار پھر مجھ سے جدا ہونے کو ہے



سنو ہدم کبھی ہم مسکراتے تھے
ہمارا دیکھ کر چہرہ چمن میں پھول کھلتے تھے
پرندے گیت گاتے تھے
ہوائیں، خوشبوؤں میں بھیگی ہر سونگٹنائی تھیں
تیرے قصے سناتی تھیں

سنو ہدم

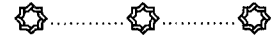
ہمیں بھی ناز تھا اپنی محبت پر اداؤں پر
بہت مسرور تھے جاناں، کبھی اپنی وفاؤں پر
مگر

ہمیں معلوم ہی کب تھا؟

کہ اک دم رُت جو بدلے گی نگاہیں بھیگ جائیں گی
دسبر کی حسین راتیں ہمارا دل دکھائیں گی
سمندر کے کنارے جو بنائے تھے کبھی ہم نے
گھر وندے ٹوٹ جائیں گے

میرے ہاتھوں سے تیرے ہاتھ پل میں چھوٹ جائیں گے
کبھی بیتے ہوئے لمحے بہت ہی یاد آئیں گے
ہمیں معلوم ہی کب تھا یہ دولت کی ہوس تم کو
ہر اک وعدہ بھلا دے گی

تمہاری ایک دم یوں بے رخی پتھر بنا دے گی
ہمیں معلوم ہی کب تھا؟
کبھی اب سوچنے بیٹھیں تو اکثر یاد آتا ہے
کسی کو بھی چاہتے تھے، کبھی ہم مسکراتے تھے



کپواڑہ وادی کشمیر کا ایک خوبصورت سردی علاقہ ہے، پاکستانی سرحد کا ایک طویل حصہ اس علاقے کے گرد گھومتا ہے۔ پُر کیف وادیوں، گھنے جنگلوں اور خوبصورت ندی نالوں والے اس جنت نظیر علاقے کے لوگ بے حد محنتی، ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔

آزاد کشمیر رجسٹری سے آگے سدید علوی کا اگلا پڑاؤ کپواڑہ ہی تھا۔ سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ کشمیر کے بلند و بالا پہاڑوں پر برف باری کا آغاز ہو چکا تھا تاہم میدانی علاقوں کا موسم ابھی خشک تھا۔ وادی کشمیر میں سردیوں کے موسم میں خوب برف باری ہوتی ہے۔ پہاڑوں پر جمی کئی کئی فٹ برف گرمیوں میں پگھلنا شروع ہوتی ہے تو اس پانی سے کشمیر کے کھیت کھلیان سیراب ہوتے ہیں۔ اسی پانی کی بدولت وادی کشمیر کے جھروں اور نغمہ خواں آبشاروں کا حسن برقرار رہتا ہے۔ کشمیر کی جنت نظیر وادی میں یہ موسم نہایت دلکش ہوتا ہے۔

درختوں کی ٹہنیوں پر جمی برف کی تہیں عجیب منظر پیش کرتی ہیں۔ کشمیری بچے اپنے گھروں کے صحن میں برف، جسے کشمیری زبان میں (شین) کہا جاتا ہے، کے مجسمے بنا کر خوب کھیلتے ہیں۔ اکثر یہ معصوم ننھے فرشتے برف کے گولوں سے امریکی اور بھارتی صدر اور وزیراعظم کے مجسمے بنا کر انہیں جوتے مارتے ہیں اور ان سے اپنی نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں جہاں برف باری سے خوبصورتی اور دلکشی کا سماں بندھ جاتا ہے وہیں پہاڑی علاقوں میں یہ موسم موت کی وادی کا منظر پیش کرتا ہے۔

کشمیر میں کچھ ایسی فلک بوس چوٹیاں بھی ہیں جہاں سارا سال برف نہیں پگھلتی۔ سدید کے سفر کا آغاز بھی انہی فلک بوس چوٹیوں کے درمیان سے ہوا تھا۔ ماہ ستمبر کے آخری دن تھے، کپواڑہ کی برف سے ڈھکی چوٹیوں پر مسلسل سفر نے اس کے خوبصورت پاؤں جلا ڈالے تھے۔

سردیوں کے موسم میں برف کا یہ سفر نہایت تکلیف دہ ہوتا ہے کیونکہ آگ کا جلا اتنا تکلیف دہ نہیں ہوتا جتنا برف کا جلا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ انجان پہاڑی راستوں پر اس کی رہنمائی کے لیے ایک گائیڈ جاسوس اس کے ساتھ تھا جسے شاید وہاں کے تمام دشوار گزار رستوں سے مکمل آگاہی تھی مگر پھر بھی وہ تھک گیا تھا۔ سردی اور بھوک سے نڈھال اس کا جسم اپنی منزل کی طرف گامزن تھا کہ اچانک سامنے نظر آتے برساتی نالے کو دیکھ کر اس کی تھکن مزید بڑھ گئی۔

وہ اس علاقے میں پہلی بار آیا تھا تبھی اسے وہاں کے موسموں اور رستوں سے آگاہی نہیں تھی۔ سفید برف کے گالوں نے قرب و جوار کی ہر شے کو ڈھک رکھا تھا۔ دور دور تک سوائے برف کے اور کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

نالے میں اس قدر طغیانی تھی کہ اس وقت اسے پار کرنا گویا خودکشی کرنے کے مترادف تھا مگر پھر بھی انہیں وہ نالہ پار کرنا تھا۔ برف کے اس بیابان میں رک کر کسی کی مدد کا انتظار کرنا لانا حاصل تھا تبھی اپنے گائیڈ کی رہنمائی میں اللہ کا نام لے کر اس نے اس برساتی نالے کے ساتھ ساتھ سفر کرنا شروع کر دیا تھا۔

دور تک نالے کے کنارے چلنے کے بعد ایک جگہ جہاں نالہ نسبتاً کم چوڑا تھا وہاں ایک درخت کٹ کر یوں نالے کے اوپر گرا ہوا تھا جیسے پل ہو۔ تاہم درخت کے اوپر جمی برف کی تہوں پر بہت زیادہ پھسلن تھی جس کی وجہ سے نالے میں گرنے کے امکانات زیادہ تھے۔

گائیڈ نے ہاتھ سے برف صاف کر کے آگے بڑھنے کا راستہ واضح کیا تو سدید کی ہمت بھی بڑھ گئی۔ نالے کے اس پار ایک بھولا بھوکا قافلہ جیسے انہی کا منتظر تھا۔



اس رات حویلی میں بہت رونق تھی۔ مہندی کی تقریب نے برقی قہقروں سے جگمگاتی حویلی کی رونق کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ صمد حسن کوشش کے باوجود حویلی نہیں آسکا تھا کیونکہ اس کی بیرون ملک میننگ تھی۔ مریرہ کو دکھ تو ہوا تھا مگر اس نے صمد پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔

عمر عباس نے اس روز وائٹ لٹھے کا سوٹ زیب تن کیا تھا جبکہ مریرہ نے وائٹ اینڈ بیلو کنٹراسٹ میں شموز کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کے گلے اور دامن پر ہاتھ کا بہت خوبصورت کام کیا گیا تھا۔

بے جی کی فرمائش پر اس نے پرانہ بھی ڈال لیا جو بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ عمر نے صمد کے نہ آنے پر اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا مگر وہ ہنس کر ٹال گئی۔ مہندی کی تقریب جاری تھی۔ شگفتہ اور قمر دنوں کے الگ الگ فنکشن رکھے گئے تھے۔ قمر کا فنکشن باہر مردانے میں تھا جبکہ شگفتہ کی مہندی کا فنکشن حویلی کے اندر ہی رکھا گیا تھا۔ مہندی کی اس تقریب میں خضر عباس اور نظر عباس کی سالی شادو بھی آئی تھی۔ وہی شادو جس کی نسبت بے جی نے عمر عباس کے ساتھ طے کر رکھی تھی مگر وہ راضی نہیں تھا۔ مریرہ نے دیکھا وہ پوری تقریب میں بے حد اداس تھا۔ شاید تبھی وہ اس کے قریب آئی تھی۔

”شادو“ اس کی پکار پر وہ ہلٹی تھی اور قدرے حیران لگا ہوں سے اس نے مریرہ کو دیکھا۔

”مجھے مریرہ کہتے ہیں، عمر کی بچپن کی دوست ہوں۔ بے جی یا بھابی نے بتایا ہوگا۔“ شادو کے حیران لگا ہوں سے دیکھنے پر اس نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کر دیا تو وہ بولی۔

”جی ہاں، بجو نے بتایا تھا آپ کا۔“

”گڈ، مجھے عمر نے آپ کا بتایا کہ آپ ان کی منگیتری ہیں۔ اس سے پہلے میں صرف آپ کے نام سے آشنا تھی۔ مجھے لگتا تھا شاید آپ کوئی سیدی سادی سی دیبی خاتون ہوں گی، مگر آپ تو کافی سلجھی ہوئی پڑھی لکھی

لڑکی لگ رہی ہیں۔“

”ہوں، ابھی پچھلے سال نفسیات میں ایم اے کیا ہے میں نے۔“

”دیری گڈ، شادی کے بارے میں کیا سوچا آپ نے؟“

”کچھ نہیں۔“ مریرہ نے دیکھا اس کے سوال پر سامنے کھڑی اس لڑکی کی آنکھوں میں ہلکا سا پانی آیا

تھا۔

”عمر اس شادی کے لیے تیار نہیں ہے، اس نے صاف لفظوں میں مکمل سچائی کے ساتھ مجھ سے اور

میرے والدین سے معذرت کر لی ہے۔“

”وہاٹ..... مگر کیوں؟“

”کسی اور سے محبت کرتا ہے وہ اس لیے۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ مریرہ کو لگا جیسے شادو نے اس کی سماعتوں میں دھماکہ کیا ہو۔ اس کی

آنکھیں حیرانی کا شدت سے پھیل گئیں، شادو نے نظریں چرائیں۔

”یہی سچ ہے، میں جانتی ہوں وہ خوش نصیب کون ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ عمر عباس میرا کبھی نہیں ہو

سکتا۔“

”نہیں پلیز ایسا مت کہو۔ میں جانتی ہوں تم اس سے بہت محبت کرتی ہو۔ بچپن میں سارے گاؤں کی

لڑکیاں تمہیں اس کا نام لے کر پاگل بناتی رہی ہیں۔ تم اتنی جلدی کیسے اس کی ذات سے دستبردار ہو سکتی ہو؟“

”میں دستبردار ہو چکی ہوں۔ وہ میرا پاگل پن تھا۔ اب مجھے بچپن کی کوئی بات یاد نہیں۔ بہتر ہے آپ

بھی یہ قصہ یہیں ختم کر دیں پلیز۔“ شادو کی آنکھوں میں اس وقت اتنا کرب تھا کہ مریرہ کو اپنا دل کتنا ہوا محسوس

ہوا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ شاہدہ عرف شادو سے مزید کچھ کہتی اسے عمر نے آواز دے کر پکار لیا۔ قدرے سن

حواس کے ساتھ وہ ست روی سے قدم اٹھاتی اس کی طرف آئی تھی۔

”بے جی کہاں ہیں؟“ اس کے قریب آنے پر عمر نے اس سے پوچھا تو مریرہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”پتا نہیں، میں نے نہیں دیکھا۔“

”تم کچھ پریشان لگ رہی ہو خیریت؟“

”نہیں میں پریشان نہیں ہوں ویسے بھی تمہیں میری فکر میں دہلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس کا موڈ

گہرا ہوا تھا، عمر کو مینشن ہونے لگی۔

”کیوں..... کیوں ضرورت نہیں، میں نے کیا کیا ہے جو تم اس نون میں بات کر رہی ہو۔“

”تم نے کچھ نہیں کیا، بس تم شاہدہ عرف شادو سے شادی کر رہے ہو وہ بھی فوری۔“

”کیوں، اس ایمر جنسی آرڈر کی وجہ؟“

”کوئی وجہ نہیں، وہ اچھی لڑکی ہے تمہیں اسے اپنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”مجھے کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں یہ میرا درد سر ہے، تمہیں خواہ مخواہ اس مسئلے میں جان کھانے کی ضرورت

نہیں ہے۔“

”کیوں ضرورت نہیں ہے، کیا میں تمہاری کچھ نہیں لگتی؟“

”ایسی بات نہیں ہے مگر میں شادو سے شادی نہیں کر سکتا۔“

”کیوں نہیں کر سکتے وجہ؟“

”تم وجہ جان کر کیا کرو گی؟“

”وہی جو تم وجہ چھپا کر کر رہے ہو؟“

”تم بے کاری بحث میں پڑ رہی ہو مریرہ اور مجھے بے کاری بحث پسند نہیں ہے۔“

”بے کاری بحث نہیں ہے یہ، کسی کی زندگی کا معاملہ ہے۔“

”تمہیں کسی کی فکر یا ہمدردی میں دہلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اس بار عمر نے سخت لہجے اختیار کیا

تھا۔ مریرہ کو بے حد دکھ ہوا۔

”تم کس سے بھاگ رہے ہو عمر! میں تمہارا راز جان گئی ہوں۔“

”کیسا راز؟“

”یہی کہ تم کسی سے محبت کرتے ہو اسی لیے شاہدہ سے شادی نہیں کر رہے مگر میں تمہیں ایسا نہیں

کرنے دوں گی، سمجھے تم۔“

”شٹ اپ۔“ عمر نے جھنجھلا کر کہا تھا اور فوراً باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مریرہ کتنی دیر وہیں کھڑی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی، عمر کا یہ رویہ اس کے لیے حقیقتاً تکلیف دہ تھا۔



سکندر علوی کا فون آیا تھا، اس کی بیوی بے حد بیمار تھی۔ دو سال کی چھوٹی سی معصوم بچی کو سنبھالنا ٹھ

ٹائم جاب کے ساتھ ممکن نہیں تھا تبھی اس نے پاکستان کال کر کے رورو کر کرنل صاحب سے معافی مانگنے کے بعد

انہیں اپنے پاس آنے پر راضی کر لیا تھا۔

حویلی میں شادی ختم ہو گئی تھی۔ کرنل صاحب مریرہ کے ساتھ گاؤں سے واپسی کے بعد سیدھے انگلیڈ

سدھار گئے۔ اگلوتے بیٹے کی اولاد کو دیکھنے کی خواہش نے انہیں بریرہ کی ناگہانی موت کا دکھ بھلا دیا تھا۔ صمید

انتہائی صروفیت کے باوجود انہیں ایئر پورٹ تک ڈراپ کرنے آیا تھا۔ کرنل صاحب کی انگلیڈ رواجی کے کچھ ہی

دن بعد اسے وہ گھر بھی چھوڑا یا جو کرنل صاحب کی ملکیت تھی۔

مریرہ اس کے لیے راضی نہیں تھی مگر اس نے اپنی محبت سے مریرہ کو راضی کر لیا تھا۔ اس کا آفس جس

علاقے میں تھا وہاں سے کرنل صاحب کے گھر کا راستہ بہت دور پڑتا تھا۔ اب تک صرف کرنل صاحب کی وجہ

سے وہ مجبوراً وہاں رہا تھا۔ اب جبکہ کرنل صاحب اپنے بیٹے کے پاس چلے گئے تھے اور ان کا ارادہ بھی وہاں

طویل قیام کا تھا لہذا اس نے پہلی فرصت میں یہ مسئلہ حل کیا تھا۔

مریرہ کرنل صاحب کی واپسی تک گھر تبدیل کرنے کے حق میں نہیں تھی تاہم صمید کے اصرار پر اس کی

مجبوری کو دیکھتے ہوئے وہ ایک کڑی شرط پر مان گئی تھی۔ اس کی شادی کو ایک سال ہونے کو آیا تھا مگر ابھی تک اس کی گود خالی تھی۔

صمید تاحال بچوں کے حق میں نہیں تھا مگر مریرہ سے کرنل صاحب کا گھر چھڑوانے کے لیے اسے مجبوراً اس کی شرط ماننے کی حامی بھرنی پڑی تھی۔ اس روز وہ آفس سے گھر آیا تو مریرہ رات کا کھانا ٹیبل پر لگائے اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”السلام علیکم؟“ آج پھر لیٹ ہو گئے آپ؟“

”ہوں، ولیکم السلام! نیا نیا بزنس کیا ہے وقت تو دینا پڑے گا۔“ وہ فریش ہو کر آ گیا تھا۔ مریرہ نے مکمل توجہ اس پر مرکوز کر دی۔

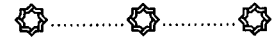
”تمہیں نہیں لگتا صمید کہ تم نے آج کل کاروبار کو کچھ زیادہ ہی ہوا بنا لیا ہے۔ ادھر گاؤں میں سب تمہاری پوچھ رہے تھے۔ تمہیں پتا ہے میں کتنی شرمندہ ہوئی سب کے سامنے ایک تمہارے نہ آنے سے۔“

”کیوں شرمندہ ہونے کی کیا بات تھی اس میں، تم وہاں موجود تو تھیں۔“

”میری اور بات تھی۔“

”اٹس او کے یار! سکون سے کھانا کھانے دو پلیز، سر میں پہلے ہی بہت درد ہے الٹا تم گھر آتے ہی کلاس لگا کر بیٹھ جاتی ہو۔“ وہ تھکا ہوا تھا یا بیزار..... مریرہ اندازہ نہیں لگا سکی تاہم صمید کی بے حسی اور بے پروائی نے اسے ہرٹ ضرور کیا تھا تبھی وہ بنا کھانا کھانے فوری وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

صمید نے اسے روکنا چاہا تھا مگر وہ نہیں رکی تو وہ خود بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جانے کیوں اس لمحے اس کا اپنا دل بے حد بوجھل ہو رہا تھا۔



مریرہ اس سے ناراض ہو کر سو چکی تھی۔ وہ رات دیر تک ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا خالی خالی دماغ کے ساتھ ٹی وی دیکھتا اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ کاش وہ اسے بتا سکتا کہ اس رات اپنی تمام تر مصروفیات پس پشت ڈال کر وہ حویلی آیا تھا۔

مہندی کی تقریب اپنے عروج پر تھی۔ سردی کی وجہ سے اس نے مفلر اپنی گردن کے گرد پلیٹ رکھا تھا۔ تانگے سے اتر کر جس وقت وہ حویلی کے احاطے کے قریب پہنچا اس کی سماعتوں میں پڑنے والے الفاظ نے بے ساختہ اسے ٹھنک کر رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مریرہ..... مریرہ..... دنیا صرف ایک مریرہ پر ختم نہیں ہے بھاء! شادو اچھی لڑکی ہے، پڑھی لکھی سمجھدار ہے۔ سب سے بڑی بات وہ تم سے پیار کرتی ہے۔ آج بھی صرف تمہیں دیکھنے کے لیے وہ یہاں اس حویلی میں آئی ہے۔ ماں جی کا بڑا دل ہے اس کے ساتھ۔ میں ہاتھ جوڑتا ہوں تیرے آگے نہ ستا اسے نکل آ مریرہ رحمان کے طلسم سے، سمجھ لے کہ وہ تیری قسمت میں ہی نہیں تھی کیونکہ اگر وہ تیری قسمت میں ہوتی تو کرنل انکل اس کی شادی صمید حسن کے ساتھ کبھی نہ کرتے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا قمر! محبت صرف پالینے کا نام نہیں ہے، آج نہیں تو کل وہ ضرور میری ہو جائے گی کیونکہ میں جانتا ہوں صمید اور اس کی شادی زیادہ دن تک نہیں چل سکتی۔“

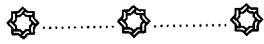
”پاگل پن ہے یہ تیرا! عمر اور کچھ نہیں۔“

”پاگل پن ہے تو پاگل پن ہی سہی، میری زندگی میں میرے جیتے جی مریرہ کے سوا دوسری کوئی لڑکی کبھی نہیں آ سکتی چاہے وہ شادو ہو یا کوئی اور بہر حال تو میری فکر چھوڑ اور اپنی تقریب نپٹا۔ وہاں مردانے میں سب تجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔“ عمر عباس نے کہا تھا اور پھر دونوں باتیں کرتے مردانے کی طرف بڑھ گئے۔ صمید اندھیرے میں کھڑا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کا دل ایک دم سے خالی ہو گیا ہو۔

عمر عباس کا گزشتہ رویہ اور اکھڑا اکھڑا سا انداز وہ بھولا نہیں تھا۔ تو کیا اس کے اور مریرہ کے بیچ کچھ ایسا تھا جو اس سے چھپا ہوا تھا؟ بھلا عمر عباس اور مریرہ رحمان کی کیا کہانی ہو سکتی تھی؟ ان دونوں کے درمیان ایسا کیا تھا جو مریرہ اس سے چھپا رہی تھی۔

دماغ ایک دم جیسے آندھیوں کی زد میں آیا تھا۔ اس وقت بنا کچھ بھی سوچے سمجھے وہ آگے حویلی میں جانے کی بجائے واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا کہ اس وقت وہ مریرہ رحمان یا حویلی کے کسی بھی فرد کا سامنا کرتا، تاہم اس نے حویلی کے نمبر پر کال کر کے شادی کی تقریب میں آنے سے معذرت کر لی تھی۔

مریرہ رحمان اور صمید حسن کی محبت بھری زندگی میں پہلا گرنے والا بدگمانی کا پتھر یہی تھا مگر مریرہ کو اس پتھر کی کبھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔



تمہیں کس طرح بھولوں

بتاؤ کوئی نسخہ ہے؟

مجھے تم یہ تو بتلاؤ کہ کیا تم کوئی منظر ہو؟

کہ جس کو دیکھ کر میں اگلے پل میں بھول جاؤں گا

یا تم کوئی کہانی ہو؟

جسے پڑھ کر میں کچھ ہی دیر میں سب بھول جاؤں گا

یا تم کوئی کھلونا ہو؟

کہ جس کے ٹوٹ جانے پر میں اس کو پھینک ڈالوں گا

یا تم کوئی تماشہ ہو؟

جسے کچھ دیر رک کر، دیکھ کر میں اپنی راہ لوں گا

بتاؤ اب کے چپ کیوں ہو؟

کوئی نسخہ تو ہوگا ناں؟ کوئی تعویذ بھی ہوگا

کوئی ترکیب تو ہوگی؟ کوئی تجویز ہی دے دو

ارے اب کچھ تو بتلاؤ اگر تم نے کہا ہے کہ
مجھے اب بھول جاؤ تم.....

میری جاں بھول جاؤں گا
مگر کیسے یہ بتلاؤ

میرے محبوب بس کر دو ہنسی آتی ہے اب مجھ کو
تمہاری ایسی سوچوں پر یہ ان بچگانہ باتوں پر
سنوایا نہیں ہوتا

تعلق ٹوٹ جانے پر کوئی بھولا نہیں کرتا
تمہیں جانا ہے تو جاؤ، میں رستے میں پڑا ہوں کیا؟
تمہیں اک لفظ بولا ہو؟ کوئی شکوہ کیا میں نے؟

کوئی آنسو بہایا ہو؟ کوئی دکھڑا سنا یا ہو؟
تمہیں رکنے کا بولا ہو؟ کوئی تفصیل مانگی ہو؟
اگر ایسا نہیں کچھ بھی تو پھر تم کیوں بے سند ہو کہ

تمہیں میں بھول ہی جاؤں
تمہیں جانا ہے نا؟ جاؤ.....

تمہاری یاد ہو، کچھ بھی ہو، تم آزاد ہو، جاؤ
تمہیں اس سے نہیں مطلب
غلط فہمی تھی یا الفت

یہ میرا درد سر ہے، درد دل ہے جو بھی، جاؤ
تمہارا کام تھا تم نے محبت کی بہت اچھے

یہ میرا کام ہے میں یاد رکھوں یا بھلاؤں
عجب باتیں ہیں دنیا کی، عجب رسمیں ہیں الفت کی
محبت کرتے تو لیتے ہیں نبھانا بھول جاتے ہیں

کسی دن چھوڑ جائیں گے بتانا بھول جاتے ہیں
مجھے اب کچھ نہیں سننا، مجھے کچھ بھی نہ بتلاؤ

مجھے تم مشورے مت دو کہ میں نے کیسے جینا ہے
اگر تم بھولنے کا ٹر مجھے بتلا نہیں سکتے تو پھر کچھ بھی نہ بتلاؤ

چلے جاؤ.....

چلے جاؤ.....

کبھی نہ لوٹ کر آنے کو تم جاؤ، چلے جاؤ.....

درکمنوں گھر پر نہیں تھی۔ شہر بانو اور اس کی بیٹی شہزاد بھی حویلی کے وزٹ کے لیے نکلی ہوئی تھیں۔
مریہ نے آتش دان میں سوکھی لکڑیاں ڈال کر قریب ہی بیٹھتے ہوئے پرانی ڈائری اٹھالی۔

صمد حسن کے ہاتھوں سے لکھی طویل نظم نے اس کا دل بہت شدید سے دھکایا تھا۔ مندل ہوئے
لفظوں میں آج بھی اس کے لس کی خوشبو تھی۔

کیسا تعلق تھا یہ دو دلوں کا کہ برسوں گزرنے کے باوجود بھی وہ اسے بھلانے میں ناکام رہی تھی۔ ہزار
رنجشوں اور عداوتوں کے باوجود وہ شخص آج بھی دل کے سنگھاسن پر پورے طمطراق سے براجمان تھا۔ اس نے
ڈائری بند کر کے سینے سے لگائی اور آہستہ سے پلکیں موند لیں۔ گزرے ہوئے لمحوں کے زرد پتے، دھیان کی
اجڑی ہوئی حویلی میں پھر سے بے مول ہونے کو ترپنے لگے تھے۔



نیا گھر بے حد خوبصورت اور کشادہ تھا مگر اس کے باوجود مریہ بہت دنوں تک وہاں ایڈجسٹ نہیں ہو
سکی تھی۔

صمد نے شروع کے دنوں میں اسے خاصا وقت دیا تھا پھر آہستہ آہستہ اس کی مصروفیات بڑھتی گئیں
تو مریہ نے قرب و جوار کی خواتین سے دوستی گانٹھ لی۔

حنہ بھی انہیں خواتین میں سے ایک تھی۔ مریہ نے اس کے ساتھ اسکول میں پڑھایا تھا۔ مریہ کے
گھر کے سامنے والا بنگلہ حنہ کے بھائیوں کا تھا۔ وہ تین بھائیوں کی اکلوتی، بے حد خوبصورت اور ذہین لڑکی تھی۔
کالج میں لیکچرر کی حیثیت سے سرکاری جاب کرتی تھی۔ چند سال قبل محبت کی شادی میں ناکامی کا ترغہ ماتھے پر سجا
کر پیا کے گھر سے واپس بھائیوں کی دہلیز پر آ بیٹھی۔

مریہ کو اس کی ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا تھا۔

اس روز موسم قدرے ابر آلود تھا۔ وہ ابھی گھر کی صفائی سے فارغ ہوئی تھی کہ حنہ چلی آئی۔
”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! آج کالج نہیں گئیں؟“ اس نے کچن سے ہی حنہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا، جواب
لاؤنج میں دھرے صوفے پر تنک چکی تھی۔

”نہیں، آج طبیعت ٹھیک نہیں تھی، چھٹی مار لی۔“

”ہوں، چائے پیو گی؟“

”بالکل، دراصل تمہارے ہاتھوں کی مزیداری چائے پینے کے لیے ہی تو میں یہاں آئی ہوں۔“

”ہم..... بٹرنگ؟“

”نہیں یا رچ کہہ رہی ہوں۔“

”او کے مان لیا، بچے کیسے ہیں تمہارے؟“

”ٹھیک ہیں، اپنے باپ کی طرف گئے ہوئے ہیں کل سے۔“

”ہوں، اسی لیے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، ہے ناں؟“ مریرہ چائے کی ٹرے اٹھائے قریب آ بیٹھی تھی۔ حمزہ نے نظریں چرا لیں۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے، وہ ان کا باپ ہے میں اسے اس کے بچوں سے ملنے سے روک نہیں سکتی مگر مجھے اس شخص کا اپنے بچوں کو ورغلانا پسند نہیں ہے۔ وہ صرف میری مخالفت اور ضد میں انہیں اس گھر میں لے کر جاتا ہے جہاں کبھی ان کی ماں کو بے حد ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔ وہاں اس شخص کی دوسری بیوی میرے بچوں کو ایک منٹ بھی اس گھر میں برداشت نہیں کرتی۔“

”ہوں، کیا تم اپنے بچوں کو اس شخص کے ساتھ جانے سے منع کر سکتی ہو؟“

”نہیں، میں ان کے معصوم ذہنوں پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”پھر؟“

”پھر کچھ نہیں، زندگی شاید اسی کا نام ہے۔“

”تم دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“

”نہیں، میں دوسری شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ ایک بار جس ذلت و اذیت کا تمغہ

گلے میں ڈال چکی ہوں دوبارہ وہی ذلت و اذیت برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔“

”ضروری نہیں ہے کہ زندگی ہر بار ایک ہی روپ میں سامنے آئے۔ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے حمزہ! شاید کہیں کوئی اچھا مرد تمہارا منتظر ہو۔“

”نہیں، دنیا بھلے اچھے لوگوں سے خالی نہ ہوئی ہو مگر مرد کے روپ میں کسی انسان سے اچھائی کی امید رکھنا زری حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے یار! میرے بابا اور تایا جی بہت اچھے مرد اور ہمسفر ثابت ہوئے ہیں۔ خود میرے شوہر ایک آئیڈیل مرد ہیں۔“

”بس کرو یار! میں پرانے زمانے کی بات نہیں کرتی۔ اس دور میں یقیناً مردوں میں تھوڑی بہت انسانیت اور شرم و حیا کے جراثیم پائے جاتے ہوں گے مگر موجودہ دور میں کسی مرد کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا طفل تسلی کے سوا اور کچھ نہیں۔“

”تم غلط سوچ رہی ہو حمزہ! میرے شوہر واقعی ایک مثالی شوہر ہیں۔“

”مگر مجھے یقین نہیں ہے۔ ہماری بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں کہ مرد عورت کے تنکے تلے چھپے ایک سانپ کی مانند ہے، جسے زندگی میں جب بھی موقع ملے گا وہ عورت کو ڈسنے سے باز نہیں آئے گا۔ کبھی تمہاری طرح میں بھی اپنے شوہر پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتی تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی اس نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ میں اس کی زندگی میں کبھی شک نہ کروں ورنہ اسے بہت دکھ ہوگا۔ اسی لیے میں اس پر اعتبار کرتی رہی۔ اس کی بے تحاشا محبت کے خمار میں ڈوبی، خود اپنی ذات کو زہریلے برزخ میں دھنساتی رہی۔ ان دنوں مجھے لگتا تھا

اس کی محبت کے سوا دنیا کی ہر چیز بیکار اور بے معنی ہے۔ مگر..... خمار کے بادل چھٹے تو میں نے جانا کہ دنیا کی سب سے بیکار اور بے معنی چیز خود میری اپنی ذات تھی۔“ حمزہ کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ ٹوٹ کر گرا تھا۔ مریرہ نے اپنے ہاتھ اس کی گود میں دھرے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔

”ایسا کیوں ہوا حمزہ! کیا اسے تم سے کوئی شکایت تھی؟“

”نہیں۔“ بائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے حمزہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”اسے مجھ سے محبت تھی، بے تحاشا محبت۔ میں کہتی دن ہے وہ کہتا دن ہے، میں کہتی رات ہے وہ ایمان لے آتا کہ رات ہے۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا دل مجھ سے بھر بھی سکتا ہے۔ اس کے دل، اس کے گھر اور اس کی زندگی میں، میری جگہ کوئی دوسری عورت بھی لے سکتی ہے۔ وہ پیار جو صرف میرے لیے تھا وہ بستر جہاں اس کے ساتھ صرف میں سوتی تھی وہ دل جو صرف میرا مسکن تھا، بالکل اچانک کتنی آسانی سے کسی اور نے مجھ سے چھین لیا۔ وہ جسے میرے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا تھا، شادی کے صرف پانچ سال بعد اسے میرا وجود ہی نظر آنا بند ہو گیا۔“

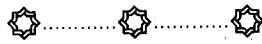
”کون تھی وہ دوسری عورت؟“

”آفس کو لیگ تھی اس کی۔ بھائی بھائی کہتی تھی۔ گھر بھی آ جاتی تھی اکثر۔ ڈیوری کے دنوں میں بھاگ بھاگ کر کام کرتی تھی۔ میں اس کے ارادے سمجھ ہی نہ سکی اور میرا شوہر دو بچوں کا باپ ہونے کے باوجود محبوب بیوی کی موجودگی کے باوجود، ایک روز اس عورت سے نکاح کر کے اسے گھر لے آیا۔ پاؤں تلے سے زمین نکلنا کسے کہتے ہیں، اس روز میں نے جانا تھا۔“

”صمید ایسے نہیں ہیں حمزہ!“ مریرہ نے اس سے زیادہ شاید خود کو تسلی دی تھی۔ حمزہ کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”خدا تمہارا یقین سلامت رکھے مریرہ! مگر مرد کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اب چلتی ہوں، بہت ٹائم ہو گیا ہے۔“ وہ شکستہ سی کھڑی ہوئی تھی۔

مریرہ نے وہیں بیٹھے بیٹھے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس میں اس وقت اٹھ کر دروازے تک جانے کی ہمت نہیں تھی۔



سردی اپنے جو بن پر تھی جب اس نے ہسپتال کے سرد کمرے میں زاویار صمید حسن کو جنم دیا تھا۔ پوری رات درد سے پڑنے کے بعد اس نے بمشکل ساتھ والی ہمسائی کو آواز دے کر بلایا تھا اور پھر وہی اسے ہسپتال لائی تھی۔

صمید حسن اس رات اطلاع دے کر گھر نہیں آیا تھا۔ مریرہ صمید کے لیے وہ رات اپنی تمام تر خوفناکی و اذیت کے ساتھ یادگار بن گئی تھی۔ جب سے وہ امید سے ہوئی تھی اس کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے تھے۔ جس روز سے ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کا بتایا تھا وہ ہواؤں میں اڑنے لگی تھی مگر صمید چپ چاپ سارہنے لگا تھا۔

اسے مریرہ رحمان کے امید سے ہونے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ سمندر پار بیٹھے کرنل شیر علی کے خوش ہونے اور سمجھانے کے باوجود بھی اس نے مریرہ کی خوشی میں خوش ہونے کی زحمت نہیں کی تھی مگر مریرہ کو پروا نہیں تھی۔

وہ جانتی تھی جب وہ خوبصورت صحت مند بچے کو جنم دے گی تو صمید کے سارے خدشا خود بخود دم توڑ جائیں گے۔

اپنی اولاد کو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر سب سے زیادہ خوش وہی شخص ہوگا تبھی وہ مصرف ہوگئی تھی۔ کبھی بازار سے بچے کی ضرورت کی تمام چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے میں ہلکان تو کبھی اپنے ہاتھوں سے اپنے بچے کے لیے سوٹر بننے اور چھوٹے چھوٹے کپڑے سینے میں بے حال۔

حمنہ حسن اپنے بچے کے لیے اس کی دیوانگی دیکھ کر اس کا خوب ریکارڈ لگاتی تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ اسے تو بس ہمہ وقت مصرف رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کھلونا چاہیے تھا۔

اس روز بہت دنوں کے بعد ہلکی لکی سی دھوپ نکلی تھی۔ سنڈے کے باعث حمنہ کو کالج سے چھٹی تھی تبھی وہ اس کی طرف چلی آئی تھی۔

مریرہ ابھی ناشتے سے فارغ ہوئی تھی لہذا دونوں لاؤنج میں آ بیٹھیں۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد حمنہ نے اس سے کہا تھا۔

”میں کل لاہور جا رہی ہوں مریرہ! تین روز تک واپس آ جاؤں گی، پلیز تم اپنا خصوصی خیال رکھنا اور ہاں ذرا اپنے شوہر پر بھی نظر رکھنا اس کی سرگرمیاں ٹھیک نہیں ہیں آج کل۔“

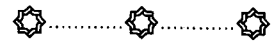
”کیا مطلب؟“ مریرہ کا دل بہت شدت سے دھڑکا تھا۔ حمنہ نے ذرا سا چہرے پھیر لیا۔

”کل کالج سے واپسی پر میں نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا شاید وہ دونوں ہسپتال جا رہے تھے۔ میری وین اسپید میں تھی میں زیادہ نہیں دیکھ سکی مگر اتنا ضرور دیکھا تھا کہ صمید کے ساتھ کوئی لڑکی تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ گاڑی سے نکل کر ہسپتال کی طرف بڑھ رہے تھے۔“ جیسے سر پر کوئی بھاری ہتھوڑا لگتا ہے مریرہ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

حمنہ اس کی رازدار مخلص سہیلی تھی۔ وہ اسے بدگمان کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا کبھی نہیں لے سکتی تھی۔ مریرہ کو لگا صمید حسن کی ذات پر اس کے اندھے اعتبار کے آئینے پر ہلکی سی ضرب لگ گئی ہو پھر بھی اس نے اپنا بھرم رکھنے کے لیے کہا تھا۔

”ہو سکتا ہے اس کی کوئی آفس کو لیگ ہو؟“

”نہیں، وہ آفس کی لڑکی نہیں تھی گھر یلو حلیے میں تھی۔ شاید دونوں آپس میں کوئی بات بھی کر رہے تھے۔“ حمنہ نے اس کے ٹوٹے پھوٹے یقین کو جھٹلایا تھا۔ مریرہ کے اندر جیسے دور تک سناٹا پھیل گیا۔



اس رات صمید حسن خاصا لیٹ گھر واپس آیا تھا۔ مریرہ نے دیکھا وہ قدرے تھکا ہوا اور خاموش تھا۔

ہر روز کی طرح اس نے گھر میں داخل ہوتے وقت نہ اسے آواز دی تھی نہ اس کی پیشانی چومی تھی۔ وہ اندر سے نیلی لکڑی کی مانند سلگتی رہی۔ صمید ہاتھ لے رہا تھا جب اس کے موبائل نمبر پر میسج ٹون بجی۔

مریرہ نے پہلی بار اس کا سیل اٹھا کر چیک کیا تو پہلا ہی پیغام اس کا لہو نچوڑنے کو کافی تھا۔ کسی نے بہت محبت سے لکھا تھا۔

”میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آج آپ نے میرا اتنا ساتھ دیا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے میرے دل میں آپ کا مقام کتنا بلند ہو گیا ہے۔ آج پہلی بار مجھے اپنی کوکھ میں پل رہے بچے سے بے حد محبت محسوس ہو رہی ہے۔ شکریہ بے حد شکریہ۔“ زندہ دیوار میں جن جانا کیا ہوتا ہے اس لمحے کوئی مریرہ صمید سے پوچھتا صرف چند لمحوں میں اس کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہوگئی تھیں۔

اسے لگا شاید وہ زندگی میں اب کبھی اپنے وجود و حرکت نہیں دے سکے گی۔ سیل فون واپس اسی جگہ پر اس نے کیسے رکھا کچھ خبر نہیں تھی۔ دماغ میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔

نئے بزنس کی آڑ میں صمید حسن اس کے اعتبار کے ساتھ یہ کیسا کھیل کھیل رہا تھا؟ یہ لڑکی کون تھی اور اس کا صمید حسن کے ساتھ کیا تعلق تھا؟

اگر دونوں کے درمیان کوئی غلط رشتہ قائم نہیں تھا تو اب تک صمید حسن نے اس لڑکی اور اس کے کردار کے بارے میں اسے کچھ بتایا کیوں نہیں تھا؟ وہ اس سے کیا چھپا رہا تھا اور کیوں؟ صمید ہاتھ لے کر آیا تو قدرے فریشت تھا۔ مریرہ گم سم سی وہیں بیٹھی رہی۔

”کیا بات ہے آج بڑی چپ چپ بیٹھی ہو؟“ اس نے یوں پوچھا تھا گویا کوئی بات ہی نہ ہو۔ مریرہ کے دل پر بڑی کاری ضرب لگی تھی۔

”کچھ نہیں، کھانا لاؤں آپ کے لیے؟“

”نہیں بھوک نہیں ہے۔ آفس میں کھا لیا تھا۔“

”اوکے۔“ اس نے زیادہ اصرار نہیں کیا۔ صمید بستر میں گھس گیا۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں تمہاری؟“

”ہوں۔“

”پھر مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے تمہیں کوئی تکلیف ہے؟“

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ رُخ پھیر کر اس نے اپنے آنسو پیے تھے۔ صمید نے ٹی وی آن کر لیا۔

”بڑے ابو سے بات ہوئی؟“

”نہیں یار! آج سارا دن کام میں اتنا مصرف رہا کہ چاہتے ہوئے بھی وقت نہیں نکال سکا۔ ویسے

کل بات ہوئی تھی، وہ بالکل ٹھیک ہیں۔“

”آپ کہاں مصرف رہے سارا دن؟“

”سناٹ پر تھا۔ ایک غیر ملکی کلائنٹ کے ساتھ اہم میٹنگ بھی تھی بس اسی کام میں سارا دن گزر گیا۔“

تمہیں فون بھی نہ کر سکا۔“

”اٹس او کے۔“ صمید کی وضاحت پر اسے لگا اس کے اندر جلتے اعتبار کے سارے دیپ بجھ گئے ہوں اور اب صرف اندھیرا ہی اندھیرا، گھپ اندھیرا.....

وہ اٹھی تھی اور اپنے بیدروم سے باہر نکل آئی تھی۔ جانے کیوں اس وقت اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

کچن میں آ کر اپنے لیے کافی بناتے ہوئے وہ دل کھول کر روئی تھی۔ اس رات پہلی بار اس نے بریرہ کو بے حد مس کیا تھا۔ اپنی ماں کی کمی شدت سے محسوس کی تھی۔ کرنل صاحب کے مشفق ہاتھوں کا لمس شدت سے مس کیا تھا۔ پہلی بار صمید اٹھ کر اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ پہلی بار وہ پوری رات کچن میں بیٹھی اکیلی بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

اگلے روز اس کی آنکھیں قدرے سوجھی ہوئی تھیں۔ صمید بستر میں ہی تھا جب وہ ناشتا تیار کر کے اسے جگانے چلی آئی۔

”صمید اٹھ جاؤں، میں نے ناشتا تیار کر دیا ہے۔“

”تھوڑی دیر میں اٹھتا ہوں، تم ناشتا کر لو۔“ کبل کے اندر منہ چھپائے ہی اس نے جواب دیا تھا۔ مریرہ چپ چاپ واپس پلٹ گئی۔

دروازے کے قریب صمید کا سیل چار پر لگا تھا۔ مریرہ نے سیل اٹھا کر دیکھا وہاں رات والا میچ نہیں تھا جس نے اس کے اندر کی پرسکون دنیا تباہ کی تھی۔ دل پر ایک اور گھونسا لگا۔

صمید حسن اگر غلط نہیں تھا تو اس وہ میچ ڈیلیٹ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر اس نے وہ میچ ڈیلیٹ کیا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ اس سے کچھ چھپا رہا تھا۔ اگر چھپا رہا تھا تو یہ کھیل کب سے جاری تھا؟ حمنہ نے کہا تھا مرد کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر اس نے اعتبار کیا تھا تو کیا اس سے غلطی ہوئی تھی؟ سوچیں تھیں کہ زہریلے ناگ کی طرح دماغ کو ڈس رہی تھیں۔

صمید تقریباً پون گھنٹے کے بعد ناشتے کی میز پر آیا تھا۔ مریرہ نے جان بوجھ کر خود کو گھر کے کاموں میں الجھائے رکھا۔ وہ اس پر اپنا درد یا کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی، تبھی چپ تھی۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صمید نے اس کی چپ کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ پہلی بار وہ اس کے بغیر رات کا کھانا گھر سے باہر کھا کر آ رہا تھا اور اسے اس پر کوئی شرمندگی نہیں تھی۔

پہلی بار وہ اس کے بغیر اکیلا بستر پر سکون سے سوتا رہا تھا۔ پہلی بار اسے اس کے بھوکا رہنے یا کھانا کھانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔

کیوں؟

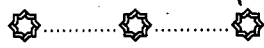
کیا اس کی محبت اتنی ہی کمزور تھی کہ کوئی آتا، صمید کو پاگل بناتا اور اس کے دل سے مریرہ رحمان کے عکس کو اکھاڑ کر پھینک ڈالتا۔

کیا واقعی صمید حسن بھی دنیا کے دوسرے روایتی مردوں کی لسٹ میں شامل ہونے جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ روئے اور صمید حسن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس سے التجا کرے کہ پلیز میرے ساتھ بے وفائی مت کرو۔

مگر کیا یہ لازم تھا کہ وہ اپنی بے وفائی کا اعتراف کرے؟ کیا یہ لازم تھا کہ اس کی التجا کے بعد وہ اس کے آنسوؤں کی لاج رکھتے ہوئے اپنی سرگرمیاں ترک کر دیتا۔ دنیا میں کسی بھی شخص کو اس کی خود ساختہ بے وفائی سے روکنا مشکل ترین کام ہے۔

دانستہ دور جانے والوں پر آنسوؤں کا اثر ہوتا ہے نہ التجاؤں کا، وہ اپنا مان نہیں کھونا چاہتی تھی۔ صمید حسن کی غیر متوقع بے وفائی کے بعد ایک مان ہی تو بچا تھا اس کے پاس، یہ بھی کھودیتی تو پیچھے کیا رہ جانا تھا؟ صمید اس کی سوجھی ہوئی آنکھوں کا نوٹس لیے بغیر ناشتہ کر کے آفس چلا گیا تھا۔ پیچھے وہ خالی دل، دماغ اور خالی معدے کے ساتھ بیٹھی چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کبھی اس کے ساتھ ایسا کھیل بھی کھیل سکتی ہے۔

بے شک اس وقت صمید حسن کے بدلے ہوئے رویے کی تکلیف اس کے لیے دنیا کی ہر تکلیف سے بڑھ کر تھی۔



جوبلی میں شادی اختتام پذیر ہو گئی تھی۔ عمر نے مریرہ کے وہاں سے آنے کے بعد تاحال اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ خضر بھائی اور نظر بھائی کے ساتھ ساتھ ان کی بیگمات بھی اس سے ناراض تھیں۔ بچپن کی منگ کو چھوڑ دینا کوئی معمولی جرم نہیں تھا۔

وہ حویلی چھوڑ کر اپنا زیادہ وقت ڈیرے پر ہی گزارنے لگا۔ دل کے زخموں کو ہوا لگانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ قمر کی بیوی حویلی کے سکون کے لیے کچھ خاص اچھا شگون ثابت نہیں ہوئی تھی۔ اپنے گرم اور غصیلے مزاج کے سبب اس نے آتے ہی حویلی کے مہینوں کو دن میں تارے دکھانا شروع کر دیئے تھے۔ اظہار صاحب چونکہ شروع سے ہی اپنی بڑی بہن زبیدہ سے دہتے تھے لہذا وہ خاموش رہتے۔ زلیخا بی بی خضر اور نظر کی بیویوں کو صبر کی تلقین کرتیں۔

دوسری طرف وقار صاحب کا بگڑا ہوا سپوت ریاض بھی کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ اپنے اندر کی آگ پر پانی ڈالنے کے لیے اس نے شادی کی پہلی رات ہی معمولی سی بات کا بنگلڑ بنا کر شکفتہ کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ شادی کی پہلی ہی رات اس نے شکفتہ سے کہہ دیا تھا کہ اسے اس کے وجود میں کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے یہ شادی صرف اس کے بھائی قمر سے انتقام لینے کے لیے کی ہے، کیونکہ قمر نے اس سے اس کی بچپن کی محبت نورین کو چھینا ہے۔

وہ عزت دار شریف ماں باپ کی بیٹی تھی اس نے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی پی لیا۔ اظہار صاحب نے بھائی کے گھر بیٹی دے کر اور بہن کے گھر سے بیٹی لے کر اپنے خونی رشتوں کو مضبوط کرنا چاہا۔

تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ آنے والے وقت میں ان کی یہی خواہش ان کے گلے کا پھندا بن جائے گی۔
قمر اپنی بیوی نورین کے روز کے تماشوں سے زچ ہو چکا تھا مگر باپ کی عزت کے لیے خاموش تھا۔
وہ اگر ڈیرے سے لیٹ ہو جاتا یا حویلی آتے ہی اس سے ملنے کی بجائے بے جی کے پاس بیٹھ جاتا، اس کا
موڈ بگڑ جاتا پھر سوسو جتن کر کے اسے منانا پڑتا، رفتہ رفتہ اپنی انہی حرکتوں کے سبب وہ اس کے دل سے اترتی جا
رہی تھی۔

ہمہ وقت شوخیوں اور شرارتوں میں گھرا رہنے والا قمر عباس اب زیادہ تر خاموش رہنے لگا تھا۔ ان کی
شادی کو تین ماہ ہونے کو آئے تھے جب نورین کی طبیعت خراب رہنے لگی۔ ڈاکٹر کو چیک اپ کروانے پر پتا چلا
کہ اس کی اورری کے اندر رسولی تھی جو گزرتے ہر دن کے ساتھ تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔
ڈاکٹر کا مشورہ تھا کہ جتنی جلدی اس کا آپریٹ کروالیا جاتا اتنا ہی بہتر تھا۔ قمر نے اپنے دلی جذبات
پر پاؤں رکھ کر صرف اس کی زندگی بچانے کے لیے وہ آپریٹ کروالیا تھا۔

زبیدہ پھوپھو کی بیٹی کی زندگی بچ گئی تھی۔ وہ خوش تھیں مگر قمر مزید بچھ کر رہ گیا تھا۔ نورین کی ذات میں
اس کی رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو چکی تھی مگر اس کے باوجود اس کے خروں اور طنطنے میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔
حویلی کے تمام کیمینوں پر اس کی اب بھی ویسے ہی حکمرانی قائم تھی۔ دوسری طرف شگفتہ امید سے تھی۔
دن بھر کولہو کے نیل کی طرح کامیں جتے رہنے کے باعث وہ اپنی صحت کا خیال نہیں رکھ پا رہی تھی اور پرانی حویلی
آ کر رہنے کی اجازت اسے نہ سر دیتا تھا، نہ شوہر۔ نتیجتاً دنوں ہی دنوں میں اس کے گلاب جیسے چہرے کی
ہڈیاں نکل آئی تھیں۔

اظہار صاحب اور زینبا بی بی کا دل بیٹی کا حال دیکھ کر کٹتا تھا مگر وہ خاموش تھے کہ بڑے بھائی کے
ساتھ جھگڑا کرنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ پھر زبیدہ بی بی بھی اب بڑے بھائی وقار ملک کے ساتھ مل گئی
تھیں۔ اظہار صاحب کی حویلی میں بیٹی کے مکمل عیش و آرام کے باوجود خوش نہیں تھیں۔ کسی نہ کسی بات کا بہانہ بنا
کر کوئی نہ کوئی طوفان اٹھائے ہی رکھتیں۔

شگفتہ کا پاؤں بھاری ہوئے پانچواں ماہ تھا جب ایک رات اس کے شوہر ریاض نے شراب کے نشے
میں دھت اس سے جھگڑا کر لیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے بھائی قمر نے جان بوجھ کر اچی بیوی نورین کو ایسا
آپریٹ کروایا ہے کہ وہ زندگی میں کبھی ماں نہ بن سکے۔

اگر اس کی مجبورہ ماں بن کر سرخرو نہیں ہو سکتی تھی تو پھر قمر عباس کی بہن کو بھی ماں بننے کا کوئی حق نہیں
تھا۔ شگفتہ نے اس الزام کے جواب میں اپنی طرف سے اپنے بھائی کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ
اس کی کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس رات چودہویں کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان پر جگمگا رہا
تھا اور نیچے زمین پر ملک وقار عباس کے بگڑے ہوئے آوارہ سپوت نے بنا کسی انجام کی پروا کیے اپنی لگی بچا زاد
کزن اور بیوی شگفتہ اظہار ملک کو میز ہیوں سے دھکیل کر اس کو ٹھوکر دوں کی زد پر رکھ لیا تھا۔

نئی حویلی کے در و دیوار میں اس کی چیخیں گونجیں تو بڑے بھائیوں کی بیگمات بھاگ کر آئیں۔ ریاض

نشے میں تھا۔ اسے بھائی پکڑ کر کمرے میں لے گئے۔ وقار ملک اور ان کی بیوی نے شگفتہ عباس کو الزامات کے
کنہرے میں کھڑا کر دیا۔ اسے جاہل، ان پڑھ، گنوار، جانے کن کن القابات سے نواز کر کلیجہ ٹھنڈا کیا گیا۔
شگفتہ رات سے صبح فجر تک درد سے تڑپتی، حویلی کی عورتوں کے دیسی ٹوکوں کا شکار بنتی رہی۔ دن
چڑھا، روشنی پھیلی تو اس کی حالت بھی مزید بگڑ گئی۔ تبھی وقار ملک صاحب نے اسے شہر کے ہسپتال میں داخل
کروانے کی اجازت دی تھی۔

قمر عباس کو جیسے ہی معاملے کی خبر ہوئی وہ فوراً شہر روانہ ہو گیا۔ شگفتہ عباس کا خون فوری آپریشن کے
باوجود پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ عمر اور اس کے گھر والوں کو یہی بتایا گیا کہ وہ میز ہیوں سے پھسل گئی تھی۔ یہ الگ
بات تھی کہ انہیں اس کا یقین نہیں آیا تھا۔ شگفتہ کو خون لگ رہا تھا۔ عمر نے اپنا خون ٹیسٹ کروا کر دو بوتلیں خون
دے دیا مگر پھر بھی اس کی حالت نہیں سنبھل سکی تھی۔

حویلی کے پچھواڑے میں بننے والی سب سے پہلی آرام گاہ شگفتہ اظہار عباس کی ہی تھی۔ اس حویلی کی
اکلوٹی بے حد لاڈلی بیٹی کی۔ اس حویلی میں اترنے والا سب سے پہلا دکھ یہی تھا۔

قاتل صاف بری الذمہ ہو گئے تھے۔ اظہار ملک اور زینبا بی بی کے لبوں نے چپ کی بکل ماری۔
چاندنی راتوں کے سحر نے ایک نو نیر جوانی کو مٹی کے سپرد کر دیا تھا۔



وہ ایک بریلی رات تھی۔ ہر طرف برف ہی برف اور کہر کی دبیز تہہ۔ شب کے تقریباً ڈھائی بجے تھے
جب اپنے اندر کے طوفانوں سے لڑتی وہ کمرے سے نکل آئی تھی۔ باہر گیلری کے کونے میں لگی کھڑکی کے اس پار
اتنی ٹھنڈی کہ اسے اپنا وجود سن ہوتا محسوس ہو رہا تھا مگر پھر بھی وہ وہیں کھڑی رہی تھی۔

تب ہی اسے کچن میں ہلکی پھلکی سی کھٹ پٹ کی آواز سنائی دی تو اس نے ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا،
ایلی پچھلے ایک ہفتے سے شہر میں نہیں تھا۔ اس نے نیا نیا بزنس اشارٹ کیا تھا لہذا یہاں آنے سے لے کر اب تک
اس کی ایلی سے ایک بار بھی کھل کر بات نہیں ہو پائی تھی۔ اس کی آیا البتہ ہسپتال سے گھر شفٹ ہو چکی تھیں اور
پرہیزان کو وہ خاصی پسند آئی تھیں۔

قدرے فربہ جسم کے ساتھ، گورے چٹے رنگ والی وہ ایک خوبصورت خاتون تھیں۔ پرہیزان کا وقت
وہاں اچھا پاس ہونے لگا تھا۔ دن کی ٹائمنگ میں اس نے ایک اسٹور پر ملازمت بھی شروع کر دی تھی، مگر ایلی کو
ابھی اس کی ملازمت کے بارے میں نہیں پتا تھا۔

اس وقت رات کے ڈھائی بجے وہاں کچن میں ایلی کی آیا نہیں ہو سکتی تھیں کیونکہ وہ معذور تھیں، تبھی وہ
محتاج قدموں سے چلتی کچن کی طرف آئی تھی۔ اندر ایلی دھیمے سروں میں کوئی انگلش دھن گنگنا رہا ہوا بلیک کافی
پینٹ رہا تھا۔ پرہیزان کے قدموں کی آہٹ پر اس نے ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تھا۔

”تم جاگ رہی ہو پری؟“ اس کی آواز میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔ پرہیزان کا سر خود بخود اثبات میں ہل
آیا۔

”ہوں، تم کب آئے؟“

”ابھی تھوری دیر پہلے۔ تمہارے کمرے کا دروازہ لاکھ تھا۔ میں سمجھا شاید تم سو رہی ہو بہر حال کافی پیو

گی؟“

”نہیں شکریہ۔“ وہ چونکہ کافی بنا چکا تھا لہذا دل چاہنے کے باوجود پرہیان نے اسے زحمت دینی گوارہ

نہیں کی۔ ایللی کافی کا کپ تھامے باہر لاونچ میں آ بیٹھا۔

”ایم سوری، میں پچھلے دنوں چاہنے کے باوجود تمہیں ناٹم نہ دے سکا، تمہیں برا تو نہیں لگا؟“

”نہیں، مجھے اب کچھ بھی بُرا نہیں لگتا ایللی!“ وہ اس کے مقابل دھرے صوفے پر ٹک گئی تھی۔ ایللی نے

خاص گہری نگاہوں سے اس کے اداس چہرے کا جائزہ لیا۔

”ایک بات کہوں پری!“

”ہوں۔“

”بزرگ کہتے ہیں جب دل کا بوجھ حد سے بڑھ جائے تو اسے کسی نہ کسی کے ساتھ شیر کر لینا

چاہیے۔“

”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میرے دل پر کوئی بوجھ ہے؟“ اب وہ بغور اس کی طرف دیکھ رہی تھی،

ایللی مسکرا دیا۔

”اگر میں کہوں تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں تو؟“

”آنکھیں ہمیشہ سچ نہیں بولتیں ایللی!“

”نہیں پری! دنیا میں اگر کسی واحد چیز کی گواہی پر اعتبار کیا جاسکتا ہے تو وہ کسی بھی جاندار کی آنکھیں

ہیں، اندر کے موسموں کا آئینہ ہوتی ہیں یہ آنکھیں۔“ وہ سنجیدہ تھا، پرہیان نے رُخ پھیر لیا۔

”تمہاری آنکھیں بھی تو بہت کچھ کہتی ہیں ایللی! مگر تم نے بھی کبھی مجھ سے کچھ شیر نہیں کیا۔“

”تم نے کبھی کچھ شیر کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔“ بڑی مہارت سے اس نے اس کا داؤ اسی پر الٹ

دیا تھا، وہ خاموش رہی۔

”بہر حال میں جب یونیورسٹی میں تھا تو اکثر تمہیں چھپ چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ وجہ بے وجہ تم سے

بات کرنے کے بہانے تلاش کرتا تھا، اس لیے نہیں کہ تمہارے بال اور آنکھیں بہت خوبصورت تھیں بلکہ اس

لیے کہ تم سب سے بہت ریز رو رہا کرتی تھیں۔ میں اکثر مار تھا سے تمہیں شیر کرتا تھا، یونیورسٹی پریڈ کے بعد

جب ماہیتھانے بتایا کہ تم پاکستان واپس چلی گئی ہو اور یہ بھی کہ تمہارے والدین نے تمہاری نسبت کہیں طے کر دی

ہے، میں بہت ڈس ہارٹ ہو گیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی تھی یا میں تمہیں پانا چاہتا تھا بلکہ اصل

بات یہ تھی کہ میں ابھی تم سے رابطے میں رہنا چاہتا تھا، تمہیں سمجھنا چاہتا تھا، بہر حال رفتہ رفتہ یہ خواہش کمزور پڑ

گئی اور میں نے مکمل طور پر خود کو عملی زندگی میں الجھا لیا۔ مجھے ہلکا سا گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی ایک مرتبہ پھر

یوں اچانک سے تمہیں میرے مقابل لاکھڑا کرے گی، ہم یوں ایک ہی چھت تلے شب و روز بسر کریں گے۔“

وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت لگن سے کہہ رہا تھا۔ پرہیان سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی، تھی وہ پھر بولا۔

”میری مئی انڈین تھیں، وہ یہاں پڑھنے آئی تھیں اسی دوران انہیں میرے ڈیڈ سے محبت ہو گئی۔

میرے ڈیڈ مصری تھے، وہ یہاں بہتر روزگار کی تلاش میں آئے تھے۔ ان کا ارادہ کسی گرین کارڈ ہولڈر سے شادی

کرنے کا تھا مگر مئی کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مئی کے تعلیم سے فارغ ہونے

کے بعد دونوں نے شادی کر لی۔ شادی کے دس سال بعد میں پیدا ہوا تب تک پاپا اپنے قدم یہاں مضبوطی سے

جما چکے تھے۔ جبکہ مئی کا سوشل حلقہ وسیع ہو گیا تھا۔ زیادہ دن تک پاپا مئی کی خفیہ سرگرمیاں برداشت نہ کر سکے لہذا

ڈیڈ نے مئی کو طلاق دے کر اپنے راستے الگ کر لیے۔ مئی نے اس سانحے کے بعد اپنی عادات نہیں بدلیں اور

بالآخر یہیں کے مقیم ایک شخص کے ساتھ شادی رچا کر بیٹھ گئیں۔ ڈیڈ مجھے اپنے ساتھ مصر لے گئے۔ بارہ سال

میں وہاں رہا، اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بہن بھائیوں کے ساتھ بعد میں ڈیڈ نے مجھے یہاں بھیج دیا تاکہ میں کسی

بھی دہنی دباؤ کے بغیر، آزاد ماحول میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ بارہ سال بعد جب میں یہاں واپس آیا تب

مئی یہیں تھیں مگر انہوں نے کبھی مجھ سے پیار نہیں کیا، وہ بس کبھی کبھار ویک اینڈ پر ملنے آتی تھیں۔“ دھیمے لہجے

میں وہ اسے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ پرہیان خاموش نظروں سے اسے دیکھتی چپ چاپ سنتی رہی۔

”ڈیڈ نے میرے ساتھ ہی میری آیا کو بھی ایڈجسٹ کروا دیا۔ مجھے کبھی روپے پیسے کی کمی بھی نہیں

ہوئی پھر بھی اندر کہیں کوئی کمی رہ گئی۔ بہت چاہنے کے باوجود میں اپنی شخصیت کو مکمل نہیں کر پایا۔“ اب کے ایللی

کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی، پرہیان نے گہری سانس بھرتے ہوئے چہرے کا رُخ پھیر لیا۔

”اگر میں کہوں کہ میری کہانی بھی تم سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے تو غلط نہیں ہوگا۔“

”میں سننا چاہتا ہوں، تم ہمیشہ مجھے اپنا خلص رازدار پاؤ گی پری!“ اس کی کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی مگر

اسے پروا نہیں تھی۔

پرہیان صوفے سے اٹھ کر پھر سے گیلری میں لگی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

”برسوں پہلے کی بات ہے ایللی! میرے پاپا صمد حسن ایک غریب انسان تھے، میں نے جب ہوش

سنجھلا تو ممانے مجھے بتایا کہ میری پیدائش سے پہلے انہوں نے میرے نانا کے ساتھ اپنا ذاتی بزنس شروع کیا

تھا۔ میں ساری زندگی اس غرور اور فخر کے ساتھ جیتی رہی کہ میں ایک آئیڈیل انسان کی بیٹی ہوں، میرے پاپا کا

دنیا میں ایک نام ہے مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔“ وہ دانستہ چپ ہو گئی تھی۔ ایللی کافی کا کپ ٹیبل پر رکھ کر خود بھی

کھڑکی کے قریب چلا آیا۔

”میں سمجھا نہیں، کیا صمد انکل تمہارے پاپا نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ ایللی کے سوال پر آہستہ سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس نے بیگنی آنکھوں کے ساتھ اسے

دیکھا تھا۔

”وہ کالج لائف میں تھے جب ان کی مریرہ رحمان نامی لڑکی کے ساتھ پہلی شادی ہوئی تھی۔ دونوں

ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ دو بچے بھی تھے ان کے، زواہار اور درمکنون، دونوں بچوں میں ان کی

”نہیں، وہ اب میرا کبھی نہیں ہو سکتا ایللی!“

”ہو سکتا ہے اگر اس کے دل میں تمہارے لیے ذرا سی محبت کی چنگاری بھی ہوئی تو۔“

”کیسے؟“

”بس یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ ایللی کی آنکھیں دمک رہی تھیں، پر ہیان نے فوراً آنسو پونچھ لیے۔

”تم کیا کرو گے ایللی؟“

”کچھ بھی کروں گا مگر تمہاری محبت تمہیں واپس لوٹا کر رہوں گا، یہ وعدہ ہے میرا تم سے۔“ وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر پھر بھی پر ہیان جانتی تھی کہ اس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہیں، تبھی وہ پلٹ آئی تھی۔

گہری ہوتی رات کے ساتھ اس کے اندر کی خاموشی بھی جیسے بڑھتی جا رہی تھی۔



اس روز وہ خاصی لیٹ اٹھی تھی۔ ناشتے کی میز پر مریرہ بیگم نے اس کی سوچھی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھا تو پریشان ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

”کیا بات ہے دری! کیا رات ٹھیک سے نہیں سوئیں؟“ درکنون کا چائے کی طرف بڑھتا ہاتھ مریرہ بیگم کے سوال پر ہوا میں معلق رہ گیا تھا۔

”نہیں ماما! ایسی بات نہیں ہے، اصل میں رات شہزاد کی کال آگئی تھی، نیند سے جگا دیا اس نے بس تب سے ہی سر میں درد ہے۔“

”ہوں، شہزاد بتا رہی تھی صیام کے والد کی رحلت ہو گئی؟“

”جی ماما۔“

”تم گئی تھیں افسوس کرنے کے لیے؟“

”جی میں اور شہزاد دونوں گئی تھیں، آپ کی طرف سے بھی تعزیت کر لی تھی۔“

”ہوں، بہت اچھا لڑکا ہے صیام! بے حد قابل اور مخلص۔“

”آپ صحیح کہہ رہی ہیں ماما لیکن میں آفس سے لیٹ ہو رہی ہوں، آپ اجازت دیں تو ناشتہ کر

لوں؟“

”کرلو، مجھے کل صبح کی فلائٹ سے دہلی واپس جانا ہے۔ شہزادو بھی بتا رہی تھیں کہ شہزادو تمہارے ساتھ تمہارے آفس میں کام کرنا چاہتی ہے، اسے ٹھیک سے گائیڈ کر دینا۔ عمر بھی اب پاکستان میں اپنا نیا بزنس شروع کرنا چاہتا ہے، بہتر ہے دونوں چاچا بھتیجی اپنا الگ کاروبار سیٹ کر لیں۔“

”ہوں، اچھی پلاننگ ہے میں بہت مس کرتی ہوں عمر انکل کو۔“

”وہ خود بھی تمہارا پوچھتا رہتا ہے، خیر شہزاد حویلی میں رکنے کی ضد کر رہی ہے اور شہزادو بھابی اس کی ضد کے سامنے مجبور ہیں، ایسے میں تمہیں چند روز کے لیے اکیلے رہنا پڑے گا۔ بہتر ہے تم آج سے ہی اپنی

جان تھی مگر..... ایک دم سے ان کے راستے علیحدہ ہو گئے، جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میری مٹی ان کے درمیان آ گئی تھیں۔“ پر ہیان کا لہجہ بھاری ہو گیا تھا، ایللی سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا آہستہ سے رُخ پھیر گیا۔

”تمہاری مٹی ان کے درمیان کیوں آ گئی تھیں؟“

”پتا نہیں، شاید صمید پاپا کے ساتھ ان کا فیئر چلا ہو یا شاید ان کی کوئی مجبوری ہو مگر مجھے انہوں نے کبھی سچ نہیں بتایا میں کبھی نہیں جان سکی کہ میں کون ہوں، مجھے میرے فیائسی نے بتایا کہ میرا وجود جائز نہیں تھا۔ صمید پاپا کے ساتھ شادی سے پہلے ہی میری ماما امید سے تھیں شاید اسی لیے صمید پاپا نے انہیں اپنا نام دیا تا کہ وہ معاشرے میں عزت سے جی سکیں۔ وہ میرے اور ماما کے محسن ہیں ایللی! مگر میں نے انہیں کبھی دل سے ہنسنے نہیں دیکھا۔ وہ ماما کے ساتھ بیڈروم بھی شیئر نہیں کرتے مگر میں نے یہ سب پہلے محسوس نہیں کیا تھا، اب کیا ہے تو سانس سینے میں الجھنے لگی ہے۔ خود اپنے ہی وجود سے گھٹن آنے لگی ہے۔“ وہ اب دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو رہی تھی۔ ایللی نے سر پیچھے دیوار کے ساتھ ٹکا لٹے ہوئے آہستہ سے پلکیں موند لیں۔

”یہ تصور ہی کتنا شرمناک ہے نا ایللی کہ میری ماں نے کسی کا حق چھینا، وہ ساری محبت اور آسائش جو ان کے بچوں کا حق تھی وہ انہوں نے ان کے بچوں سے چھین کر میری جھولی میں ڈال دی مگر وقت نے ان کا قصور معاف نہیں کیا ایللی! انہوں نے کسی سے اس کا حق چھینا، بدلے میں میری تقدیر نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، ساری محبتیں، آسائش، غرور و فخر، محبت..... سب کچھ.....“ اس کا لہجہ ابھی بھی بھاری تھا۔

ایللی چپ چاپ خاموشی سے اسے سنتا رہا۔ اس وقت اس کے دل کا سارا غبار نکل جانا ہی بہتر تھا۔

”تمہارے فیائسی کو ان سب باتوں کا کیسے پتا؟“ بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا جب وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

”صمید پاپا کی سگی بیٹی درکنون میرے فیائسی کی کلاس فیلو رہ چکی ہے۔ دونوں کے درمیان ہلکی پھلکی دوستی کا رشتہ بھی رہا ہے۔ ساویز اکثر مجھے اس کے بارے میں بتاتا رہتا تھا مگر تب میں یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ میری بہن ہے یا یہ کہ وہ صمید پاپا کی سگی بیٹی ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ ساویز کو سب کچھ سچ بتا دے گی، وہ سچ جس سے میں اب تک بے خبر رہی۔“

”ساویز کیا کہتا ہے اب؟“

”کچھ نہیں اس نے مجھ سے رشتہ ختم کر دیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک بے نام و نشان لڑکی کے ساتھ شادی کر کے اپنی آنے والی نسلوں کی زندگی برباد نہیں کر سکتا۔ اس نے ایک پل کے لیے بھی نہیں سوچا ایللی کہ میں اس سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اس نے مجھے اس جرم میں سزائے موت سنا دی جو میں نے کیا ہی نہیں تھا، جس میں میرا کوئی کردار، کوئی قصور ہی نہیں تھا۔ کتنی آسانی سے وہ ہر بات بھلا کر اپنے راستے علیحدہ کر گیا، یوں جیسے میرا وجود اس کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا تھا۔“ پر ہیان کی آنکھیں اس وقت آنسو نہیں لہو بہا رہی تھیں، ایللی چپ چاپ کھڑی کے پاس بکھری برف کو دیکھتا رہا۔

”کیا تم یہاں اسے پھر سے پانے کے لیے آئی ہو؟“

روٹین بہتر کر لو۔“

”ڈونٹ وری مم! اکیلے رہنا میرے لیے مسئلہ نہیں ہے۔“

”جانتی ہوں مگر پھر بھی تمہاری ماں ہوں، بے فکر نہیں رہ سکتی تمہاری ذات سے۔“

”مجھے پتا ہے میری ماں دنیا کی بہترین ماں ہے۔“ ناشتہ مکمل کرتے ہوئے اس نے مریرہ کا ہاتھ چوما

تھا، وہ مسکرا دی۔

”اب میں جاؤں آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے۔“

”ہوں، مگر دھیان سے ڈرائیو کرنا تم بہت بے پروائی سے گاڑی چلاتی ہو دری!“

”ڈونٹ وری مم! میں اتنی جلدی آپ کی جان چھوڑنے والی نہیں۔“ ڈاننگ نیبل سے گاڑی کی چابی

اٹھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا تھا اور تیز قدموں سے چلتی گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس

نے شہر زاد کو میج کیا تھا۔

”جہاں بھی ہو فوراً آفس پہنچو، تمہارے کان کھینچنے ہیں۔“ جواب میں اس کا پیغام بھی فوری موصول

ہوا تھا۔

”کیوں خیریت؟“

”ہوں، خیریت ہی ہے۔“ گاڑی ڈرائیو کرنے سے پہلے اس کی انگلیوں نے پھر تیزی سے ٹائپ کیا

تھا، شہر زاد نے جواب میں جو حکم لکھ دیا۔

قدرے فاسٹ ڈرائیو کے ساتھ وہ آفس پہنچی تو صیام اس سے پہلے وہاں موجود تھا۔ درکنون کا دل

بے ساختہ دھڑک اٹھا، رات شہر زاد نے بتایا تھا کہ وہ آفس نہیں آئے گا تبھی وہ بے فکری سے چلی آئی تھی مگر وہ

خلاف توقع موجود تھا۔ تبھی اسے بے حد حیرانی ہوئی۔ وہ ابھی اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھی تھی جب وہ ہلکی سی دستک

کے بعد اس کے کمرے میں چلا آیا۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! آپ یہاں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی، صیام نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جی میم! کچھ ضروری کام تھا مجبوراً آنا پڑا، آپ پلیز یہ فائل چیک کر لیجیے گا صرف آپ کے سائن

کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ آج اگر اسے مکمل کر کے نہ بھجوا دیا گیا تو کمپنی کو خاصے نقصان کا اندیشہ ہے اور یہ

مسز حسین کا وزیٹنگ کارڈ ہے، وہ ایپروڈ جانے سے پہلے ہر صورت آپ سے ملاقات کی خواہاں ہیں۔ بہتر ہوگا

اگر آپ آج کل میں ٹائم نکال کر ان سے مل لیں۔ میرے خیال میں وہ ہماری کمپنی کے لیے اچھا اضافہ ثابت ہو

سکتی ہیں۔“ ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ صاف ستھرے حلیے میں ملبوس اس شخص کو دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ

سکتا تھا کہ وہ اپنے والد کی آخری رسومات کی ادائیگی کر کے وہاں آیا ہوگا۔ درکنون نے اس سے دانستہ نظریں

چرائی تھیں۔

”ٹھیک ہے میں ایک دو روز میں مل لوں گی ان سے اور یہ فائل بھی میں ابھی دیکھ لیتی ہوں، آپ

آفس کی طرف سے بے فکر ہو کر گھر جائیں اور اپنے ضروری کام پٹھائیں۔“

”شکریہ۔“ اس کی فراخ دلانہ آفر پر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ پلٹا تھا جب اس نے بے ساختہ

اسے پکار لیا۔

”صیام صاحب“

”جی۔“ وہ پلٹا تھا مگر درکنون اس کی طرف متوجہ نہیں تھی وہ فائل کو دیکھ رہی تھی۔

”پلیز تشریف رکھیں مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے آپ سے۔“ بنا اس کی طرف دیکھے اس نے کہا

تھا، صیام قدرے الجھن کا شکار چپ چاپ اس کے مقابل ٹک گیا۔

”آپ نے کمپنی میں قرض کے لیے درخواست دی تھی؟“ وہ اس کے مقابل بیٹھا تھا جب اس نے

سنجیدگی سے پوچھا، صیام نے سر جھکا لیا۔

”جی۔“

”آپ کی درخواست منظور ہو گئی ہے، کمپنی اس ماہ کی تنخواہ کے ساتھ آپ کو پانچ لاکھ روپے کی رقم

بطور قرض دے رہی ہے۔“

”شکریہ، مگر مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ اس سے زیادہ سنجیدہ تھا، درکنون کو بے حد حیرانی ہوئی۔

”کیوں؟“ صیام نے اس کے ”کیوں“ پر بے ساختہ نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیونکہ قرض اب میرے کسی کام کا نہیں ہے۔“

”ایم سوری! مجھے آپ کے والد صاحب کی رحلت کا واقعی بہت افسوس ہے۔“ وہ شرمندہ تھی، صیام کی

آنکھوں کے کنارے پھر سے نم ہو گئے۔

”آپ کی معذرت بھی اب میرے کسی کام کی نہیں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب کچھ بھی پہلے جیسا

نہیں ہو سکتا۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مگر آپ کے گھر کے حالات ابھی بہت بہتر نہیں ہیں۔“

”اللہ مالک ہے میم! میں اس کی رضا میں راضی ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر آفس ٹائم کے بعد ورکشاپ پر ملازمت شاید اب آپ کے لیے آسان نہ رہے،

گھر میں اب آپ کے والد حیات نہیں ہیں اور وقت جتنا خراب چل رہا ہے آپ یقیناً اس سے بے خبر نہیں

ہیں۔ گھر میں موجود تین عورتوں کے لیے آپ کا بروقت گھر پہنچنا بہت ضروری ہے اسی لیے میں نے رشید

صاحب سے کہہ کر آپ کی تنخواہ بڑھا دی ہے، اب آپ کو ورکشاپ پر کام کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”شکریہ، مگر اس مہربانی کو میں کیا نام دوں، ہمدردی یا بھیک؟“

”نہ ہمدردی، نہ بھیک، صرف مفاد۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”میں سمجھا دیتی ہوں۔ آپ اس کمپنی کے ذہین اور قابل ورکر ہیں، یہ بات نہ صرف میں جانتی ہوں بلکہ

اس کمپنی کا پورا اسٹاف بھی اس سے باخبر ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ اپنے نامساعد حالات کی وجہ سے مجبور ہو کر کسی اور کمپنی کی اس کمپنی سے بہتر سیلری پیکیج والی آفر قبول کریں۔ کمپنی فی الحال آپ جیسے محنتی اور ذہین ورکر کو کھونے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔“ نہایت رسان سے اس نے جواز پیش کیا تھا۔ صیام کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنی عزت دی مگر میں بنا سیلری میں اضافے کے بھی اس کمپنی سے منسلک رہوں گا یہ میرا خود سے کیا ہوا کانٹریکٹ ہے۔“

”شکریہ، آپ کی اسی وفاداری کی وجہ سے میں آپ کی بے حد عزت کرتی ہوں۔“

”تھینک یو۔“ وہ مسکرایا تھا مگر اس کی مسکراہٹ میں بھی عجیب سی اداسی تھی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ اسے مزید کچھ کہتی شہزاد ہلکی سی دستک کے ساتھ اس کے روم میں چلی آئی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! آؤ بیٹھو۔“ درکنون نے فی الفور توجہ اس کی جانب مبذول کی تھی جواباً وہ صیام کی برابر والی سیٹ پر ٹک گئی۔

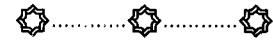
”میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ آج آفس سے چھٹی کر لیجیے گا مگر آپ پھر یہاں موجود ہیں، کیا اتنی ظالم باس ہے در؟“ وہ صیام سے مخاطب تھی۔ درکنون خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”نہیں، مگر آج میرا آنا بہت ضروری تھا اسی لیے چھٹی نہ کر سکا۔ پھر میں نے آفس میں مطلع بھی نہیں کیا تھا۔“ وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے رات کو در کو مطلع کر دیا تھا بہر حال اب آپ کے بھانجے کی طبیعت کیسی ہے؟“

”کافی بہتر ہے، عشرت اور میں صبح پھر چیک اپ کے لیے شہر لے آئے تھے اسے۔“

”گڈ، میں بھی چلوں گی اسے دیکھنے۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ تابعداری سے کہتا وہ درکنون سے اجازت لے کر اٹھ گیا تھا۔ درکنون شہزاد کے چہرے پر بکھرے خوبصورت رنگوں کو دیکھتی رہی۔



پرانی حویلی کے پچھواڑے میں شگفتہ اظہار عباس خاک سپرد ہو کر ابدی نیند کیا سوئی، وہاں جیسے سناٹے اتر آئے۔ در و دیوار کے ساتھ جیسے عجیب سی وحشتیں چٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اظہار ملک صاحب کے کندھے جھک گئے جبکہ بے جی کے وجود کو اس المناک سانحہ نے بستر سے لگا دیا تھا۔

ان کی آنکھیں دن رات بھیگی رہتی تھیں۔ عمر عباس کے اندر جیسے کوئی الاؤ دہک اٹھا تھا جبکہ باقی تینوں بھائیوں کے لبوں پر گہری چپ بکل مار کر بیٹھ گئی تھی۔

مریہ صمد پر یہ خبر جیسے بجلی بن کر گری۔ صمد ان دنوں شہر سے باہر تھا، مریہ نے پریکٹس کے باوجود گاؤں جانے کی ٹھان لی۔ کرنل صاحب پاکستان میں نہیں تھے پھر ان کی بہو کی زندگی بھی خطرے میں تھی، سکندر علوی کو نشے کی شدت نے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ایسے میں چند ماہ کی ننھی سی عائلہ کو سنبھالنا انہی کے سپرد

تھا۔ تبھی مریہ نے جان بوجھ کر انہیں مزید پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ گاؤں کے لیے نکل رہی تھی جب اس نے صمد کو کال ملائی۔

”ہیلو۔“ پہلی بیل پر ہی اس کی کال پک ہوئی تھی۔ مریہ اس وقت اپنے اور اس کے درمیان پیدا ہونے والی ساری تلخی بھول گئی۔

”ہیلو صمد آپ کہاں ہیں اس وقت؟“

”خیریت؟“ اس کے پریشان لہجے پر وہ چونکا تھا، مریہ کا آواز بھرا آئی۔

”خیریت نہیں ہے۔“

”کیوں کیا ہوا؟“

”شگفتہ اظہار عباس کا قتل ہو گیا ہے صمد! حویلی پر قیامت بیت گئی ہے آپ جلدی سے گھر آ جائیں، ہمیں گاؤں کے لیے نکلنا ہے۔“

”اودہ بہت افسوس ہوا سن کر مگر ایسا ہے کہ میں ابھی فوری طور پر گھر نہیں پہنچ سکتا۔ تم بھی جس حال میں ہو اس حال میں گاؤں کا سفر کسی طور مناسب نہیں، بہتر ہے تم کال پر اظہار افسوس کر لو بعد میں ٹائم نکال کر اکیلا تعزیت کر آؤں گا۔“ صمد کے لہجے میں خاصی بے پروائی تھی۔ مریہ کا دل جل کر راکھ ہو گیا، وہ بولی تو اس کے لہجے میں بے حد تلخی تھی۔

”نہیں، آپ کو کہیں بھی جانے اور تعزیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ صرف اپنے کاروبار اور موجودہ سرگرمیوں پر توجہ دیں، وہاں میرے رشتے ہیں میں چلی جاؤں گی۔“

”مگر میں تمہیں اس کے لیے اجازت نہیں دوں گا۔“

”مجھے اپنے رشتوں کو برتنے کے لیے آپ کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے کہا تھا اور پھر فوراً کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ وہ حویلی پہنچی تو وہاں کچھ بھی پہلے جیسا نہیں تھا۔

اظہار ملک صاحب، بے جی، خضر عباس، نظر عباس، قمر عباس، دونوں بھابیاں سب کے چہروں پر ایک ہی تحریر رقم تھی۔ گہرے رنج اور ملال کی تحریر۔ بے جی مریہ کے گلے لگ کر روئیں تو پھر انہیں چپ کر دانا مشکل ہو گیا۔

عمر گاؤں میں نہیں تھا۔ مریہ کو حویلی پہنچے وہ دوسری رات تھی جب وہ گھر آیا تھا۔ بے حد رن حلیے میں ہلکی ہلکی ہوئی شیو کے ساتھ اس کا سراپا مکمل طور پر بکھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ مریہ کو وہاں حویلی میں موجود دیکھ کر اس کی آنکھیں چند ساعتوں کے لیے بے ساختہ بھیگی تھیں۔

”کیسے ہو عمر؟“

”تمہیں کیسا دکھائی دے رہا ہوں؟“ اس نے پلٹ کر اسے نہیں دیکھا تھا مگر مریہ پھر بھی اس کی آنکھوں میں تیرتی وحشت کو دیکھ سکتی تھی۔ بنا شدید سردی کی پروا کیے وہ دونوں اس وقت سکھ چین کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ مریہ نے نظریں اس کے دھول مٹی سے اٹے چہرے سے ہٹا لیں۔

”مجھے گمان نہیں تھا کہ وقار اکل کی حویلی میں شگفتہ کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک ہوگا۔“

”گمان تو مجھے بھی نہیں تھا، ہوتا تو بھلے جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑتا، میں اس کی شادی ریاض جیسے جنگلی انسان کے ساتھ کبھی نہ ہونے دیتا۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے عمر! ریاض نے یہ سب کیوں کیا ہوگا؟“

”صرف انتقام کے لیے اس کی رال شروع سے ہی قمر کی بیوی نورین پر نیپتی تھی مگر قمر نے نورین کے ساتھ شادی کر کے گویا اسے نیچا دکھا دیا۔ اسی کا بدلہ لیا ہے اس نے ہم سے۔“ عمر کے چہرے کی سرخی اس کے اندر کے جذبات کا بخوبی پتا دے رہی تھی، مریرہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

”کتنے افسوس کی بات ہے کہ اللہ نے جس مخلوق کو سب سے افضل قرار دیا وہی مخلوق ایسے گھٹیا کارنامے سرانجام دے رہی ہے کہ خود اپنے انسان ہونے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ بھلا ایسے بھی کرتا ہے کوئی؟“ وہ دکھ سے کہہ رہی تھی، عمر خاموش رہا۔

اسکے اندر بہت گہری چپ اتری تھی، مریرہ تین دن حویلی میں گزار کر شہر واپس آئی تو صمد کا موڈ بے حد خراب تھا۔

رات آفس سے واپسی کے بعد وہ بنا اس سے کوئی بات کیے سو گیا تھا۔ اگلی صبح مریرہ کی آنکھ کھلی تو وہ آفس کے لیے نکل چکا تھا۔ اس کی ناراضگی، مریرہ کے لیے اس کی فکر اور محبت پر غالب آ گئی تھی۔ اسی روز دوپہر میں مریرہ کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ حمنہ شہر میں نہیں تھی اور صمد کا موبائل مسلسل آف جا رہا تھا، پورے شہر میں اور کوئی بھی ایسا شاسا نہیں تھا جسے وہ مدد کے لیے پکار سکتی۔

صمد نے رات کو دیر سے گھر آنے کا بیج کیا تھا مگر وہ نہیں آیا تھا۔ صبح سے رات اور پھر رات سے اگلی صبح تک اس کا موبائل بھی مسلسل آف رہا تھا۔

مریرہ ساری رات درد میں تڑپتی رہی، اگلی صبح درد سے نڈھال ہو کر مجبوراً اس نے ساتھ والی ہمسائی کو آواز دے کر بلا اٹھا اور پھر وہی ہمسائی اسے فوری ہسپتال لائی تھی جہاں اس نے کئی گھنٹے زندگی اور موت کی کشمکش میں رہنے کے بعد بلا خر زوایا صمد حسن کو جنم دیا تھا، جو ہو بہو اس کی ہی فوٹو کا پی تھا۔

صمد کو زوایا کی پیدائش کی خبر اس کے دنیا میں آنے کے پورے بارہ گھنٹوں بعد ملی تھی اور وہ یہ خبر ملتے ہی فوراً ہسپتال کی طرف بھاگا تھا۔

مریرہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت وہ کس عذاب میں گرفتار تھا۔ ایک طرف بیٹے کا باپ بننے کی خوشی تھی تو دوسری طرف منیر صاحب (بزئس پائرنر) کی لمحہ بہ لمحہ موت کی طرف بڑھتی زندگی کا دکھ تھا۔ اس پر مستزاد کہ انہوں نے ہاتھ باندھ کر ان سے اپنی اکلوتی بیٹی سارا کو اپنا نام دینے کی درخواست بھی کر ڈالی تھی۔

وہ شادی شدہ تھے، مریرہ رحمان میں ان کی جان تھی اس سے ہر طرح کی بدگمانی کے باوجود وہ صرف اسی کے ساتھ پوری زندگی بیتانا چاہتے تھے۔ انہوں نے منیر صاحب سے معذرت کی تھی مگر انہوں نے اس کی معذرت کو قبول نہیں کیا تھا۔

مرنے سے پہلے وہ ہر صورت اپنی بیٹی کو محفوظ ہاتھوں میں سونپنا چاہتے تھے تاکہ دوبارہ ان کا اوباش بھتیجا اسے پریشان نہ کر سکے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صمد حسن کے سامنے رو پڑے تھے، ان کی بیٹی رخصتی سے قبل ہی ماں بن رہی تھی اور یہ وہ سب سے بڑا عیب تھا جس کی وجہ سے سوائے صمد حسن کے دنیا کا اور کوئی شریف، عزت دار انسان ان کی بیٹی کو اپنا نام نہیں دے سکتا تھا تبھی انہوں نے صمد حسن کی منت کی تھی کہ ان کے سامنے یہ آپشن رکھا تھا کہ وہ صرف ان کی بیٹی کو اپنا نام دے دیں پھر بھلا ساری زندگی اسے اپنی اور اپنی بیوی کی ملازمہ بنا کر رکھیں وہ اعتراض نہیں کریں گے نہ ان کی بیٹی کو ہی کبھی ان سے کوئی شکایت ہوگی۔

صمد حسن فرار کی ہزار کوشش کے باوجود ایک مرتے ہوئے شخص کی بے بسی کے سامنے ہار گئے تھے، جس وقت انہیں ہسپتال سے کال گئی، ٹھیک اسی وقت ان کا سارا بیگم سے نکاح ہوا تھا۔ جس وقت انہوں نے مریرہ کو ہسپتال سے ڈسچارج کروا کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ٹھیک اسی وقت منیر صاحب نے ہمیشہ کے لیے پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔

وہ وقت ایسا نہیں تھا کہ مریرہ رحمان کو ساری سچائی بتائی جاسکتی لہذا اسے ہسپتال سے گھر چھوڑ کر وہ فوراً منیر صاحب کی طرف نکل گئے تھے۔ سارا بیگم زار و قطار رو رہی تھیں۔ انہوں نے اسے تسلی دی پھر منیر صاحب کی آخری آرام گاہ کی طرف سفر کی تیاری میں لگ گئے۔

مریرہ رحمان چونکہ اس ساری کہانی سے بے خبر تھی لہذا صمد حسن کے اس رویے نے اس کے پہلے سے زخمی دل کو اور بھی لبو لہان کر ڈالا تھا۔

صمد حسن کی ذات پر جو تھوڑا بہت مان اور اعتبار بچا تھا اس کی بھی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ وہ درد جو اس نے تنہا ہسپتال کے سرد کمرے میں سہا تھا صمد حسن کی لافعلی اور بے حسی نے اس درد کی شدت کو کئی گنا مزید بڑھا دیا تھا۔



زادیا صمد حسن کی پیدائش کو پورے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے جب حمنہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کا ٹرانسفر ہو گیا تھا اور وہ اسی سلسلے میں آج کل بے حد مصروف تھی تاہم مریرہ کی ڈیوری کی خبر ملتے ہی اس نے اپنی تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ مریرہ کی آنکھیں اسے دیکھتے ہی پھر بھر آئی تھیں۔

”کیسی ہو میرا! چپکے چپکے بیٹے کی ماں بن گئیں اور بتایا بھی نہیں۔“ اس نے مریرہ کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔ مریرہ کو لگا اس کے زخم جیسے پھر سے ہرے ہو گئے ہوں، وہ بولی تو اس کا لہجہ بے حد شکستہ تھا۔

”ٹھیک ہوں، تم کہاں چلی گئی تھیں؟“

”یہیں تھی یار! اصل میں میرا ٹرانسفر ہو گیا تھا، وہی رکوانے کے چکر میں لگی ہوئی تھی مگر کامیابی نہیں ملی۔ اب تو مہینوں بعد ہی شکل دیکھ پاؤں گی تمہاری، بہر حال بیٹے کی پیدائش بہت مبارک ہو، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا ناں پیدائش میں؟“

”نہیں، ساتھ والی آپالے گئی تھیں ہسپتال، کل سے اب تک وہی دیکھ بھال بھی کر رہی ہیں۔“

دونوں بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک رکھنے کا پابند ہوں یہ اور بات ہے کہ نورین اس کی حقدار نہیں ہے۔“

”وہ حقدار ہے یا نہیں مگر بابا اپنے بڑے بھائی کے بعد اب اکلوتی بہن کے ساتھ کسی طور اپنے تعلقات کو خراب کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں گاؤں میں کسی بھی قسم کی کوئی دشمنی انور نہیں کر سکتے لہذا تم ابھی اور اسی وقت اس لڑکی کو طلاق دے کر یہاں سے روانہ کرو، نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا“ اس بار دھمکی دے کر رعب ڈالنے والا نظر عباس تھا۔

قمر عباس نے ایک نظر سر جھکائے کھڑی شہر بانو پر ڈالی پھر بے نیازی سے جوتوں کو پاؤں کی جکڑن سے آزاد کرتے ہوئے بولا۔

”معافی چاہتا ہوں بھائی میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا، شہر بانو نہ صرف میری عزت ہے بلکہ میری پانچ سالہ پرانی محبت بھی ہے جبکہ نورین کے ساتھ شادی میں نے صرف بابا کے دل کی خوشی کے لیے مجبوراً کی تھی، مگر اب جبکہ وہ ہر لحاظ سے ایک خالی عورت ثابت ہو چکی ہے میں ساری زندگی اسے گلے کا تعویذ بنا کر نہیں رکھ سکتا۔ میری زندگی پر میرا اپنا بھی کچھ حق ہے، آپ کو گراتا ہی بابا کی عزت اور پھوپھو کے ساتھ ان کے بہترین تعلقات کا خیال ہے تو آپ دوسری شادی کر لیں نورین سے، میں طلاق دینے کے لیے تیار ہوں۔“ اس بار اس کا لہجہ اتنا سناٹ تھا کہ کوئی چاہتے ہوئے بھی اسے مزید کچھ نہ کہہ سکا۔

یوں رخصت ہوتے موسم سرما میں شہر بانو اس حویلی کا حصہ بن کر وہاں بسنے والے مکینوں کے دل پر راج کرنے لگی۔ نورین نے وہ حویلی چھوڑ دیا اور روٹھ کر ماں کے پاس جا بیٹھی۔

اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ قمر شہر بانو کو طلاق دے کر حویلی سے رخصت کرے، نہیں تو وہ نہ خود سکون سے بیٹھی نہ اسے جینے دے گی مگر قمر نے نہ اس کی ناراضگی کا کوئی نوٹس لیا تھا نہ اس کے ناجائز مطالبے کا، تاہم اظہار ملک صاحب کے سامنے اس کی گردن ضرور جھک گئی تھی، جواب بھی اپنے بہن بھائیوں سے بہتر تعلقات کے خواہاں تھے۔

وقت جیسے پر لگا کر اڑ رہا تھا، نورین نے قمر کو سبق سکھانے کے لیے قادر صاحب کے بیٹے ریاض سے تعلقات استوار کر لیے تھے جو اس کے حصے کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اب بھی اس کا طلبگار تھا۔ دوسری طرف خدا نے قمر عباس کی سن لی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی شہر بانو نے اسے ماں بننے کی خوشخبری سنا دی تھی جس کے بعد نہ صرف وہ ہواؤں میں اڑنے لگا تھا بلکہ پوری حویلی پر چھائی یاسیت میں بھی کمی آ گئی تھی۔

شہر بانو نے اپنے اخلاق اور سلیقے سے نہ صرف شوہر کا دل مٹھی میں کر لیا تھا بلکہ ساس سرور حویلی کے باقی مکین بھی اس کی محبت کے گن گاتے جھٹکتے تھے۔ یہی وہ چیز تھی جس نے نورین بیگم کے دل و دماغ میں آگ بھڑکا کر اسے بارود بنا دیا تھا۔ شہر بانو کے نظن سے قمر عباس کے وارث کے آنے کی خبر نے اس کی راتوں کی نیند اڑا دی تھی۔ وہ اسے بے سکون کرنا چاہتی تھی۔ تقدیر نے وارثا کر دیا تھا۔ وہ اسے شکست دینا چاہتی تھی مگر خود ہار گئی تھی۔ اس نے اس سے سب کچھ جھین لینا چاہا تھا مگر قسمت نے اس سے سب کچھ جھین لیا تھا پھر وہ بارود نہ بنتی تو اور کیا کرتی؟

”کیوں؟ ساتھ والی آپا کیوں، تمہارا شوہر کہاں ہے؟“ حمزہ کو اچھنچھا ہوا تھا، مریرہ نے نظریں چرا لیں۔

”پتا نہیں، میں کل سارا دن انہیں فون کرتی رہی مگر ان کا سیل آن نہیں ملا، تبھی مجبوراً ساتھ والی آپا کو آواز دے کر بلانا پڑا اور پھر تم بھی شہر میں نہیں تھیں۔ ڈیوری کے بعد آپا نے ہی ہسپتال سے انہیں فون کروایا تھا تبھی وہ آئے تھے مگر صرف چند گھنٹوں کے لیے، مجھے ہسپتال سے گھرا کر وہ پھر کہیں غائب ہو گئے۔“

”دیری گڈ! اسی شوہر کے لیے تم کہتی تھیں کہ عام مردوں جیسا نہیں ہے، حد ہوتی ہے بے حیائی کی بھی۔“ حمزہ کے غصے کا گراف بڑھا تھا۔ مریرہ کے اندر تک جیسے خاموشی بکھر گئی، اس کا یقین ٹوٹ گیا تھا۔

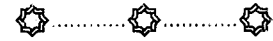
حمید حسن کی ذات پر اس کے اندھے اعتبار کی دھجیاں بکھر گئی تھیں۔ وہ اب کیا کہتی؟ وقت نے اسے بے وقوف ثابت کر دیا تھا۔

”بہر حال تم پریشان مت ہو، میں ابھی چند دنوں تک یہیں ہوں، تمہارے ساتھ۔“

اگلے ہی پل حمزہ کی تسلی نے اسے پرسکون کر دیا تھا اور پھر واقعی آنے والے تین چار دنوں میں اس نے سبکی بہن سے بھی بڑھ کر اس کا خیال رکھا تھا۔

وہی تھی جس نے اس کے بیٹے کو زویا کا نام دیا تھا اور مریرہ نے بنا حمید کی اجازت کے اپنے بیٹے کا یہی نام رکھ دیا۔

”زویا حمید حسن!“



وہ موسم سرما کی ایک اداس سرد شام تھی جب قمر عباس، عمر عباس کی مدد سے اپنی یونیورسٹی فیلو ”شہر بانو“ کو شہر سے بیہ کر حویلی لایا تھا۔

حویلی میں اس شام گویا طوفان آ گیا تھا۔ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم نورین نے رو رو کر اور چیخ چیخ کر پورے گاؤں میں ہلچل مچا دی تھی۔ قمر عباس کی دوسری شادی کی جرأت اسے کسی طور قبول نہیں تھی تبھی اس نے خوب واویلا مچایا تھا۔

اظہار ملک صاحب جو پہلے ہی بیٹی کی ناگہانی موت کے غم میں سودا کی ہوئے تھے اس نئی آفت پر مزید ڈھے گئے۔ ان کی بہن نے گاؤں کے چوراہے پر کھڑے ہو کر نہ صرف انہیں گالیاں دی تھیں بلکہ خوب بے عزت بھی کیا تھا تبھی خضر عباس اور نظر عباس نے قمر کی کلاس لی تھی۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں یہ نیا بکھیرا کھڑا کرنے کی؟ کیا تم پھوپھو اور ان کی بیٹی کی فطرت سے آگاہ نہیں ہو، پورے گاؤں میں تماشہ بنا کر رکھ دیا ہے انہوں نے ہمارا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔“ خضر بھاء نے سخت اشتعال میں اسے ڈنپا تھا۔ بے جی خاموش کھڑی چپ چاپ آنسو بہاتی رہیں تبھی قمر بولا تھا۔

”میں نے دوسری شادی کر کے کوئی گناہ نہیں کیا ہے بھاء! نورین بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے، میرا سکون بھی نہیں رہا اب اس کے پاس لہذا یہ میرا حق ہے کہ میں اپنے وارث کے حصول کے لیے دوسری عورت سے عقد کروں۔ بے شک میرا دین مجھے اس کا حق دیتا ہے، میں نورین کو بھی چھوڑ نہیں رہا بلکہ میں اپنی

رخصت ہوتی سردیوں کی ایک شام میں اس نے ریاض کو گھر بلایا تھا۔ اس کی ماں اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ ریاض اس کا پیغام ملتے ہی سر کے بل دوڑا چلا آیا تھا۔ تبھی کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد نورین نے اس سے پوچھا تھا۔

”میں جانتی ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتے ہو، اتنا کہ میرے لیے تم نے اپنی بیوی شگفتہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا حالانکہ وہ ظاہری حسن میں مجھ سے کہیں بڑھ کر تھی پھر بھی تم نے اسے قبول نہیں کیا۔ تمہاری بھابیوں کے ذریعے گاؤں کے بہت سے لوگ شگفتہ کی موت کی حقیقت جان چکے ہیں مگر میں نے تمہیں یہاں یہ کہانی سنانے کے لیے نہیں بلایا بلکہ یہ پوچھنے کے لیے بلایا ہے کہ اگر میں اس قمر عباس سے طلاق لے لوں تو کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟“ وہ ایک ماہر کھلاڑی تھی لہذا ہر کھیل میں ہمیشہ ترپ کا پتہ ہی پھینکا کرتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا تھا، ریاض کی بانجھیں کھل گئیں۔

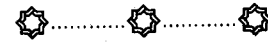
”کیسی باتیں کر رہی ہو نورین! میں تو ازل سے تمہارا طلب گار ہوں، اگر تم قمر عباس سے طلاق لے کر مجھ جیسے نالائق بندے کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر شروع کرتی ہو تو بھلا میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش بختی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ اصلی ہیرے کی قدر ایک جوہری ہی جانتا ہے مگر کاش یہ پھوپھو نے پہلے ہی سمجھ لیا ہوتا تو آج یوں تمہاری زندگی برباد نہ ہوتی۔“ اپنی رضا کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اس کے ساتھ ہمدردی جتنا بھی ضروری سمجھا تھا، نورین کا سراٹھانے میں ہل گیا، اس کا تیر عین نشاٹ پر لگا تھا۔

”تم صحیح کہتے ہو ریاض! می کو واقعی اصلی ہیرے کی پہچان نہیں ہوئی وگرنہ وہ میری شادی اس گھنیا انسان کے ساتھ نہ کرتیں جسے کبھی میری قدر ہی نہیں ہوئی یقیناً اس کی جگہ تم ہوتے تو یوں بچے کا بہانہ بنا کر ایسا گرا ہوا سلوک نہ کرتے میرے ساتھ۔“

”بالکل..... بچوں کا کیا ہے بچے تو گود بھی لیے جاسکتے ہیں۔“ وہ اس کی تائید میں سر ہلا رہا تھا۔ نورین کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شکریہ، تم نے میرا مان رکھ لیا، اب تم گھر جاؤ۔ میں امی سے بات کر کے ایک دو دن میں تمہیں سب فائنلی بتاتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے، میں تمہاری طرف سے پیغام کا انتظار کروں گا۔“ ریاض نے کہا تھا اور مسکراتے ہوئے باہر نکل گیا۔ دونوں گدھ ایک دوسرے کو نوچنے کا سوچ رہے تھے اور ادھر تقدیر کے پنوں پر سیاہی ہی سیاہی بکھرتی جا رہی تھی۔



ماضی کی گود میں رکھ آئے خواب اور خواہش
اک روگ بن گیا تھا اس وبال کا شعور
وہ پکارے تو دل لوٹ آتا ہے خوشی سے
پنچھی بھول جاتا ہے ہر بار نئے جال کا شعور



آکسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں
جس طرح مرگ جواں پر دیہاتوں میں
بوڑھیاں روتے ہوئے بین کیا کرتی ہیں
جس طرح ایک سیاہ پوش پرندے کے کہیں گرنے سے
ڈار کی ڈار زمینوں پر آتر آتے ہیں
چیخ شور مچاتے ہوئے گر لاتے ہیں
اپنے محروم رویوں کی المناکی پر
اپنی تنہائی کے ویرانوں میں چھپ کر رونا
اجنبیت کے گھٹا ٹوپ بیابانوں میں
شہر سے دور سیاہ غاروں میں چھپ کر رونا
اک نئے دکھ میں اضافے کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی ہی ذات کے گنجل میں الجھ کر رونا
اپنے گمراہ مقاصد سے وفا ٹھیک نہیں
ہم پرندے ہیں نہ مقتول ہوائیں پھر بھی
آکسی روز کسی دکھ پر اکٹھے روئیں



شہر زاد نے درکنون کا آفس جوائن کر لیا تھا۔ اس روز وہ آفس آئی تو شہر زاد پہلے سے اس کے کمرے میں موجود تھی۔ مکمل بلیک سوٹ میں اس کا سنہری مائل خوبصورت سراپا قیامت ڈھا رہا تھا۔ درکنون اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

”السلام علیکم! آج خیر ہے؟“

”وعلیکم السلام! سب خیر ہے۔ تم سناؤ آج اتنی لیٹ کیوں ہو گئیں؟“

”گاڑی ورکشاپ گئی ہوئی تھی، ممی کی گاڑی کی چابی نہیں ملی آج پبلک ٹرانسپورٹ سے آئی ہوں۔“

”واؤ پھر تو بڑا مزہ آیا ہوگا؟“

”جی ہاں، پبلک ٹرانسپورٹ میں بندہ مزے ہی کرتا ہے۔“ پرس ٹیمبل پر رکھتے ہوئے اس نے اپنی

سیٹ سنبھالی، شہر زاد کھل کر مسکرا دی۔

”چلو خیر ہے کبھی کبھی گورنمنٹ سروس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔“ وہ اسے چڑا رہی تھی،

درکنون نے خاموش رہنے میں عافیت جانی، تبھی شہر زاد پھر بولی۔

”پتا ہے دری! پرسوں میں صیام کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی، لائٹ کنکشن تاحال بحال نہیں ہو

سکا ان کا تبھی شگفتہ اور صیام نے مل کر رات کے اندھیرے میں جسٹ کینڈل لائٹ کی مدد سے کھانا تیار کیا۔“

دری بڑا مزہ ہے غربت کا بھی اپنا مزہ ہوتا ہے نا؟“

”ہوں.....“

”تم صیام کی تنخواہ کیوں نہیں بڑھا دیتیں، وہ ایک قابل ورکر ہے۔ اگر اس کی تنخواہ بڑھ جائے تو یقیناً

اس کی زندگی اور گھر کے چھوٹے چھوٹے سینکڑوں مسائل حل ہو سکتے ہیں۔“

”جانتی ہوں۔“

”جانتی ہو تو کچھ کرتی کیوں نہیں؟“

”جیسا تم چاہتی ہو ویسا کچھ نہیں ہو سکتا شہر! سارے ملازمین کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اگر میں

صرف صیام کی تنخواہ میں اضافہ کرتی ہوں تو باقی کے ورکرز کو اعتراض کرنے کا موقع مل جائے گا اسی لیے میں نے

صیام کے ساتھ ساتھ باقی ورکرز کی تنخواہوں میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔“

”ویری گڈ، تم واقعی بہت اچھی باس ہو دری!“

”شکریہ۔“

”تمہیں پتا ہے اس کی بہن شگفتہ کے سسرال والوں نے رشتہ ختم کر دیا ہے؟“

”واہ؟“

”ہاں یار! وہ لوگ اس کے والد کی رحلت پر آئے تھے افسوس کرنے، ساتھ ہی رشتے سے بھی

معذرت کر گئے، کل ہی اس لڑکے کا کسی اور جگہ رشتہ پکا ہو گیا ہے۔“

”اوہ یہ تو حقیقتاً بہت بُرا ہوا۔“

”غریبوں کی زندگی میں زیادہ تر سب بُرا ہی بُرا ہوتا ہے دری! کاش میرے بس میں ہوتا تو میں صیام

کی زندگی کے سارے دکھ سمیٹ لیتی۔“ شہر زاد بہت سنجیدگی سے کہہ رہی تھی، درکنون نظر جھکا گئی۔

”ایک بات پوچھوں شہر زاد! سچ بتاؤ گی؟“

”ہوں پوچھو!“ شہر زاد نے فوراً توجہ اس کی جانب مبذول کی۔ درکنون نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں

کو آپس میں پھنسا کر اپنا چہرہ مٹھیں پر ٹکا دیا۔

”کیا تم واقعی صیام میں انٹرسٹڈ ہو؟“

”آف کورس، تمہیں لگتا ہے میں ڈرامہ کر رہی ہوں؟“

”شاید۔“

”تم پاگل ہو دری اور کچھ نہیں۔“

”اوکے، ممتا بتا رہی تھیں عمر انکل پاکستان آ رہے ہیں؟“ فوراً سے پیشتر اس نے موضوع بدلا۔

”ہاں، ان کی یہاں کسی دوست سے بات ہوئی ہے، وہ اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔“

”اور تم؟“

”ظاہر ہے میں انہیں سپورٹ کروں گی۔“

”چلو اچھی بات ہے اب کام شروع کریں۔“

”ہوں۔“ شہر زاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ درکنون سر جھٹک کر کمپیوٹر میں مصروف ہو گئی۔



حنان کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آج کل وہ آفس میں زیادہ ٹائم دے رہا

تھا۔ اس وقت بھی اپنے کیمین میں موجود وہ مکمل تندہی سے کام میں مصروف تھا جب صیام درکنون کے آفس سے

نکل کر سیدھا اسی کے پاس چلا آیا، حنان نے اسے دیکھ کر فوراً کام روکا۔

”تم یہاں آفس میں؟“

”ہوں، کچھ ضروری کام تھا بس ابھی گھر کے لیے نکل رہا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں بھی شام تک چکر لگاؤں گا، ویسے ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مناؤ تو۔“

”ہوں پوچھو۔“

”کیا تم شہر زاد میں انٹرسٹڈ ہو؟“

”تم سے کس نے کہا؟“

”مجھے ایسا لگا کیونکہ پچھلے دنوں سے وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہیں۔ گھر، ہسپتال، اور یہاں آفس میں

بھی۔“

”تو اس سے یہ بات کہاں ثابت ہوتی ہے کہ میں ان میں یا وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہیں؟ وہ ایک نیک

دل لڑکی ہیں حنان! تمہیں ان کی یا میری نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔“

”میں شک نہیں کر رہا مگر یہاں آفس میں ایک دو لوگ تمہیں اور انہیں لے کر باتیں کر رہے تھے تبھی کلیئر کرنا مناسب سمجھا۔“

”لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہے یا! میں پروا نہیں کرتا ویسے بھی میرے دل میں ان کے لیے ایسا ویسا کچھ نہیں ہے، نہ کبھی ہو سکتا ہے۔“

”گلد“ کل تمہاری فیائسی کی دوست بتا رہی تھی کہ شہزاد میڈم جلد ہی اپنی الگ براچ جوائن کرنے والی ہیں جس میں تمہارے لیے انہوں نے میجر کی سیٹ ریزرو کی ہوئی ہے ایسا اگر ہوا تو کیا تم یہ کمپنی چھوڑ دو گے۔“

وہی بات جو اندر درکنون نے اس کے گوش گزار کی تھی، اب حنان بھی اسی بات کا تذکرہ کر رہا تھا تو کیا درکنون سب کچھ پہلے ہی جانتی تھی؟ کیا اس کی تنخواہ میں اضافے کے پیچھے واقعی یہی بات تھی؟

”نہیں۔“ فوراً سے پیشتر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کوئی کتنی ہی اچھی جاب آفر کیوں نہ کرے میں یہ کمپنی نہیں چھوڑ سکتا۔“

”وجہ؟“ حنان جیسے سب جان لینا چاہتا تھا۔ صیام کو مجبوراً نگاہ چرائی پڑی۔

”وجہ میرا رشتہ حنان ہے جو یہاں میرے ساتھ ہوتا ہے، کہیں اور چلا گیا تو بھلا تمہاری شکل کہاں دیکھنے کو ملے گی۔“

”اچھا بچو، میں جیسے تمہیں جانتا نہیں ہوں، ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔“

”کوئی کالا نہیں ہے، اب تم ذرا توجہ سے پنا کام کرو میں پہلے ہسپتال اور پھر گھر کے لیے نکلتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے مگر میں وجہ جان کر رہوں گا یہ یاد رکھنا۔“ دروازے سے نکلتے نکلتے حنان نے اس سے کہا

”تو وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر اس کے کہیں سے باہر نکل گیا۔ باہر گاڑی میں شہزاد اس کی منتظر تھی، صیام کو مجبوراً اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھنا پڑا۔“



”آپ یہاں کب سے جاب کر رہے ہیں صیام؟ میرا مطلب ہے درکنون کے پاس؟“ گاڑی ہسپتال کی طرف رواں دواں تھی جب شہزاد نے ڈرائیو کرتے ہوئے صیام سے پوچھا جو بے نیازی سے باہر دیکھتے ہوئے خاموش بیٹھا تھا، شہزاد کے سوال پر اس نے توجہ سامنے مرکوز کی۔

”زیادہ عرصہ نہیں ہوا، کیوں؟“

”ویسے ہی، میرے پاس آپ کے لیے اس سے بھی بہتر جاب کی آفر ہے۔“

”شکریہ مگر میں فی الحال اپنی جاب سے مطمئن ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس جاب سے آپ اپنے گھر والوں کی ذمہ داری ٹھیک سے پوری نہیں کر پا رہے۔“

”اللہ مالک ہے، آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سو تو ہے پھر بھی آپ کبھی اپنی اس جاب سے غیر مطمئن ہوں تو پلیز میری آفر پر ضرور غور کیجیے گا۔“

”جی ٹھیک ہے..... شکریہ آپ نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔“

”نہیں شکریہ کی کوئی بات نہیں، ویسے ایک بات پوچھوں اگر آپ کو برانہ لگے؟“

”جی پوچھیے۔“ وہ اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، شہزاد کچھ سوچتے ہوئے سامنے سڑک پر دیکھتی

رہی، گاڑی کی رفتار اب پہلے سے بھی کم ہو گئی تھی۔

”کیا آپ نے زندگی میں کسی سے محبت کی ہے؟“ صیام کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے ایسا کوئی

سوال بھی کر سکتی ہے، تاہم پھر بھی اس نے پھر سے نگاہ باہر کے مناظر پر نکاتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

”جی ہاں۔“ شہزاد کے پاؤں اس کے غیر متوقع جواب پر فوراً بریک پر پڑے تھے۔

”کس سے؟“

”ہے کوئی پھولوں سے رنگ روپ والی، چاند کی چاندنی سے بھی زیادہ اجلی لڑکی۔“

”کہیں آپ اپنی فیائسی کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”نہیں۔“

”کیا وہ لڑکی بھی آپ سے محبت کرتی ہے؟“

”نہیں، اسے تو میرے اندر شور مچاتے جذبات کا پتا بھی نہیں اور نہ ہی میں کبھی اسے یہ پتا لگنے دوں گا

کیونکہ میری اور اس کی حیثیت میں بہت فرق ہے۔ میں ساری زندگی اس کا خدمت گار بن کر تو رہ سکتا ہوں مگر ہمسفر بن کر شاید کبھی نہیں رہ سکتا۔“

”آہم..... کیا وہ آفس میں بھی ساتھ ہوتی ہے؟“

”جی ہاں، صرف آفس میں ہی نہیں میرے ہر پل میں وہ میرے ساتھ ہوتی ہے۔“

”گلد“ کیا آپ کے گھر والوں نے اسے دیکھا ہے؟“

”جی ہاں، والد صاحب کی رحلت کا افسوس کرنے آئی تھی وہ۔“ صیام اس کے ہر سوال کا فوری جواب

دے رہا تھا۔ شہزاد کے اندر عجیب سی ہلچل شروع ہو گئی، صیام کے والد صاحب کی وفات کا افسوس کرنے آفس

سے صرف دو ہی لڑکیاں گئی تھیں، ایک وہ اور دوسری درکنون.....

درکنون جیسے بے حس باس سے صیام کی محبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، تو کیا وہ صاف لفظوں

میں اسے اپنے دل کی بات پہنچا رہا تھا۔ وہ تو تھی درکنون کے علاوہ جس کا اسٹینڈرڈ صیام کے اسٹینڈرڈ کے ساتھ

میل نہیں کھاتا تھا، وہی تو تھی جو صیام کے ساتھ رہنے کے باوجود اس کے اندر کا حال نہیں جان پاتی تھی۔ اسے لگا

جیسے ایک دم سے ہر چیز بے حد خوبصورت ہو گئی ہو۔ سامنے موجود تارکول کی سڑک بھی اس لمحے اسے بے حد

خوبصورت دکھائی دے رہی تھی، دل جھوم جھوم گیا۔ اس کے برعکس صیام کسی اور ہی سوچ میں گم تھا۔ شہزاد اگر

اس کے لیے دل میں کوئی غلط خیال رکھتی بھی تھی تو صیام نے اس سے سب کلیئر کر دیا تھا۔ بھلا اس کے دل میں جو

مقام درکنون کا بن چکا تھا کوئی اور اس مقام تک پہنچ بھی کیسے سکتا تھا۔



رات خاصی بیت گئی تھی جب اس نے اپارٹمنٹ میں قدم رکھا۔ گھپ اندھیرے میں نشے کی شدت کے باعث اس کے ہاتھ سوکچ بورڈ کو ڈھونڈنے میں ناکام ثابت ہوئے تھے بھی ایک دم سے وہاں کمرے کی ساڑی لائنس آن ہو گئی تھیں۔ زاویار نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اس کے سامنے کچھ ہی فاصلے پر ڈزسوٹ میں ملبوس صمد حسن صاحب کھڑے تھے، لمحے سے بھی قبل اس کا سارا نشہ ہرن ہوا تھا۔

”آپ؟“

”ہوں میں، کیوں خوشی نہیں ہوئی دیکھ کر؟“ وہ سنجیدہ تھے۔ ان کے چہرے پر پھیلا کرب ان کے اندر کی بے سکونی کا پتا دے رہا تھا۔ زاویار ایک طرف دھرے صوفے پر ڈھے گیا۔

”کیوں آئے ہیں یہاں؟“

”اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جانے۔“

”ایم سوری، مگر یہاں آپ کا کوئی بیٹا نہیں رہتا۔“

”مگر مجھے تو مغرب کی ہواؤں نے یہیں کا پتا دیا تھا۔“

”میں اس وقت آپ سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں ڈیڈ!“

”میں پسند بھی نہیں کروں گا کہ تم مجھ سے بحث کرو۔“

”تو پھر پلیز آپ یہاں سے چلے جائیں۔“

”چلا جاؤں گا مگر تمہیں ساتھ لے کر۔“

”مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا ہے میں مزید آپ کے ساتھ کوئی واسطہ رکھنا چاہتا ہوں۔“

”مگر کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں نے تم سے ایک چھوٹی سی حقیقت چھپائی؟“

”جی ہاں، آپ کے لیے چھوٹی سی حقیقت ہوگی مگر میرے لیے یہ میری پوری زندگی کا سوال تھا۔“

”کیا تم مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا ایک موقع بھی نہیں دو گے زاویار!“

”کیا اب بھی آپ کے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ ہے ڈیڈ! پچیس سال آپ نے مجھے ایک فریب میں رکھا، پچیس سال میں اپنی حقیقی ماں سے دور اس عورت کی محبت میں جیتا رہا جو حقیقت میں میری ماں کی غائب تھی۔“

”یہ سچ نہیں ہے زاویار۔“

”تو پھر سچ کیا ہے ڈیڈ! اگر یہ سچ نہیں ہے تو پھر آپ نے مجھ سے ہر بات چھپا کر کیوں رکھی؟ کیوں مجھے میری سگی ماں سے محروم رکھا، کیوں چھینا آپ نے مجھے ان سے کیوں ان کی جگہ کسی دوسری عورت کو دی انہیں ان کے ہی گھر سے بے دخل کیا؟“

”میں نے بے دخل نہیں کیا وہ خود مجھے چھوڑ کر گئی تھی۔“

”مگر کیوں؟ کوئی بھی عزت دار شریف عورت بلا وجہ اپنا گھر چھوڑ کر نہیں جاتی۔“

”میں نے کب کہا کہ وہ بلا وجہ چھوڑ کر گئی تھی؟“

”تو پھر وہ وجہ بتا دیں جس نے انہیں آپ کا گھر چھوڑنے پر مجبور کیا؟“ زاویار کا لہجہ تلخی سے پُر تھا۔ صمد صاحب کو بے ساختہ نظر چرائی پڑی۔

”انہوں نے میرا گھر اس لیے چھوڑا کیونکہ..... کیونکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی تھیں۔“

”وہاں.....؟“ زاویار کو لگا جیسے زمین اس کے قدموں تلے سے ہل گئی ہو۔

”ہوں..... میرے اور اس کے درمیان بہت فاصلے آگئے تھے اسی لیے اس نے اپنا راستہ الگ کر لیا۔“

تم سے یہ حقیقت اس لیے چھپائی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا ایک ٹوٹی پھوٹی شخصیت کا مالک ہو جہاں تک سارا بیگم کی بات ہے تو وہ کوئی آوارہ یا بدچلن عورت نہیں تھی زاویار! مجھ سے شادی سے پہلے اس کا اپنے سگے چچا زاد سے نکاح ہوا تھا۔ پرہیان اسی شخص کی بیٹی ہے مگر وہ شخص سارا کے قابل نہیں تھا اسی لیے دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ میرا سارا کے ساتھ کوئی افیر نہیں تھا، نہ ہی میں دوسری شادی کا خواہش مند تھا مگر میں بہت مجبور ہو گیا تھا ہسپتال میں بے بسی سے دم توڑتے سارا احمد کے والد میر صاحب میرے بزنس پارٹنر تھے۔ بہت احسانات تھے ان کے مجھ پر۔ میں ان کی منت کے سامنے بہت زیادہ دیر تک پہاڑ نہ بن سکا۔ بس یہی میری خطا ہے۔“ ایک باپ بہت ٹوٹے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔

زاویار کا سر جھک گیا، دل میں آنی بدگمانیوں کے بادلوں کو چھٹنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ کرنل صاحب نے بھی کچھ ایسا ہی کہا تھا اگر صمد حسن غلط ہوتے تو بھلا کرنل صاحب ان سے رابطہ کیوں رکھتے؟ واقعی شاید اس کی ماں غلط تھی تبھی تو صمد حسن کے ساتھ ساتھ وہ کرنل صاحب کو بھی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ زاویار نے پہلے اس نچ پر نہیں سوچا تھا اب سوچا تھا تو اپنے ہرری ایکشن پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

”ایم سوری پاپا! شاید میں نے آپ کو غلط سمجھا۔“

”اٹس اوکے، مائی سن۔“ صمد صاحب نے مسکرا کر کہتے ہوئے اپنے جوان بیٹے کو فوراً سینے سے لگایا،

ان کی کوشش بے کار نہیں گئی تھی۔

مریرہ بیگم کے کردار کی ذرا سی جھول دکھا کر برسوں کا سرمایہ ہاتھ آ رہا تھا تو یہ سودا برا نہیں تھا۔



”پری.....“ وہ اسٹور پر جانے کے لیے نکل رہی تھی جب ایلین نے اسے آواز دی۔ ڈارک بلوشرٹ پر جینز کی نیلی پینٹ پہنے وہ خاصا صاف ستھرا دکھائی دے رہا تھا، پرہیان ایڑھیوں کے بل اس کی طرف گھومی تھی۔

”ہوں۔“

”کہاں جا رہی ہو؟“

”کچھ کام ہے باہر، کیوں خیریت؟“

”ہوں خیریت ہی ہے، تمہارے ڈیڈ آئے ہوئے ہیں انگلینڈ شاید ان کی صلح ہو گئی ہے تمہارے بھائی

سے تبھی تمہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ مارتھا پیرس گئی ہوئی ہے کل تمہارا بھائی اس کے اپارٹمنٹ گیا تھا تمہارا پوچھنے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا، انیل نے اسے میرا پتا دے دیا، شاید تم نے یا مار تھانے اس کے سامنے میرا ذکر کیا ہو، تبھی اس نے تمہارے بھائی سے کہا کہ تم میرے گھر پر ہو سکتی ہو۔ تمہارے ڈیڈ اور بھائی کل آئے تھے میرے آفس۔“

”پھر.....“

”پھر میں نے ان سے کہا کہ تم میرے گھر آئی تھیں مگر میں شہر میں نہیں تھا، تم مایوس ہو کر کہیں اور چلی گئیں۔ یہ بھی کہ میرا اب تم سے کوئی رابطہ نہیں ہے، وہ مایوس واپس لوٹ گئے، کیا میں نے ٹھیک کیا پری؟“

”ہوں۔“ پر ہی ان نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”تمہیں دیر تو نہیں ہو رہی؟“

”نہیں، کیا؟“

”کچھ اور بھی بتانا تھا تمہیں۔“

”کیا؟“

”تمہارا فیانی تھا ناں وہ ساویز آفندی۔“

”ہوں، کیا ہوا اسے؟“

”اسے کچھ نہیں ہوا، میں اس سے ملا تھا جا کر۔“

”کیوں اور تم کیسے جانتے ہو اسے؟“

”یونیورسٹی پریڈ میں ایک بار وہ تم سے ملنے آیا تھا تبھی دیکھا تھا یہاں پچھلے دنوں ایک بار کلب میں بھی ملاقات ہوئی تھی اس سے۔“

”اوہ مگر تم اس سے خود جا کر کیوں ملے؟“

”کچھ ضروری کام تھا بزنس کے سلسلے میں اس لیے ملنا پڑا۔“

”ٹھیک ہے، کیا تم آج رات گھر پر ہو گے؟“

”شاید، کیوں؟“

”یونہی کچھ ڈسکس کرنا تھا تم سے۔“

”ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا گھر پر رہوں۔“

”شکریہ ایللی!“ اس کے شکریہ کے جواب میں ایللی مسکرا دیا۔ پر ہی ان اداس مگر مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھتی باہر نکل گئی۔



رخصت ہوتی سردیوں کی وہ ایک اداس شام تھی جب نورین نے پھر ریاض کو ملنے کا پیغام بھجوایا تھا، یہ ملاقات اس بار نورین کے گھر کی بجائے باہر کھیتوں میں طے تھی۔ ریاض دیئے گئے وقت سے بھی پہلے مقررہ جگہ پر موجود تھا۔ گہرے سرخ سوٹ میں ملبوس نورین کا حسن اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔

”ہاں بول، کیوں بلوایا ہے چوہدرانی صاحبہ۔“ بالکل اس کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوئے اس نے پُرشوق نگاہوں سے نورین کی آنکھوں میں جھانکا، جہاں کا جل کی باریک سی لکیر بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ نورین کے لب اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔

”کیا تجھے نہیں پتا کہ کیوں بلوایا ہے تجھے؟“

”مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے، تو کچھ بتائے گی تو ہی پتا چلے گا ناں۔“

”چل سن فیئر، میں نے امی سے ہماری شادی کی بات کی تھی۔“

”پھر؟“

”پھر کیا، وہ تو خوش ہو گئیں سن کے، تیری طرف تو پہلے ان کا دھیان ہی نہیں تھا ویسے بھی شگفتہ کے ساتھ تیری نسبت طے تھی اب وہ بھلا گئے بھائی کی بیٹی کا حق تو نہیں چھین سکتی تھیں ناں۔“

”ہوں، کہتی تو تو ٹھیک ہے پھر؟“

”پھر کیا، امی کو ہمارے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں مگر.....“

”مگر کیا؟“

”مگر ایک مسئلہ ہے ریاض۔“

”کیسا مسئلہ؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ قمر جان چھوڑنے کو تیار نہیں ہے یعنی وہ طلاق نہیں دے رہا۔“

”کیوں؟ وہ سالہا خود تو دوسری شادی کر کے بیٹھ گیا اور تجھے طلاق کیوں نہیں دے رہا؟“

”بس یونہی اذیت دینا چاہتا ہے اسے یہ بھی پتا لگ گیا ہے کہ تو نے ان کی بہن شگفتہ کی جان میری

وجہ سے لی ہے، تبھی وہ ہم دونوں کو سزا دینا چاہتا ہے۔“

”ایسی کی تیسری اس کی سزا کی۔“

”وہ بہت عیار انسان ہے ریاض، تو اسے نہیں جانتا۔“

”اسے چھوڑ اسے میں دیکھ لوں گا، تو بتا تو کیا چاہتی ہے اب؟“

”میں نے کیا چاہنا ہے؟ میانے کہتے ہیں کھی جب سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی پھر نیڑھی کرنی پڑتی

ہے۔“

”ہوں یعنی تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اس کا پتہ بھی صاف کر دیا جائے۔“

”بالکل کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔“

”ہوں کہتی تو تو ٹھیک ہے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا، اب تیری خوشی کی خاطر اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔“ ریاض کے لبوں پر معن خیز مسکراہٹ تھی،

نورین کے اندر تک ٹھنڈا تر گئی۔

جس شخص نے اس پر کسی اور عورت کو ترجیح دینے کا گناہ کیا تھا اس کی اتنی سزا تو جہنمی تھی۔



اس روز بہت دنوں کے بعد ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تھی۔ عمر گاؤں میں نہیں تھا۔ وہ آج کل ملک سے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ خضر بھاء اور نظر بھاء کے سسرال میں شادی تھی لہذا وہ دونوں اپنی اپنی بیگمات اور بچوں کے ساتھ عین مہندی والے دن حویلی سے رخصت ہوئے تھے۔ شہر بانو کا ساتواں مہینہ تھا مگر پھر بھی اس نے حویلی کے تمام کام بہت اچھے طریقے سے سنبھال رکھے تھے۔ قمر بھی پہلے سے زیادہ سنجیدہ اور سمجھدار ہو گیا تھا۔

اس روز وہ زمینوں پر اکیلا تھا، کپاس کی کٹائی ہو چکی تھی اور اب گندم کی فصل نے بھی زمین سے ڈرا ڈرا سا سر باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ قمر کو کوئی خاص کام تو تھا نہیں اس نے یونہی گوڈی شروع کر دی۔ ابھی وہ کام ختم کر کے گھر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ریاض اپنی گاڑی پر وہاں پہنچ گیا، قمر کی نظر جیسے ہی اس پر پڑی اس کا خون کھول اٹھا۔

”تو یہاں؟“

”ہوں، کیوں اچھا نہیں لگا دیکھ کر؟“ اس کے لبوں پر اشتعال دلانے والی مسکراہٹ تھی۔ قمر نے رمی

پھینک دی۔

”تجھ جیسے جانور کو دیکھنا کسے اچھا لگ سکتا ہے بھلا؟“

”مت بھول کہ یہ جانور ابھی کچھ وقت پہلے تیری بہن کا خصم رہ چکا ہے۔“ وہ گاڑی سے اتر آیا تھا۔

قمر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

”بدقسمتی تھی میری بہن کی جو رب سوہنے نے اس کا نصیب تجھ جیسے جانور کے ساتھ لکھ دیا ورنہ تجھ جیسے کتے کو تو اس کا آنچل بھی نہ دیکھنے دیتے ہم۔“

”اتنی نفرت؟“

”تو نفرت کے بھی لائق نہیں ہے۔“

”چل نہ سہی میں نے کون سے دانے لینے ہیں تجھ سے، میں تو صرف اتنا کہنے آیا تھا کہ نئی شادی ہوئی ہے تیری، مزے کر اور نورین کی جان چھوڑ دے ایسا نہ ہو کہ تجھے بھی اپنی دلاری بہن کے پاس جانا پڑ جائے۔“

”بکواس بند کر اور دفع ہو جا یہاں سے۔“

”اس کا مطلب ہے تو شرافت سے نہیں مانے گا؟“

”تو دفع ہوتا ہے کہ کروں تیرا بندوبست۔“

”تو کیا بندوبست کرے گا میرا، بندوبست تو تیرا میں کرنے آیا ہوں۔“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے گاڑی سے پہل نکالا اور پھر بنا کوئی موقع دیئے سامنے خالی ہاتھ کھڑے قمر پر فار کھول دیا۔ گولی قمر کے بائیں

بازو کے قریب سے ہوتی ہوئی پیچھے نکل گئی تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور پھر سنبھل کر کھڑا ہوا تھا کہ اس نے دوسرا فار بھی داغ دیا۔

دوسرا وار پہلے سے بھی زیادہ زور آور تھا، سنبھلنے کی لاکھ کوشش کے باوجود قمر اوندھے منہ تازہ تازہ گوڈی کی ہوئی زمین پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں اور منہ مٹی سے آٹ گئے تھے پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ریاض نے تیسرا وار بھی کر دیا۔ گاؤں کی خاموش فضا میں اس کے پہل سے نکلنے والے فارز کی آواز نے ارد گرد کے درختوں پر سینکڑوں پرندوں کو بے چین کر دیا تھا۔ روتے کر لاتے چیختے وہ انسانیت کی پستی اور جہالت پر کانٹیں کانٹیں کر رہے تھے۔

گندم کی سر اٹھاتی سنہری بالیاں، خون کی سرخ چنری اوڑھے جھک گئی تھیں۔ ارد گرد کے سنان کھیت نوحہ کنائیں تھے۔ آخری منظر جو عینی شاہدین نے دیکھا ریاض ملک قمر عباس کے قریب بٹیوں کے بل بیٹھا اس کے خون سے لت پت کشادہ سینے پر چاقو کے پے در پے وار کر رہا تھا جیسے اس روز وہ ہر طرح سے اس کی موت کی تسلی کر لینا چاہتا ہو۔

زر، زن اور زمین میں پھر ایک زندگی کو زن نے نکل لیا تھا۔ ایک اور قیمتی جان جہالت کی نذر ہو گئی تھی۔ ریاض نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا تھا، اب نورین کی باری تھی۔



رخصت ہوتی سردیوں کے اداس دنوں میں قمر عباس جیسے گمراہ جوان کے بے رحمانہ قتل نے پورے گاؤں کی فضا میں عجیب یاسیت بکھیر دی تھی۔ حویلی میں گویا قیامت پھا ہو گئی، اطلاع دینے والے نے صرف قمر عباس کے قتل کی اطلاع نہیں دی تھی بلکہ ایک قیامت کے پھا ہونے کی اطلاع دی تھی۔

سکھ چین کی چھاؤں میں تخت پر بیٹھی بے جی چھوٹی چھوٹی نفی بچیوں کو قرآن پاک کا درس دے رہی تھیں جب حویلی کے بیرونی دروازے پر زوردار دستک سنائی دی۔ شہر بانو اس وقت پالک چن رہی تھی، آٹا اس نے پہلے ہی گوندھ کر رکھ دیا تھا۔ آج نہ جانے کیا بات تھی کہ صبح سے ہی اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ عجیب بوجھل سی طبیعت ہو رہی تھی جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہو، اور بالآخر انہونی ہو گئی تھی۔

حویلی کے بیرونی گیٹ پر دستک دینے والا خیر کی خبر لے کر نہیں آیا تھا۔ بے جی ابھی تخت سے اٹھنے کا قصد کر ہی رہی تھیں کہ اچانک حویلی کے مزارعے نے ان کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔

”غضب ہو گیا چوہدرانی جی!“

”اللہ خیر کرے کیا ہوا؟“ ان کی نظریں مزارعے کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ دیکھ کر پتھر اگئی تھیں تبھی وہ نظریں جھکاتا ہوا بولا تھا۔

”قمر بھائی کا قتل ہو گیا ہے چوہدرانی جی! ابھی گاؤں کا بندہ اطلاع دے کر گیا ہے۔“

”کیا.....؟“ چوہدرانی کا ہاتھ بے ساختہ اپنے کلیجے پر پڑا تھا۔ اندر رسوئی میں پالک صاف کرتی شہر بانو کی سماعتوں میں جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا۔ بھلا قمر عباس کا قتل کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کی تو پورے

گاؤں میں کسی سے بھی دور نزدیک کی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو ہمہ وقت خوش رہنے اور خوش رکھنے والا لا اُبالی سانو جوان تھا۔ اس کا احساس تو ابھی اس کی کوکھ میں پل رہا تھا۔ ابھی تو اس نے اپنے دنیا میں آنے والے بچے کا چہرہ دیکھنا تھا، اس کی خوشی منانی تھی بھلا وہ ابھی سے خاک اوڑھ کر سونے کا ارادہ کیسے کر سکتا تھا؟

شام کے دھندلے گہرے پڑ رہے تھے جب گاؤں کے چند لوگ قمر عباس کے خون میں لت پت وجود کو اٹھا کر حویلی لے آئے۔

پورے گاؤں میں چوہدریوں کے بیٹے کے قتل نے گویا تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ماحول جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل کرنا اور قتل ہونا معمول کی بات تھی اسی ماحول میں قمر عباس کے بے رحمانہ قتل نے گویا جنگل میں آگ لگا دی تھی۔ اظہار ملک جو ساتھ والے گاؤں کے نمبردار سے ملنے گئے ہوئے تھے بیٹے کے قتل کی ناگہانی خبر سن کر لئے ہوئے مسافر کی طرح حویلی پہنچے تھے۔

وہاں کتنے لوگ تھے جنہوں نے اسے قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا، قطعی بے بسی سے زندگی کو الوداع کہتے ہوئے دیکھا تھا۔ کتنے لوگ تھے جنہوں نے ریاض ملک کا نام لیا تھا۔ اظہار ملک صاحب کو لگا جیسے روح نے ان کے بدن کا ساتھ چھوڑ دیا ہو۔ جوان لاڈلے بیٹے کی لاش پر وہ کسی کئے ہوئے درخت کی مانند گرے تھے، وقار ملک صاحب تک بھی اپنی سپوت کا کارنامہ اطلاع بن کر پہنچ چکا تھا۔

نئی حویلی کے وسیع احاطے میں چکور کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے وہ بے صبری سے ریاض ملک کے حویلی پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔ شام ڈھل چکی تھی اور اب رات کی سیاہی دن کے اجالے کو مکمل طور پر آغوش میں لیتے ہوئے اپنی بانہیں پھیلا رہی تھی جب ریاض حویلی پہنچا تھا۔ قمر عباس کے توانا جسم سے نکلنے والے سرخ خون کے دھبے اب بھی اس کے لباس پر اس کی درندگی کا واضح ثبوت بن کر دکھائی دے رہے تھے شاید وہ لباس تبدیل کرنے ہی حویلی آیا تھا۔ وقار ملک صاحب کو حویلی کے احاطے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے دیکھ کر ایک پل کے لیے اس کے چہرے کا رنگ اڑا تھا مگر اگلے ہی پل وہ اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے ان کے قریب چلا آیا۔

”السلام علیکم ابا!“

”چٹاخ.....“ اس کے سلام کا جواب وقار ملک صاحب نے اسے تھپڑ کی صورت دیا تھا۔

”ناہنجار..... گندی اولاد..... تجھے پتا بھی تھا کہ الیکشن سر پر ہیں اور میں نے ہر صورت یہ سیٹ جیتی ہے پھر بھی تُو نے ایسی احمقانہ حرکت کر ڈالی وہ بھی اپنے برابر کے لوگوں کے ساتھ؟ اتنی ہی گرمی چڑھی تھی خون میں تو مزار سے مر گئے تھے کیا سارے؟ کسی کا بھی گلا کاٹ دیتا پکڑ کے۔“ انہیں سکے جیتنے کے مرنے کا افسوس نہیں تھا بلکہ اپنے الیکشن کی فکر تھی۔ ریاض کو بھی ابھی یاد آیا تھا کہ الیکشن سر پر تھے بھی وہ شرمندگی سے بولا۔

”غلطی ہو گئی ابا!“ معافی چاہتا ہوں۔“

”معافی کے بچے تجھ سے میں بعد میں پنپوں گا ابھی اپنی یہ مکروہ شکل لے کر دفع ہو جا یہاں سے اور جب تک معاملہ ٹھنڈا نہ پڑ جائے، خبردار اگر گاؤں کا رخ کیا تو.....“ وہ اسے یوں ڈانٹ رہے تھے جیسے اس نے کسی انسان کا نہیں بے زبان جانور کا خون بہایا ہو اور یہ صرف وقار ملک اور ریاض ملک کی کہانی نہیں تھی،

پاکستان اور ہندوستان کے سینکڑوں دیہاتوں کی کہانی تھی جہاں جنگل کا قانون تھا جس کی لالچی اس کی بھینس والا معاملہ تھا۔

ریاض اپنے باپ کے حکم پر تابعداری سے سر ہلا کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے حویلی سے رخصت ہوتے ہی وقار ملک نے اپنے خاص خادم کو طلب کیا۔

”حکم سائیں۔“ ملازم ہاتھ باندھے مکمل تابعداری کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر تھا۔ تبھی انہوں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے حکم صادر کیا۔

”پتا کر گاؤں میں کون کون اظہار کے بیٹے کے قتل کا عینی شاہد ہے، جس جس نے بھی یہ قتل ہوتے دیکھا ہے ان سب کو فوراً حویلی میں حاضر کرو۔“

”جی سائیں۔“ خادم حکم لے کر اگلے ہی پل وہاں سے رخصت ہو گیا۔

وقار ملک صاحب سوچ بچار کرتے ہوئے آگے کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگے۔



گاؤں میں قتل کے عینی شاہدین میں مائی جیراں کا نام سرفہرست تھا۔ مائی جیراں کا گھر اظہار ملک صاحب کی زمینوں کے بالکل قریب تھا۔ جس وقت ریاض ملک نے قمر عباس کے وجود میں گولیاں اتاری تھیں مائی جیراں اتفاق سے اپنے گھر کے باہر ہی موجود تھی، مائی جیراں کی زندگی کی کہانی تو بہت طویل تھی مگر مختصر خلاصہ بس اتنا ہی تھا کہ اس کی صرف ایک ہی جوان بیٹی تھی شہناز! برسوں پہلے اس کے اکلوتے بیٹے کو جیل ہو گئی تھی وہ بھی ایسے جرم میں جس کا نہ خود مائی جیراں کو پتا تھا نہ اس کے بے گناہ بیٹے کو۔ اسے بس اتنا پتا تھا کہ رات کا وقت تھا جب پولیس کی گاڑی اچانک اس کے گھر پر آئی تھی۔ اس کے بیٹے کو تین دن سے تیز بخار تھا مگر دوپانی کے لیے پیسے نہیں تھے بس وہ گاؤں کے مولوی صاحب سے دو تین بار دم کروا آئی تھی جس سے تھوڑا بہت افادہ ہوا تھا مگر بخار کا زور مکمل طور پر نہیں ٹوٹا تھا۔ پولیس نے جب اس کے گھر پر دھاوا بولا وہ اپنے بیٹے کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی۔ دودھ کا برتن پولیس کو بے دھڑک گھر میں گھستے دیکھ کر اس کے ہاتھ سے چھوٹا تھا اور سارا گرم دودھ پکڑوں اور پاؤں پر جا گرا۔ وہ بس دیکھتی رہ گئی تھی جب ایک پولیس والے نے اسے سائیڈ پر دھکیل کر اس کے بخار سے نڈھال بیٹے کو گریبان سے پکڑ کر اٹھا لیا۔

”چل اوئے، تھانے چل کر سیوا کرتے ہیں تیری“ مائی جیراں پولیس والے کی بات سن کر بجلی کی سی سرعت سے اپنے بیٹے کے قریب آئی تھی۔

”کیا بات ہے تھانے دار صاحب! کیا کیا ہے میرے بیٹے نے؟“

”تھانے چل کر پتا لگے گا بی بی! کیا کیا ہے تیرے بیٹے نے۔“

”مگر اسے تو تین دن سے تیز بخار ہے۔“ مائی جیراں کے حواس گم ہوئے تھے، پولیس والے کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اتار دیتے ہیں تھانے لے جا کر اس کا بخار، پولیس والوں کی چھتر دل سے تو بڑے بڑوں کے ہوش

ٹھکانے آ جاتے ہیں، یہ تو ابھی بال ہے۔“ اس کے معصوم بیٹے کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے اس نے تھپڑ رسید کیا تھا، مائی جیراں کا کلیجہ جیسے کٹ گیا۔

عوام کی جان و مال کی حفاظت کے لیے وردی پہننے والی یہ مخلوق بھلا موت کے فرشتے سے کم کہاں ہوتی ہے کسی کے لیے۔ جن کو دیکھ کر غنڈوں اور گناہ گاروں کو کانپنا چاہیے وہی غنڈوں اور گناہ گاروں کے ساتھ دوستی پال کر عزت دار شریف لوگوں کے لیے خوف بن جائیں تو خدا کی زمین بہت چھوٹی پڑ جاتی ہے۔ مائی جیراں کے لیے بھی خدا کی زمین چھوٹی پڑ گئی تھی۔ اس وقت پولیس کی گاڑ کے روانہ ہوتے ہی وہ بھاگ کر حویلی آئی تھی جہاں اس کا نکراؤ وقار ملک صاحب کے ساتھ ہوا تھا انہیں سامنے دیکھتے ہی وہ ان کے پاؤں پڑ گئی۔

”سائیں آپ کی مدد چاہیے، پولیس میرے بیٹے کو تھانے لے گئی ہے۔“

”تھانے لے گئی ہے تو میں کیا کروں، قانون کے معاملے میں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔“

”آپ سب کچھ کر سکتے ہیں سائیں! میرا بیٹا آپ کی آنکھوں کے سامنے پل کر جوان ہوا ہے، وہ

بے گناہ ہے اس نے کوئی جرم نہیں کیا۔“

”اس نے کوئی جرم کیا ہے یا نہیں کیا، اس کا فیصلہ تو نے نہیں پولیس نے کرنا ہے۔ ان کا دماغ خراب نہیں ہے جو بنا کسی جرم کے وہ تیرے بیٹے کو اٹھا کر لے جائیں۔ آخر اوپر جواب دینا ہوتا ہے بھی پھر بھی اگر وہ بے گناہ ہوا تو آ جائے گا گھر، ایویں رولا نہ ڈال۔ اب ہٹ پرے..... شکار کے لیے لیٹ ہو رہا ہوں میں۔“ ایک ٹھوکر سے اس غریب بوڑھی عورت کو سائیڈ پر دھکیلتے ہوئے وقت کا وہ فرعون حویلی سے باہر نکل گیا تھا۔

مائی جیراں دوپٹے سے بے نیاز کسی لئے ہوئے مسافری طرح ناکام و نامراد گھر واپس لوٹ آئی، اس رات تھانے کی چار دیواری میں اس کا لعل پولیس گردی کی بھیٹ چڑھا تھا۔ جسے کبھی ماں نے باپ کی وفات کے بعد پھولوں کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا تھا، اسی جسم پر لوگوں کی جان و مال کے محافظوں نے درندگی اور بربریت کی اُن مٹ داستانیں رقم کر دی تھیں۔

سردیوں کی طویل راتیں تھیں۔ اس رات جیل اور تھانے کے عملے نے مائی جیراں کے بیٹے کی درد میں ڈوبی چیخیں سنی تھیں۔ اگلی صبح اس نمٹانے نے سب کے سامنے اقرار جرم کر لیا تھا۔ دو روز قبل ساتھ والے گاؤں کی جو جوان لڑکی اغوا ہوئی تھی پولیس والوں نے اسے اسی گاؤں کے ایک کھیت سے برآمد کر لیا تھا وہ بھی قطعی برہنہ حالت میں۔ اس لڑکی کا مردہ وجود اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اسے چھی طرح بے عزت کرنے کے بعد نہایت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا اور اس قتل کا ایک ہی واحد چشم دید گواہ تھا۔

”مائی جیراں کا بیٹا۔“ سزا تو ملتی تھی اسے، اندھے قانون کے ملک میں ایک بااثر مجرم کو جرم کرتے ہوئے دیکھنے کی سزا تو ملتی ہے۔ مائی جیراں کو کیا خبر تھی کہ جس شخص کے پاس وہ جرم کی بھیک مانگنے گئی تھی خود اسی شخص نے تو اس کے لعل کی جان کی قیمت ادا کی تھی۔

ہر حقیقت سے باخبر قانون کے رکھوالوں نے پورے پچاس ہزار میں کیس مائی جیراں کے بیٹے پر فٹ کر دیا تھا۔ اگلے روز گاؤں کے معززین اور لڑکی کے خاندان والوں کے سامنے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

مائی جیراں کے بیٹے کے اقرار جرم کے مطابق وہ کل رات کھیت میں کام کر رہا تھا جب اس نے ساتھ والے گاؤں کی اس لڑکی کو حویلی سے نکلنے ہوئے دیکھا وہ لڑکی اس کے گاؤں کی حویلی میں چوہدریوں سے اس کی شکایت کرنے آئی تھی کیونکہ وہ اکثر ساتھ والے گاؤں میں آتے جاتے اسے تنگ کرتا تھا اسی شکایت کا بدلہ لینے کے لیے اس نے رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھا کر اس کو بے بس کیا اور اپنے گھر سے دور کھیتوں میں لے گیا۔ لڑکی اسے سنگین دھمکیاں دے رہی تھی لہذا سزا کے خوف سے اس نے اس لڑکی کی جان لے لی۔

جوسبق اسے کل رات تھانے کی چار دیواری میں پڑھایا گیا تھا اس نے فرزد ہرایا۔ وہ جانتا تھا اقرار جرم کی سزا موت ہے مگر اقرار جرم کے بغیر جو سزا اسے کل تھانے کی چار دیواری میں ملی تھی وہ موت سے بھی بدتر تھی۔ کوئی این جی او، کوئی وزیر، کوئی قانون نافذ کرنے والا ادارہ اسے اس سزا سے بچا نہیں سکتا تھا تبھی اس نے وہ جرم قبول کر لیا جس کی اسے سمجھ بھی نہیں تھی۔ مائی جیراں سب کے سامنے اپنے اکلوتے بیٹے کے اقرار جرم پر پھٹی پھٹی نگاہوں کے ساتھ اسے ایک نیک دیکھ رہی تھی۔ کل شام تو وہ اسے گاؤں کے مولوی صاحب کے پاس خود دم کروانے لے کر گئی تھی۔ پرسوں صبح سے وہ ایک پل کے لیے بھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا تو پھر جو کھیت میں کام کرنے کے لیے گیا وہ کون تھا؟

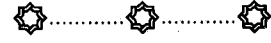
وہ روٹی تھی اور اس نے اپنی ممتا کا واسطہ دے کر اپنے بیٹے کو کہا تھا کہ وہ سچ بولے مگر اس کے بیٹے پر نہ اس کے رونے کا اثر ہوا تھا، نہ اس کی ممتا کے واسطے کا، وہ بڑی مضبوطی سے اپنے فیصلے پر قائم رہا تھا۔ نتیجتاً چند روز کے بعد پولیس نے اس پر فرد جرم عائد کر کے اسے شہر کی بڑی جیل میں بھجوا دیا تھا۔ کوئی بھی نہیں جان سکا تھا کہ اس نے اس اقرار جرم کے بدلے کیا بچایا تھا۔

ایک صرف اس کی بہن جانتی تھی کہ جس سے وہ دل کی ہر بات شیر کیا کرتا تھا۔ جس رات اس لڑکی کا قتل ہوا اس رات وہ بستر سے اٹھ کر رفع حاجت کے لیے باہر آیا تھا اور تبھی اسے دور کھیتوں سے کسی لڑکی کے چلانے کی آواز آئی تھی۔ وہ رفع حاجت سے فارغ ہو کر باہر آیا تو اسے گاؤں کی کچی سڑک پر ملک وقار کی جیب تیزی سے قریب سے گزرتی دکھائی دی۔

وہ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ کوئی انہونی ہوئی ہے مگر انہونی اس وقت نہیں ہوئی تھی، انہونی تو اس وقت ہوئی تھی جب اس نے ملک وقار کے اس جرم کا خود اعتراف کر لیا وہ بھی صرف پولیس والوں کی مار اور ملک وقار جیسے درندے کی طرف سے اپنی بہن کی عزت پامال ہونے کے خوف سے بھلا یہ راز کوئی جان سکتا تھا؟ یہ راز صرف وہی بہن جانتی تھی جسے گھر آ کر اس نے یہ راز بتایا تھا۔ چاند کی چاندنی میں نہ صرف اس نے ملک وقار کو دیکھا تھا بلکہ قریب سے جیب بھگاتے ملک وقار نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ جانتا تھا کہ اسے ملک وقار کی نظروں میں آ جانے کی سزا ملے گی یہی ہوا تھا۔

مائی جیراں نے اپنا مکان، بیٹی کے جینز کے لیے جمع کیا سارا سامان سب بیچ دیا مگر سب کچھ قانون کی اندھی دیوی پر لٹا کر بھی وہ اپنے لخت جگر کو پولیس اور قانون کے شکنجے سے نہ چھڑا سکی۔ عدالت نے اس کے اقرار جرم اور چوہدری کے دو پالتو کتوں کی گواہی کو برا ثبوت مانتے ہوئے اسے موت کی سزا سنائی۔

تبھی پورے دس سال اذیت ناک قید کاٹنے کے بعد ایک صبح وہ پھانسی کے تختے پر جھول گیا۔ ملک میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی مد میں جو ساٹھ فیصد بے گناہ پولیس وردی کے بعد اندھے قانون کی بھیٹ چڑھ کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں انہی بد نصیبوں میں سے ایک مائی جیراں کا بیٹا بھی تھا جس کا وہ ہر دن سوگ منایا کرتی تھی۔ پورے دس سال کے بعد وقت نے کروٹ لی تھی اور اب وقت کے فرعون کے جرم کی چشم دید گواہ وہ خود تھی۔



عجب دن تھے محبت کے، عجب موسم تھے چاہت کے
کبھی گریا آ جائیں

تو پلکوں پر ستارے جھللاتے ہیں
کسی کی یاد میں راتوں کو اکثر جاگنا معمول تھا اپنا
کبھی گر نیند آ جاتی تو ہم یہ سوچ لیتے تھے
ابھی تو وہ ہمارے واسطے رویا نہیں ہوگا
ابھی سویا نہیں ہوگا

ابھی ہم بھی نہیں روتے ابھی ہم بھی نہیں سوتے
سو پھر جاگتے تھے اور اس کو یاد کرتے تھے
اکیلے بیٹھ کر ویران دل آباد کرتے تھے

ہمارے سامنے تاروں کے جھرمٹ میں اکیلا چاند ہوتا تھا
جو اس کے حسن کے آگے بہت ہی ماند ہوتا تھا
فلک پر رقص کرتے اُن گنت روشن ستاروں کو
جو ہم ترتیب دیتے تھے تو اس کا نام بنتا تھا
ہم اگلے روز جب ملتے
تو گزری رات کی ہر بے کلی کا ذکر کرتے تھے
ہر اک قصہ سناتے تھے

کہاں کس وقت اور کیسے یہ دل دھڑکا بتاتے تھے
میں جب کہتا کہ جاناں آج تو میں رات کو اک پل نہیں سویا
تو وہ خاموش رہتی تھی
پراس کی نیند میں ڈوبی ہوئی دو جھیل سی آنکھیں
اچانک بول اٹھتی تھیں
میں جب اس کو بتاتا تھا کہ میں نے رات کو روشن ستاروں میں

تمہارا نام دیکھا ہے
تو وہ کہتی رضی تم جھوٹ کہتے ہو
ستارے میں نے دیکھے تھے اور ان روشن ستاروں میں
تمہارا نام لکھا تھا
عجب معصوم لڑکی تھی
مجھے کہتی تھی کہ اب اپنے ستارے مل ہی جائیں گے
مگر اس کو خبر کیا تھی کنارے مل نہیں سکتے
محبت کرے والوں کے ستارے مل نہیں سکتے



حمنہ کا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ چند دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ اپنی جاب پر واپس چلی گئی تھی۔
مریہ نے خود کو ننھے زاویار کی معصوم ذات میں مصروف کر لیا تھا۔ اب اسے صمید کے بدلے ہوئے شب و روز کی
پہلے جیسی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ اس روز وہ دوپہر کا کھانا پکا کر ابھی فارغ ہوئی تھی جب صمید خلاف توقع جلدی
گھر آ گیا۔

”کیا پکایا ہے؟“

”مٹر گوشت۔“ بنا اس کی طرف پلٹ کر دیکھے اس نے جواب دیا تھا جب وہ اس کے بالکل قریب
چلا آیا۔

”او کے آج رات تیار رہنا کہیں چلنا ہے۔“

”کہاں؟“ اب کے وہ پلٹی تھی جواب میں صمید نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”جہاں میرا دل چاہے لے جاسکتا ہوں کوئی اعتراض؟“ بہت دنوں کے بعد وہ اپنی پرانی ٹون میں
واپس آیا تھا، مریہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”نہیں، مگر میرے بیٹے کو بخار ہے میں اسے اتنی ٹھنڈ میں باہر لے کر نہیں جاسکتی۔“

”صرف تمہارا بیٹا؟“

”جی ہاں۔“ وہ بہت گہری نگاہوں سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا، مریہ نے رخ پھیر لیا۔

”کب سے بخار ہے اسے؟“

”پچھلے دو روز سے۔“

”مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”آپ کو کیوں بتاتی میں؟ آپ کا کیا تعلق ہے اس کی ذات سے؟ آپ نے تو مجبوراً میری شرط
پوری کی تھی اسے کیسے اور کتنے درد اکیلے سہہ کر پیدا کرنا ہے پالنا ہے یہ میرا درد سر ہے آپ کا نہیں۔“ وہ جذباتی
ہوئی تھی صمید نے رخ پھیر لیا۔

”ایسا مت کہو پلیز، وہ میری بھی ذات کا حصہ ہے کیونکہ اس نے اس عورت کے لپٹن سے جنم لیا ہے جسے میں اپنی زندگی مانتا ہوں۔“

”بکواس ہے یہ، نرا فریب ہے جو اول روز سے آپ دے رہے ہیں اور میں اس کا شکار ہو ہی ہوں۔“

”مریہ.....“ صمید کو دکھ ہوا تھا جب ہی وہ چلا اٹھی۔

”کچھ غلط نہیں کہا ہے میں نے، میں نے غلط سمجھا تھا آپ کو یہ میری غلطی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا کہ آپ دنیا کے دوسرے مردوں کی طرح نہیں مگر میں غلط تھی۔ مرد جس کلاس کے بھی ہوں ان کی فطرت ایک جیسی ہوتی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں آپ کی موجودہ سرگرمیوں سے واقف نہیں ہوں تو یہ آپ کی سب سے بڑی بھول ہے، جرم اور گناہ کبھی چھپائے نہیں چھپتے۔“

”کیسا جرم..... کیسا گناہ؟“ صمید کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا تھا، مریہ کی غم آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

”جس گناہ اور جرم کی میں بات کر رہی ہوں آپ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔“ وہ اپنے اندر طوفان چھپائے ہوئے تھی۔ صمید کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی ہوگی تبھی اس نے نظریں چرائی تھیں۔

”میں نے کوئی گناہ یا جرم نہیں کیا۔“

”بالکل..... آپ کی نظر میں یہ جرم یا گناہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے پرانی لڑکیوں کے ساتھ عیاشی کرنا، جھوٹ بولنا، کام کا بہانہ بنا کر اپنی بیوی کو دھوکے میں رکھنا..... یہ سب آپ کی نظر میں غلط ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ اگر یہی سب میں کرتی تب میں آپ سے پوچھتی یہ جرم یا گناہ ہے کہ نہیں۔“ صد شکر کہ وہ ابھی پورے سچ سے آگاہ نہیں تھی، تبھی وہ رخ پھیرے پھیرے بولا تھا۔

”اتنی پارسا تو تم بھی نہیں ہو جتنا خود کو دکھاتی رہی ہو۔ میں بھی تمہارے ماضی سے بے خبر نہیں ہوں۔“ پارسا عورت کے لیے اپنے ہی شوہر کے منہ سے نکلنے والے ایسے الفاظ کتنی تکلیف کا باعث بنتے ہیں کاش کوئی اس لمحے مریہ صمید سے پوچھتا۔

”کیا ہے کیا ہے ایسا میرے ماضی میں جو میں نے چھپایا ہے مگر پھر بھی آپ جانتے ہیں۔“ پتھرائی آنکھیں اب لبورنگ ہو رہی تھیں، صمید نے دل کا بوجھ نکال پھینکے میں ہی بہتری جانی۔

”تم بھی اچھی طرح واقف ہو کہ میں تمہارے ماضی کے کس راز کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔“

”میں واقف نہیں ہوں آپ بتائیں آپ کیا جانتے ہیں میرے ماضی کے بارے میں؟“

”میں نے بتا بھی دیا تو تم اپنی صفائی کیسے پیش کرو گی؟“

”وہ میرا مسئلہ ہے کہ مجھے صفائی پیش کرنی ہے یا نہیں، آپ مجھے وہ بتائیں جو آپ جانتے ہیں۔“

”تمہارے اور عمر عباس کے بیچ کیسے معاملات تھے؟“ اچانک اس نے اس سے پوچھا تھا اور وہ لنگ

رہ گئی تھی۔ ”اب پلیز یہ مت کہہ دینا کہ کون عمر عباس؟“

”میرے اس کے ساتھ جو بھی معاملات تھے بڑے ابا اور حویلی والوں سے پوشیدہ نہیں تھے اگر اس کے ساتھ میرا ذاتی معاملہ ہوتا تو آج میں عمر عباس کی بیوی ہوتی آپ کی نہیں۔“

”اسی بات کا تو روگ پال رکھا ہے اس نے، یہی غم تو اسے سیدے منہ مجھ سے بات نہیں کرنے دیتا۔ اسی صدمے کی وجہ سے تو ابھی تک وہ کنوارہ بیٹھا ہے، شاید تم نے اسے امید دلائی ہو کہ جلد ہی مجھ سے چھٹکارا پا کر تم اس کے ساتھ نکاح پڑھ لو گی، آخر یونہی تو حویلی بھاگ بھاگ کر نہیں جاتیں تم۔“ لفظ برجھیوں کی صورت دل پر کیسے لگتے ہیں مریہ رحمان کو بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے سچ بازار میں اس کے سر سے چادر چھین لی ہو۔

صمید حسن کے اندر اس کے لیے اتنا گند بھرا ہو گا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی تبھی اس کی آنکھیں چھلکی تھیں۔

”بس بہت ہو گیا صمید! اس کے بعد ایک لفظ نہیں۔“

”کیوں؟ خود پر بات آئی تو ناقابل برداشت ہو گئی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہر سچائی سے بے خبر جب تم مجھ پر لفظوں کی سنگ باری کر رہی تھی تو مجھے بھی ایسے ہی تکلیف ہوئی تھی۔“ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر مریہ نے اسے اس کا موقع نہیں دیا وہ پلٹی اور پھر بنا کچھ کہے کچن سے باہر نکل گئی تھی۔



رات میں زاویار کا بخار مزید بڑھ گیا تھا۔ وہ بہت زور زور سے رو رہا تھا اور مریہ اسے چپ کروانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھی جب صمید کمرے میں اس کے پاس چلا آیا۔

”لاؤ ادھر مجھے دو۔“

”نہیں میں سنبھال لوں گی۔“ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مسلسل روتی رہی ہے۔ صمید کو بے ساختہ پشیمانی نے آ گھیرا۔

واقعی اس نے مریہ سے بہت نامناسب الفاظ کہہ ڈالے تھے جو کچھ اس نے قمر عباس اور عمر عباس کے درمیان سنا تھا وہ محض ایک غلط فہمی بھی تو ہو سکتی تھی تبھی وہ بولا تھا۔

”مریہ میں بہت پریشان ہوں پلیز مجھے اور پریشان مت کرو۔“

”پریشان نہیں کرنا چاہتی اسی لیے تو کہہ رہی ہوں آپ جا کر سو جائیں، میں اپنے بیٹے کو سنبھال لوں گی۔“ مریہ کا لہجہ سپاٹ تھا، وہ چڑ گیا۔

”صرف تمہارا بیٹا نہیں ہے یہ، سمجھی؟“ کہنے کے ساتھ ہی اس نے زاویار کو مریہ کی ہانہوں سے نکال لیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ گھر سے باہر نکلا اور گاڑی نکال کر لے گیا، مریہ محض دیکھتی رہ گئی تھی۔



سرینگر سے 28 کلومیٹر شمال کی جانب جھیل ماسنبل کے کنارے پر ایک چھوٹا سا خوبصورت گاؤں ماسنبل آباد ہے۔ سدید علوی کو اسی گاؤں میں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔

کپواڑہ سے لولاب..... لولاب سے بانڈی پورہ اور بانڈی پورہ سے سردیوں کے شدید موسم میں بے حد مشکل ترین سفر کرتے ہوئے وہ جس بازی پورہ سے سیدھا گاؤں ماسنبل صفا پورہ پہنچا تھا جس کے مشرق میں طویل پہاڑی سلسلہ ہے۔

”کرش ٹاپ“ نامی بلند و بالا پہاڑ بھی اسی گاؤں میں واقع ہے۔ یہ طویل پہاڑی سلسلہ شمال کی جانب بانڈی پورہ اور پھر گاؤں لولاب سے جاملتا ہے جبکہ جنوب کی طرف یہ سلسلہ گاندربل اور صورہ سے ہوتے ہوئے ترل کی فلک بوس چوٹیوں کے ساتھ جاملتا ہے۔ چھ گاؤں پر مشتمل علاقہ صفا پورہ دو خوبصورت جھیلوں کے درمیان واقع ہے ایک طرف جھیل ماسنبل کی نیلگوں لہروں نے علاقے کے حسن کو چار چاند لگا رکھے ہیں تو دوسری طرف مغرب کی جانب لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے گزرتا دریا نے جہلم گویا پورے علاقے کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ انہی پر فضا وادیوں میں ایک چھوٹا سا گاؤں چھوٹا تھا جو کرش ٹاپ کے دامن میں آباد تھا۔ پہاڑ سے گرنے والے جھرنوں اور آبشاروں کی چھم چھم کرتی آواز جب رات کے وقت بند کمروں کے اندر آتی تو یوں محسوس ہوتا گویا کوہ قاف پر پریاں گنگنا رہی ہوں۔

اس گاؤں کو چاروں طرف سے لہلہاتے کھیتوں اور سیبوں کے باغات نے گھیر رکھا تھا۔ موسم بہار میں علاقے کی خوبصورتی اور دلکشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سروسوں کے پھولوں سے لدے ہوئے کھیت پورے ماحول کو معطر کر دیتے تھے۔ اسی گاؤں میں طیب احمد کا گھر تھا جو کشمیری مجاہد تھے اور جس کا سب سے بڑا خواب ہزاروں نوجوانوں کی طرح وادی کشمیر کی آزادی تھی جس پر بھارتی حکومت نے طاقت کے زور پر ناجائز پر قبضہ کر رکھا تھا۔

فاطمہ، طیب احمد کی بہن اور بے حد دلیر لڑکی تھی۔ اس کی عمر چوبیس سال مگر عزائم بے حد بڑے تھے۔ اپنے مجاہد بھائی طیب احمد سے اس نے بندوق چلائی بھی سیکھ رکھی تھی۔ فاطمہ سے چھوٹا طلحہ تھا جسے بھارتی فوج کی درندگی نے ایک ہاتھ سے معذور کر دیا تھا۔ طلحہ سے پانچ سال چھوٹی عائشہ تھی جو بے حد خوبصورت بچی تھی۔ سدید چونکہ یہاں ایک مجاہد کی حیثیت سے آیا تھا لہذا اسے طیب احمد کے گھر والوں سے بے تحاشا پیار ملا۔

شام ڈھل چکی تھی، جھیل ماسنبل سے آتی سرد ہواؤں کے تھپیڑوں اور سفر کی تھکن نے سدید کو بے ساختہ بستر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا تبھی ننھی عائشہ جس کا چہرہ کسی تازہ سیب کی طرح سرخ و سفید تھا ہاتھ میں کانگری لیے اس کے پاس چلی آئی۔

”یہ لیں سدید بھائی اسے اپنے بستر میں رکھ لیں، سردی کا احساس یوں اڑن چھو ہو جائے گا۔“ چٹکی بجا کر کہتے ہوئے اس ننھی پری نے اسے اس کے فرضی نام سے پکارا تھا جو یہاں آنے سے پہلے اس کے افسران نے اسے ڈی کوڈ کیا تھا۔

طیب احمد کے گھر والے اسے اسی نام کی شناخت سے جانتے تھے۔ سدید ننھی عادیہ کے ہاتھ میں کانگری دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کشمیر کی مقبوضہ وادی میں یہ اس کا پہلا سفر اور قیام تھا لہذا کانگری کو دیکھ کر حیران ہونا فطری بات تھی۔ ننھی عائشہ کے ہونٹ کانگری سے اس کی لاعلمی پر مسکرائے تھے۔

”کیا ہوا؟“

”یہ کیا ہے اور میں بھلا اس کا کیا کروں گا؟“ اس نے ایک نظر کانگری پر ڈالتے ہوئے ننھی عائشہ کے سوال کے جواب میں پوچھا تھا تبھی وہ کھل کر ہنس پڑی پھر اس کی معلومات پر افسوس کرتے ہوئے بولی۔

”آپ کو اتنا بھی نہیں پتا کہ یہ کیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا تبھی احمد نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے اس کی مشکل آسان کی تھی۔

”یہ کانگری ہے، ہمارے کشمیری کلچر کا ایک اہم حصہ، یہاں کشمیر میں اس کے بغیر سردیاں گزارنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ کشمیر میں وہ غریب لوگ جو الیکٹرک روم ہیٹر انفرڈ نہیں کر سکتے ان کے لیے یہ چھوٹی سی چیز ہی غنیمت ہے۔ یہاں ہمارے لوگ اسے بستر میں رکھ کر نہ صرف اپنے بستر گرم کرتے ہیں بلکہ اسے دستوں سے پکڑ کر کشمیر کا ہر بوڑھا، بچہ، جوان بے خوف و خطر اسے اپنے فیرن (کشمیری جبہ) میں رکھ کر جہاں چاہ مزے سے گھوم پھر سکتا ہے۔“

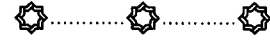
”واؤ، پھر تو یہ واقعی کمال کی چیز ہے۔“ حیرانی سے کہتے ہوئے سدید نے اس چھوٹی سی ٹوکری کو غور سے دیکھا جو کانگری کے نہایت باریک تنکوں سے بنائی ہوئی تھی۔ اوپر کی طرف دو خوبصورت دستے بنے ہوئے تھے اور اندر کی طرف مٹی کا چھوٹا سا پیالہ نصب کیا تھا جس کے اندر دھکتے ہوئے سرخ انگارے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

”اگر میں بستر میں رکھوں تو کیا بستر نہیں جلے گا؟“

”جلے گا، جب تک آپ اس کے استعمال میں ماہر نہیں ہوں گے آپ کانگری سے استفادہ حاصل نہیں کر سکتے۔“ اس بار طیب کے بزرگ باپ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ سدید نے یہ جواب سن کر فی الحال اسے محض ہاتھ گرم کرنے تک ہی رکھا۔



کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برسات کے بعد
دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد



اداس موسم میں زرد پتے!
یہاں تم کو بلارہے ہیں
نجانے کتنی رُتوں سے پیاسے!
یہ دشت تیرے منتظر ہیں
کبھی تو لوٹو کبھی تو پلٹو
کہ زندگی میں دیرائیاں ہیں
بنا تمہارے.....!!
یہ موسموں کی ادائیں دیکھو
کبھی ہنسائیں کبھی رلائیں.....
تم بھی کہو اب کیا کریں ہم؟
یاد رکھیں کہ بھول جائیں؟

اس رات جمیل ماسنبل سے اٹھنے والی سرد ہواؤں کے تھپڑوں نے سدید کو بے ساختہ کپکپائے پر مجبور کر دیا تھا۔ دن بھر اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد رات کو وہ گھر آیا تو سب بڑے ہال نما کمرے میں بیٹھے آگ تاپ رہے تھے۔ وہ بھی فریش ہو کر سب کو سلام کرتا اپنے بستر میں گھس گیا تھا۔ فاطمہ اس کے لیے گرم کھانا اور کشمیری چائے لے آئی تھی۔ سدید نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹرے تھام لی۔ فاطمہ کی ماں بے پناہ حسن کی مالک ایک سادہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ سدید نے انہیں اب تک بہت کم بات چیت کرتے دیکھا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اللہ رب العزت کے ذکر میں بسر کیا کرتی تھیں یا پھر گھر کے کام کاج میں..... سدید ان کا بے حد احترام کیا کرتا تھا۔ وہی اس وقت اسے کہہ رہی تھیں۔

”تم ابھی یہاں کشمیر کی سردی کے عادی نہیں ہو بیٹا اس لیے بہتر ہے تم آج اپنے بستر کو کانگری سے گرم کر لو۔“ سدید انہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہ کارگل اور سیاجن کے برف پوش پہاڑوں پر کئی کئی ہفتے گزار چکا ہے، چیوا پیچنے تک بھی اس کا مقابلہ برفانی سرد ہواؤں اور تھپڑوں سے رہا تھا، سردی اس کے حوصلے کمزور نہیں کر سکتی تھی مگر..... اس پر نور چہرے والی مشفق خاتون کے خلوص کا احترام کرتے ہوئے اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ ”چیوا“ میں گزرے پچھلے چند دنوں نے اسے کسی حد تک کانگری کے استعمال سے استفادہ کرنا سکھا دیا تھا۔ رات میں سردی کے مزید بڑھ جانے کا امکان تھا۔ عائشہ اسے کانگری دے گئی تھی۔ کانگری پیش کرنے کے دوران اس نے سدید سے پوچھا تھا۔

”ایک بات پوچھوں صدید بھائی۔“

”ہوں پوچھو۔“ وہ اس ننھی سی پری کو دیکھ کر مسکرایا تھا۔ عائشہ کچھ پل سوچ میں ڈوبی رہی پھر قدرے

یاسیت سے بولی۔

”آج پھر دوپہر میں ادھر وہ آرمی والے آئے تھے، ان کے پاس بہت بڑی بڑی بندوقیں تھیں۔ پتہ ہے آج وہ سنگھاڑوں والی اماں کے بیٹے کو مار کر پھینک گئے۔ فاطمہ کہتی ہے یہ لوگ ادھر ہمارے کشمیر پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ سارے لوگوں کو مار کر یہاں خود رہنا چاہتے ہیں۔ کیا ان کے پاس رہنے کے لیے اپنا گھر نہیں ہے؟“ وہ اتنی معصومیت سے سوال پوچھ رہی تھی کہ سدید بے ساختہ شاکہ انداز میں اس کے معصوم سے چہرے پر بکھری فکر مندی کے احساس کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ وہ کن لوگوں کی بات کر رہی تھی سمجھنا مشکل نہیں تھا۔ تبھی اس نے نرمی سے اس کا گال چھوا۔

”کیا وہ لوگ روز ادھر آتے ہیں؟“

”ہاں..... کبھی کبھی روز، کبھی کچھ دنوں کے بعد، آپ کو پتہ ہے انہوں نے طلحہ کا بازو بھی توڑ دیا تھا، ابا کو بھی بہت مارا تھا۔ یہ لوگ ہمیں ہمارے ہی کشمیر میں کیوں نہیں رہے دیتے صدید بھائی، ہم نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟“ کتنی پریشانی سے وہ پوچھ رہی تھی۔ سدید نے بے ساختہ چہرے کا رخ پھیر لیا۔

اب وہ اس ننھی کلی کو کیا بتاتا کہ جن قوموں کے حکمران خود بک جائیں اور اپنی ریاست کے ایک ایک فرد کی بولی لگا کر اس کے دام وصول کر لیں، وہاں سالوں انسانیت منہ چھپائے بلکتی پھرتی ہے، اس سے پہلے کہ وہ عائشہ کو کوئی جواب دیتا وہاں فاطمہ چلی آئی۔

”تم سوئی نہیں اب تک؟“ عائشہ شاید فاطمہ سے ڈرتی تھی تبھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”سورہی ہوں، میں تو بس صدید بھائی کو کانگری دینے آئی تھی۔“

”ٹھیک ہے اب چلو۔“

بنا سدید کی طرف دیکھے وہ عائشہ کو بازو سے پکڑ کر لے گئی تھی۔ سدید اس رات بہت دیر تک جاگتا رہا۔ گھر کے تمام افراد تھوڑی دیر میں سو گئے تھے سوائے طیب احمد کے جو کبھی کبھار چھپ چھپا کر گھر آتا تھا۔ رات کے سنانے میں پہاڑ سے گرنے والے جھرنے اور آبشاروں کی جھم جھم بند کردوں کے کواڑوں

سے اندر آتی گویا واقعی پریوں کی لوری سنا رہی تھی۔ سدید کی کب آنکھ لگ گئی اسے پتہ ہی نہ چلا۔ سونے سے پہلے وہ کانگری کو بھی بستر سے نکالنا بھول گیا تھا۔ نتیجتاً اگلے روز جب ابھی صبح پھوٹنے ہی والی تھی اسے طیب احمد کے گھر والوں کے سامنے سخت شرمندہ ہونا پڑا۔ رات نیند میں کانگری بستر میں الٹ گئی تھی۔

فاطمہ کی آنکھ کھلی تو وہ دونوں ہاتھوں سے جلتے بستر کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے ساختہ اس کے گلابی لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ عائشے سپارہ پڑھنے جا چکی تھی۔ اس کے والد اللہ یار مسجد اور والد نور بانو بھی فجر کی نماز کے بعد حسب معمول ذکر و اذکار میں مصروف تھیں۔ تبھی وہ جو ناشتہ بنانے کی غرض سے باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی پلٹ آئی۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ سدید نے اس کے سوال پر پلٹ کر دیکھا اور قدرے شرمندگی سے چہرہ

موڑ لیا۔

”معافی چاہتا ہوں رات میں نیند کے دوران پتہ ہی نہیں چلا کہ کب.....“

”کوئی بات نہیں آپ نماز پڑھ لیں، میں بستر بدل دیتی ہوں۔“

”مگر..... میں واقعی بہت شرمندہ ہوں۔“

”نہیں اس میں شرمندہ ہونے والی کوئی بات نہیں، اجنبی لوگوں کو تھوڑا ناگوار لگتا ہے یہاں سیٹ ہونے

میں، آہستہ آہستہ آپ بھی سب سمجھ جائیں گے، آپ ہمارے مہمان ہیں، ہمارے لیے اتنی مشکلات اٹھا کر یہاں تک پہنچے ہیں، آپ کے لیے تو کشمیریوں کی جان بھی حاضر ہے، ایک بستر کی تو کوئی اوقات ہی نہیں۔“ وہ شکل و صورت میں جتنی حسین تھی اسکی آواز اور لب و لہجہ اس سے بھی کہیں زیادہ دلنشین تھا۔

سدید شرمندہ شرمندہ اثبات میں سر ہلاتا وضو کرنے چل دیا۔ آج دوپہر گیارہ بجے اسے اپنے ایک ساتھی سے ملنا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد گھر والوں کو سلام کر کے گھر سے نکل گیا۔ عائشے اسکول گئی تھی جبکہ اللہ یار صاحب کسی ضروری کام سے ”چیوا“ سے باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر پر صرف نور بانو اور فاطمہ ہی تھیں جب انڈین آرمی کی بکتر بند گاڑیاں اس علاقے میں گھس آئیں۔

طلحہ کو بخار تھا وہ اس کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی جب اس کے کانوں میں دروازے کے اس پار باہر گلی میں اٹھنے والے شور کی آوازیں پڑیں۔ شراب کے نشے میں مست بتوں کے پجاری اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے اس علاقے کے ہر گھر پر چھاپہ مار رہے تھے اور چھوٹا بڑا نوجوان جوان کے ہاتھ لگتا اسے گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہے تھے۔ فاطمہ کا دل ایک بار پھر بے ساختہ دھڑکا۔

”یا اللہ خیر۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے گھر کے بیرونی دروازے کو فوری لاک کیا مگر ابھی وہ پلٹی ہی تھی کہ وحشی درندوں نے اس کے گھر کی چوکت کو بھی ٹھڈے اور ٹھوکروں پر رکھ لیا یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ دروازہ توڑ دینے کا عزم رکھتے ہوں۔ فاطمہ کو مجبوراً لاک گرا تا پڑا۔

”طیب کہاں ہے؟“ جیسے ہی اس نے لاک کھولا کئی فوجی ایک ساتھ دندناتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ فاطمہ بے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

”وہ گھر پر نہیں ہیں۔“

”ہنو پیچھے جیسے ہمیں پتہ ہی نہیں تم جیسی مکار قوم کا، پتہ نہیں کتنے ملی ٹینٹ گھر میں گھسار کھے ہوں گے۔“ ایک فوجی غصے سے کہتا اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر دھکیلتے ہوئے اندر کمرے کی طرف بڑھا تھا۔ فاطمہ تیر کی طرح اس کے پیچھے لگی۔

”میں نے کہا ناں، وہ گھر پر نہیں ہیں، انہیں پکڑنا ہے تو وہاں کرش ٹاپ کی پہاڑی پر جاؤ اور پکڑ لو۔“ ”چٹاخ۔“ اس کے بولنے پر اندر کمرے کی طرف بڑھتا فوجی پلٹا اور پھر رک کر ایک تماچہ اس کے گال پر جڑ دیا۔

”زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں۔“

فاطمہ جانتی تھی کہ مجاہدین کے ٹھکانے کا پتہ ہونے کے باوجود وہ لوگ کرش ٹاپ کی پہاڑی کا رخ نہیں کرتے تھے تبھی اس نے طعنہ مارا تھا۔ جواب میں انڈین فوجی کا رد عمل اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔ اندر کمرے میں سویا طلحہ بھارتی فوج کو اپنے گھر کے آنگن میں دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا تھا۔ تبھی بھارتی فوجی آگے بڑھا اور اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”چلو وہ نہیں ہے تو اس کا بھائی سہی۔“

باقی فوجی اس کے گھر کا کونہ کونہ چھان چکے تھے۔ فاطمہ تڑپ اٹھی جبکہ اس کی ماں بھی کمرے سے نکل کر صحن میں چلی آئی تھی۔

”اسے چھوڑ دو، یہ بیمار ہے۔“

”چھوڑ دیں گے جب تمہارا بڑا بیٹا ہاتھ چڑھ گیا۔“

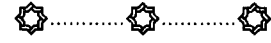
”یہ ظلم ہے خدا سے ڈرو کافرو، وہ بچہ ہے۔“ مگر ان لوگوں نے اس کی صدا نہیں سنی تھی۔ وہ قطعی بے دردی سے طلحہ کو گھسیٹ رہے تھے جو اس سے پہلے بھی ان کے عتاب کا شکار ہو چکا تھا۔ اب بھی وہ فوجی اسے ملے اور گھونے مارتا لے جا رہا تھا۔ فاطمہ نے جو اسے روتے اور تڑپتے دیکھا تو فوراً لپک کر اس کی طرف گئی اور اسے ان درندوں سے چھڑان کی کوشش کرنے لگی۔

ایک بھارتی فوجی کے ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا تھا اس نے وہ بے تحاشا اس کے نازک بازوؤں پر برسنا شروع کر دیا مگر اس نے اپنے بھائی کا بازو نہیں چھوڑا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر دوسرے فوجیوں نے بھی اس پر ڈنڈے اور گتوں کے بٹ برسانے شروع کر دیئے تھے۔ ساتھ ہی ایک فوجی نے جھٹکے سے طلحہ کو کھینچ کر گاڑی میں دھکیل دیا۔ فاطمہ کی حالت عجیب ہو گئی تھی اس نے سڑک کنارے پڑے پتھر اٹھا اٹھا کر ان پر پھینکنے شروع کر دیئے، ساتھ ساتھ وہ غم و غصے سے چلا بھی رہی تھی۔

”کتو، کافرو، حرام زادو، خدا بیزار غرق کرے تمہارا۔“ مگر وہ ہنستے، قہقہے لگاتے، سیٹیاں بجاتے گاڑی لے کر نکل گئے تھے۔ فاطمہ آنسو بہاتی دھندلی نگاہوں سے دیر تک اسی سڑک کو دیکھتی رہی۔ طیب احمد کو اس واقعے کی خبر پہنچ گئی تھی۔

پچھلے تین چار روز سے اس کی طبیعت بے حد خراب تھی مگر اس کے باوجود طلحہ کی گرفتاری کا سنتے ہی وہ فوراً بستی کی طرف نکل پڑا۔ سرد موسم اور خود سے لا پرواہی کے باعث راستے میں ہی اس کی طبیعت کافی خراب ہو گئی تھی۔ سر بھی بری طرح چکرانے لگا۔ ادھر قریب ہی پہاڑ کے دامن میں ان کے سیبوں کے باغات تھے۔ اس وقت طبیعت کی خرابی کے باعث وہ باغ کے اندر جا کر لیٹ گیا۔ بخار کی شدت نے جلد ہی اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا تھا۔

انڈین آر می کو بد قسمتی سے اسی وقت اس کا سراغ مل گیا اور وہ فوراً پہاڑ کے دامن میں ”وڑ“ باغ کے اندر گھس گئی۔ طیب احمد بے ہوشی کی حالت میں گرفتار ہو چکا تھا۔



زاویار کو ڈاکٹر سے چیک کروانے کے بعد جس وقت وہ گھر آیا مریرہ گم سم سی دلیز پر بیٹھی تھی۔ صمید کو رکشے سے اترتے دیکھ کر جیسے اس کی جان میں جان آئی۔

”کیسا ہے میرا بیٹا؟“ جیسے ہی وہ قریب آیا، اس نے جھپٹنے والے انداز میں زاویار کو اس کی بانہوں سے نکال لیا تھا یوں جیسے اسے خدشہ ہو کہ وہ اس کے بیٹے کو کہیں لے نہ جائے۔ صمید نے اس کے اس انداز پر قدرے تاسف سے اسے دیکھا تھا۔

”ٹھیک ہے اب۔“ واقعی وہ ٹھیک تھا، اس کا بخار بھی پہلے کی نسبت بہت کم تھا۔ مریرہ نے بے ساختہ اسے سینے میں بھینچ لیا۔

صمید اس رات بھوکا سو گیا تھا۔ اگلی صبح زاویار کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ وہ بیڈ پر لیٹا کھیل رہا تھا۔ صمید نے سے اٹھا کر سینے پر لٹالیا۔ وہ اسے پیار کر رہا تھا۔ مریرہ نے ایک نظر اسے زاویار سے کھیلنے ہوئے دیکھا پھر اٹھ کر کچن میں چلی آئی۔ تھوڑی دیر کے بعد صمید بھی زاویار کو جھولے میں لٹا کر اس کے پیچھے ہی کچن میں چلا آیا۔

”ابھی تک ناراض ہو میرو۔“ اس کے پیچھے وہ بالکل اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ مریرہ کا غصہ پھر بڑھنے لگا۔

”نہیں۔“ مختصر کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف رہی تھی جب وہ اس کے سامنے آ گیا۔

”میرو تم ناراض نہیں ہو پھر بھی میں تم سے سخت شرمندہ ہوں، کہ میں نے تمہارے لیے اتنے گھٹیا الفاظ استعمال کیے۔ میرا یقین مانو میرے دل میں تمہارے لیے ایسا دیا کچھ نہیں ہے، بس وہ سب میرا وقتی غصہ تھا، غلط نہی تھی۔“

”ٹھیک ہے، مجھے آپ کی کسی وضاحت سے کوئی سروکار نہیں۔“

”یہ تو غلط بات ہے میرو، ہم دو لوگ ہی تو ہیں اس گھر میں، اگر ہم بھی ایک دوسرے کے ساتھ یوں اجنبی بن کر رہیں گے تو بتاؤ بھلا ایسا کیسے چلے گا؟“

”اچھا..... اب آپ کو احساس ہوا ہے کہ ہم اس گھر میں دو ہی لوگ ہیں، ہمیں اجنبی بن کر نہیں رہنا

چاہیے۔“ طنزیہ لہجے میں پھنکارے ہوئے وہ پلٹی تھی۔

”یہ احساس اس وقت کہاں جا سوا تھا جب بزنس کا بہانہ بنا کر پرانی عورتوں کے ساتھ عیش کر رہے تھے۔ اس وقت مریرہ کیوں دل سے اتر گئی تھی؟ رات بھر موبائل فون پر اجنبی عورتوں کے ساتھ چیٹ کرتے مریرہ کا خیال کیوں نہیں آیا؟ کس کا بچہ ہے وہ؟ جس کا چیک اپ کروانے کے لیے ہسپتالوں کے دھکے کھاتے ہیں اور اپنی بیوی کی پروا نہیں ہوئی کہ وہ کہاں کس اسپتال میں اکیلی دھکے کھاتی بیچے جن رہی ہے۔ اگر مجھ سے محبت نہ سہی ہمدردی کا بھی تعلق ہوتا تب بھی آپ میرے ساتھ ایسا نہ کرتے۔“ وہ رو رہی تھی۔ صمید نے ہونٹ بھیجنے لیے۔

”تم مجھے غلط سمجھ رہی ہو میرو۔“

”جی نہیں، میں آپ کو ابھی صحیح سمجھی ہوں، آپ یہ مت سمجھیں کہ میں بے خبر ہوں، مجھے کسی بات کا پتہ نہیں، میں نے وہ سب میسر پڑھ لیے تھے جو آپ کی کسی خیر خواہ نے آپ کو بھیجے تھے اور بعد میں آپ نے وہ حذف کر دیے تھے تاکہ میں نہ دیکھ لوں۔“ وہ ہر بات سے باخبر تھی، اس لمحہ اس سے کوئی بھی جھوٹ بولنا ممکن نہیں تھا۔ تبھی وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا تھا۔

”میں جانتا ہوں تم ہر بات سے باخبر ہو، خدا شاہد ہے میں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتا تھا مگر حالات ہی کچھ ایسے بن گئے میرو کہ میں چاہتے ہوئے بھی تم سے کچھ شیئر نہ کر سکا، بہت الجھ گیا تھا میں۔“

”مجھے کوئی جھوٹی کہانی نہیں سننی۔“

”میں کوئی جھوٹی کہانی نہیں سنا رہا، جن حالات کا شکار رہا ہوں تم ان سے باخبر نہیں ہو۔“ جتنی قطعیت سے وہ بولی تھی اس سے کہیں زیادہ تیز لہجے میں صمید نے اس کی بات کاٹی تھی۔

”میں مانتا ہوں تم نے جو کچھ سنایا دیکھا وہ غلط نہیں ہے، مگر وہ ویسے بھی نہیں ہے جیسے تم سمجھ رہی ہو، وہ میسر جو تم نے پڑھے، وہ منیر صاحب کی بیٹی کے میسر تھے، جن کے ساتھ گھومنے پھرنے کا تم نے سنایا دیکھا وہ بھی منیر صاحب کی بیٹی تھی۔ منیر صاحب کو تو جانتی ہو ناں تم، بزنس پارٹنر ہیں میرے، جس روز میں تمہیں ہسپتال سے ڈسچارج کروا کر گھر لایا، اسی روز ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ تمہیں گھر چھوڑ کر میں ان کے کفن و دفن کے انتظامات میں لگ گیا تھا، کیونکہ دنیا میں ایک بیٹی کے سوا ان کا اور کوئی بھی نہیں تھا۔“ قدرے رساں کے ساتھ وہ اس کو اعتماد میں لے کر بالآخر سارا سچ بتانے پر تیار ہو گیا تھا۔

”پچھلے ایک ماہ سے منیر صاحب ہسپتال میں داخل تھے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سگے بھتیجے نے ان کی بیٹی کی عزت برباد کر کے اسے طلاق دے دی تھی، کیونکہ منیر صاحب کو اس کے برے کرتوتوں کی خبر ہو گئی تھی۔ اس روز میں منیر صاحب کے ساتھ آفس کے کسی ضروری کام سے ان کے گھر گیا تھا جب وہاں کمرے میں ان کی بیٹی نہایت برے حال میں بے ہوش پڑی تھی۔ ایک ہفتے کے بعد اسے ہوش آیا تھا اور اس ایک ہفتے میں منیر صاحب جیسے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ جب تم نے مجھے ہسپتال جانے کے لیے کالز کیں تب میرا سیل بغیر چارج کے میری پاکٹ میں بند پڑا تھا۔ میں اتنا پریشان تھا اس وقت کہ تمہیں کال کر کے نہ اطلاع دے سکا نہ

ہی گھر آسکا، مگر پھر بھی میں تم سے شرمندہ ہوں میرو کیونکہ واقعی میری وجہ سے ہمارے درمیان بہت غلط ہوا ہے، جو کہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ اس کا لہجہ اس کے سچ کی گواہی دے رہا تھا۔ مریرہ نے آنسو پونچھ لیے۔

”اب کہاں ہے ان کی بیٹی؟“ مریرہ کا سوال غیر توقع نہیں تھا مگر پھر بھی صمد پریشانی کا شکار ہوا تھا۔ سچ ابھی وہ بتانا نہیں چاہتا تھا اور جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ تبھی نظریں چراتے ہوئے ہلا تھا۔

”پتہ نہیں، میں تمہاری وجہ سے اتنا اپ سیٹ تھا کہ منیر صاحب کی رحلت کے بعد ان کے گھر جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔“

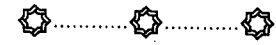
”ٹھیک ہے، مگر منیر صاحب کے ساتھ جو بھی ہوا، اس میں میرا قصور کہاں نکلتا تھا جو تم نے ان کی پریشانی میں میرے ساتھ اپنا رویہ مکمل طور پر تبدیل کر لیا؟“

”ان کی وجہ سے نہیں کیا تھا وہ کوئی اور غلط فہمی تھی۔ مجھے لگا شاید تم اور عمر عباس ایک دوسرے میں انٹرنلڈ تھے اسی لیے حویلی میں وہ مجھ سے ٹھیک سے نہیں ملا۔“ عمر عباس اور قمر عباس کے درمیان ہونے والی گفتگو جو اس نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی، اس وقت وہ مکمل طور پر چھپا گیا تھا۔ مریرہ کے دل کو کسی طور اطمینان ہوا۔ وہ بولی تو اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

”میرا اس کے ساتھ کبھی ایسا کوئی خاص تعلق نہیں رہا، اگر ہوتا تو چاہے کچھ ہو جاتا میں اسی سے شادی کرتی، عمر عباس نے بھی کبھی مجھے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا، ہو سکتا ہے اگر وہ پروز کرتا تو میں اس کے بارے میں سوچتی، مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میں جس معاملے میں قطعی بے قصور ہوں، اسی معاملے میں بار بار مجھے گھسیٹا جائے، ذلیل کیا جائے۔“

”ایم سوری دوبارہ ایسا کبھی نہیں ہوگا، مگر تم بھی پلیز کبھی میری محبت پر شک مت کرنا، میرا دل، میری محبت، میری زندگی صرف تمہارے وجود سے ہے میرو۔“ مریرہ کے خشک لہجے پر اس نے پھر لجاجت سے کہا تھا۔ جواب میں وہ اثبات میں سرلاتے ہوئے رخ پھیر گئی۔

گزرے دنوں کی اذیت کے بادل چھٹنے میں ابھی کچھ وقت تو لگنا تھا!!



ملک وقار کے بیٹے کے قتل کے جرم کے عینی شاہدین، ملک وقار کی ہدایت پر حویلی حاضر کر دیئے گئے تھے۔ مگر ان عینی شاہدین میں ”مائی جیراں“ نہیں تھی۔ جس وقت ملک ریاض حیوانیت کا شکار ہو کر قمر عباس کی جان لے رہا تھا مائی جیراں اپنے گھر کے قریب فصلوں کے دوسری طرف کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی مگر جس وقت گاؤں میں اس قتل کا شور مچا مائی جیراں اس وقت گاؤں میں نہیں تھی۔

ملک وقار کے کارندے کو خبر ہی نہ ہو سکی کہ وہ بوڑھی عورت بھی ملک ریاض جیسے درندے کے کرتوتوں کی چشم دید گواہ ہو سکتی ہے۔ نئی حویلی میں اس وقت عدالت لگی تھی۔ ملک ریاض کے جرم کے عینی شاہدین سر جھکائے، ہاتھ باندھے خاموش کھڑے تھے اور ملک وقار اپنی گھنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے ان سب کا تفصیلی ننگا ہوں کے ساتھ جائزہ لے رہا تھا۔

سب سے پہلے اس نے جس شخص کو مخاطب کیا، وہ گاؤں کا ماچھی تھا اور جس وقت وہ حادثہ ہوا اس وقت وہ دن بھر کی مشقت کے بعد اپنے گھر کو لوٹ رہا تھا تبھی اس نے وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

”ہاں بھی کرم دین بتاؤ کیا دیکھا تم نے کل شام؟“ اس کا لہجہ کرخت نہیں تھا۔ ماچھی کرم دین نے سچ اگلا شروع کر دیا۔

”میں کھیتوں کے قریب سے گزر رہا تھا سرکار، تبھی میں نے کسی کی دہلی آواز میں چلانے کی صدا سنی، میں آواز کی طرف لپکا تو دیکھا کہ چوہدری ریاض صاحب قمر عباس صاحب کے سینے پر بیٹھے، بوڑھے شکاری چاقو سے ان کی گردن اور سینے.....“

”باس.....“ اس سے پہلے کہ کرم دین ماچھی اپنا بیان مکمل کرتا ملک وقار نے غصے سے اسے خاموش کر دیا۔ ”یہ وہ بیان ہے جو تم نے یہاں آنے سے پہلے پولیس کو دیا ہے، مگر یہاں سے جانے کے بعد تم پولیس اور پنچائیت کے سامنے جو بیان دو گے اس میں چوہدری ریاض کا نام نہیں ہوگا سمجھتے تم۔“ وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا تھا ہو رہا تھا، ماچھی کرم دین نے سر جھکا لیا۔

”مت بھولو کہ تمہارے گھر میں تمہاری دو جوان بیٹیاں ہاتھ پیلے ہونے کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ بیٹا تمہارا چھوٹا ہے ابھی، یہ نہ ہو کہ اظہار ملک کے ساتھ ہمدردی تمہیں آٹھوں پہر سر پینے پر مجبور کر دے۔ تھانیدار صاحب سے میری بات ہو چکی ہے، جو بیان تم سب نے یہاں آنے سے پہلے وہاں لکھوائے ہیں، کسی کھاتے میں نہیں آئیں گے، سنا تم نے.....“ وہ اب بوڑھے شیر کی مانند دھاڑ رہے تھے۔ کرم دین ماچھی نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

”شاباش، اب جاؤ تمہاری بیٹیوں کے لیے کچھ سوچتا ہوں میں۔“

”مہربانی سائیں، مہربانی۔“ اچھے دل و دماغ کے ساتھ وہ جس عاجزی سے آیا تھا اسی عاجزی کے ساتھ واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ملک وقار نے ان دونوں جوان لڑکوں کی طرف توجہ کی تھی جن کا نام تھانے میں عینی شاہد کی لسٹ میں درج تھا۔

”ہاں ابھی یقیناً تم نے بھی وہی دیکھا ہوگا جو ماچھی کرم دین نے دیکھا؟“

”جی سائیں۔“

”پھر کیا خیال ہے آج پنچائیت میں کیا وہی بیان دہراؤ گے جو کل تھانے میں لکھوا کر آئے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی، سامنے کھڑے لڑکوں میں سے ایک بول اٹھا۔

”آپ کے بیٹے نے ظلم کیا ہے سائیں، قمر عباس سائیں سارے گاؤں کی جان تھے، اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائی انہوں نے، جتنے آپ ہمارے مائی باپ ہیں، اتنا ہی ہم اظہار ملک سائیں کو مانتے ہیں، اس بار ہم سے جھوٹ نہیں بولا جائے گا۔“

”اچھا.....!“ ملک وقار اپنے ہی مزارعے کے لڑکے کی جرأت پر حیران ہوا تھا۔ مگر پھر فوراً ہی لہجے میں نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

”میں جانتا ہوں ریاض نے کوئی اچھا کام نہیں کیا، اظہار بھائی ہے میرا، اپنے بھتیجے کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے مگر بابا تم لوگ یہ بھی تو دیکھو کہ ریاض کی کوئی ذاتی دشمنی تو نہیں تھی ناں قمر کے ساتھ، ضرور قمر نے اس کے ساتھ کچھ ایسا کیا ہو گا کہ بات یہاں تک آ پہنچی، اب حویلی کا ایک بیٹا تو مارا گیا، دوسرا تو نہیں مارا جاسکتا ناں۔“

”کچھ بھی ہو سائیں آج چوہدری صاحب کے ہاتھ سے قمر عباس سائیں کی جان گئی ہے، کل ہماری بھی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے کو یہیں روکنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، جاؤ تم لوگ۔“ شدید اشتعال نے ملک وقار کا چہرہ غصے سے سرخ کر دیا تھا۔ وہ دونوں لڑکے اپنی دانست میں حق اور سچ کا ساتھ دینے کی خوشی میں سرشار حویلی سے نکل آئے۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد ان دونوں کے باپ ملک وقار کے سامنے پیش تھے۔

”کچھ سنا تم نے تمہارے بیٹے کیا کرتے پھر رہے ہیں گاؤں میں؟“

”جی سائیں، جوان اولاد ہے پھر شہر میں چار جماعتیں پڑھ بھی آئے ہیں، کسی کی نہیں سن رہے وہ۔“

”ہوں..... کتنے بچے ہیں تمہارے حق نواز؟؟“ ان دونوں میں سے ایک کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ جب وہ بولا۔

”چار بچے ہیں سائیں، یہ مکلا شہر ادسب سے بڑا ہے، اس سے چھوٹی تین بیٹیاں ہیں۔“

”ہوں، بیٹیوں کے گھر آباد دیکھنا چاہتے ہو کہ نہیں؟“ وہ جو کہہ رہے تھے اسے سمجھنا گاؤں کے ان غریب محنت کشوں کے لیے مشکل نہ تھا۔ تھی حق نواز کا سر جھکا تھا۔

”دیکھنا چاہتا ہوں سرکار، برسوں آپ کا نمک کھایا ہے، بڑے احسان ہیں آپ کے مجھ غریب پر۔“

”بڑے احسانوں کا بدلہ تمہارا کی کمین بیٹا میرے بیٹے کی جان لے کر ادا کرنا چاہتا ہے؟“ اس بار وہ دھاڑے تھے۔ حق نواز مزارعے کی زبان جیسے تالو سے چپک گئی۔

”بڑا سمجھایا ہے سرکار، بڑے واسطے دیئے ہیں مگر وہ ناخلف کچھ سمجھنے اور سننے کو تیار نہیں۔“ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے بے حد عاجزی سے کہا۔ وہ پھر دھاڑ اٹھے۔

”ایسے ناخلف بیٹے پیدا ہی کیوں کرتے ہو تم لوگ جو ہمارے منہ کو آئیں؟“ حق نواز مزارعے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا سو وہ خاموش کھڑا رہا۔

”اور تم..... کیا نام ہے تمہارے سنبو لے کا؟“ اب وہ حق نواز کے ساتھ کھڑے شخص کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ لہجے کا غضب برقرار تھا۔

”جی ارشد۔“

”ہوں، کتنا پڑھ لیا ہے اس نے شہر میں؟“

”پتہ نہیں جی، بس اتنا پتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا ہے کسی بڑے اسکول میں، اس کی ماں بتا رہی تھی پندرہ کر لی ہیں اس نے۔“

”ہوں، تم وہی ہونا جس کی تین سال پہلے ایک رات اچانک کھڑی فصل کو آگ لگ گئی تھی۔ ڈاکو ڈھور ڈنگر بھی لے گئے تھے۔“

”جی سائیں۔“

”کھڑی فصلوں کو آگ ایسے ہی نہیں لگتی ارشاد حسین، بڑے راز ہوتے ہیں اس آگ کے پیچھے۔ کسی مائی کے لعل کی جرات نہیں کہ وقار ملک کے ہوتے ہوئے اس کے بیٹے پر ہاتھ ڈالے، کان کھول کر سن لو تم لوگ، تمہارے بیٹے چوہدریوں کے باغی ہیں اور باغیوں کے لیے ہمارے پاس موت سے کم کوئی سزا نہیں، اگر اپنی اور اپنے باقی گھر والوں کی سلامتی چاہتے ہو تو دونوں اپنے اپنے بیٹوں کے حق میں دستبردار ہو جاؤ، تھانے کچہری کے معاملات میں خود سنبھال لوں گا، جیسے ہی بات آئی گئی ہوئی، تمہارے بیٹے بھی گھر آ جائیں گے مگر ابھی ان کا خون ٹھنڈا کرنا ضروری ہے۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مائی باپ؟“

”فارسی میں نہیں کہا میں نے، میرے آدمیوں نے تم دونوں کے بیٹوں کو خود قمر عباس کو قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے، اظہار ملک معاف کر بھی دے مگر میں ان کی یہ جرات معاف نہیں کروں گا، اب جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ وہاں ٹھہرے نہیں تھے۔ پیچھے حق نواز اور ارشاد حسین پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔

قمر عباس کی تدفین ہو چکی تھی۔ پرانی حویلی کے پچھواڑے میں شگفتہ اظہار کے ساتھ دوسری بننے والی آرام گاہ اسی کی تھی۔ قمر عباس ملک ریاض کی سوگھتا پھر رہا تھا مگر جانے وہ کہاں روپوش ہو گیا تھا کہ کہیں بھی اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

بے جی کی حالت بے حد نازک تھی، جبکہ شہر بانو کو ہوش ہی نہیں آ رہا تھا۔ خضر عباس اور نظر عباس کی آنکھوں میں انتقام کی آگ دبک اٹھی تھی مگر اس وقت حالات ایسے تھے کہ وہ دونوں چاہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پا رہے تھے۔ ملک وقار کے دو بیٹے ملک سے باہر تھے۔ ریاض ملک سے چھوٹا شہر میں پڑھ رہا تھا، لہذا بدلے کی آگ میں گھر کی عورتوں پر بندوق چلانا ان کے ضمیر نے گوارہ نہیں کیا تھا۔

ملک وقار قمر کے جنازے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اگر واقعی ان کے بیٹے نے یہ حرکت کی ہے تو وہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے پورے گاؤں کے سامنے گولی ماریں گے۔ ملک اظہار کو ان کی زبان اور آنسوؤں کا اعتبار تھا۔

قمر عباس اپنی تمام تر شوخیوں، ذہانت اور خوابوں کے ساتھ اپنی آخری آرام گاہ میں جا سویا تھا۔ نورین بیگم جو اس کے جنازے پر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی ”شہر بانو“ کو ہوش و حواس سے بیگانہ دیکھ کر اس کے کلیجے میں جیسے ٹھنڈ پڑ گئی۔

اگلے روز عصر کے قریب قمر عباس کی قل خوانی کے بعد گاؤں کی پنچائیت بلائی گئی تھی جس میں وقار ملک اور اظہار ملک کے ساتھ ساتھ علاقے کا تھانیدار اور تمام معزز بزرگ افراد موجود تھے جنہوں نے اس کیس کا

فیصلہ کرنا تھا۔ پنچائیت بیٹھ گئی تھی۔ قتل کے عینی شاہدین کو بھی حاضر کیا گیا تھا۔ سب سے پہلے وقار ملک صاحب نے ماچھی کرم دین کو آواز دی۔

”ہاں بھئی، بتاؤ پنچائیت کے سامنے تم نے اس روز کھیت میں کیا دیکھا؟ یاد رکھنا میں اس وقت ریاض کا باپ بن کر نہیں بلکہ اس گاؤں کا نجات دہندہ اور مصنف بن کر یہ سوال پوچھ رہا ہوں اگر ذرا سی بھی نمک حرامی کی میرے بھائی کے ساتھ تو زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔“

”جی سائیں۔“ اس کے پر اشتعال لہجے پر کرم دین ماچھی نے ہاتھ جوڑے تھے۔

”میں غریب مزدور آدمی سائیں، قمر عباس سائیں کے بہت احسان ہیں میرے اوپر، میں بھلا کیوں جھوٹ بولوں گا، اللہ کو حاضر ناظر جان کر میں نے جو دیکھا وہی بتاؤں گا۔“ دونوں ہاتھ عاجزی سے جوڑے اس نے بے ساختہ کندھے پر گرے صاف سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی تھی۔

”میں نے تھانے دار صاحب کو اس قتل کے فوری بعد اپنا بیان لکھوا دیا تھا اس روز میں وکیل صاحب کے گھر بانی پہنچا کر اپنے گھر واپس آ رہا تھا کہ قریب کے کھیت سے کسی کی دبی دبی چیخوں کی آواز سنی، میں بہت گھبرا گیا تھا سائیں، اسی لیے فوراً اسی کھیت کی طرف بھاگا، جب میں تھوڑا قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی قمر عباس سائیں کی چھاتی پر بیٹھا ان کے سینے میں چا تو اتار رہا ہے جبکہ ایک دوسرے آدمی نے ان کی ٹانگیں اور ہاتھ قابو کیے ہوئے تھے، پہلی نظر میں مجھے لگا جیسے وہ ریاض سائیں ہیں مگر ایسا نہیں تھا سرکار، اس شخص نے جیسے ہی میرے قدموں کی آہٹ سنی فوراً پلٹ کر میری طرف دیکھا اور تبھی مجھے پتا چلا کہ وہ ریاض سائیں نہیں بلکہ حویلی کے مزارعے حق نواز کا بیٹا شہزاد تھا اور اس کے ساتھ جس شخص نے قمر عباس سائیں کی ٹانگیں اور ہاتھ قابو کیے ہوئے تھے وہ ارشاد حسین کی کمین کا بیٹا ارشد تھا۔ دونوں مجھے دیکھ کر گھبرائے اور فوراً میری طرف بھاگے، مگر بھلا ہو ریاض سائیں کہ کہ اسی وقت ان کی گاڑی وہاں پہنچ گئی اور ان کے دو آدمی میرے اور ان کے درمیان آ گئے جس سے یہ دونوں گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔“

”کیا بکواس ہے یہ، میں اس بیان کو نہیں مانتا، یہ سراسر جھوٹ ہے۔“ ماچھی کرم دین کا بیان مکمل ہوتے ہی عمر غصے سے کھڑا ہوا تھا، جب وقار ملک صاحب نے اسے جھڑک دیا۔

”چپ کر کے بیٹھا رہ، عمر، پنچائیت یہاں سچ جھوٹ کا پتہ لگانے کے لیے ہی بٹھائی گئی ہے، بہتی گرمی نہ کھا، پنچائیت کو اس کا کام کرنے دے۔“ وقار ملک صاحب کی دیکھا دیکھی باقی بزرگوں نے بھی اسے سمجھانا شروع کر دیا۔ اظہار ملک صاحب بت بنے بیٹھے رہے۔

”ہاں بھئی حق نواز تو بتا سچائی کیا ہے کہاں ہے تیرا بیٹا؟“ وقار ملک ماہر کھلاڑی تھے جن جن کے پتے پھینک رہے تھے۔ ساری پنچائیت کی نظریں حق نواز پر جم گئیں۔ تھانے دار خاموشی سے سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا، نئے بیان ریکارڈ کرتا گیا۔ حق نواز کہہ رہا تھا۔

”پتہ نہیں سرکار، جب سے یہ شرمناک واقعہ ہوا ہے وہ ناخلف گھر سے غائب ہے، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جس شام قمر عباس سائیں کا قتل ہوا اس شام میرا بیٹا بہت گھبرایا ہوا تھا، اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور

کپڑوں پر تازہ خون کے نشان، وہ بہت عجلت میں تھا فوراً ہی گھر سے نکل گیا تب سے اب تک اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

”ہوں، اور ارشاد حسین تو کیا کہتا ہے؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں سرکار، میری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔ رب سوہنے سے دعا ہے وہ ایسی ناخلف اولاد کسی کو نہ دے، پتہ نہیں کیا بیر تھا اس کا قمر عباس سائیں کے ساتھ، میں سوچتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے، کیا کہوں میں، مجھے تو میری نافرمان گندی اولاد نے گاؤں میں سراٹھا کر چلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔“

”ہوں، کیا ارشد بھی شہزاد کے ساتھ تھا اس شام؟“ یہ سوال علاقے کے تھانے دار کی طرف سے ہوا تھا۔ ارشاد حسین کی جھکی گرن مزید جھک گئی۔

”جی سرکار، دونوں عصر کے قریب اکٹھے ہی میرے گھر سے نکلے تھے کرکٹ کھیلنے کے لیے، مجھے بخار تھا میں چار پائی پر پڑا انہیں باہر جاتے دیکھتا رہا، مجھے کیا خبر تھی سائیں کہ دونوں کرکٹ کا بہانہ بنا کر کیسا کھیل کھیلے جارہے ہیں۔“

”ہوں، یہ بتاؤ ان دونوں کی قمر عباس سائیں کے ساتھ دشمنی کی کوئی وجہ تمہارا علم میں ہے کہ نہیں؟“

”کوئی پتہ نہیں تھانے دار صاحب، بس اتنا پتہ ہے کہ قمر عباس سائیں نے جس لڑکی کے ساتھ دوسری شادی کی تھی وہ لڑکی میرے اور حق نواز کے بیٹے کے ساتھ انہی کی جامعیت میں پڑھتی تھی۔“

”ہوں، یعنی یہ معاملہ رقابت اور لڑکی کا تھا۔“ تھانے دار نے ہنکارہ بھرتے ہوئے وجہ قتل کا سراغ لگا لیا تھا کہ یہ اس کیس میں بے حد ضروری تھا۔ عمر کی رگیں غصے کی شدت سے تن گئیں۔

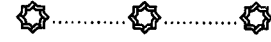
”یہ سب بکواس کر رہے ہیں، حقیقت کو غلط رنگ دے کر ریاض جیسے غنڈے کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میرے بھائی کا خون اتنا سستا نہیں ہے کہ یوں اصل قاتل صاف بچ جائے، یقیناً یہ سب بک گئے ہیں یا ڈر گئے ہیں۔“

”اپنی حد میں رہ عمر، تم قانون کے معاملات کو اپنی نظر سے دیکھ کر سچ اور جھوٹ کا سراغ نہیں لگا سکتے، یہ جن کا کام ہے انہی کو کرنے دو تو بہتر ہے، ویسے بھی اولاد سے پیاری کوئی چیز نہیں ہوتی، یہ دونوں جو کہہ رہے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا انجام کی ہو سکتا ہے، جان بوجھ کر اپنے جوان بیٹے کو کوئی باپ سولی پر لٹکا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔“ ملک وقار کا غصہ اس بار دیکھنے لائق تھا۔ عمر تنفر سے سر جھٹکتا وہاں سے چلا گیا۔ پنچائیت اور قانون کی کارروائی پوری ہو چکی تھی۔

گواہ اپنا حلفیہ بیان درج کروا چکا تھا، قاتلوں کے ورثا کی طرف سے بھی اقرار جرم کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔ اب کوئی شک باقی نہیں رہا تھا، تبھی وہاں ملک ریاض کو قطعی بے قصور اور بری الذمہ قرار دے دیا گیا تھا اب جو ہونا تھا شہزاد اور ارشد کے ساتھ ہونا تھا جو اس وقت بھی تھانے میں بند پولیس والوں کا بدترین نارچر سہرہ رہے تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ ابھی پنچائیت اپنا فیصلہ سناتی، اچانک مائی جیراں وہاں آ پہنچی تھی۔

”مجھے بھی اپنا بیان ریکارڈ کروانا ہے کیونکہ میں بھی اس انہونی کی چشم دید گواہ ہوں۔“ اس نے کہا تھا

اور ملک وقار کے حامیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔



اس رات سدید کی واپسی قدرے لیٹ ہوئی تھی۔ وہ گھر آیا تو ایک عجیب سے سنائے نے اس کا استقبال کیا۔ نور بانو بخار میں پھنک رہی تھی جبکہ ننھی عائشے آگ کی انگلیٹھی قریب رکھے اپنا دوپٹہ سینک سینک کر فاطمہ کے سونجھے ہوئے بازوؤں پر رکھ رہی تھی جہاں انڈین آرمی کے بے رحم درندوں نے نہایت بے دردی سے ڈنڈے اور گنوں کے بٹ برسائے تھے۔ سدید اس کا حال دیکھ کر چوکھٹ پر ہی ٹھنک گیا۔

”السلام علیکم!“ اس کے سلام پر فاطمہ اور عائشے نے ایک ساتھ اس کی طرف دیکھا تھا۔

”وعلیکم السلام!“ جواب عائشے نے دیا تھا۔ فاطمہ نے چپکے سے اپنے آنسو چھپا لیے۔

”کیا ہوا..... کیا کوئی آیا تھا ادھر اور طلحہ کہاں ہے؟“ ایک ہی سانس میں اس نے کئی سوال پوچھ لیے

تھے، تبھی عائشے بولی تھی۔

”طلحہ بھائی کو انڈین آرمی اٹھا کر لے گئی ہے بھائی، انہیں بہت تیز بخار تھا، وہ بہت رو رہے تھے،

فاطمہ کے بازوؤں پر بھی بہت ڈنڈے مارے ہیں انہوں نے۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں، شاید وہ لوگ طیب بھائی کی تلاش میں آئے تھے۔“ سدید کو اپنے کیوں پر بے حد شرمندگی

ہوئی۔

کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ یہاں کیوں آتے تھے؟ کشمیر کی کوئی بھی گلی، گھر، محلہ بھلا ان سے

محفوظ تھا؟ کوئی ایسی بستی تھی جو بے گناہوں کے خون سے سرخ نہ کی گئی ہو؟ کیا انڈین آرمی کی طرف سے

کشمیریوں کی نسل کشی کے لیے روزانہ درجنوں نو جوانوں کو بے قصور پکڑ کر انہیں ابدی نیند سلا دینا ہی بات تھی؟

کیا وہ اس بات سے واقف نہیں تھا کہ چیوا سمیت کشمیر کے چپے چپے میں کتنی ہی بے گور و کفن لاشیں

کھیت کھلیاؤں میں پڑی ملتی تھیں، جن کے بارے میں یہ پتہ لگانا بھی مشکل ہوتا تھا کہ وہ بد نصیب کس کشمیری

ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور کس کشمیری بہن کے دل کا سکون ہیں۔ آئے روز انہیں لاوارث سمجھ کر مقامی

قبرستانوں میں منوں مٹی تلے سپرد کر دیا جاتا تھا۔

منی میں ملے خواب، خواہشات، تمنائیں، سب خاک ہو جاتی تھیں اور ان بد نصب لاشوں کے ورثاء

کی ساری زندگی ان کی واپسی کے انتظار میں دہلیز کی چوکھٹ سے چکی رہ جاتی تھیں۔ اپنے ملک کے میڈیا کی

سنگدلی اور بے حسی کے باوجود وہ جانتا تھا کہ کشمیر میں درجنوں کشمیری نو جوان جو لاپتہ تھے ان کی اکثریت گمان

قبروں میں سو رہی تھی جبکہ ان شہیدوں کے گھر والوں کو ان کی قبریں تک دیکھنی نصیب نہیں ہوئی تھیں۔

عائشے کی آنکھوں میں آنسو تھے، سدید کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ وہاں مجاہد کی حیثیت سے رہ ضرور رہا

تھا مگر اسے کام وہی کرنا تھا جس کا اس کے افسران اسے حکم دیتے۔ وہ یہاں جس خاص مقصد کے تحت آیا تھا،

اس مقصد کے حصول تک وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جان کو کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ تبھی دہلیز سے پلٹ

گیا۔ مگر اس رات وہ ایک پل کے لیے بھی سکون سے نہیں سو سکا تھا۔



ستاروں سے کہو اب رات بھر

ہم ان سے باتیں کر نہیں سکتے

کہ ہم اب تھک گئے جاناں

ہمیں جی بھر کے سونا ہے

کسی کا راستہ نکلنے کا یا را بھی نہیں ہم میں

مسافر آ گیا تو ٹھیک ہے لیکن

نہیں آتا تو نہ آئے

ان آنکھوں میں ذرا بھی روشنی باقی نہیں شاید

وگر نہ تیرگی ہم کو یوں گھیرے میں نہیں لیتی

مگر یہ سب ازل سے لکھ دیا تھا لکھنے والے نے

ستاروں سے کہو بہتر ہے ہم کو بھول ہی جائیں

ہمیں آرام کرنا ہے، ضروری کام کرنا ہے!!

رات وہ ایللی کی آیا کے پاس بیٹھی ان کی تنہائی بانٹ رہی تھی جب انہوں نے اسے بتایا۔

”ایللی بہت پیارا اور حساس انسان ہے پری، اس نے رشتوں کے تاریک پہلوؤں کو بہت قریب سے

دیکھا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ آج یہاں اسے سمیٹنے کے لیے، میں اس کے ساتھ رہ رہی ہوں۔“

”جی..... مجھے بتایا تھا ایللی نے، وہ خود بھی آپ سے بہت محبت کرتا ہے۔“

”جانتی ہوں، وہ خود سے جڑے ہر رشتے سے محبت کرتا ہے، مگر بدلے میں اسے صرف دکھ ملے ہیں،

میری طرح وہ اپنی ماں سے بھی بے انتہا محبت کرتا تھا مگر اس کی ماں نے اس کی زندگی بکھیرنے میں کوئی کسر باقی نہیں

رکھی۔“

”کیوں ایسا کیا، کیا اس کی ماں نے؟“

”کیا..... کیا نہیں بلکہ کیا نہیں کیا اس بد بخت نے، پہلے اپنی تفریح کے لیے چھوٹے سے بچے کو چھوڑ

کر چلی گئی، باپ نے پال پوس کر جوان کیا تو دوبارہ اس کی زندگی میں آ کر اسے اپنے ہی باپ کے خلاف کھڑا

کر دیا، یہی نہیں بلکہ انڈیا سے اپنے بھتیجی یہاں بلا کر اسے ایللی کی زندگی میں اس کی سب سے بڑی خواہش بنا

دیا، مگر ایللی نے جب اسی بھتیجی سے شادی کی خواہش کی تو وہ مکار عورت ایک دم سے بدک گئی۔ شاید اس کے

ارادے کچھ اور تھے، دونوں پھوپھی بھتیجی کب لندن سے روپوش ہوئیں پتہ ہی نہیں چلا، بہت ٹوٹا ہے میرا ایللی، میں

نے راتوں کے سرد سناٹوں میں اس کی سسکیاں گونجتی سنی ہیں۔“ وہ آدھا بچ جو اسے مار تھا کی زبانی پتہ چلا تھا

مکمل ہو گیا تھا۔ پر ہیان کو بے حد دکھ ہوا۔

”ایلی ایک بہترین انسان ہے آئی، پھر اس کی مٹی نے اپنی بھتیجی کی شادی اس کے ساتھ کیوں نہیں

کی؟“

”پتہ نہیں، شاید وہ ابھی اپنی بھتیجی کو بیاہنا ہی نہ چاہتی ہو۔“

”ہوں، یہ ہو سکتا ہے۔“ اس نے تائید کی۔ تبھی ایلی چلا آیا۔

”ہیلو ایوری باڈی، کیا چل رہا ہے؟“

”کچھ نہیں، تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔“

”ہم..... پھر تو یقیناً میری عمر بڑی لمبی ہوگی۔“

”بے شک۔“

”کافی کاموڈ ہے کہ نہیں؟“

”بالکل ہے اگر تم بھی ساتھ پیو گے تو؟“

”ٹھیک ہے، میں فریش ہو کر آتا ہوں، پھر اکٹھے پیتے ہیں۔“ اس کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ پر ہیان

نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ فریش ہو کر آیا تو پر ہیان کافی بنا چکی تھی۔

”آج بہت خوش ہوا، خیریت؟“ کافی پھینٹتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولا۔

”ہوں..... آج میرا آفس مکمل ہو گیا ہے۔ تمہارا وہ فیئسی ہے ناں ساویز، وہ بھی میرے ساتھ کام کر

رہا ہے۔“

”اوہ.....“

”پتہ ہے پری میرے ذہن میں کیا ہے؟“

”کیا؟“

”میں ایک اسٹوری ترتیب دے رہا ہوں۔“

”کیسی اسٹوری؟“

”لو اسٹوری۔“

”میں سمجھی نہیں ایلی؟“

”میں سمجھا دیتا ہوں، دیکھو تم ساویز سے پیار کرتی ہو، پہلے وہ بھی تم سے پیار کرتا تھا، مگر اب اس کا

دماغ خراب ہو چکا ہے، تو اس کے خراب دماغ کو ٹھیک کرنے کے لیے ہم ایک کھیل کھیلیں گے لو اسٹوری کا میں

اس پر یہ ظاہر نہیں کروں گا کہ مجھے تم دونوں کی ناکام محبت کا پتہ ہے، نہ ہی تم اس کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ تم

میری اور اس کی پائنر شپ کا جانتی ہو۔ ہم اسے سب اتفاق ہی شو کروائیں گے، تم دیکھنا پری وہ شخص کچھ ہی وقت

میں واپس پلٹ کر تم تک نہ آئے تو کہنا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ایلی، مگر تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟“ وہ جتنا پر جوش تھا پر ہیان کا لہجہ اتنا ہی الجھا ہوا

تھا۔ تبھی وہ مسکرایا۔

”میں نہیں چاہتا پری کہ جو تکلیف میرے دل نے سہی ہے تم اس تکلیف کے حصار میں رہو۔“

”ہوں..... تم بہت اچھے ہو ایلی۔“

”اتنا بھی اچھا نہیں ہوں، تم ساتھ رہو گی تو پتہ چل جائے گا۔“

”اوکے..... مگر میرے لیے اس وقت ساویز آفندی کی واپسی سے بھی زیادہ وہ مقصد اہم ہے جس کا

خواب لے کر میں یہاں لندن میں آئی ہوں۔“

”کیسا مقصد؟“ اب ایلی اسے توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ پر ہیان نے کافی کا خالی گلاس سائیڈ پر رکھ دیا۔

”میں چاہتی ہوں ایلی، میں ایک ایسا ادارہ بناؤں جو بڑے پیمانے پر ان بچوں کو تحفظ اور خوشیاں

فراہم کرے کہ جن کے والدین انہیں کچرے کے ڈھیر پر پھینک کر چلے جاتے ہیں یا پھر وہ بچے جن کی ماں تو

ہوتی ہے مگر باپ کے نام کا خانہ ہمیشہ خالی رہتا ہے، تم نہیں جانتے چھوٹی سی عمر میں ماں اور باپ کے وجود سے

محرومی کا دکھ ایک بچے کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے، لاشعور کی عمر میں ہر بچے کی بہترین تفریح اس کی ماں کا

وجود ہوتا ہے، جو اس کے ساتھ کھیلتی ہے، اس کے لاڈ اٹھاتی ہے، فرمائشیں پوری کرتی ہے، اسے اپنے سینے پر اپنی

آغوش میں لوری دے کر سلاتی ہے، میں سوچتی ہوں جن بچوں کے پاس یہ بہترین تفریح نہیں ہوتی ان کا بچپن

کیسا گزرتا ہوگا؟ وہ تو لاشعور کی عمر میں ہی بوڑھے ہو جاتے ہوں گے، ہے ناں؟“ زخمی نگاہوں سے وہ اس کی

طرف دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ ایلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میرے اندر بہت بے چینی ہے ایلی، جب سے مجھے اپنی حیثیت کا پتہ چلا ہے، میں ایک رات بھی

سکون سے نہیں سو پائی، حالانکہ میری ماں نے زندگی میں کبھی مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی، باپ کے

پیار کی بھی نہیں، مگر وہ بچے جنہیں ماں کا وجود بھی میسر نہیں، وہ کیسے زندہ رہتے ہوں گے ایلی، یہ معاشرہ اس

معاشرے کے بے رحم لوگ، روزانہ کی کھال ادھیڑ کر انہیں کانٹوں پر گھسیٹتے ہوں گے، روز انہیں اس گناہ اس جرم

کی سزا ملتی ہوگی جو انہوں نے کبھی کیا ہی نہیں، کیوں؟“ اب وہ رورہی تھی۔ ایلی نے رخ پھیر لیا۔

”تم مجھے دکھی کر رہی ہو پری۔“

”ایم سوری، مگر میرے اندر بہت غبار ہے ایلی، میں ٹھیک سے سانس بھی نہیں لے پا رہی ہوں، اس

دنیا کے تمام لاوارث اور ناجائز بچے میرا دکھ ہیں اور میں چاہتی ہوں میں یہ دکھ بانٹ لوں، کیا تم اس کام میں

میری مدد کرو گے؟“

”شیور، تم جو بھی کرو گی مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی پری۔“

”تھینک یو، مجھے یقین تھا تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔“

”ہوں..... مگر تم نے مجھے بہت مایوس کیا ہے۔“

”ہاں..... وہ کیسے؟“

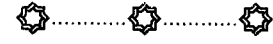
”ایسے۔“ شہادت کی انگلی کی پور سے اس کا آنسو چن کر اس کے سامنے کرتے ہوئے اس نے منہ

بنایا۔ پر ہیان مسکرا دی۔

”تمہیں اتنی کمزور لڑکی نہیں سمجھتا تھا پری۔“

”سوری..... دوبارہ کوشش کروں گی کہ اپنے جذبات پر قابو رکھ سکوں۔“

”گڈ گرل۔“ وہ مسکرائی تھی ایللی بھی مسکرا دیا۔



اس روز موسم بہت خوبصورت تھا۔ درمکنون سو کر اٹھی تو سر بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا مگر اس نے پروا نہیں کی، آج اسے بہت سے ضروری کام پٹانے تھے۔ لہذا ناشتے کے بعد مریرہ بیگم سے کال پر بات کرتی وہ آفس کے لیے نکل آئی تھی۔

ابر آلود موسم کے باوجود صیام اس سے پہلے آفس میں موجود تھا۔ وہ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اسی کیے کہین میں چلی آئی۔

”السلام علیکم!“ صیام اسے دیکھتے ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہوا۔ سی گرین کرتا شلوار میں درمکنون کا نازک سا سناپا آج نظر لگ جانے کی حد تک پیارا لگ رہا تھا۔

”وعلیکم السلام! میں چاہتی ہوں آج آپ مسز ہمدانی کے ساتھ مینٹنگ رکھ لیں، کل ہمیں اسلام آباد کے لیے نکلنا ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں ابھی مسز ہمدانی کو کال کر دیتا ہوں۔“

”جی..... اور آپ نے گھر میں بتا دیا کہ آپ تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہے ہیں میرے ساتھ؟“

”جی مادام، میں نے ذکر کر دیا تھا۔“

”گڈ..... میرے روم میں آئیے۔“ خالصتا پریشانی لہجے میں کہتی وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ صیام اثبات میں سر ہلا کر، سامنے کمپیوٹر پر کھلی ہوئی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اگلے دو منٹ کے بعد وہ درمکنون کے کمرے میں اس کے مقابل تھا۔

”جی میم!“

”بیٹھیے۔“ میز کے دوسری طرف دھری کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے صیام پر نگاہ ڈالی۔

ڈارک گرے ڈریس پیٹ پر وائٹ فل شرٹ میں بازو کہنیوں تک فولڈ کیے وہ بے حد خوبصورت لگ رہا تھا۔ اسے توجہ ہٹانی پڑی۔

”میں سوچ رہی تھی مسٹر صیام کہ گاؤں میں رہائش کی وجہ سے آپ کو کافی مشکلات کا سامنا ہے، پھر وہاں زیادہ سہولیات بھی نہیں، ایسے میں گھر سے آپ کی عدم موجودگی گھر والوں کے لیے اور بھی مشکلات کا باعث بن سکتی ہے، میری ایک دوست ایبروڈ میں رہتی ہیں ان کا یہاں گھر خالی پڑا ہے، کافی مہینوں سے، اگر آپ چاہیں تو میں وہ گھر مناسب کرائے پر آپ کے لیے ہائیر کر سکتی ہوں، کیونکہ آپ کی سفری مشکلات دیکھتے

ہوئے میں بعض اوقات ضرورتاً بھی آپ کو آفس میں نہیں روک سکتی۔“ وہ پوائنٹ جس پر وہ پچھلے ایک ہفتے سے سوچ رہی تھی اس وقت اس نے صیام کے سامنے رکھ دیا اور اب وہ اس کے چہرے پر بکھرنے والے رنگ دیکھ سکتی تھی۔

”شکریہ میم کہ آپ نے اتنا سوچا میرے لیے، میں آج کل خود بھی اسی کام میں لگا ہوا ہوں، ابو کے بعد میرا گاؤں میں رہنا بہت مشکل ہے۔“

”تو ٹھیک ہے پھر آپ تیاری کیجیے، مسز ہمدانی کے ساتھ ملاقات سے پہلے میں چاہوں گی آپ وہ گھر دیکھ لیں۔“

”جی ٹھیک ہے، مگر اس کا کرایہ؟“

”اس کی آپ فکر نہ کریں، وہ میں طے کر لوں گی انشاء اللہ آپ کے بجٹ کے اندر اندر رہی ہوگا۔“

”شکریہ۔“

”کوئی بات نہیں، اب آپ جا سکتے ہیں۔“ مصروف سے انداز میں سر ہلا کر اس نے اسے جانے کا عندیہ دیا۔

صیام چاہتے ہوئے بھی اس کے دل کے راز سے آگاہ نہ ہو سکا۔ وہ ابھی اسلام آباد والی مینٹنگ کا جائزہ لے رہی تھی جب شہزاد حسب عادت بنا دستک دیئے اس کے کمرے میں چلی آئی۔

”السلام علیکم باس کیسی ہیں آپ؟“

”وعلیکم السلام! تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟“

”بہت پیاری۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے ٹک گئی۔

”سوری میں تھوڑی لیٹ ہو گئی، اصل میں رات سے طبیعت بہت خراب ہے، فلو اور بخار نے مت ماری ہوئی ہے۔“

”ہوں، وہ تو نظر بھی آ رہا ہے، چھٹی کر لیتی آج۔“

”نہیں“

یار، چھٹی نہیں کر سکتی، تمہیں تو وجہ پتہ ہے، رخ محبوب دیکھے بغیر چین کہاں ملتا ہے، ویسے صیام تمہارے ساتھ اسلام آباد جا رہا ہے؟“

”ہوں..... مینٹنگ ہے وہاں، اس کا جانا ضروری ہے۔“

”میں بھی چلو ساتھ؟“

”کیوں تم کیا کرو گی ساتھ چل کر؟“

”کچھ نہیں، بس صیام کے ساتھ ساتھ رہوں گی۔“

”پاگل مت بنو، اسے وہاں کام کرنا ہے، کوئی سیر و تفریح کے لیے نہیں جا رہا وہ۔“

”پتہ ہے، مگر اسے دیکھے بغیر میرے تین دن کیسے گزریں گے؟“

”گزر جائیں گے، تھوڑا کام کی طرف توجہ بھی دے دیا کرو، آفر آں تمہیں عمر انکل کے ساتھ ایک بڑا

برنس سنبھالنا ہے۔“

”پتہ ہے یار، پتہ نہیں تمہارے اندر کی لڑکی اتنی پتھر دل کیوں ہے، کاش کوئی تو تمہارے دل کی سلطنت پر بھی حکومت کرے، پھر میں پوچھوں ہاں بی بی اب بتاؤ عشق کس بلا کا نام ہے۔“

”فضول کم بولا کرو آئی سمجھ؟“

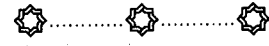
”نہیں آئی، تم یہ بتاؤ مریرہ آئی کا کب تک دوہنی کا پروگرام ہے؟“

”پتہ نہیں، ابھی چند دن تو رکھیں گی۔“

”اوکے، پھر کرو کام، میں ذرا آفس کا جائزہ لے لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ نظریں مسلسل کمپیوٹر اسکرین پر چپکائے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شہزاد اپنا پرس

سنبھالتی اس کے کمرے سے نکل گئی۔



بارش شروع ہو چکی تھی جب صیام نے اسے مسز ہمدانی کے ساتھ ملاقات کا وقت طے کر کے اطلاع دی۔ شام چار بجے کا وقت ملاقات کے لیے طے ہوا تھا اور اس وقت دن کے اڑھائی بج رہے تھے۔ درمکنون نے ایک نظر کلائی پر بندھی رست وایچ پر ڈالی پھر اسے گاڑی نکالنے کا حکم دے دیا۔ اگلے بیس منٹ میں بنا بارش کی پروا کیے وہ آفس سے نکل آئی تھی۔

صیام خاصی توجہ کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔ جب اس نے ایک خوبصورت مکان کے سامنے اس سے گاڑی رکوائی۔

”آئیں۔“ اپنی سیٹ چھوڑتے ہوئے اس نے کہا اور گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔

صیام بنا کچھ سمجھے اس کے حکم پر گاڑی ایک سائیڈ میں کھڑی کر کے اس کے پیچھے چلا آیا۔ درمکنون نے سامنے موجود گھر کا لاک کھولا اور بے حد اعتماد سے قدم اٹھاتی اندر چلی آئی۔

”یہی وہ گھر ہے جس کے لیے میں آپ کو بتا رہی تھی۔“ مین ہال کی لائٹ روشن کرتے ہوئے اس نے صیام کو بتایا۔ تین بیڈروم ایک کچن، تین عدد انچ باتھ، ایک ڈرائنگ روم اور ہال کمرے کے ساتھ وہ خاصا خوبصورت گھر تھا جو مریرہ نے اسے یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے پر گفٹ کیا تھا۔ مگر اس نے صیام پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ گھر اس کی ملکیت ہے۔ صیام سرسری سا گھر کا جائزہ لینے کے بعد نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔

”میں یہ گھر انورڈ نہیں کر سکتا میم۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ ابھی میری پوزیشن اتنی اچھی نہیں ہے کہ میں یہاں اپنی فیملی رکھ سکوں۔“

”یہ آپ کا مسئلہ نہیں، آپ ایسا کیجیے کہ اسلام آباد جانے سے پہلے آج شام تک یہاں شفٹ ہو جائیں، یہ ایک محفوظ گھر ہے جہاں آپ کی عدم موجودگی میں بھی آپ کے گھر والے سکون سے رہ سکتے ہیں۔ میرا گھر بھی یہاں سے قریب ہے، میں چوکیدار کو کہہ دوں گی وہ آپ کے جانے کے بعد تین دن یہاں ڈیوٹی کر لے

گا۔“ کسی آنسرنگ مشین کی طرح وہ اسے بہت روانی سے بتا رہی تھی۔ صیام خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ گیا۔ وہ پری تو پہلے ہی دل میں بہت اونچی مسند پر بیٹھی تھی، یہ سب کر کے تو اس نے اسے بے مول خرید لیا تھا۔

”آپ یہ مت سمجھئے گا کہ یہ سب میں اپنی طرف سے کر رہی ہوں، ان فیکٹ یہ میری ماما کا حکم ہے اور میں کبھی اپنی ماما کے حکم سے پہلو تہی نہیں برت سکتی۔“ اب وہ وضاحت دے رہی تھی۔ مگر صیام کے لب اب بھی خاموش تھے۔

وہ اسے بہت سپاٹ نگاہوں سے بے خود سا دیکھے جا رہا تھا۔ درمکنون ایک نظر اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد سٹ پنا کر رُخ پھیر گئی تھی۔

”اب چلیں مسز ہمدانی ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔“

”جی۔“ گہری سانس بھرتے ہوئے وہ ہوش میں آیا۔

درمکنون اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں کی خاموشی دیکھ سکتی تھی۔ جس وقت اس نے گاڑی مسز ہمدانی کے گھر کے قریب روکی بارش ختم چکی تھی۔

”آپ اب گھر جاسکتے ہیں، میں نے گھریلو ملازمین کو کہہ دیا ہے وہ گاؤں سے یہاں شفٹنگ میں مدد کریں گے آپ کی۔“

”شکریہ۔“ شاید وہ اس کی نوازشات کو ہمدردی سمجھ رہا تھا، درمکنون اثبات میں سر ہلاتی گاڑی سے نکل آئی۔ مسز ہمدانی کے ساتھ اس کی ملاقات بے حد کامیاب رہی تھی۔ رات وہ جس وقت دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہو کر گھر پہنچی اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

اگلے روز اس نے آفس سے چھٹی کر لی۔ پورا دن سو کر گزارنے کے بعد شام کے چار بجے جب وہ بیدار ہوئی تو شہزاد اس کے گھر پر موجود تھی۔

”السلام علیکم!“ وہ اسے لاؤنج میں ٹیلی ویژن کے سامنے براجمان دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ جو اب شہزاد نے ریموٹ اٹھا کر ٹیلی ویژن آف کر دیا۔

”وعلیکم السلام! ہو گئی نیند پوری؟“

”ہوں۔“

”شکر ہے، میں نے کل کہا بھی تھا کہ زیادہ خوبصورت نظر نہ آیا کرو، نظر لگ جائے گی، دیکھا لگ گئی ناں نظر، آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں تمہاری۔“

”ہوں..... غلطی ہو گئی مادام، آئندہ احتیاط کروں گی۔“

”اوکے، مریرہ پھوپھو کی کال آئی تھی، تمہارا پوچھ رہی تھیں، میں نے بتا دیا کہ سو رہی ہو شاید وہ رات میں دوبارہ کال کریں۔“

”ٹھیک ہے، تم کب آئیں؟“

”ابھی پندرہ بیس منٹ پہلے، ملازمہ نے بتایا کہ تم سو رہی ہو لہذا میں یہاں بیٹھ گئی۔“

”چلو اچھا کیا، آفس میں دن کیسا گزرا آج۔“ وہ اس کے قریب صوفے پر تنک گئی
شہر زاد نے دونوں ٹانگیں اوپر کر کے ایک بازو صوفے کی پشت گاہ پر رکھ لیا۔
”بے حد بور اینڈ ڈل۔“
”کیوں؟“

”تم جو نہیں تھیں آفس میں، پھر صیام بھی جلدی چلا گیا تھا شاید کوئی ضروری کام تھا اسے۔“
”ہوں، چائے پیو گی؟“

”شیور، اگر تم کہو گی تو ضرور پیوں گی۔“ وہ آج فرصت میں دکھائی دے رہی تھی۔ درکنون کچن میں
چلی آئی، ساتھ ہی شہر زاد بھی اٹھ آئی۔
”ایک مزے کی خبر سناؤں تمہیں؟“
”ہوں۔“

”صیام کی فیملی شہر شفت ہو گئی ہے کل رات۔“
”اچھا؟“ چائے کا پانی چولہے پر رکھتے ہوئے اس نے دلچسپی شوکی تھی۔ شہر زاد نے اثبات میں سر
ہلا دیا۔

”ہاں یار، آج ہی صیام نے بتایا آفس میں، یہیں پاس میں شفت ہوئے ہیں وہ لوگ، میں تو مل بھی
آئی ہوں جا کر۔“
”گڈ.....“

”اور تمہیں پتہ ہے دری، صیام بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔“ اگلے ہی پل اچانک اس نے کہا اور
درکنون کو لگا جیسے اسے چکر آ گیا ہو۔

”اس نے کہا تم سے؟“ چھوٹی سی پتیلی میں پانی کھول رہا تھا، اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کتنی چینی
ڈال چکی ہے۔ شہر زاد اب اسے بتا رہی تھی۔
”ہاں، اس نے خود بتایا ہے۔“
”گڈ، پھر تو تمہاری لاٹری نکل آئی؟“

”ظاہری بات ہے، میں نے ماما کو بھی بتا دیا ہے اس کے بارے میں، اور صیام سے اپنے نئے پروجیکٹ
پر بات بھی کر لی ہے، جیسے ہی عمر انکل پاکستان آئے اور انہوں نے بزنس اشارت کیا میں صیام کو ہتھیا لوں گی تم
سے۔“ وہ بے نیازی سے اس پر اپنا ارادہ ظاہر کر رہی تھی۔ درکنون نے کھولتے ہوئے پانی میں دودھ ڈال دیا۔
”اچھی دوست ہو یار! میرے درکرز کی چین توڑ رہی ہو، وہ بھی میرے آفس میں گھس کر۔“

”ایم سوری، دل کا معاملہ ہے یار، سمجھا کرو۔“
”ٹھیک ہے۔“

”تم کچھ پریشان ہو، کیا بات ہے دری؟“

”کچھ نہیں بس یونہی تھوڑی سی تھکن ہے اور کچھ ہلکا ہلکا بخار بھی، تم پریشان مت ہو۔“
”اوکے اسلام آباد کتنے دن کا قیام ہے تمہارا؟“
”کچھ پتہ نہیں شاید دو تین دن لگ جائیں۔“ وہ اب چائے کپوں میں انڈیل رہی تھی۔ شہر زاد نے
بسکٹ نکال لیے۔

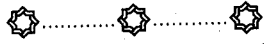
”ہوں..... واپسی کتنے دن تک ہو گی؟“
”کچھ پتہ نہیں یار، بتایا تو ہے، تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہو رہی ہے؟“ اب کے وہ پلٹی شہر زاد مسکرا دی۔
”تمہیں پتہ تو ہے میرا دل نہیں لگتا صیام کے بغیر۔“
”اوہ فارگاڈ سیک شہر زاد، تم تو بالکل ہی عقل سے پیدل ہو گئی ہو، ایسے بھی ہیرے نہیں جڑے صیام میں جو
تمہیں اس کے سوا کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔“ وہ اس کی ہمہ وقت صیام کی تکرار پر چڑی تھی۔ شہر زاد ڈھٹائی سے ہنس دی۔
”تمہیں کیا پتہ، کبھی اسے میری آنکھ سے دیکھو تو پتہ چلے۔“
”اوکے، لیکن خدا کا واسطہ ہے میرے سامنے ہر وقت صیام صیام کی تسبیح مت کیا کرو، مجھے یہ پسند نہیں۔“
”تم ہو ہی سڑیل۔“ اس کی بیزاری پر شہر زاد نے تنک کر کہا۔ درکنون خاموشی سے چائے کی چسکیاں
لیتی رہی۔

”اچھا سنو، تمہاری اسلام آباد سے واپسی تک میں گاؤں میں پرانی حویلی کے راز حل کرنے کی کوشش
کروں گی۔“

”پرانی حوالی کی بچی، تم میری غیر موجودگی میں آفس کو ناٹم دو گی، سمجھی؟“
”ہوں..... سمجھ گئی باس۔“ درکنون کے ڈپٹ کر کہنے پر اس نے شرارت سے مسکرا کر کہا۔ جواباً
درکنون بھی مسکرا دی۔



رستوں میں اُن دیکھے سنے کھلے ہوئے ہیں
خواب، دھنک، خوشبو اور چہرے ملے ہوئے ہیں
تیز ہوا میں دیپ سے کے جلے ہوئے ہیں
لیکن شہر کے دروازے پر
بے خوابی کے دکھ سکھ اوڑھے جانے
کس کی آس میں آنکھیں
نیندوں کا پہرہ دیتی ہیں!!



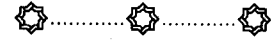
شب کے اڑھائی بجے تھے کہ کسی لڑکی کی دلدوز چیخوں کی آواز سے ”چیوا“ کی فضا لرز اٹھی۔ سدید
اس رات گھر نہیں تھا کیونکہ پورے علاقے میں انڈین آرمی نے کریک ڈاؤن کر رکھا تھا ایسی صورتحال میں کسی
بھی قسم کا خطرہ مول لینا دانشمندی کی بات نہیں تھی۔ شب کے اندھیرے میں گونجنے والی اذیت ناک چیخوں کی
آواز اسی محلے کی ایک نوجوان لڑکی آسیہ کی تھی جس سے فاطمہ کی بہت گہری دوستی تھی۔ ننھی عائشے کی آنکھ انہی
چیخوں کی آواز سے کھلی تھی۔

فاطمہ اور اس کی ماں جاگ رہی تھیں اور اللہ رب العزت سے رحم و نصرت کی بھیک مانگتے ہوئے
چپ چاپ رو رہی تھیں۔ عائشے ڈر کر ماں کی گود میں چھپ گئی۔ شب کے اندھیرے میں آئے روز کسی نہ کسی
کشمیری کے گھر سے دلدوز چیخوں کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں تھیں کیونکہ جمہوری بھارت کی سیکولر
فوج کے پاس لامحدود اختیارات تھے۔ کسی بھی کشمیری نوجوان کو بغیر کسی جرم یا ثبوت کے کہیں بھی لے جا کر تار چر
کرنا، گولیوں سے بھون دینا، کسی بھی کشمیری دوشیزہ کی عزت کے دامن کو گھر گھر تلاشی کے دوران تار تار کر دینا،
کسی بھی آباد کشمیری گھرانے کو توڑ پھوڑ کر آگ کی نذر کر دینا اس کے روز کے معمولات میں شامل تھا۔ اس دن
بھی یہی ہوا تھا۔ کرش ٹاپ کے دامن میں آباد گاؤں ”چیوا“ کی گلیاں بھارتی درندگی کا شکار ہوئی تھیں۔ ”چیوا“
کے علاقے میں مجاہدین کی موجودگی کا بہانہ بنا کر انہوں نے پورے علاقے کے گرد اپنا حصار باندھ کر وہاں
کریک ڈاؤن کیا تھا۔ شب بھر کی خواری کے بعد بھی وہاں کوئی کشمیری مجاہد نہ ملا تو اشتعال میں آ کر انہوں نے
علاقے کی مقامی آبادی پر چڑھائی شروع کر دی۔

آسیہ کا گھر بھی ان بدنصیب گھروں میں سے ایک تھا جہاں بھارتی درندوں کے ناپاک قدم پڑے
تھے۔ وہ دو بہنیں تھیں اور سوائے کشمیری زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتی تھیں۔ بچپن میں ہی باپ کے سائے
سے محرومی نے ان سیدھی سادھی معصوم لڑکیوں کو ہمت سے زیادہ محنت مشقت کا عادی بنا دیا تھا۔

چند سال قبل ان کا اکلوتا جوان بھائی کہ جس کے سر پر سہرا سجانے کے لیے اس کی ماں کب سے
خواب دیکھ رہی تھی بھارتی درندگی کی بھیٹ چڑھ گیا تھا۔ اس روز بھی بھارتی فوج نے علاقے میں مجاہدین کی
موجودگی کا بہانہ بنا کر وہاں کریک ڈاؤن کر رکھا تھا۔ اس کے بھائی راشد کی ابھی مونچھیں بھی نہیں پھوٹی تھیں کہ

درد کی خوشبو گئی، زخموں کی رعنائی گئی
موسم ہجراں تری اب کے پذیرائی گئی
کون سی محفل، کہاں کے روز و شب کیسا قیام
زندگی تو اصل میں اک سانس ہے آئی گئی



من آنگن میں شہر بسا ہے
شہر میں اک دریا بہتا ہے
جس میں چاند، ستارے، درپن
کبھی نہ ٹوٹنے والے بندھن
کہیں نہ بھولنے والی یادیں
ٹوٹی پھوٹی سی فریادیں
روشن دن اور جھلمل راتیں
لفظ ادھورے پوری باتیں
لہروں پر اٹھتے جذبے بہتے جائیں
کوئی کہانی کہتے جائیں
ہرے بھرے پیڑوں پہ شاخیں سایوں کی زنجیر بنائیں
نئے موسم کے خوشحال پرندے پلکوں پر پھیلے رنگوں سے
آنکھوں میں تصویر بنائیں
دریا میں افلاک نہائیں
اندر کے سب بھید کنارے کھلتے جائیں
دریا کی لہروں میں رستے

اس کی ماں نے محلے ہی میں ایک لڑکی تلاش کر کے اس کی منگنی کر دی۔ آسیہ اور صبا کو بھائی کے سر پر بچے سہرے کے خواب دن رات بے چین رکھتے تھے۔ دونوں بہنیں خوب محنت کر کے اپنے اکلوتے بھائی کی خوشیاں پوری کرنے کی کوشش میں جتنی رہتی تھیں۔ منگنی کو تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

اکثر فاطمہ بھی ان کے گھر جا کر کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔ سرخ و سپید رنگت اور سبز آنکھوں والی آسیہ اسے ہمیشہ سے اپنی تمام دوستوں میں سب سے زیادہ عزیز رہی تھی۔ پورے محلے میں ان کا گھر بے حد معزز مانا جاتا تھا۔ آسیہ کا بھائی راشد بھی اپنی بہنوں کی طرح سیدھا سادھا اور صوم و صلوة کا پابند تھا۔

اس رات وہ عشاء کی نماز پڑھ کر گھر آ رہا تھا جب شب کے اندھیرے میں اسے ہینڈز آپ کی آواز سنائی دی، اس کے پاس چونکہ کوئی اسلحہ یا گن وغیرہ نہیں تھی لہذا اس نے فوری ہاتھ اوپر کر لیے۔ گاؤں چوڑا کی گلیوں میں اس وقت مکمل سناٹا تھا۔ راشد کو بھارتی فوج کے اہلکار گریبان سے پکڑ کر قریبی کھیتوں میں لے گئے۔ اگلے پانچ منٹ وہ اس سے گاؤں میں مجاہدین کی آمد کے بارے میں تصدیق کرتے رہے، پانچ منٹ کے بعد بھی جب انہیں راشد کی زبانی کشمیری مجاہدین کی علاقے میں موجودگی کی کوئی اطلاع نہ ملی تو وہ جاتے ہوئے اس کے سر میں گولی مار کر اسے وہیں کھیت میں تڑپتا چھوڑ گئے۔ آسیہ اور اس کی ماں پر وہ رات قیامت بن کر گزری تھی۔

شب کے اندھیرے میں گونجنے والی فائر کی آواز سننے کے باوجود بھی وہ ماں بیٹیاں شب بھر دہلیز کو تکتی راشد کی واپسی کا انتظار کرتی رہی تھیں۔ انہیں خبر ہی نہیں تھی کہ جس سر پر سہرا سجانے کے وہ خواب دیکھ رہی ہیں وہ سر بھارتی درندوں کی دہشت گردی کا شکار ہو چکا ہے۔

اگلی صبح گاؤں میں کسی نے اطلاع دی کہ قریبی کھیتوں میں کسی نوجوان کی لاش پڑی ہوئی ہے۔ محلے کے لوگوں نے جا کر دیکھا تو اکڑی ہوئی وہ بے گور و کفن لاش کسی اور کی نہیں بلکہ آسیہ کے بھائی راشد کی ہی تھی جو نہ کسی تنظیم کا سرکردہ رکن تھا نہ ہی کوئی گوریلہ کمانڈو، مگر پھر بھی اسے نہایت بے دردی سے موت کی نیند سلا دیا گیا تھا۔ ایسی نیند جس کا حساب لینے والا، یا جسے کسی حساب میں شمار کرنے والا پوری دنیا میں کوئی نہیں تھا سوائے خود کشمیری مجاہدین اور کشمیری عوام کے!

آسیہ اس وقت بہت بیمار ہو گئی مگر رفتہ رفتہ زندگی کی بے حسی نے اسے پھر سے سانسوں کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اب اس کے ہونٹوں پر بات بے بات مسکراہٹ کی جگہ ایک مستقل چپ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ چند سالوں کی مسافت کے بعد وقت کا پہرہ گھومتے ہوئے پھر اسی مدار پر آ گیا تھا۔ اس بار ایک جمہوریت پسند، طاقت ور ریاست کے کارندوں کی دہشت گردی کی پلیٹ میں آنے والی خود آسیہ تھی۔

ایک باعصمت کشمیری بیٹی کہ جس کا کل اثاثہ ہی عزت تھی!

وہ ایک اندھیری رات تھی۔

چیوا کے باسیوں کی میٹھی نیندیں تو کب سے حرام ہو چکی تھیں مگر اس رات بھارتی فوج کے کریک ڈاؤن نے علاقے میں عجیب سے خوف اور بے چینی کا سحر پھونک دیا تھا۔ دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے آسیہ اور اس کی ماں کے ساتھ ساتھ ننھی سی صبا کا دل بھی دہلا دیا تھا۔ پھر اس سے پہلے کہ تینوں ماں بیٹی کچھ سوچ سمجھ پاتیں، بھارتی فوج کے اہلکار بیرونی دروازے کا لاک توڑ کر گھر میں گھس آئے تھے۔ آسیہ اور صبا فوج کو دیکھتے ہی دوڑ کر ماں سے چپک گئی تھیں۔ تبھی ایک اہلکار نے آگے بڑھ کر ان کی ماں کو بالوں سے پکڑ لیا۔

”کہاں ہیں ملی ٹینٹ (جنگجو) بتاؤ کہاں چھپایا ہے انہیں؟“

”پوچھنے کے ساتھ ہی اس اہلکار نے اس کی ماں کو زوردار لات رسید کرتے ہوئے گھر سے باہر نکال لیا تھا۔ تبھی فضا میں آسیہ اور اس کی بہن صبا کی چیخوں کی آواز گونجی تھی۔ اپنی مہربان ماں کو ظالم فوج کے شکنجے میں دیکھ کر آسیہ تڑپتے ہوئے اس کے قریب آئی تھی۔

”میری ماں کو چھوڑ دو، ہمیں کسی ملی ٹینٹ کا نہیں پتہ۔“

”بکواس بند کرو۔“

اسی اہلکار نے غرا کر کہتے ہوئے اسی وقت پلٹ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔ آسیہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ تبھی ایک دوسرے اہلکار کی نظر آسیہ کے شباب پر پڑی اور اس کی آنکھوں میں فوراً شیطانی ہوس اُتر آئی۔

محلے کے چیدہ چیدہ لوگ جو گھروں سے باہر نکل آئے تھے اللہ سے اس گھرانے کے لیے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ اسی اثناء میں بھارتی فوجی اہلکار نے آسیہ کو بازو سے پکڑ کر گھر کے اندر دھکیل دیا۔

”چلو اندر اور بتاؤں کہاں کہاں خفیہ ”ہائیڈز“ بنا رکھی ہیں تم مکار لوگوں نے؟“

اس اہلکاری دیکھا دیکھی دوسرے کارندے بھی اس کی ماں کو وہیں گلی میں چھوڑ کر گھر کے اندر گھس آئے تھے۔ ننھی صبا کو بھی انہوں نے ساتھ ہی گھسیٹ لیا۔ دروازہ دوبارہ بند ہو چکا تھا۔ ان کی ماں لپک کر دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو ساتھ والے گھر کی ایک عورت نے انہیں زبردستی پکڑ کر روک لیا۔

”پاگل ہوئی ہو عشرت..... یہ بے دین کافر لوگ ہیں، اس وقت تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتیں، ابھی جوان عورت ہو، سوائے اپنی عزت گنوانے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ مگر وہ پھر بھی تڑپتی رہیں۔ ان کے گھر کے بلب توڑ دیئے گئے تھے۔

گھر کے اندر سے آسیہ اور صبا کی دلخراش چیخوں کی صدائیں فضاء میں گونجتی رہیں۔ فاطمہ اور اس کی ماں سمیت تمام محلے والوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

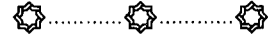
گھر کے اندر وحشی درندے بنا کسی خوف یا انجام کے نوزخ کلیوں کو مسل رہے تھے اور گھر کے باہر کھڑے مظلوم کشمیری لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کیے بے بسی سے روتے رہے۔ اس وقت وہاں کوئی بھی ان معصوم نوزخ کلیوں کی مدد کرنے سے قاصر تھا کیونکہ بے دین کافروں سے اگر وہ ان دونوں بہنوں کی عصمت بچانے کی کوشش کرتے تو خود ان کی اپنی بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ جاتی۔ شدید سردیوں کی وہ

تاریک رات جیسے صدیوں پر محیط ہو گئی تھی۔

اگلی صبح کا سورج چوہا کے باسیوں کے لیے سوگواریت کا پیغام لے کر طلوع ہوا تھا۔ کریک ڈاؤن کے خاتمے کے ساتھ ہی بھارتی فوج کی بکتر بند گاڑیاں ایک ایک کر کے علاقے سے نکل گئی تھیں مگر..... آسیہ کے گھر میں کچھ بھی سلامت نہیں رہا تھا۔ ہرے بھرے جنگل میں زبردستی گھس آنے والے خونخوار درندوں کے نوکیلے جبڑوں نے اس رات بستی کے اس گھر میں دونوں خیز جوانیوں کا خون پی کر ان کے سونے جیسے شفاف بدنوں کو بھنبھوڑ ڈالا تھا۔ ننھی صبا یہ جبر برداشت نہیں کر سکتی تھی، لہذا دوران تشدد ہی اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔

جبکہ آسیہ پھٹے کپڑوں کے ساتھ کمرے کے کونے میں سہمی ہوئی یوں بیٹھی تھی جیسے کوئی شاندار عمارت کسی اچانک زلزلے یا طوفان سے منہدم ہو کر مٹی کا ڈھیر بن جائے۔ اس وقت گاؤں چوہا کے ہر باسی کی آنکھوں میں آنسو تھے، آسیہ اور صبا کی ماں اپنا کل اثاثہ لٹ جانے پر سینہ کو بی کرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی، جبکہ فاطمہ اپنے سونچے ہوئے بازوؤں کی پروا کیے بغیر بے حسی سے گھر کے کام نپاتی رہی۔ تمام رات انگاروں پر لوٹنے کے بعد صبح کا یہ انجام اس سے پوشیدہ نہیں تھا۔

صرف ایک الزام پر اچھل قصاب اور افضل گورد کشمیری کو پھانسی کے تختے پر چڑھانے والی جمہوری حکومت کے لیے اس جنت نظیر وادی میں، پاکستان سے الحاق کرنے کی خواہش رکھنے والوں اور پاکستانی سرزمین سے محبت کرنے والے بے گناہ کشمیریوں کے لیے ایسی ہی سزائیں تھیں۔



بارش ہو رہی تھی۔ جس وقت وہ آفس سے گھر آیا اس کے کپڑے مکمل طور پر بارش میں بھیگ چکے تھے۔ شگفتہ ہینڈ پمپ کی مدد سے کپڑے دھو رہی تھی، جبکہ عشرت شام کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ البتہ اس کا بیٹا ماں کی گود میں تھا جو گھر کے حالات اور شوہر کی اچانک وفات کے بعد بہت کمزور ہو کر رہ گئی تھیں۔ صیام فریش ہونے کے بعد انہی کی چار پائی پر تک گیا۔

”السلام علیکم!“

”علیکم السلام آج جلدی آگئے پتر؟“

”جی ماں جی، آج کچھ ضروری کام نپانے تھے اس لیے جلدی نکل آیا۔“

”ہوں..... میں نے بھائی صاحب سے بات کر لی ہے۔ تیری غیر موجودگی میں وہ یہاں آ جائیں گے تین چار روز کے لیے۔“ اس کی ماں اسے اطلاع دے رہی تھیں تاکہ وہ اسلام آباد جا کر پریشان نہ ہو۔ تبھی وہ گہری سانس بھرتے ہوئے بولا۔

”اب اس کی ضرورت نہیں ہے ماں جی؟“

”کیوں؟ ماں جی کو حیرانی ہوئی تھی جبکہ عشرت اور شگفتہ نے بھی اسے چونک کر دیکھا تھا۔

”کیونکہ ہم اب یہاں نہیں رہیں گے۔“

”اللہ خیر کرے، کیسی باتیں کر رہے ہو پتر، کہیں ملازمت تو نہیں چھوڑ دی تو نے؟ ارے پلگے بھلا

یہاں نہیں رہیں گے تو کہاں رہیں گے اور کون سا ٹھکانہ ہے ہم غریبوں کا۔“

”ہم شہر شفٹ ہو رہے ہیں اماں جی، ایک ایسے گھر میں جہاں زندگی کی ہر عیش اور خوشی ہوگی اور وہ بھی ابھی اسی وقت۔“

”مگر..... ہمارے حالات؟“

”حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے ماں جی، آپ بس چلنے کی تیاری کریں۔“ اس کے لہجے میں خوشی تھی، شگفتہ کپڑے چھوڑ کر چلی آئی۔

”بھائی..... ہم شہر کے اخراجات کیسے پورے کریں گے؟ ابھی تو یہاں اتنے لوگوں کا قرض دینا ہے، پھر ابا کی قبر یہاں ہے، ہم شہر چلے گئے تو اسے کون سنبھالے گا؟“

”میں سنبھالوں گا، آتا جاتا رہوں گا یہاں، پھر ہمارا یہاں اپنا گھر تو نہیں ہے نا؟ یہاں بھی کرایہ دینا ہے وہاں بھی، ویسے بھی اس گھر میں اب کوئی سہولت نہیں ہے، مجھے آفس سے یہاں آنے جانے میں جو خواری اٹھانی پڑتی ہے وہ الگ ہے، باقی جہاں تک قرض کی بات ہے تو وہ میرا اس ماہ کی تنخواہ سے ایک ایک پائی ادا کر چکا ہوں اب جلدی سے سامان باندھ لو، تمہیں ایک محفوظ گھر میں شفٹ کرنے کے بعد ہی میں کہیں جا پاؤں گا۔“ اس کے لہجے میں فکر تھی۔ شگفتہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے بھائی، پر پتہ نہیں شہر کا ماحول کیسا ہو؟ وہاں ہمیں کیسے گھر میں رہنا نصب ہو۔“

”یہ سب میرا مسئلہ ہے تم سامان باندھو جلدی۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس بار اس نے بحث نہیں کی۔

گھر میں کل سامان ہی کتنا تھا جو باندھنے اور سمیٹنے میں دیر لگتی۔ عشرت کھانا تیار کر چکی تھی، لہذا کھانے سے فارغ ہو کر وہ لوگ فوراً گاؤں سے نکل آئے تھے۔ سامان کی منتقلی کے لیے وہ پہلے ہی شہر سے گاڑی ساتھ لے آیا تھا، لہذا جس وقت وہ گاؤں سے شہر پہنچے، رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ گاؤں میں جو چیدہ چیدہ جانے والے تھے ان سے میل ملاقات میں بھی کافی وقت نکل گیا تھا۔

بارش تھم چکی تھی۔ ماں جی، عشرت اور شگفتہ کی آنکھیں سامنے موجود شاندار گھر کو دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

”بھائی کیا ہم یہاں رہیں گے؟“ شگفتہ کو یقین نہیں آ رہا تھا لہذا اس نے پوچھا۔ جواباً صیام کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”ہوں.....“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ماشاء اللہ یہ تو بہت پیارا گھر ہے۔ یقیناً یہاں لائٹ کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوگا، مگر..... ایک مسئلہ ہے۔“

”کیا؟“

”جتنا شاندار یہ گھر ہے ہمارا تو آدھا بجٹ اس کے کرائے میں ہی پورا ہو جائے گا۔“

”نہیں ایسا نہیں ہوگا، کرایہ مناسب ہی ہوگا اور پھر میری تنخواہ بھی بڑھ گئی ہے اس ماہ۔“ گاڑی سے

سامان اتارتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ پھر بیرونی گیٹ کا لاک کھولتے ہوئے وہ انہیں گھر کے اندر لے آیا۔ اندر سے گھر کی خوبصورتی اور بھی قابل دید تھی۔

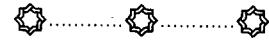
عشرت اور شگفتہ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنے شاندار گھر میں بھی رہ سکتی ہیں۔ ماں جی کی آنکھوں میں ستائش تھی۔ جیسے انہیں بھی اتنی بڑی تبدیلی کا یقین نہ آ رہا ہو۔ کہاں تو کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تھی اور کہاں اب جیسے محل میں آگئے تھے جہاں ضرورت کی ہر چیز پہلے سے موجود تھی کچھ صیام لے آیا تھا۔ وہ پوری رات ان سب نے جاگ کر گزاری تھی۔

ایک کمرہ صیام نے اپنے لیے سیٹ کر لیا تھا جبکہ دوسرے کمرے میں ماں جی اور عشرت شگفتہ نے اپنے بستر لگا لیے۔

بچن میں گیس اور پانی کی سہولت کے ساتھ ساتھ پورے مہینے کا راشن بھی موجود تھا، وہ اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کرتے کم تھا۔

اگلے روز صیام آفس آیا تو درمکون چھٹی پر تھی۔ اس کے دل کی ساری خوشی جیسے سمندر کے جھاگ کی مانند بیٹھ گئی۔ درمکون کی سیٹ پر شہزاد کو براجمان دیکھ کر ایک عجیب سی بے کلی نے اسے اپنے حصار میں لیا تھا تاہم اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

اگلے پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ ضروری کام اعذر پیش کر کے آفس سے نکل گیا۔ اگر درمکون آفس میں نہیں تھی تو اس کا بھی آفس میں کوئی کام نہیں تھا۔



فلائٹ کا ٹائم ہو گیا تھا۔ درمکون صیام کے ساتھ جس وقت ایئر پورٹ پہنچی سرد ہواؤں کے تھپڑوں نے اسے بے ساختہ کپکپانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کا قیام فائیو اسٹار ہوٹل میں تھا۔ درمکون اور صیام کے کمرے سینکڈ فلور پر بک تھے۔ دونوں کے کمرے ایک دوسرے کے بالکل آگے سامنے تھے۔

ساویز آفندی بھی اس میننگ میں مدعو تھا مگر درمکون بے خبر تھی۔ اسے محض اتنا پتہ تھا کہ وہ ایک بڑی میننگ تھی، جس میں پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے کمپنی مالکان اور ان کے پی اے کے علاوہ بیرون ملک سے بھی کچھ وفد آ رہے تھے۔ تاہم ان وفد میں ساویز آفندی کا نام بھی شامل ہو گا یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ ساویز کا کمرہ بھی سینکڈ فلور پر تھا اور وہ صرف ایک دن کے لیے انگلینڈ سے اسپیشلی پاکستان آیا تھا۔

رات جس وقت وہ لوگ ہوٹل پہنچے تھے اسلام آباد میں ٹھنڈ کافی تھی اوپر سے درمکون کی طبیعت پہلے ہی ناساز تھی لہذا ہوٹل پہنچتے ہی اس کا بخار کافی بڑھ چکا تھا۔ صیام جو اس کے ساتھ ساتھ تھا اس کی گزرتی ہوئی طبیعت سے بے خبر نہیں رہ سکا تھا مگر عجیب بے بسی تھی کہ وہ اس کی کوئی مدد بھی نہیں کر سکتا تھا، جب تک کہ وہ خود اس سے نہ کہتی۔

وہ لوگ اوپر اپنے کمروں میں جانے کے لیے لفٹ میں آئے تب اچانک اسے زور کا چکر آیا اور اس نے لڑکھڑاتے ہوئے بے ساختہ صیام کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ ٹھیک تو ہیں مادام؟“ صیام کی جان پر بن گئی تھی۔ درمکون نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”اگر آپ بہتر سمجھیں تو پہلے کسی ڈاکٹر کے پاس چلیں؟“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر آپ کا بخار؟“

”آپ پریشان نہ ہوں، مجھے اکثر ایسا بخار ہو جاتا ہے۔“

”مگر.....“

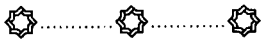
”نو اگر مگر، آپ پلیر اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں، صبح ہمیں میننگ میں بہت اچھی تیاری کے ساتھ شریک ہونا ہے۔“ خود کو سنبھالتے ہوئے وہ خالصتا پرڈیشنل لہجے میں بولی۔ صیام کو گہری سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی اس کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی ابھی اس نے روم سروس کو بلا کر ایک گلاس گرم دودھ اور ساتھ میں بخار کی میڈیسن کا آرڈر دیا۔

درمکون ابھی لباس تبدیل کر کے بستر پر دراز ہونے ہی والی تھی جب دروازے پر ہونے والی دستک نے اس کی توجہ کھینچ لی۔ شب کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے اس نے ڈور ہول سے دیکھا باہر ویٹر ہاتھ میں ٹرے لیے موجود تھا اس نے دروازہ کھول دیا۔

”جی فرمائیے۔“

”یہ گرم دودھ اور بخار کی میڈیسن ہے سامنے والے سرے آپ کے لیے بھجوائی ہے۔“ ویٹر اس کے استفسار پر اسے بتا رہا تھا۔

درمکون نے نظر اٹھا کر دیکھا صیام اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑا بے حد پریشان سا اسے ہی دیکھ رہا تھا، اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔ ویٹر سے ٹرے تھام کر اس نے آہستہ سے دروازہ بند کیا مگر اس رات صیام کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکی تھی۔



پنچائیت اپنا حتمی فیصلہ سنانے ہی والی تھی کہ اچانک وہاں مائی جیراں کی آمد اور الفاظ نے ملک اظہار اور ان کے بیٹوں سمیت گاؤں کے تمام معزز افراد کو حیران کر ڈالا تھا۔

ملک وقار جو ابھی سکون کی سانس لے کر بیٹھے تھے مائی جیراں کی آمد اور مداخلت پر پہلو بدل کر رہ گئے۔ اب جانے وہ کون سا انکشاف کرنے والی تھی۔ ان کی آنکھوں کی سرخی عود کر آئی وہ مائی جیراں کو ایسی خشکیوں سے گھرا ہوا گھور رہے تھے گویا کچا چٹا جاکیں گے۔ گاؤں میں ان کی طاقت اور رعونت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود وہ بڑھیا ان کے خلاف جانے کی گستاخی کر رہی تھی۔ اس کا یہ قصور کسی طور قابل معافی نہیں تھا۔ مائی جیراں کہہ رہی تھی۔

”چھوٹے چوہدری صاحب کے کھیت میرے گھر کے بالکل قریب ہیں سرکار، جس وقت وہ انہونی

ہوئی میں بد نصیب بڑھیا اپنے گھر کے باہر اُپلے تھاپ رہی تھی۔ میں نے قمر سائیں کو خود اپنی آنکھوں سے کھیت میں کام کرتے ہوئے دیکھا تھا، میرا حال چال بھی پوچھا تھا انہوں نے اور یہ دعا کرنے کے لیے بھی کہا تھا کہ اللہ انہیں سلامتی کے ساتھ صحت مند اولاد نصیب کرے، میں نے دعا دی تھی، پھر وہ اپنے کام میں اور میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی، تبھی وہاں کسی جپ کے رکنے کی آواز سنائی دی، میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو بڑی حویلی کے سپوت ملک ریاض کو وہاں قمر سائیں کے قریب کھڑے پایا، انہوں نے سفید لٹھے کی شلوار پر گہرا جامنی کرتا پہن رکھا تھا اور وہ کچھ ایسا کہہ رہے تھے کہ جس سے قمر سائیں کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، میں اُپلے چھوڑ کر تھوڑی قریب گئی تو میں نے ملک ریاض کو کہتے سنا، وہ قمر سائیں سے کہہ رہا تھا۔

”نئی نئی شادی ہوئی ہے تیری، مزے کر اور نورین کی جان چھوڑ دے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے بھی تیری دلاری بہن کے پاس جانا پڑ جائے۔“

قمر عباس سائیں نے یہ سن کر اسے وہاں سے دفع ہو جانے کے لیے کہا تھا، تبھی ملک ریاض نے پستول نکال لیا اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے قمر سائیں کے جسم میں ایک ساتھ تین گولیاں اتار دیں، جب اس سے بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے ان کے سینے پر بیٹھ کر چاقو کے وار کرنے شروع کر دیے، میں چیختی تھی، میری چیخ پر ماچھی کرم داد بھی وہاں آیا تھا اس نے بھی اپنی آنکھوں سے وہی منظر دیکھا جو میری بد نصیب آنکھیں دیکھ رہی تھیں، آپ کو اگر مجھ پر یقین نہ ہو تو آپ ماچھی کرم داد سے بھی ساری حقیقت معلوم کر سکتے ہیں۔“

”باس..... بہت ٹرٹر کر چکی تو بڑھیا، ماچھی کرم داد اپنا بیان ریکارڈ کروا چکا ہے، جو اصل گناہ گار ہیں وہ اقبال جرم بھی کر چکے ہی، تو ہم دو بھائیوں کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی کوشش نہ کر۔“ ملک وقار شدید اشتعال میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مائی جیراں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

”اقبال جرم.....“ اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

جانے کون بد نصیب تھا جس نے ملک ریاض جیسے درندے کے گناہ کا اقرار اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ اسے بے ساختہ دس سال پہلے کا اپنے بیٹے کا اقبال جرم یاد آیا، جس کے معصوم جسم کی کھال پولیس والوں کے فرض نے ادھیڑ ڈالی تھی، جو گاؤں میں اس قتل کا واحد چشم دید گواہ تھا جو قتل ملک وقار کے ہاتھوں ہوا تھا مگر جس کا اقبال جرم اس کے نابالغ معصوم بیٹے نے کیا تھا اور بالآخر پھانسی کے تختے پر جھول گیا تھا۔

وقت پھر وہی کہانی دہرا رہا تھا، فرق صرف اتنا تھا کہ اس بار نا کردہ گناہ کا اقرار کرنے والے اس کے نہیں کسی اور ماں کے جگر کے ٹکڑے تھے۔

پنچائیت نے اس کے بیان کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ وجہ گاؤں میں اس کی وہ شہرت تھی جو اس کے معصوم بے گناہ بیٹے نے اقبال جرم کے بعد گاؤں میں ماں کے ماتھے پر چپکا دی تھی۔ وہ ایک عزت کے لٹیرے، قاتل بیٹے کی ماں بھی بھلا اس کی گواہی کیسے معتبر مانی جاسکتی تھی، نتیجتاً اسے بے عزت کر کے وہاں سے واپس بھیج دیا گیا۔ اگلے چند دنوں میں پولیس نے اپنی ضروری کارروائی مکمل کر کے کیس عدالت کے سپرد کر دیا۔ جہاں دو عینی شاہدین کی گواہی کو کافی ثبوت مانتے ہوئے انصاف کی کرسی پر بیٹھے منصف کے قلم نے حق نواز کے بیٹے

شہزاد اور ارشاد حسین کی کے بیٹے راشد کو، انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے موت کی سزا سنائی۔ دو اور ماؤں کی گودا جڑ چکی تھی۔ کائیں کائیں کرتے چور چاتے پرندوں کا احتجاج کسی ریکارڈ میں نہیں آیا تھا۔ قانون اور انصاف کے تقاضے پورے ہو گئے تھے۔

ملک ریاض دوبارہ حویلی آ گیا، جس رات وہ شہر سے حویلی آیا حویلی کا جشن دیکھنے لائق تھا، دوسری طرف پرانی حویلی میں ایک مرتبہ پھر ماتم ہو رہا تھا۔ سردیوں کی طویل راتوں میں دل پر لگنے والے گھاؤ اور بوجھ نے بے جی کی جان لے لی تھی۔ رات عشاء کی نماز پڑھ کر وہ ایسی سوئیں کہ پھر صبح کسی کے جگانے پر بھی انہوں نے بند آنکھیں نہیں کھولی تھیں۔

حویلی کے پچھواڑے میں شگفتہ اظہار عباس اور قمر عباس کے بعد تیسری بننے والی آرام گاہ ”بے جی“ کی ہی تھی جنہیں وقت کے ناگ نے ڈس لیا تھا۔



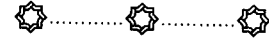
پرانی حویلی میں بے جی کی وفات کے بعد ملک اظہار اور ملک وقار کے درمیان دشمنی کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ عمر عباس نے قمر عباس کے قتل کا کیس واپس لے کر حق نواز اور ارشاد حسین کی کے بے گناہ بیٹوں کو قانون کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا تھا مگر وہ مائی جیراں کی بیٹی اور گھرانے کو ملک وقار کے انتقام کی بھینٹ چڑھنے سے نہیں بچا سکا۔ مائی جیراں پنچائیت سے واپسی کے بعد وہ گاؤں چھوڑ کر ساتھ والے گاؤں میں اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔ اسے محض گمان نہیں پنچتہ یقین تھا کہ ملک وقار اپنے بیٹے کے خلاف گواہی کے بعد یقیناً اسے معاف نہیں کرے گا، لہذا کوئی نقصان اٹھانے سے پہلے ہی وہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

تاہم چار ماہ بعد جب بات پرانی ہو گئی اور ملک ریاض بھی حویلی واپس لوٹ آیا تھا وہ ایک شام چپ چاپ گاؤں واپس آ گئی۔ اس کی جوان بیٹی کی شادی کے دن رکھے جا چکے تھے اور اسے ابھی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے بہت محنت اور کام کرنے تھے۔ اس روز بہت دنوں کے بعد قدرے تیز دھوپ نکلی تھی۔ مائی جیراں کو بخار تھا لہذا گھر کے کام کاج کے ساتھ ساتھ باہر کے کام بھی مائی جیراں کی بیٹی شہناز کے کندھوں پر آ پڑے تھے۔ دن بھر تپتے سورج کی کرنوں کی تمازت عصر کی اذان کے ساتھ ہی کم پڑنے لگی تھی۔ گاؤں کی پرسکون فضاء میں گوشچی پن نچلی اور نیوب ویلوں کی آواز بے حد بھلی محسوس ہو رہی تھی جب مائی جیراں کی بیٹی شہناز نے ہاتھ میں پکڑی دراتی کو ایک سائینڈ پر رکھ کر کئے ہوئے سبز چارے کو کپڑے میں رکھ کر گانڈھ لگا دی۔ گھر میں موجود دو بکریاں صبح سے بھوکی کھڑی تھیں مگر کپڑوں کی دھلائی میں مصروف شہناز کو اتنا وقت ہی نہیں مل سکا تھا کہ وہ ان کے چارے کے لیے سبز گھاس کاٹ لاتی۔ کپڑوں کی دھلائی سے فارغ ہونے کے بعد مائی جیراں کو جن کا اصل نام نذیراں بی بی تھا، بخار کی دوا اور چائے کی پیالی دے کر وہ دراتی سنبھالتے ہوئے کھیتوں کی طرف نکل آئی تھی۔ ساتھ والے گاؤں میں اس کا منگیترا آج کل شہر گیا ہوا تھا، شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں، وہ اسی کے خیالوں میں مگن، سر پر چارے کی گٹھڑی رکھے گھر کی طرف آ رہی تھی جب اچانک قریبی کھیت سے نکلتے ایک نقاب پوش نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے مکاد (گنا) کے فصل کے اندر کھینچ لیا۔

عصر کے بعد مغرب ہو گئی تھی مگر شہناز گھر نہیں آئی۔

تیز بخار میں پھٹکتی مائی جیراں کا دل اچانک سے گھبرا گیا تھا۔ بنا اپنی حالت کی پروا کیے وہ گھر سے باہر نکل آئی تھی۔ پن بجلی کی آواز ابھی بھی فضا میں گونج رہی تھی۔ ٹیوب ویلوں کا شور بھی ساعتوں کی زینت بن رہا تھا مگر اس کی شہناز کہیں نہیں تھی۔ چار ماہ کے بعد اس کے خدشے پورے ہو گئے تھے۔ اس کے دل کا چور باہر نکل آیا تھا۔ عجیب بے بسی تھی کہ وہ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتی تھی کہ رسوائی کا ڈر تھا۔ جس بیٹی کے ہاتھ پر محض چند دنوں کے بعد مہندی لگنے والی تھی وہ اس کے اچلے دامن پر کوئی داغ کیسے لگنے دیتی۔ مغرب سے عشاء ہو گئی تھی مگر شہناز کا کہیں کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ رات مائی جیراں کے لیے جیسے قیامت کی رات تھی۔ تیز بخار کی پروا کیے بغیر وہ پوری رات بیرونی دروازہ کھول کر دہلیز پر بیٹھی رہی تھی۔ اگلے روز مغرب کے قریب کسی نے آ کر اسے شہناز کے ملنے کی اطلاع دی تھی۔ گاؤں سے چند کلومیٹر کی مسافت پر پہنچنے والی نہر کے پانی میں تیرتی شہناز کی برہنہ لاش اس لائق بھی نہیں تھی کہ اسے نظر بھر دیکھا جاتا۔ دس سال پہلے ایک جرم اس کے بیٹے سے سرزد ہوا تھا، ملک وقار کی درنگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا جرم اور اس جرم کی سزا اسے اپنی جان گنوا کر ادا کرنی پڑی تھی۔

دس سال بعد ٹھیک ویسا ہی جرم مائی جیراں کر بیٹھی تھی اور اس بار اس جرم کا کفارہ اسے بیٹی کی جان کے ساتھ ساتھ اس کی عزت گنوا کر ادا کرنا پڑا تھا۔



دن ڈھل چکا تھا۔ صبح سے شام کی مسافت کے بعد تھکا ماندہ سورج اپنی سنہری کرنوں کو آغوش میں لیے مغرب کے سینے میں منہ چھپانے کی تیاری کر رہا تھا۔ جب مائی جیراں کی بیٹی شہناز نے سبز چارے کی گٹھڑی سر پر رکھی اور گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

قرب وجوار کے کھیت سنسان پڑے تھے۔ دو روز قبل ہوئی بارش نے کچی سڑک پر پھیلنے والے کچھڑ کو آتے جاتے راہ گیروں کے لیے مصیبت بنا دیا تھا۔ تبھی وہ نیچے کچی سڑک پر نگاہ جمائے، اپنے ہی خیالوں میں مست جا رہی تھی کہ اچانک قریبی کھت سے کسی تنومند نقاب پوش نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

شہناز پر ٹوٹنے والی یہ آفت اتنی اچانک تھی کہ اسے سنہلنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ اس کی گٹھڑی زمین بوس ہو گئی تھی، ہاتھ سے درانتی بھی چھوٹ کر گر پڑی۔ نقاب پوش نے اسے کماد کی فصل میں گھسیٹ کر اس کا منہ مٹی سے بھر دیا تھا تاکہ وہ چلا نہ سکے بعد ازاں اسے قریب رکنے والی ٹرائی میں ڈال کر اس کے اوپر کماد ڈال دی، ارد گرد کسی کو اس انہونی کی کانوں کا خبر نہیں ہو سکی تھی۔ شہناز کی گٹھڑی اور درانتی کو بھی کماد کی فصل کے اندر ہی چھپا دیا گیا تھا۔

شہناز کو جس وقت ہوش آیا دن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکا تھا اور وہ ایک ویران سے کھنڈر مکان میں بے یار و مددگار پڑی ہوئی تھی۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ ملک وقار کا بیٹا ملک ریاض اور اس کے کارندے وہاں اس کے سامنے آ گئے۔ ان کی حالت سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ سب نشے میں تھے۔ شہناز کا دل بے ساختہ زور سے دھڑک اٹھا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے ساتھ وہاں کچھ بھی اچھا نہیں ہونے والا تھا۔ تبھی اس نے چلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کے اندر سے اٹھنے والی چیخیں اس کے حلق میں ہی دم توڑ گئی تھیں۔ وہاں فرار کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا، لہذا اس نے ملک ریاض کے پاؤں پکڑ لیے۔

”مجھے چھوڑ دیں سائیں، میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”تو نے نہیں کیا مگر تیری ماں نے تو کیا ہے، اسے سزا تو ملنی چاہیے ناں۔“ اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے وہ غرایا۔ شہناز بلبلاتا اٹھی۔

”خدا کا واسطہ ہے آپ کو، میری اور میری ماں کو معاف کر دیں دوبارہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔“

”دوبارہ غلطی کرنے کے قابل رہو گی تم ماں بیٹی تو غلطی کرو گی ناں؟ ہماری عدالت میں ہر غلطی کی صرف سزا ہے، معافی نہیں ہے۔“ شراب کے نشے میں دھت وہ بے حد رعونت سے کہہ رہا تھا۔ شہناز کا وجود خشک پتے کی مانند کانپ کر رہا گیا۔ اس شیطان نما انسان سے انسانیت کی توقع رکھنا حماقت کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

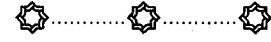
سب سے پہلے اس کا دوپٹہ نوج کر دور پھینکنے والا فرعون ملک ریاض ہی تھا پھر اس کے ایماء پر اس کے کارندے قریب آئے تھے، وہ کس کس کے ہاتھ جھٹکتی، کس کس سے اپنا اُجلا دامن بچانے کی کوشش کرتی، ہوش و حواس سے بے خبران بھڑیوں میں بھلا انسانیت ہی کہاں تھی۔

مغرب سے عشاء اور عشاء سے صبح فجر تک ان بھینڑیوں نے یوں اس کے جسم کو بھنبھوڑا تھا کہ اسے اپنا کوئی ہوش ہی نہ رہا۔ جسم کے ایک عضو پر ان کی حیوانیت کے نشانات رقم تھے، وہ سرتا پیر زخم بن گئی تھی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاتی رہی مگر وہاں کوئی اس کی مدد کے لیے نہ آ سکا۔ اچھی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد ملک ریاض کے کارندوں نے اس کے حکم پر اس کے لیے دراز بال فینچی سے کاٹ کر اس کے سر کو ٹنڈ منڈ کر دیا تھا۔ بالوں کے بعد اس کے جسم کے اعضاء کی باری آئی تھی۔ پہلے دونوں کا کانے گئے، پھر ناک کو بھی چہرے سے الگ کر دیا گیا۔ شہناز کے لیے یہ تکلیف قابل برداشت نہیں تھی لہذا اس نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس کے جسم سے جان نکلنے کے بعد اس کی عصمت کو بھنبھوڑنے والے درندوں نے اپنے آقا کے حکم پر سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اس بدنصیب کو اسی حال میں بہتی ندی کے سرد پانی کے سپرد کر دیا۔

پورا دن تیرنے کے بعد یہ لاش پانی میں بہتی اس کے گاؤں پہنچی تھی اور اب پورے گاؤں میں چہرے مگوئیاں ہو رہی تھیں۔ ہر کسی کے لبوں پر اس کی اپنی من پسند کہانی تھی کسی کو لگتا تھا کہ شہناز ساتھ والے گاؤں میں اپنے شادی سے خوش نہیں تھی، لہذا اسی دکھ میں شادی سے فقط چند روز قبل اس نے نہر کے پانی میں کود کر اپنی جان دے دی، جبکہ کسی کا خیال تھا کہ وہ ماں سے جھگڑ کر گاؤں میں کسی کے ساتھ فرار ہو گئی تھی مگر جس کے ساتھ وہ فرار ہوئی تھی اس نے اس کے ساتھ وفا نہیں کی تبھی اسے بے عزت کرنے کے بعد اس کا برا حشر کر کے اسے پانی کی سفاکی کے سپرد کر دیا۔

مائی جیراں سب کے تبصرے سنتی بس خالی خالی سی ویران نگاہوں کے ساتھ اپنی معصوم شریف بیٹی کے

اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا جائزہ لیتی رہی۔ پورے دس سال کے بعد اسے اپنے اکلوتے بیٹے کے بے گناہ ہونے کے باوجود اقبال جرم کرنے کی وجہ سمجھ میں آئی تھی۔ کتنی اذیت سہی تھی اس کی بیٹی نے اپنی ماں کے جرم کا تاوان بھرنے کے لیے..... اس روز کے بعد کسی نے اس گاؤں میں مائی جیروں کو نہیں دیکھا تھا..... اپنا ذہنی توازن کھونے سے پہلے ہی وہ اس گاؤں سے کوچ کر گئی تھی۔



شہناز کی المناک موت کو تیسرا ہفتہ مکمل ہو رہا تھا جب ملک وقار نے ملک ریاض کو ایروڈ بھجوانے کی تیار کر لی مگر ریاض فی الحال ایروڈ جانے کے حق میں نہیں تھا۔ نورین کے ساتھ اس کی بات طے ہو گئی تھی لہذا وہ اب شادی کے بعد ہی کہیں جانے کا سوچ رہا تھا۔

زبیدہ بی بی نے اس بار جہیز میں اپنی اکلوتی بیٹی کو دو عدد دھینسوں کے ساتھ تین مربے زمین بھی دی تھی جو ریاض نے شادی سے پہلے ہی اپنے نام کروالی۔ ملک وقار کے کارندوں نے ان کے حکم پر پرانی حویلی اور اس کے تمام مکینوں پر کڑی نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ ملک اظہار دل کے شدید اٹیک کے بعد زیادہ تر بستر کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ خضر عباس اور نظر عباس ہی ان کی جگہ تمام معاملات سنبھالے ہوئے تھے۔

عمر عباس کی سرگرمیاں البتہ مشکوک ہو گئی تھی۔ وہ بہت کم حویلی میں ٹھہرتا تھا۔ کئی کئی دن غیر حاضری کے بعد اس کا حویلی میں بسیرا ہوتا تھا، وہ بھی محض ایک رات یا دو رات کے لیے۔ شگفتہ اظہار عباس کے بعد قمر عباس اور بے جی کی موت لاوا بن کر اس کے دل کو دکھائے ہوئے تھی یہی وجہ تھی کہ ملک وقار کی کڑی نگرانی کے باوجود، شادی سے صرف ایک دن پہلے جب نورین نے ریاض کو کھیت پر ملنے کے لیے بلایا، اس نے یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔

نئی حویلی کی سجاوٹ اور جشن ادھورے رہ گئے تھے۔

رات بھر گھر سے غائب رہنے والی نورین کا مردہ جسم، ملک ریاض کے بے جان جسم کے ساتھ برہنہ حالت میں خود انہی کے کھیتوں میں پایا گیا تھا۔ جوان بیٹے کی موت کا دکھ کیا ہوتا ہے اس وقت ملک وقار کو پتہ لگا تھا۔ پورے گاؤں میں جیسے کھلبلی مچ گئی تھی۔ ایک طرف نئی حویلی میں ماتم ہو رہا تھا تو دوسری طرف پرانی حویلی میں شہر بانو نے ایک چاندی خوبصورت، صحت مند بچی کو جنم دے کر گویا پوری حویلی میں خوشیاں بکھیر دی تھیں۔ شگفتہ اظہار عباس اور خضر کی بیٹی کے بعد اس حویلی میں جنم لینے والی وہ تیسری لڑکی تھی مگر بد قسمتی سے اس کا باپ یہ خوشی دیکھنے کے لیے زندہ نہیں تھا۔ وہ پیدا آئی یتیم تھی تاہم اظہار ملک صاحب نے روتی ہوئی شہر بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تھی۔

”دل چھوٹا نہ کر پتر، قمر نہیں رہا تو کیا ہوا اس کا باپ ابھی زندہ ہے، میں اس کے سر پر دست شفقت رکھوں گا، آج سے یہ قمر کی نہیں میری بیٹی ہے، ملک اظہار کی بیٹی، شہر زاد بانو۔“ ان کا لہجہ مضبوط تھا۔ روتی ہوئی شہر بانو کے آنسو ٹھم گئے۔

اگلی صبح ملک ریاض اور نورین کے پراسرار قتل کی خبر پرانی حویلی تک بھی پہنچ گئی تھی، شہر بانو کو لگا جیسے

اس کے زخموں پر مرہم لگ گیا ہو۔ زبیدہ بی بی اکلوتی بیٹی کی ذلت آمیز موت پر سینہ کو بی کرتے ہوئے بین کر رہی تھی جبکہ ملک وقار کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ پورے گاؤں کو تہس نہس کر کے رکھ دیتا۔ پاگل کتے کی طرح وہ کبھی تھانے تو کبھی حویلی کے چکر لگا رہا تھا۔ انہیں عمر عباس پر شک تھا مگر عمر گاؤں میں نہیں تھا، لہذا پولیس چاہتے ہوئے بھی اس کیس میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی تھی۔ ملک ریاض کے بڑے دونوں بھائی ایروڈ سے حویلی واپس آ گئے تھے۔ ملک وقار کی طرح ان کی رگوں میں بھی جوشیلا خون تھا لہذا اپنے جوان بھائی ملک ریاض کی تدفین کے بعد انہوں نے اپنے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ جب تک وہ عمر عباس اور اس کے بھائیوں کے قتل کا بدلہ نہیں لیں گے سکون سے نہیں بیٹھیں گے نہ ہی ایروڈ واپس جائیں گے۔

قمر عباس کے بے رحمانہ قتل کے بعد سے شروع ہونے والی یہ جنگ خاصی سنگین شکل اختیار کر گئی تھی۔



زاویار صمد حسن ان دنوں چھ ماہ کا تھا جب مریرہ کو شگفتہ اظہار عباس کے بعد قمر عباس اور بے حد مشفق بے جی کی ناگہانی رحلت کی خبر ملی۔ حمزہ ان دنوں چھٹیوں میں گھر آئی ہوئی تھی۔ مریرہ نے اسے صمد حسن سے متعلق ساری سچائی بتا کر ایک مرتبہ پھر صمد حسن کا قد اونچا کر دیا تھا۔

اس روز منہ کی چھٹی کا آخری دن تھا، جب وہ اس سے مل کر بہت سارا وقت اس کے ساتھ بیتانے کے بعد گھر واپس آئی تو خلاف توقع صمد گھر پر موجود تھا۔ لاؤنج میں ٹی وی چل رہا تھا اور صمد بنا کپڑے تبدیل کیے چپ چاپ سا اس کے سامنے بیٹھا جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ مریرہ ننھے زاویار کو بانہوں میں لیے اس کے قریب آ بیٹھی۔

”خیریت آج آپ آفس سے جلدی گھر آ گئے؟“

”ہوں، تمہیں اچھا نہیں لگا؟“ بنا اس کی طرف دیکھے اس نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

”مجھے برا کیوں لگے گا؟“

”کہاں تھیں تم.....؟ میں پچھلے تین گھنٹوں سے پاگلوں کی طرح تمہیں کا لڑ کرتے ہوئے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ اس کے سوال کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بے حد خشک لہجے میں پوچھا تھا جب وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

”ایم سوری صمد، میں ذرا حمزہ کی طرف چلی گئی تھی وہ رات میں اپنی جاب پر واپس جا رہی ہے تو میں اس کی تیاری میں مدد کرواتی رہی، سیل یہاں گھر پر ہی رہ گیا تھا۔“

”اوکے، مگر مجھے تمہارا حمزہ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ پسند نہیں ہے، وجہ تم جانتی ہو۔“

”ہوں، مگر وہ صرف ایک غلط فہمی تھی صمد، اس نے جو دیکھا وہی بتایا، اس کا مقصد مجھے آپ سے بدگمان کرنا نہیں تھا۔“

”جو بھی ہے، میں کبھی پسند نہیں کروں گا کہ وہ دوبارہ یہاں میرے گھر میں قدم رکھے یا ہمارے درمیان کوئی نئی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کرے، اگر تمہارے لیے میری پسند ناپسند کی ذرا سی بھی اہمیت ہے تو

میں امید کرتا ہوں کہ تم میری بات کی لاج رکھو گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ اسے حمنہ کے لیے صمید کا بات کرنے کا انداز پسند نہیں آیا تھا تبھی وہ دھیسے سے کہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ کچن میں آ کر ابھی اس نے آنا گوندھنا شروع ہی کیا تھا جب وہ اس کے پیچھے ہی وہاں چلا آیا۔

”تمہارے لیے ایک بری خبر ہے مریرہ۔“ اور وہ جو اچھے دماغ کے ساتھ اپنے کام میں لگی تھی ایک دم سے چونک کر پلٹی۔

”کیا.....؟“

”ہوں، حویلی میں قمر عباس کے قتل کے بعد بے جی کے رحلت بھی ہو گئی ہے۔ آج ہی آفس میں کسی سے پتا چلا ہے۔“ تاسف سے سر جھکائے وہ اسے بتا رہا تھا۔ مریرہ کو لگا جیسے کسی نے بہت وزنی چیز اس کے سر پر دے ماری ہو۔

”کیسے؟“ بہت مشکل سے وہ ہونٹ ہلا پائی تھی جب وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

”میں وجہ نہیں جانتا مگر ملنے والی اطلاع کے مطابق یہ سب خاندانی دشمنی کی وجہ سے ہوا ہے، عمر عباس کے تایا کے بیٹے کا کارنامہ ہے یہ۔“ عمر عباس کے نام پر اسے یاد آیا تھا کہ پچھلے چھ ماہ سے اس کا عمر عباس یا حویلی کے کسی فرد سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ صمید نے اس کا وہ نمبر بند کر دیا تھا جس پر کبھی کبھار عمر کی کال آ جاتی تھی۔ کرنل صاحب دیار غیر بیٹھے تھے، وہ جیسے اپنے ہر رشتے سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ کیا گزری ہوگی حویلی والوں پر، یہی سوچ سوچ کر اس کا دل پھٹ رہا تھا، آنسو تھے کہ بہتے چلے جا رہے تھے۔ چند لمحے خاموشی سے روتے رہنے کے بعد اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

”میں حویلی جانا چاہتی ہوں۔“

”ہرگز نہیں، فی الحال گاؤں کا ماحول تمہارے لیے سازگار نہیں ہے، پرانی حویلی اور نئی حویلی کے درمیان دشمنی ٹھن گئی ہے ایسی صورتحال میں تمہارا وہاں جانا کسی طور خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

”نہ ہو مگر میں حویلی جا کر رہوں گی، میں آپ کی طرح بے حس نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ، مگر میرا بیٹا تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں نہیں چاہتا تمہاری حماقت میں اسے کوئی نقصان ہو۔“ وہ کہہ رہا تھا اور مریرہ رحمان حیرانی سے شاکد نگاہوں کے ساتھ اسے دیکھے جا رہی تھی۔ کیا یہ وہی صمید حسن تھا جس کے ساتھ اس کی محبت کی شادی ہوئی تھی؟ کیا یہ وہی شخص تھا جو بچے کو پیدا کرنے کے حق میں ہی نہیں تھا؟ بجائے اس کے کہ وہ اس کے احساسات کو سمجھتے ہوئے اسے خود گاؤں لے کر جاتا، الٹا وہ اس کے بچے کو بھی اس کے ساتھ جانے سے روک رہا تھا تا کہ وہ وہاں سکون سے نہ رہ سکے۔ کیا اس شخص کی محبت بس یہیں تک تھی؟ کیا ایک مرد کی محبت کی حقیقت بس یہی تھی؟ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس وقت دھائیں مار مار کر رونا شروع کر دیتی۔

”ٹھیک ہے، میں اکیلی چلی جاؤں گی، لیکن اگر میری غیر موجودگی میں میرے بچے کا کوئی نقصان ہوا

تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔“ اس کی نم آنکھوں میں غصہ تھا۔ صمید حسن نے لب بھینچ کر سر جھٹک دیا۔ پورے تین دن گاؤں رہ کر چوتھے روز وہ شہر واپس آئی تو اپنے گھر میں ایک خوبصورت جوان لڑکی کو دیکھ کر چونک اٹھی۔

”السلام علیکم!“ اس کے دستک کے جواب میں دواڑہ کھولنے والی خوبصورت لڑکی نے بنا اس کی حیرانی کو کوئی اہمیت دیئے سلام جڑ دیا تھا۔ مریرہ نے ہاتھ میں تھامایک زمین پر رکھ دیا۔

”وعلیکم السلام! کون ہو تم؟“

”اندر آ جاؤ، میں بتاتا ہوں کون ہے یہ۔“ اپنے سوال کے جواب میں صمید حسن کی آواز سن کر وہ خالی ذہن کے ساتھ گھر کے اندر چلی آئی۔

زاویار کا بیٹا صمید حسن کی گود میں کھیل رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کے مقابل بیٹھ گئی۔ تبھی اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

”یہ سارا ہے زاویار کی گورنس۔“

”مگر مجھے اپنے بیٹے کی پرورش کے لیے کسی گورنس کی ضرورت نہیں ہے۔“

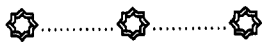
”تمہیں نہیں ہے مگر مجھے ہے۔“ مریرہ کے دبے دبے لہجے میں احتجاج پر اس نے قدرے تیز آواز میں اس کے احتجاج کا گلا گھونٹا تھا۔

”تم کیا سمجھتی ہو، تم تین تین چار چاروں کے لیے کہیں بھی کسی کے دکھ میں شریک ہونے کے لیے گھر سے چلی جاؤ گی تو میں سارا دن کام کاج چھوڑ کر گھر بیٹھا، بچے کی نپیاں بدلتا رہوں گا؟ کل پھر حویلی میں کسی کی موت ہو جاتی ہے اور تم پھر اپنے شوہر اور بچے کی پروا کیے بغیر حویلی کا رخ کر لیتی ہو تو بتاؤ میں کیا کروں گا؟ کیا میں بھی تمہاری طرح بے حس ہو کر یہاں اپنے بچے کو گھر میں اکیلا روتا بلکتا چھوڑ کر چلا جایا کروں؟ یا پھر وہاں آفس میں بازوؤں میں اٹھائے پھروں۔“ اس کی بات غلط نہیں تھی۔ مریرہ نے جھک کر زاویار کو اس کی گود سے اچک لیا۔

”دوبارہ اس کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ دوبارہ میں جہاں بھی جاؤں گی اپنے بچے کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

”خوش فہمی ہے تمہاری، اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں اپنے بچے کو وہاں گاؤں میں کسی کی دشمنی کی بھینٹ چڑھنے دوں گا تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ صمید نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

مریرہ بنی ان سنی کرتی اندر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں ابھی تک بے تحاشا رونے کی وجہ سے سو جھمی ہوئی تھیں۔ شدید تھکن کے سبب ایک ایک جوڑ دکھ رہا تھا مگر وہ اپنی تھکن کی پروا کیے بغیر اپنے بیٹے کے ساتھ کھیل میں لگی رہی۔ یونہی زاویار کے ساتھ کھیلتے کھیلتے کب اس کی آنکھ لگ گئی اسے پتہ ہی نہ چلا۔



رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی جب پیشانی پر کسی کے ہونٹوں کے پرحدت لمس نے اچانک اسے

گہری نیند سے بیدار کر دیا۔ کمرے میں ٹائٹ بلب کی مدھم مدھم سی ٹھنڈی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ بیڈ کی طرف کروٹ کے بل زوایاں سو رہا تھا جبکہ دوری طرف صمد حسن تھا جو تقریباً اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ مریرہ ایک ہاتھ سے اسے پرے دھکیلتی فوراً اٹھ بیٹھی تھی۔

”مجھے دکھاوے کے پیار کی ضرورت نہیں ہے صمد حسن۔“

”ہونی بھی نہیں چاہیے۔“ بے حد پیار سے کہتے ہوئے اس نے اپنا بازو مریرہ کے کندھوں کے گرد پھیلا لیا تھا۔ مریرہ کے حلق میں ڈھیر سارے آنسو ایک ساتھ جمع ہونے لگے۔

”پتہ نہیں آج کل کیوں مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ شادی کے لیے آپ جیسے مرد کا انتخاب کر کے مجھ سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔“

”ایسا تو ہوگا، جب دو لوگوں کے درمیان غلط فہمیوں کی فسیل کھڑی ہونے لگتی ہے تو اکثر یہی احساس ہوتا ہے، مگر یہ سب ٹھیک نہیں ہے میرو، میں لاکھ برا انسان سہی مگر خدا گواہ ہے تمہارے لیے میری محبت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے، روز اول کی طرح آج بھی میری دھڑکن صرف تمہارے ہی نام کی تسبیح کرتی ہے۔“

”بس کریں پلیز..... جتنا بدلاؤ میں آپ کے اندر دیکھ چکی ہوں اس کے بعد آپ کی یہ لچھے دار باتیں مجھے مزید بیوقوف نہیں بنا سکتیں۔“

”میرے اندر بدلاؤ لانے والی بھی تم ہی ہو۔“

”میں بدل جانے والی محبتوں کو لفظ محبت میں شمار نہیں کرتی۔“

”فضول کی بحث ہے میرو، یہ چھوٹی چھوٹی غلط فہمیاں کہیں ہمیں بہت دور نہ لیجائیں، میں بس اسی بات سے ڈرتا ہوں۔“

”ہم ابھی بھی ایک دوسرے کے قریب نہیں ہیں، اگر تمہیں لگتا ہے کہ تمہاری رویے کی وجہ سے ہمارے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا تو یہ تمہاری سب سے بڑی بھول ہے۔“

”اوکے، تمہیں لگتا ہے کہ سارا قصور صرف میرا ہے۔“

”بالکل۔“

”اب تم زیادتی کر رہی ہو میرو، تم مجھے ضد اور غصہ دلانے والی چیزوں کے پیچھے بھاگ کر جن سے میں تمہیں منع کرتا ہوں۔“

”ضد اور غصے میں انسان اس ہستی کے لیے بے حس نہیں ہو جاتا جس سے اس نے کبھی پیار کیا ہو۔“

”میں بے حس نہیں ہوں بس تھوڑا سا الجھ گیا ہوں، شاید ہم دونوں ہی اس وقت ایک دوسرے کو نہیں سمجھ پارہے۔“

”مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے پلیز سو جائیں۔“

”ہرگز نہیں، کیونکہ مجھے تم سے بہت گلے ہیں اس لیے آج نہ سوؤں گا نہ تمہیں سونے دوں گا۔“

”مجھے اب آپ کی ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں صمد۔“ قدرے بیزار سے کہتی ہوئی وہ بیڈ سے اتر

کر باہر ٹیرس کی طرف چلی آئی تھی۔ صمد برامانے کی بجائے اس کے پیچھے چلا آیا۔

”تمہیں نہیں لگتا مریرہ تم جب بھی گاؤں سے ہو کر آتی ہو تمہارا رویہ میرے ساتھ یونہی اجنبی سا ہو جاتا ہے۔“

”آپ کا وہم ہے اور کچھ نہیں۔“

”ٹھیک ہے چلو مان لیا کہ میں سو فیصد غلط ہوں تم صحیح ہو..... بس.....؟ اب تم مجھے وہ بات بتاؤ جس کی وجہ سے تمہارا موڈ آف ہوا ہے، کیا تم زوایاں کی گورنس کو لے کر ناراض ہو؟“

”مجھے کیا حق ہے کسی بھی وجہ سے آپ سے ناراض ہونے کا۔“ دونوں بازو سینے پر لپیٹے لپیٹے اس نے غصے سے کہا تھا جب صمد نے مسکراتے ہوئے اسے کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔

”میرے سارے حقوق تمہیں ہی تو حاصل ہیں پگلی، میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا جس سے تمہیں تکلیف ہو مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ ایسا ہو ہی جاتا ہے۔“ اب وہ اسے وضاحت دے رہا تھا۔ مریرہ نظریں پھیرے کھڑی سنتی رہی۔

”جہاں تک زوایاں کی گورنس کا سوال ہے تو وہ ایک بے سہارا شادی شدہ خاتون ہے میرو، اس کے غریب باپ کی التجا پر صرف اسے چھت کا آسرا اور تین وقت کی روٹی کا سودا کر کے میں اسے یہاں لایا ہوں تاکہ وہ میری محبوب بیوی اور بچے کی خدمت کرے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے، جو خون کے رشتے ہیں وہ عزت اور جان کے دشمن ہیں اوپر سے حالت دیکھو اس کی، شاید ڈیوری کا آخری مہینہ چل رہا ہے، صرف انسانیت کے ناطے ترس کھا کر میں نے اسے یہاں ملازمت پر رکھا ہے تاکہ میری غیر موجودگی میں تم تنہائی محسوس نہ کرو، اگر میں کسی وجہ سے رات گھر نہ آسکوں تو تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو، اگر تم پسند نہیں کرو گی تو میں اسے فارغ کر دوں گا۔“ اس کا دل صاف کرتے ہوئے وہ اس کی نظروں میں کھویا ہوا اپنا اعتماد دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مریرہ ابھی بھی خاموش کھڑی رہی۔

”اگر تم گاؤں والے مسئلے کی وجہ سے مجھ سے بدظن ہو تو میں تمہیں کوئی صفائی نہیں دوں گا، کیونکہ میرا دل تمہارے اس گاؤں سے بہت کھٹا پڑ چکا ہے۔ میں یہ برداشت ہی نہیں کر سکتا کہ دنیا میں کوئی بھی شخص تمہیں میرے سوا دیکھے، سوچے، چاہے، اس معاملے میں چاہے تم مجھے جتنا بھی غلط سمجھو مگر میں مکمل بے بس ہوں، کیا کروں۔“ وہ اب واقعی بے بس لگ رہا تھا۔ مریرہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

”میرا عمر عباس کے ساتھ کسی بھی قسم کا کوئی ایسا ویسا تعلق نہیں ہے صمد، اس معاملے میں تم ضرور کسی بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔“

”نہیں، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے میں نے خود اس شخص کو کسی سے یہ کہتے سنا ہے کہ وہ تمہیں چاہتا ہے اور زندگی بھر تمہارے سوا اور کسی لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔“

”ٹھیک ہے، مان لیتی ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے، مگر یہ بھی سچ ہے صمد کہ اس شخص نے کبھی میرے سامنے ایسا کوئی اظہار نہیں کیا، میں نہیں جانتی کہ اس کے دل میں کیا ہے، مگر میرے دل میں کیا ہے میں

ادائیگی میں، یہ صرف وہی جانتا تھا۔

سارا احمد نے صرف ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔ ان دونوں محبت کرنے والوں کے درمیان شاید اس کی جگہ کہیں بنتی بھی نہیں تھی۔



تتلیاں پکڑنے کو کتنا سہل جانا تھا

خوشبوؤں کو چھو لینا

بارشوں کے موسم میں شام کا ہر اک منظر

گھر میں قید کر لینا!

روشنی ستاروں کی مٹھیوں میں بھر لینا

کتنا سہل جانا تھا!

جگنوؤں کی باتوں سے پھول جیسے آنگن میں

روشنی سی بھر لینا

اس کی یاد کا چہرہ خواب ناک آنکھوں کی

جھیل کے گلابوں پر دیر تک سجا رکھنا

کتنا سہل جانا تھا!

اے نظر کی خوش فہمی اس طرح نہیں ہوتا!!

تتلیاں پکڑنے کو دور جانا پڑتا ہے!!

اس روز وہ اسٹور سے گھر واپس لوٹی تو پورا بدن تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ لندن کی سرد فضاؤں میں آئے اسے یہ دوسرا ماہ تھا۔ اس نے پاکٹ سے اپنی سیلری کے پیسے نکالے اور کرائے کی رقم الگ کر کے باقی پیسے واپس پاکٹ میں رکھ لیے۔ ایللی کے کمرے سے میوزک کا اٹھتا ہوا شور اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ آج گھر پر موجود تھا۔ سبھی وہ کچھ دیر آبیابی کے پاس بیٹھ کر اس کے کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ دروازہ بند تھا مگر لاک نہیں تھا۔

پرہیان کے ذرا سے دھکیلنے پر دونوں پٹ وا ہو گئے تھے۔ اس نے جھانک کر دیکھا اندر ایللی اپنے بیڈ پر اوندھا لیٹا ہوا تھا جبکہ اس کے کمرے کی لائٹس بھی آف تھیں۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اس کے کمرے کی طرف آئی تھی۔

”ایللی!“ ہاتھ بڑھا کر کمرے کی مین لائٹ آن کرتے ہوئے اس نے اسے پکارا مگر دوسری طرف ایللی بے سدھ پڑا رہا۔ اس نے پرہیان کی پکار کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ قدرے پریشان مزید آگے بڑھ آئی۔

”ایللی.....“ اس بار پکار قدرے بلند تھی مگر ایللی کی خاموشی برقرار رہی۔ اتنے تیز میوزک میں یقیناً وہ

بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں، اگر اس نے کبھی میرے سامنے ایسی ویسی کوئی بات کی ہوتی تو یقیناً میں اسی وقت اس کا دماغ صاف کر دیتی، وہ بہت اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میرے لیے آپ اور میرا گھر اتنی اہمیت رکھتے ہیں۔“

”ہوں..... اب اندر چلو باہر بہت ٹھنڈ ہے۔“

”تو کیا ہوا، جو شخص کئی کئی دن بنا میری حالت کی پروا کیے گھر سے غائب رہ سکتا ہے، بے حد مشکل ترین وقت میں مجھے تنہا چھوڑ سکتا ہے، ذرا سی رنجش پر میرا بچہ چھین کر مجھے اکیلے گاؤں بھیج سکتا ہے، اسے اتنی سی ٹھنڈ کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔“ ہر طرح سے دل صاف ہونے کے باوجود اس نے اپنی خفگی ختم نہیں کی تھی۔ صمد بالوں میں ہاتھ پھیرتا گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”ایک ہی جرم کی سزا میں، کتنی بار لفظوں کے یہ چابک مارو گی تم مجھے؟“

”جتنی بار میرا دل چاہے گا۔“

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے، میرا بھی وعدہ ہے کبھی آف نہیں کروں گا۔“

”اتنے اچھے نہیں ہوں تم۔“ اس بار پلٹ کر کہتے ہوئے مریرہ نے صمد کے گال پر چٹکی بھری تھی۔ وہ

مسکرا دیا۔

”اتنا ہی اچھا ہوں میں کبھی آزما کر دیکھنا۔“ اسی کی ٹون میں کہتے ہوئے اس نے مریرہ کے بال کھینچے

تھے۔ وہ بھی مسکرا دی۔ اگلی صبح ناشتے کی میز پر وہ سارا احمد سے کہہ رہا تھا۔

”میری بیوی کو فی الحال اس گھر میں کسی ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے لہذا تم اپنا بندوبست کہیں اور کر

لو۔“ سارا جو ٹیبل پر ناشتے کا سامان رکھ رہی تھی اس کے الفاظ پر تڑپ اٹھی۔ مریرہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں

آنسوؤں کے ساتھ ساتھ بے حد کرب اور بے بسی تھی تبھی اس کا دل پسینا ہوا۔

”نہیں، کہیں اور بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جب تک تمہیں کوئی مضبوط آسرا نہیں مل جاتا

تم یہیں اسی گھر میں میرے پاس رہ سکتی ہو۔“

”بہت شکریہ..... میں آپ کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گی۔“

”کوئی بات نہیں، یہ احسان نہیں صرف انسانیت ہے، میں اُمید کرتی ہوں کہ تم میرے اعتماد کو کبھی

ٹھیس نہیں پہنچاؤ گی۔“

”جی..... اللہ نے چاہا تو آپ کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، اب تم جا سکتی ہو۔ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا میں خود پکاؤں گی، تم کوشش کرنا میرے

شوہر کی موجودگی میں صرف اپنے کام سے کام رکھو۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ اس کے حکم پر سارا احمد نے ہاتھ میں پکڑے برتن وہیں رکھ دیئے تھے۔

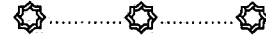
صمد حسن نظریں چرا گیا۔ یہی بہت تھا کہ اس کی توقع کے عین مطابق، مریرہ رحمان نے اپنے نرم

دل کے ہاتھوں مجبور اس لڑکی کو گھر میں رہنے کی اجازت دے دی تھی، ورنہ اسے کتنا خوار ہونا پڑتا اپنے فرض کی

سو نہیں سکتا تھا تبھی اس نے ہاتھ بڑھا کر سی ڈی پلیئر بھی خاموش کر دیا۔

”ایلی تم ٹھیک تو ہو؟“ اب وہ اس کے بیڈ کے بالکل قریب اس پر قدرے جھک کر پوچھ رہی تھی۔ مگر ایلی کے جسم میں اب بھی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ پرہیان کی پریشانی بڑھ گئی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے جیسے ہی اسے سیدھا کیا، شاکٹ رہ گئی۔ ایلی کا وجود تیز بخار میں جل رہا تھا۔ اس کی خوبصورت غلامی آنکھیں مکمل بند تھیں۔ جانے وہ رات کب گھر واپس آیا تھا اور کب سے اس کی یہ حالت تھی۔ نہ اس نے آفس کے کپڑے تبدیل کیے تھے نہ ہی پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کرنے کی کوشش کی تھی۔ بہت پہلے ایک بار اس نے بتایا تھا کہ جب وہ بہت اذیت میں ہوتا ہے تب تین چیزوں کا سہارا لیتا ہے، شراب، شباب اور تیز میوزک..... وہاں شباب تو موجود نہیں تھا مگر شراب اور تیز میوزک کی نشانیاں ضرور مل گئی تھیں۔ شاید نہیں یقیناً وہ رات ڈرنک کرتا رہا تھا۔ پرہیان چونکہ صبح لیٹ اٹھی تھی لہذا جلدی جلدی تیار ہو کر بنا ناشتہ کیے گھر سے نکل گئی۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ ایلی اس وقت گھر پر ہو سکتا ہے۔ اپنی عقل اور جلد بازی پر ماتم کرتی وہ اس پر جھکی تھی اور پھر اس کے پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کر کے گرم مکمل اس کے اوپر ڈال دیا۔ اس کے کمرے کی ونڈو بھی کھلی ہوئی تھی جس سے فضاء میں خنکی کا احساس جیسے ہڈیوں میں گھسا جا رہا تھا۔

شام کی بڑھتی ہوئی تاریکی نے ارد گرد اندھیروں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ پرہیان نے ایک نظر کھڑکی سے باہر گرتی ہلکی ہلکی برف کو دیکھا، پھر مضبوطی سے دونوں پٹ بند کر کے پردے برابر کر دیے۔ ایلی کا بخار گزرتے ہر پل کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا مگر عجیب مشکل تھی کہ نہ اس کے پاس کسی قریبی ڈاکٹر کا نمبر تھا نہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے متعلق زیادہ جانتی تھی۔ آیا بی کو وہ ابھی کھانا کھلا کر نیند کی ٹیبلٹ دے کر آئی تھی۔ ان کو اس وقت جگانا اور کسی مدد کی امید رکھنا بیکار تھا۔ تبھی وہ اس پر جھکی تھی!!



جب ہو سکے تو بھلا دینا رنجش دل کی
کہ محبتوں کا اصول ہے درگزر کرنا
تیرے طرزِ تغافل سے گلہ تو نہیں
ہمیں آتا نہ تھا دلوں میں گھر کرنا



آج وہ آخری تصویر جلا دی ہم نے
جس سے اس شہر کے پھولوں کی مہک آتی تھی
آج وہ گہمت آسودہ کنادی ہم نے
عقل جس قصر میں انصاف کیا کرتی تھی
آج اس قصر کی زنجیر ہلا دی ہم نے
آگ کا غد کے چمکتے ہوئے سینے پہ بڑھی
خواب کی لہر میں بہتے ہوئے آئے ساحل
مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا سلگتا ہوا کرب
گنگناتے ہوئے عارض کا دمکتا ہوا تل
جگمگاتے ہوئے آویزوں کی مبہم فریاد
سرسراتے ہوئے لمحوں کے دھڑکتے ہوئے دل
ایک دن روح کا ہر تار صدا دیتا تھا
کاش ہم بک کے بھی اس جنس گراں کو پالیں
قرض جان دے کے متاع گزراں کو پالیں
خود بھی کھو جائیں اور اس رمز مناں کو پالیں
اور اب یاد کر اس آخری پیکر کا طلسم
قصہ رفتہ بنا خواب کی باتوں سے ہوا
اس کا پیارا سا بدن اس کا مہکتا ہوا روپ

آگ کی نذر ہوا اور انہی باتوں سے ہوا

اس کا پیارا سا بدن اس کا مہکتا ہوا روپ

آپ کی نذر ہوا اور انہی باتوں سے ہوا

ایلی بخار کی شدت کے باعث بے سدھ پڑا تھا۔ پر ہیان نے ذرا سا سہارا دے کر اسے سیدھا لٹا دیا۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد وہ فرسٹ ایڈ باکس نکال لائی تھی۔

”ایلی.....“ اس نے بے سدھ پڑے ایلی کا شانہ ہلایا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تو مجبوراً اسے اس کا کندھا جھنجھوڑنا پڑا۔

”ایلی آنکھوں کھولو پلیز۔“ اس بار اس کی صدا پر ایلی نے کسماتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

”منہ کھولو۔“ اس نے حکم جاری کیا تبھی ایلی نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا جیسے جاننا چاہ رہا ہو کیوں؟ پر ہیان ایک مرتبہ پھر جھکی تھی۔

”منہ کھولو ایلی تھرمامیٹر لگانا ہے۔“ وہ اس کی نگاہوں میں ابھرتے سوال کو پڑھ چکی تھی تبھی جواب دیا۔ ایلی نے اس بار اس کے حکم پر چپ چاپ منہ کھول دیا۔ پر ہیان نے اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگایا۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد اس نے ایلی کے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر چیک کیا۔

”او میرے خدا، ایک سو چار۔“ تھرمامیٹر کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تبھی اسے ایلی کی پکار سنائی دی۔

”پپ..... پانی.....!“ پر ہیان نے چونک کر اس کے خشک لبوں کی جنبش کو دیکھا پھر پانی لینے چلی گئی۔

دو منٹ کے بعد جب وہ پانی لے کر آئی ایلی پھر بے سدھ ہو چکا تھا۔

”ایلی۔“ پر ہیان کو ایک بار پھر اسے اس کا کندھا جھنجھوڑنا پڑا۔

اس پر نقابہت طاری تھی لہذا ایلی کے آنکھیں کھولنے کے بعد مجبوراً اسے سہارا دے کر پانی پلانا پڑا۔

اتنی شدت کی سردی میں بھی ایلی کا پورا وجود آگ بنا ہوا تھا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ پر ہیان کو کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے سر و پانی میں کپڑا بھگو کر اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر رکھنا شروع کر دیا۔ بخار کی دو گولیاں وہ پہلے ہی کھلا چکی تھی۔ بچپن میں اکثر جب کبھی اسے تیز بخار ہو جاتا تو اس کی ماں بھی یونہی اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھگو بھگو کر رکھتی تھی لہذا اس نے بھی وہی ٹریٹمنٹ شروع کر دیا۔ پیشانی کے بعد اس نے ایلی کے دونوں بازوؤں، اس کی ہتھیلیوں اور پنڈلیوں کو بھی گیلیے تو لیے سے خوب رگڑا تھا تا کہ بخار کا زور ٹوٹ جائے۔ ایلی مدہوش تھا مگر اس مدہوشی میں بھی اس نے اس کا نرم دودھیا ہاتھ نرمی سے تھام کر اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں، بہت ٹوٹ کر بکھر چکا ہوں، اب ترس کھاؤ مجھ پر فارگا ڈسک مجھے چھوڑ کر مت جانا بہت بے سکون ہو گیا ہوں میں مجھے سکون دو پلیز، تم ہر بار میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں ہر بار میرے

جذبات کا مذاق نہیں اڑا سکتیں تم مت کرو میرے ساتھ ایسا مار ڈالوں گا میں تمہیں۔“ وہ اضطراب کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ پر ہیان کا ہاتھ لرز اٹھا۔

قطعی غیر محسوس انداز میں اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر ایلی نے اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کو جلتی ہوئی آنکھوں سے ہٹا کر اپنے گالوں پر رکھ چکا تھا۔ پر ہیان کی ریڑھ کی ہڈی سننا انھی۔ ایلی کے جلتے گالوں کا لمس اس کے پورے وجود کو دہکا گیا تھا تبھی ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے وہ فو اٹھ کھڑی ہوئی۔ صبح تک ایلی کا بخار کافی حد تک کم ہو چکا تھا مگر نقابہت ابھی باقی تھی۔

اتوار کی چھٹی کے باعث آج پر ہیان گھر پر تھی۔ بہت دنوں کے بعد اس روز لندن کی سرد فضاؤں میں سورج نے ذرا سا سر اُبھارا تھا۔ پر ہیان، ایلی کے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھی کچن میں چلی آئی تھی۔

رات ایلی کی وجہ سے اس کا کھانا گول ہو گیا تھا نتیجتاً اسے بھوکا سونا پڑا تھا۔



ایلی کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ رات جہاں تک اسے یاد تھا وہ کمرے کا ہیئر آن کر کے نہیں سویا تھا مگر اس وقت کمر کا ہیئر آن تھا۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر تھرمامیٹر بھی دھرا تھا جبکہ سی ڈی پلیئر بھی آف تھا۔ اس نے پھر سے پلکیں موند لیں۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اٹھا تو سر چکر رہا تھا ہلکی ہلکی بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وہیں بیڈ پر گر گیا۔ رات والی نقابہت ابھی بھی باقی تھی۔ چند لمحوں تک بے سدھ سا بیڈ پر پڑا رہنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا واش روم تک گیا۔ منہ دھوتے وقت اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا جو کہ ایک ہی دن میں سرسوں کے پھول کی مانند زرد ہو کر رہ گیا تھا۔ منہ پر ٹھنڈے پانی کے کئی چھپکے مارنے کے بعد اس نے اچھی طرح تویلیے سے چہرہ رگڑ کر خشک کیا پھر قدرے ہمت کرتے ہوئے کچن کی طرف چلا آیا۔ پر ہیان اپنے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی وہ اسے وہاں موجود دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

”گڈ مائنک۔“ پر ہیان نے اس کی آواز پر بے ساختہ پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔

”گڈ مائنک اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔“

”فٹ اینڈ فائن، مجھے کیا ہونا ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے وہ ڈائننگ ٹیبل کی کرسی پر ٹپک گیا۔ پر ہیان پھر سے کافی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”رات تمہیں بہت تیز بخار ہو گیا تھا۔“

”اوہ..... کیا تم میرے کمرے میں آئی تھیں۔“

”ہوں، تم شاید نشے میں تھے اس لیے تمہیں کسی بات کا ہوش نہیں تھا بہر حال میں نے بخار کی دوا دے دی تھی۔“

”شکریہ پری، لیکن اگلی بار پلیز تم بنا مجھے مطلع کیے یا میری اجازت لیے میرے کمرے میں نہیں آؤ گی۔“ وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا پر ہیان بہت اچھی طرح سے جانتی تھی تبھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں بہت تھک گیا ہوں، بہت ٹوٹ کر بکھر چکا ہوں، اب ترس کھاؤ مجھ پر فارگا ڈسک مجھے چھوڑ کر مت جانا بہت بے سکون ہو گیا ہوں میں مجھے سکون دو پلیز، تم ہر بار میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں ہر بار میرے

”ناشتہ کرو گے۔“ بناس کی طبیعت کا پوچھے اس نے ناشتے کی آفر کی۔ ایللی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ہوں کیا ہے ناشتے میں۔“

”کافی ہے، ساتھ میں سلاکس لوں گی۔“

”ٹھیک ہے مجھے ایک انڈہ اور دودھ دے دو۔“ وہ قدرے شرمندہ دکھائی دے رہا تھا۔ پر ہیان نے

اسے انڈہ اہال دیا ساتھ ہی دودھ بھی گرم کر دیا۔

”رات تم جلدی سو گئی تھیں، میں لیٹ آیا تھا تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“

”جانتی ہوں، کیا پہلے بھی تم یونہی دو دو تین تین دن گھر سے باہر رہتے تھے؟“ اس نے انڈہ اور گرم

دودھ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ ایللی نے دیکھا اس کا چہرہ بے حد سپاٹ اور آنکھیں رت جگے کی امین لگ

رہی تھیں۔ اس کی شرمندگی مزید بڑھ گئی۔

”نہیں..... پہلے میں اپنے سارے شوق گھر پر ہی پورے کر لیا کرتا تھا اب تمہاری موجودگی میں مجھے

گھر پر وہ سب اچھا نہیں لگتا۔“

”تم کہنا چاہتے ہو میری وجہ سے تمہاری زندگی ڈسٹرب ہو کر رہ گئی ہے۔“

”نہیں، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں تم ایک اچھی پاکیزہ لڑکی ہو میں دل سے تمہارا احترام کرتا

ہوں اسی لیے تمہاری موجودگی میں کچھ بھی ایسا نہیں کرنا چاہتا جو تمہیں ٹھیک نہ لگے۔“

”اوکے..... مگر مجھے تمہارا شراب پینا بھی پسند نہیں ہے۔“

”روز نہیں پیتا میں بس کبھی کبھی.....!“

”رات تم بہت ڈسٹرب تھے، کیوں؟“

”تم کیا کرو گی وجہ جان کر۔“

”کچھ نہیں گھسی کسی کے ساتھ دل کا بوجھ بانٹ لینے سے دکھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”ہوں.....“ ایللی نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا پھر خاموشی سے گرم

دودھ کے دو تین سپ لینے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔

”کل بار کلب گیا تھا میں یک دوست کے ساتھ، پارٹی دی تھی اس نے۔“

”پھر؟“

”پھر..... پھر وہیں وہ نظر آ گئی جسے کئی ماہ لندن کے ایک ایک گوشے میں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا

پھرا تھا۔“

”تمہاری موم کی بھتیجی؟“

”ہوں۔“

”پھر تم نے بات کی اس سے؟“

”نہیں۔“

”کیوں؟“

”وہ وہاں میرے لیے نہیں آئی تھی۔“

”میں سمجھی نہیں۔“ پر ہیان کی الجھن پر ایللی نے چند لمحوں کی خاموشی اختیار کر کے گلاس لبوں سے لگا لیا

تھا۔ پر ہیان شیشے کے گلاس میں دودھ کی کم ہوتی مقدار کو دکھتی رہی۔ گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھنے کے بعد وہ

بولا۔

”پہلی بار جب ماما سے انڈیا سے یہاں لندن لائی تھیں تب میں اس کا واحد بوائے فرینڈ تھا مگر اب

ایسا نہیں ہے۔ کل رات وہ کسی اور کے ساتھ تھی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ جس کے ہاتھوں شاید اس کی عزت

بھی محفوظ نہ رہی ہو۔“

”اوہ..... ویری سیڈ..... مگر وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔“

”پیسے کے لیے۔“

”پیسہ تو تمہارے پاس بھی ہے ایللی۔“

”ہاں مگر وہ صرف میری ذات تک محدود رہنے والی تھی نہیں ہے۔ میں نے اسے شادی کی آفر کی تھی

ایک معاشرتی جائز بندھن کی، مگر اس نے انکار کر دیا یہ کہہ کر کہ اسے بیڑیوں کی عادت نہیں ہے۔ وہ مجھ سے

محبت کے دعوے کے باوجود اور کئی لوگوں کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی رہی تھی کسی سے ڈائمنڈ رنگ کے حصول کے

لیے کسی سے قیمتی ملبوسات کے لیے کسی کے ساتھ بہترین ہوٹل میں کھانا کھانے کے لیے مجھے جب یہ سب پتا چلا

تو میں برداشت نہ کر سکا اور میری اس کے ساتھ لڑائی ہو گئی، مئی بھی درمیان میں آ گئی تھیں مگر انہوں نے بھی میرا

ساتھ دینے کے بجائے اس کا ساتھ دیا۔ مئی نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اس کے ساتھ کپڑا مانز نہیں کر سکتا تو اپنے

راستے علیحدہ کر لوں۔“

”پھر۔“

”پھر کیا میرے لاکھ چاہنے پر بھی ہمارے راستے علیحدہ ہو گئے وہ انڈیا چلی گئی اور میں یہاں اکیلا کلبوں

میں خود کو برباد کرتا رہا۔ پانچ سال یونہی گزر گئے۔ گزرے پانچ سالوں میں میں اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا

مگر اب..... پانچ سال کے بعد جب میں پھر سے جینے کی کوشش کر رہا ہوں تو وہ پھر میرا سکون برباد کرنے

یہاں چلی آئی ہے۔ پتا نہیں کیا رنجش ہے اس کے دل میں میرے لیے۔“

”کیا نام ہے اس کا۔“

”سندھیا۔“

”اوہ مطلب وہ ہندو ہے۔“

”ماں مئی بھی ہندو تھیں۔ پاپا نے شادی سے پہلے انہیں مسلمان کیا تھا مگر انہوں نے اسلام کو دل سے

قبول نہیں کیا۔ اگر دل سے قبول کر لیتیں تو شاید راہ راست پر آ جاتیں۔“

”ضروری نہیں یہاں بہت سے لوگ مسلمان ہونے کے باوجود حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں ہیں ان

ہوتا تھا۔

مرکب کی زندگی میں جب کوئی تبدیلی آتی ہے اور وہ وفا کی لائن سے اتر کر بے وفا کی پٹری پر چڑھتا ہے تو اس کی دو واضح نشانیاں ہوتی ہیں۔

نمبر ۱: وہ ضرورت سے زیادہ بیوی کے ساتھ پیار جتنا ہے تاکہ اس کے معاملات چھپے رہیں اور ضمیر بھی ماموت نہ کرے۔

نمبر ۲: بات بات پر بلاوجہ بیوی کو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے تاکہ وہ اس کے کسی معاملے سے آگاہ ہو بھی جائے تو اسے روک ٹوک یا پریشان نہ کر سکے۔ صمد حسن پہلے فارمولے پر عمل کر رہا تھا۔

مگر مریرہ رحمان کو اس تبدیلی کے پیچھے چھپی حقیقت سے آگاہی نہیں تھی۔ وہ تو بے حد خوش تھی کہ صمد کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس کی چاہت کی شدتیں پھر سے لوٹ آئی ہیں۔ وہ شدتیں جو اس نے شادی کے اولین دنوں میں دیکھی تھیں۔ جس روز بہت بارش ہوئی تھی۔ شب بھر بارش کا نہ رکنے والا سلسلہ جاری رہا تھا۔ صمد حسن آفس جا چکا تھا۔ مریرہ دیر تک سونے کے بعد اٹھی تو گھر میں عجیب سی خاموشی کا راج تھا۔ سارے کام بھی جوں کے توں پڑے تھے جس کا مطلب تھا کہ سارا منیر اپنے کمرے سے باہر نکل کر کام کرنے کے لیے نہیں آئی تھی۔ اسے عجیب سی حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے سارا منیر نے ایسی بے پروائی نہیں کی تھی، تبھی لاؤنج میں زاویار حسن کے ساتھ لاڈ اٹھواتی مریرہ رحمان کو بے نام سی تشویش نے جکڑ لیا۔ زاویار کو لاؤنج کے کارپٹ پر کھلونوں میں مگن کر کے وہ اس اسٹور نما کمرے کی طرف آئی تھی جہاں سارا بیگم کا قیام تھا۔ کمرے میں نیم تاریکی کا راج تھا۔ مریرہ نے اندر آ کر لائٹ جلائی تو سارا کو چارپائی پر درد سے تڑپتے ہوئے پایا۔

اس کی پریکٹس کے آخری ایام چل رہے تھے اور اس وقت دروزہ نے اس کا پورا وجود جیسے درد میں جکڑ رکھا تھا۔ قطعی بے بسی کے ساتھ اپنا پیٹ پکڑے وہ چارپائی پر ادھر سے ادھر کروٹ لے رہی تھی۔ مریرہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فوراً اسے پیشتر اس نے صمد حسن کو کال کر کے گھر بلایا اور پھر اگلے بیس منٹ کے بعد وہ اسے قریبی ہسپتال لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے جہاں چند ہی لمحوں میں ڈاکٹرز نے ان دونوں کو صحت مند بنی کی پیدائش کی خبر سنائی تھی۔

مریرہ رحمان کا سارا منیر احمد کے ساتھ کوئی بھی خاص تعلق نہیں تھا مگر پھر بھی جانے کیوں اس وقت وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اسے بیٹی کی شدید خواہش تھی۔ زاویار کی پیدائش پر بھی وہ بیٹی کے لیے دعائیں مانگتی نہیں تھکتی تھی مگر تب اسے یہ خوشی نہیں مل سکی تھی۔ صمد نومولود بچی کے لیے اس کی وارفتگی دیکھ کر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اگلے روز جب تک سارا احمد کو ہسپتال سے گھر شفٹ نہیں کر دیا گیا تھا وہ اس کے پاس رہی تھی اور صمد دل ہی دل میں اس کا ممنون ہوتا رہا تھا۔

اس وقت بھی وہ سارا احمد کے پاس بیٹھی اس کی بیٹی کو پیار کر رہی تھی جبکہ صمد قریب کھڑا اسے مسلسل چھیڑ رہا تھا تبھی اچانک اس نے پوچھا۔

”کیا اس بچی کے باپ کو اس کی پیدائش کی اطلاع دے دی ہے صمد۔“

کا کوئی عمل پیارے نبی ﷺ اور ان کے مقرب صحابہ کی طرز پر نہیں ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے ایلی جوان لوگوں کو کبھی اپنی سرپرستی میں نہیں لیتا جو دل سے اسے قبول نہ کرنا چاہیں۔ اسلام صرف انہی لوگوں کو اپنی سرپرستی میں لیتا ہے جو خود دل سے اس کی طرف آنا چاہیں۔“

”ہوں، میں ایگری کرتا ہوں تم سے۔“

”شکریہ..... اب تم تھوڑا ریٹ کر لو تب تک میں چھوٹے موٹے کام پنپا لیتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اور ہاں آج آفس جانے کی قطعی ضرورت نہیں، تم بھی سنڈے کی چھٹی کو انجوائے کرو، کاروبار آہستہ آہستہ خود ہی سیٹ ہو جائے گا۔“ ڈائمنگ نیبل سے اٹھتے اٹھتے اس نے اسے تلقین کی تو ایلی کا سر پھر اثبات میں ہلا۔

”شکریہ پر ہیان۔“

”اب شکریہ کس لیے۔“

”رات جو تم نے میری کیئر کی اس کے لیے۔“

”اپنے پاس رکھو، مجھے تمہارے شکریہ کی ضرورت نہیں۔“

”ٹھیک ہے تم بھی اپنے یہ پیسے سنبھال کر رکھو فی الحال ان کی بھی مجھے ضرورت نہیں۔“ رات کرائے کے جو پیسے وہ اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ آئی تھی ایلی نے واپس کر دیے۔ پر ہیان اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گئی۔

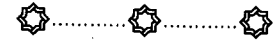
”یہ یہاں رہنے اور کھانے پینے کے پیسے ہیں ایلی، میں مفت میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“

”جانتا ہوں مگر فی الحال مجھے ان تھوڑے سے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جمع کرتی رہو، سال کے بعد اکٹھا کرا یہ دے دینا۔“

”مگر کون جانتا ہے کہ میں سال تک یہاں رہوں گی کہ نہیں۔“

”تم یہیں رہو گی اب لکھ کر رکھ لو۔“ وہ اسے الجھا رہا تھا۔

پر ہیان مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے اس کے چوڑے شانے پر ہلکا سا مکا رسید کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج سنڈے تھا اور اسے اس ایک دن میں بہت سے کام پنپانے تھے۔



مریرہ رحمان اور صمد حسن کی محبت کی کہانی میں ایک تیسری عورت سارا منیر کی وجہ سے جو بریک آیا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔ صمد حسن کے شب و روز بدل گئے تھے۔ بدگمانیوں کے بادل چھٹتے ہی دلوں کا مطلع پھر سے صاف ہو گیا تھا۔ ہمہ وقت پریشان اور الجھا الجھا سارا منیر والا صمد حسن اب پھر پہلے کی طرح آفس جانے سے قبل اسے خوب تنگ کرتا۔ دونوں روز رات میں دیر تک ایک دوسرے کے سنگ باہر گھومتے پھرتے۔ زاویار حسن کی ذات کے ساتھ صمد حسن کے بے حد پیار نے مریرہ کے دل میں مزید خوشیوں کے محل تعمیر کر دیے تھے۔ آفس سے واپسی کے بعد اب صمد حسن کا سارا وقت مریرہ رحمان اور اپنے بیٹے زاویار صمد حسن کے لیے وقف

”نہیں۔“ صمد کے لیے اس کا یہ سوال قطعی غیر متوقع تھا تاہم پھر بھی اس نے سنبھل کر جواب دیا تھا۔ سارا احمد نے اس لمحے کرب سے پلکیں موند لی تھیں۔

”کیوں۔“

”کیونکہ میرے پاس اس شخص کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔“

”آپ کے پاس نہیں ہے تو یقیناً سارا کے پاس ہوگا۔“ اس بار اس نے پلکیں موند لیں سارا منیر احمد کی طرف دیکھا، جواب میں اس نے بھی آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اوہ ویری سیڈ..... یہ تو بچی کے ساتھ زیادتی ہوگی کہ باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ باپ کی شفقت سے محروم رہے۔“

”محروم کیوں رہے گی تم ہونا اسے ماں اور باپ دونوں کا پیار دینے والی۔“ صمد نے مسکرا کر کہتے ہوئے اس کے بال کھینچے تھے۔ مریرہ جواب میں اسے گھور کر رہ گئی۔

”اللہ اس کی ماں کو سلامت رکھے، ماؤں کے ہوتے ہوئے بیٹیوں کو کسی اور رشتے سے محرومی کا دکھ زیادہ پریشان نہیں کرتا۔ ہاں اگر سارا کو اعتراض نہ ہو تو اس بچی کا نام میں اپنی پسند سے رکھ لوں۔“ بچی کو سارا منیر احمد کے پہلو میں احتیاط سے لٹاتے ہوئے اس نے کہا۔ سارا نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کیسی بات کر رہی ہیں، آپ کو پورا حق ہے میری بیٹی کا نام رکھنے کا۔ آپ تو میری محسن ہیں مریرہ، میری زندگی کے بے حد کٹھن وقت میں آپ نے مجھے اپنے گھر میں ٹھکانہ دے کر ساری عمر کے لیے مجھے اپنا مقروض کر دیا ہے۔“

”نہیں میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا، سہارا اور ٹھکانہ دینے والی ذات صرف اللہ کی ہے میں اور صمد تو بس وسیلہ بنے ہیں۔ خیر میں نے بچی کا نام پر ہیان رکھ دیا ہے۔“

”یہ کیسا نام ہے۔“ صمد نے اعتراض اٹھانا اپنا فرض سمجھا تھا۔ مریرہ پھر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”بہت پیارا نام ہے اس کا مطلب ہے ”پری جیسی حسین“۔ اگر میری بیٹی ہوتی تو میں اس کا بھی یہی نام رکھتی۔“

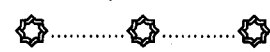
”ہوں لیکن اگر ہماری بیٹی ہوتی تو پتا ہے میں اس کا نام کیا رکھتا۔“

”کیا؟“

”درمکنوں۔“

”اب یہ کیسا نام ہے۔“

”بہت پیارا نام ہے، درمکنوں کا مطلب ہے ”چھپا ہوا موتی۔“ مریرہ کی ناک پیار سے دباتے ہوئے اس نے درمکنوں نام کی وضاحت کی تھی جواب میں وہ اسے ہلکا سا مکا رسید کر کے رہ گئی۔



شب کے اڑھائی بجے تھے جب زاویار کے رونے پر صمد کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ پانی مانگ رہا تھا۔

صمد نے اٹھ کر اسے پانی پلا دیا۔ مریرہ بے خبر سو رہی تھی۔ زاویار کو تھپک کر سنانے کے بعد اس نے ایک نظر بے خبر سوئی ہوئی مریرہ رحمان پر ڈالی پھر کبل اٹھا کر اس پر اچھی طرح سیٹ کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ باہر چاندنی رات تھی۔ صمد بنا آہٹ کیے اسٹور روم کی طرف آیا تو سارا بیگم جاگ رہی تھیں۔

پر ہیان کے کان میں درد تھا وہ اسے بمشکل دودھ پلا کر سنانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ صمد پر نظر پڑتے ہی اس نے بے حد تعجب سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ اس وقت یہاں؟“

”ہوں، پر ہیان کے رونے کی آواز آ رہی تھی ایک نظر دیکھنے چلا آیا۔ آپ تو ٹھیک ہیں ناں؟“

”جی۔“

”کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“

”نہیں۔“

”ٹھیک ہے یہ پیسے رکھ لو، جس چیز کی بھی ضرورت ہو بتا دینا میں لے آؤں گا۔“

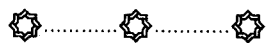
”نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ نے اب تک جو کیا ہے وہی بہت ہے میرے لیے۔“ سارا بیگم کا سر جھکا ہوا تھا۔ صمد نے پیسے ان کے تنکے کے نیچے رکھ دیے۔

”یہ آپ کا حق ہے اور میرا فرض بھی۔ میں جانتا ہوں کہ جس حیثیت سے آپ یہاں رہ رہی ہیں وہ آپ کے ساتھ زیادتی ہے مگر میں مجبور ہوں سارا، مریرہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ مجھے کسی اور کے ساتھ شیئر کرنے کا تصور بھی نہیں ہے اس کے پاس، میں اسے دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ جانتی ہیں یہ شادی میرا شوق نہیں مجبوری تھی۔“

”جی میں جانتی ہوں مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔“

”گلہ ہو بھی تو فی الوقت میں اس کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ بس میری آپ سے صرف ایک ریکوئسٹ ہے جب تک میں آپ کا کسی دوسری محفوظ جگہ پر رہنے کا بندوبست نہیں کر دیتا تب تک کسی بھی صورت اسے پتا نہ چلے کہ ہمارا کیا تعلق ہے۔ میں اسے کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا سارا کیونکہ میں جانتا ہوں وہ بہت جذباتی اور حساس ہے۔ آپ کوشش کرنا کہ اسے اپنے حوالے سے کوئی بھی فرضی کہانی سنا کر مطمئن کر سکیں تاکہ اس کے دل میں ہمارے تعلق کو لے کر ذرا سا شک بھی نہ آئے۔“

”جی ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی۔“ سارا بیگم نے یقین دلایا تھا وہ مطمئن سا اس کا شکریہ ادا کرتا اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔



مجھ سے پوچھتے ہیں لوگ کس لیے دسمبر میں

یوں اداس رہتا ہوں

کوئی دکھ چھپاتا ہوں یا کسی کے جانے کا

سوگ میں مناتا ہوں
آپ میرے الم کا صفحہ صفحہ کھولیں گے؟
آپ نے دکھاتا ہوں ضبط آزماتا ہوں
سردیوں کے موسم میں گرم گرم کافی کے
چھوٹے چھوٹے سب لے کر کوئی مجھ سے کہتا تھا
ہائے اس دسمبر میں کس بلا کی سردی ہے؟
کتنا ٹھنڈا موسم ہے کتنی بخ ہوائیں ہیں
آپ بھی عجب شے ہیں
اتنی سخت سردی میں ہو کے اتنے بے پروا
جینز اور ٹی شرٹ میں کس مزے سے پھرتے ہیں
شال بھی مجھے دے دی کوٹ بھی اوڑھا ڈالا
پھر بھی کانپتی ہوں میں
چلیے اب شرافت سے پہن لیجیے سویٹر
آپ کے لیے میں نے بن لیا تھا دو دن میں
کتنا مان تھا اس کو میری اپنی چاہت پر
اب بھی ہر دسمبر میں اس کی یاد آتی ہے
گرم گرم کافی کے چھوٹے چھوٹے سب لے کر
ہاتھ گال پر رکھے حیرت اور تعجب سے
مجھ کو دیکھتی رہتی اور مسکرا دیتی
شوخی و سر دلچے میں مجھ سے پھر وہ کہتی تھی
اتنے سرد موسم میں آدھی سیلوں کی ٹی شرٹ؟
اس قدر نہ اترائیں.....
سیدھے سیدھے گھر جائیں
اب کی بار جب آئیں
براؤن ٹراؤزر کے ساتھ بلیک ہائی نیک پہنیں
کوٹ کوئی ڈھنگ کا لیں
ورنہ میں قسم سے پھر ایسے روٹھ جاؤں گی
سامنے نہ آؤں گی
ڈھونڈتے ہی رہیے گا

پاس بیٹھے ابو کے پالینکس پر کیچے گرما گرم ڈسکشن
کافی لے کے کمرے میں، میں تو پھر نہ آؤں گی
خالی خالی نظروں سے آپ ان خلاؤں میں
یوں ہی تکتے رہیے گا
اور بے خیالی میں ڈانٹ کھاتے رہیے گا
کتنی مختلف تھی وہ، سب سے منفرد تھی وہ
اپنی ایک لغزش سے اس کو کھودیا میں نے
اب بھی ہر دسمبر میں اس کی یاد آتی ہے۔

صمد حسن لندن سے واپس آ گئے تھے۔ زاویار ان کے ساتھ نہیں آیا تھا کہ اسے ابھی لندن میں بہت
سے کام تھے۔ مگر پرہیزان کہاں چھپ گئی تھی یہ وہ ابھی نہیں جانتے تھے۔ زاویار نے انہیں معاف کر دیا تھا ان
کے لیے یہی بہت تھا۔

مریرہ رحمان کو کھونے کے بعد وہ اس کی واحد نشانی کو کھودینے کا نقصان نہیں اٹھا سکتے تھے۔ سارا بیگم
البتہ رنجیدہ تھیں۔ اس وقت جب وہ اپنے کمرے میں مکمل طور پر مریرہ رحمان کی یادوں میں کھوئے اس سے
منسلک نظم پڑھ رہے تھے وہ ان کے پاس آئی تھیں۔

”صمد۔“ اور وہ جو ڈائری کھولے ہر حقیقت سے بے خبر گرم سم بیٹھے تھے چونک اٹھے۔
”ہوں۔“

”پری کا پتا چلا۔“

”نہیں۔“ گہری سانس بھر کر کہتے ہوئے انہوں نے ڈائری بند کر دی۔

”میں نے زاویار کو کہہ دیا ہے وہ ان شاء اللہ جلد اسے ڈھونڈ کر پاکستان واپس بھجوا دے گا۔“

”وہ نہیں آئے گی صمد میں اسے جانتی ہوں۔“

”اگر وہ نہیں آئے گی تو ہم اس کے پاس چلے جائیں گے سارا، تم پریشان مت ہو۔“

”میں پریشان نہیں ہوں۔“ شکستہ لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے اپنا سر صمد حسن کے گھٹنے پر ٹکا دیا۔

”پرہیزان اور زاویار کی طرح اب کبھی کبھی مجھے بھی شدت سے احساس ہوتا ہے صمد کہ میں نے آپ

کا اور مریرہ کا بہت نقصان کیا ہے۔ اس نے کتنے مان سے مجھے کہا تھا کہ میں اس کے اعتبار کو کبھی نہیں نہ

پہنچاؤں۔ اس کے شوہر کی موجودگی میں اپنے کام سے کام رکھوں۔ مگر میں نے کیا کیا صمد میں نے اس کے

اعتبار کی دھجیاں اڑا دیں۔ وہ جس شخص کے چھن جانے سے ڈرتی تھی میں نے وہی شخص اس سے چھین لیا؟ اس

نے مجھے کھن وقت میں اپنے گھر میں پناہ دی اور میں نے..... میں نے اسے اسی گھر سے در بدر کر دیا۔ سب کچھ

چھین لیا میں نے اس سے صمد۔ وہ آپ کو مجھ سے دور رکھنا چاہتی تھی اور میں..... میں اس وقت اسے بتا بھی

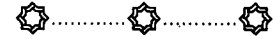
نہیں سکی کہ جس شخص کے چھن جانے سے وہ خوفزدہ ہے وہ شخص تو میں اس سے کب کا چھین چکی ہوں۔ مجھے جیسی

سفاک اور خود غرض عورت کہاں ہوگی بھلا۔“ سارا بیگم کی آنکھوں میں پچھتاوے کے آنسو تھے۔ صمد حسن کا اضطراب مزید بڑھ گیا۔ وہ بولے تو ان کے لہجے میں شکستگی نمایاں تھی۔

”گزری ہوئی گھڑیوں پر پچھتا کر خود کو اذیت دینے کا کوئی فائدہ نہیں سارا۔“

”آپ بھی تو پچھتا رہے ہیں صمد..... مریرہ رحمان کو کھودینے کے بعد میں نے کبھی آپ کو دل سے ہٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ یہاں نہیں ہے مگر پھر بھی وہ مجھے ہر جگہ چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہے۔ شاید کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے والی مجھ جیسی بے رحم اور بے ضمیر عورتوں کی زندگی یونہی سکون سے خالی ہو جاتی ہے، تبھی تو اس کا وہ بیٹا جسے میں نے سگی ماؤں سے بڑھ کر پالا ہے مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ میری اپنی بیٹی جس نے میری کوکھ سے جنم لیا جس کی زندگی میں خوشیوں کے چراغ جلانے کے لیے میں نے آپ کی زندگی کی خوشیوں کے سارے چراغ بجھا دیے، میری شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہے۔ کتنی بدنصیب ہوں میں صمد کہ آپ کی بیوی ہوتے ہوئے میں پچھلے بیس سالوں میں آپ کے دل تک رسائی نہیں پاسکی۔ بھلا اس سے بڑھ کر بھی کسی عورت کی کوئی سزا ہوگی؟“ وہ اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔ صمد حسن چاہتے ہوئے بھی تسلی کے دو بول نہ بول سکے۔ ان کے اپنے اندر بے حد دھواں بھرا تھا۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں وہ، ان کی زندگی سے نکل جانے کے باوجود بھی مریرہ رحمان دور کہاں گئی تھیں۔ گزرے ہوئے بیس سالوں کی دوری نے اس انا پرست عورت کو اور بھی ان کے دل کے قریب کر دیا تھا۔



”میں نے پرانی حوالی کا پزل حل کر لیا ہے ماما۔“ شہر بانو اس وقت شہاب نامہ کے مطالعے میں غرق تھیں جب شہزاد کے الفاظ نے انہیں بے ساختہ چونکا ڈالا۔

قدرے الجھی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے انہوں نے اپنی بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا جو بے حد مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔ تبھی انہوں نے پوچھا۔

”کیسا پزل؟“

”پرانی حویلی کے اجڑنے کا پزل تھا میں جان گئی ہوں اس رات حویلی میں کیا ہوا تھا۔“ قدرے سنجیدگی سے کہتی وہ شہر بانو کے قریب آ بیٹھی۔ شہر بانو نے کتاب بند کر دی۔

”کیا ہوا تھا اس رات حویلی میں؟“ سوالیہ نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا جب وہ بولی۔

”شگفتہ پھوپھو پوجانی کی بے درد موت ہوئی تھی، میں سب جان گئی ہوں انہیں خود ان کے شوہر ملک ریاض نے درندگی سے موت کے منہ میں پہنچایا تھا۔ چاندنی رات تھی وہ.....“ قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ اسے بتا رہی تھی۔ شہر بانو نے بے ساختہ رکی ہوئی سانس بحال کی۔

”نہیں۔“ گہری سانس بھر کر کہتے ہوئے انہوں نے گلاسز بھی اتار کر سائیڈ پر رکھ دیے تھے ایک دم سے ان کے اندر جیسے تھکن اتر آئی تھی۔

”وہ چاندنی رات نہیں تھی شہر، بے حد تاریک رات تھی وہ بے حد خوفناک رات۔“

”پھر بتائیے ناں ماما کیا ہوا تھا اس رات میں ایسا کہ کوئی بھی اس رات کی ہولناکی سے پردہ اٹھانے کو تیار نہیں۔“

”تم جان کر کیا کرو گی“

”کچھ بھی نہیں، بس مجھے حویلی کے پچھواڑے میں بنی اپنے بزرگوں کی آخری آرام گاہوں کی کہانی پتا چل جائے گی۔ وہ کہانی جو دیار غیر سے مجھے یہاں حویلی میں کھینچ لائی ہے۔“

”وہ کہانی اب ماضی کا حصہ بن گئی ہے شہر واد گزرے ہوئے ماضی کی راکھ کو کریدنے سے کچھ حاصل نہیں۔ بہتر ہے تم گزرے ہوئے وقت کا راز حل کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے اپنے مستقبل پر توجہ دو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ حویلی کے راز حل کرتے کرتے تم اپنی ذات کو کسی مشکل میں ڈال لو۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر ماما.....!“

”کچھ اگر گرنیں، صرف تمہاری پسند پر جانے کیسے میں یہاں اس حویلی میں قیام کے لیے راضی ہوئی ہوں، حالانکہ اب یہاں کے در و دیوار میں میرا دم گھٹتا ہے۔ پوری پوری رات جاگ کر گزارتی ہوں میں۔ کاش تم میری اذیت کا اندازہ کر سکو شہر، اوپر سے عمر بھائی کو ہمارے یہاں قیام کا پتا چلے گا تو وہ طوفان اٹھا دیں گے۔“

”مگر کیوں؟“ وہ جذباتی ہوئی۔ جب ساری کہانی راکھ کا ڈھیر بن چکی ہے تو پھر اب یہاں رہنے میں کیا مسئلہ ہے۔“

”مسئلہ ہے۔“ شہزاد کے اکتا کر کہنے پر اس نے قدرے تیز لہجے میں اسے ڈپٹا۔ ”کچھ کہانیاں راکھ کا ڈھیر بھی بن جائیں تب بھی ان میں دہی چنگاریاں ساری سلگتی رہتی ہیں۔ جو بعد میں اکثر کریدنے والوں کے ہاتھ تک جلا دیتی ہیں۔ پرانی حویلی کے مکین ابدی نیند سوچکے ہیں مگر ان کو ابدی نیند سلانے والوں کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ملک فیاض ابھی زندہ ہے ملک وقار کا بڑا بیٹا نئی حویلی کا سپوت، اس کے بھی جوان بچے ہیں جو یہیں اسی گاؤں میں پلے بڑھے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری اکلوتی بیٹی، جو میری کل زندگی کا سرمایہ ہے کبھی ان کی نظر میں آئے۔ ہمارے پاس اب کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا ہے شہر۔“ بولتے بولتے شہر بانو کا لہجہ بھیگ چکا تھا۔ شہزاد نے قدرے شرمندی ہو کر ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”آپ بے فکر رہیں ماما، میں ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے آپ کو یا عمار کل کو کسی دکھ یا مصیبت کا شکار ہونا پڑے..... خوش؟“

”ہوں۔“

”تھینک یو۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے شہر بانو کے گلے میں ہاتھیں ڈالیں تو انہوں نے جواب میں اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

”چلو اب سو جاؤ۔“

”نہیں ماما، مجھے آپ سے کچھ شیز کرنا تھا۔“

”ہوں کہو۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔“

”نہیں، اگر تم نے اپنی حدود میں رہ کر کچھ غلط نہیں کیا تو نہیں ہوں گی۔“

”مجھے اپنی حدود اور حرمت کا پاس ہے ماما۔“

”ٹھیک ہے پھر بلا جھگ کہو کیا بات ہے۔“ اب وہ مکمل توجہ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ شہزاد

کو بے ساختہ نظریں چرانا پڑیں۔

”ماما ایک لڑکا ہے صیام۔“ سر جھکا کر اس نے بالآخر سب بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ”دری کے آفس

میں کام کرتا ہے میرے ساتھ، بے حد ڈشنگ پر سنائی ہے اس کی بہت محنتی اور ذہین بھی ہے میں اسے پسند کرتی

ہوں شاید وہ بھی مجھے پسند کرتا ہے مگر.....!“

”مگر کیا؟“

”مگر ایک مسئلہ ہے ماما۔“

”کیسا مسئلہ؟“

”مسئلہ یہ ہے کہ وہ پہلے سے انگیڈ ہے حالانکہ وہ اس لڑکی کو پسند نہیں کرتا نہ ہی اس نے اب تک اس

رشتے کو تسلیم کیا ہے شاید اس کے گھر والے بھی اس رشتے پر راضی نہیں ہیں۔“

”تو پھر یہ رشتہ ہوا کیسے؟“

”یہ رشتہ اس کے ابو نے کیا تھا ماما، اب وہ بھی دنیا میں موجود نہیں ہیں۔“

”ہوں، یہ سب اس لڑکے نے کہا تم سے۔“

”نہیں ماما، اسے تو پتا بھی نہیں ہے کہ میں اسے پسند کرتی ہوں، بہت ریزرو نیچر کا مالک شخص ہے۔“

”تو پھر تمہیں اس بات کا کیسے پتا چلا؟“

”اس کی چھوٹی بہن نے بتایا تھا۔“

”ٹھیک ہے مریدہ سے بات کروں گی میں۔“

”اوٹھینک یو سوچ ماما، میں جانتی تھی میری ماں کبھی ایک روایتی عورت ثابت ہو ہی نہیں سکتیں۔“ فرط

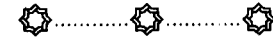
جذبات میں اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اس نے ان کا منہ چوم لیا۔

”چلو سو جاؤ اب بہت رات ہو گئی ہے۔“

”ٹھیک ہے آپ بھی سو جائیں اب بہت رات ہو گئی ہے تو اس کتاب کو بھی رکھ دیں بس۔“ کتاب

اٹھا کر دور رکھتے ہوئے وہ انہی کے بستر میں گھس گئی تھی۔

شہزاد نے مسکرا کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے آہستہ سے پلکیں موند لیں۔



وہ ایک تاریک رات تھی بے حد تاریک اور خوفناک..... اماؤس کی رات کی طرح پر اسرار رات.....

ملک وقار اور اس کے بیٹوں نے اپنے وسیع اثر و رسوخ کی بنا پر ملک ریاض اور نورین کے قتل کی ایف

آئی آر میں خضر عباس اور نظر عباس کے نام فٹ کرا دیے تھے۔ گاؤں کے چار لوگوں کو گواہ کی حیثیت سے خریدنا

ان کے لیے چنداں مشکل نہیں تھا۔ وہاں مقدس قرآن پاک پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی گواہی دینے والوں اور دنیا کی

چند روزہ زندگی پر اپنی آخرت کی دائمی زندگی کو داؤ پر لگانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ضمیر ہمیشہ کی نیند سو گئے تھے۔

ملک وقار کے آدمیوں نے خضر عباس اور نظر عباس کے خلاف گواہی دی اور دونوں بے گناہی کے باوجود پابند

سلاسل ہو گئے۔

عمر گاؤں میں نہیں تھا وگرنہ اس کا نام سب سے پہلے ایف آئی آر کی زینت بنتا، پرانی حویلی میں

زندگی اور زندگی کی خوشیاں جیسے روٹھ گئی تھیں۔ اظہار ملک صاحب بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کا دماغ مفلوج

ہو چکا تھا۔ پے در پے لگنے والے صدمات نے بہت گہرا اثر ڈالا تھا ان پر۔

اس رات حویلی میں ان کے مفلوج وجود کے علاوہ خضر عباس اور نظر عباس کی بیگمات اور بچے بھی تھے

شہزاد اپنی چند ماہ کی بیٹی شہزاد کو لے کر دو تین روز کے لیے اپنے چچا کی طرف گئی ہوئی تھی جن کا گھر اس کا میکہ

تھا اسے خبر بھی نہیں تھی کہ حویلی پر کیسی قیامت ٹوٹنے والی ہے۔ شب آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی جب حویلی کی

اوپرچی دیواروں کو پھلانگ کر ملک فیاض اور ملک نیاز پرانی حویلی میں داخل ہوئے تھے۔ خضر عباس کی بیوی کنیز کی

آنکھ کھٹکے سے کھلی تھی۔ فضا میں خنکی کے احساس کے باوجود اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا جبکہ دل بہت تیزی کے

ساتھ دھڑک رہا تھا۔

وہ اپنے الگ کمرے میں بچوں کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ ایک نظر دائیں بائیں سوئے معصوم بچوں پر

ڈالنے کے بعد وہ انہی اور پاؤں میں چپل اڑس کر کمرے سے باہر نکل آئی، حویلی کے ساتھ ملحقہ جانوروں کے

باڑے میں بیلوں کے گلے میں پڑے گھنگھر و خوب زور و شور سے بج رہے تھے۔ ہنہناتے بیلوں کی آواز نے

اسے مزید چونکا کیا تھا۔ تبھی تاریک رات میں معمولی سی ٹارچ کے ساتھ وہ متطاقد قداموں سے چلتی باہر حویلی کے

صحن میں آئی تھی جہاں لگے بڑے سے گھنے پیڑ کے اس پار ملک فیاض نے کسی خونخوار درندے کی طرح لپک کر

اس کی گردن دبوچی تھی کنیز کو چلانے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

ملک نیاز نے اپنے بھائی کا بھرپور ساتھ دیتے ہوئے اس کی لمبی چٹیا سے اس کا منہ باندھ دیا۔ اگلے

ہی پل دونوں بھائیوں نے اسے تخت پر گرا کر اس کی ٹانگیں اور ہاتھ بھی قابو کر لیے تھے۔ اوپر آسمان پر چاند یہ

درندگی بھرا منظر دیکھنے کو موجود نہیں تھا۔ ملک فیاض نے کنیز کے مکمل بے بس ہو جانے کے بعد اس کی چھاتی پر

بیٹھتے ہوئے چادر میں چھپا نوکیلا خنجر نکالا اور قطعی بے رحمی کے ساتھ کنیز کی لائبی گردن کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔

اگلے پندرہ سے بیس منٹ کے بعد بنا حلق سے کوئی آواز نکالے کنیز بی بی نے جو اس حویلی کی سب

سے بڑی بہو تھی قطعی بے بسی کے ساتھ تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ سکھ چین کے پیڑ کے نیچے بچھا تخت جہاں

کبھی بے جی بیٹھ کر حویلی اور گاؤں سے متعلق ضروری فیصلے کیا کرتی تھیں گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو

قرآن پاک پڑھایا کرتی تھیں۔ اس حویلی کی بڑی بہو کے خون سے سرخ ہوتا جا رہا تھا عمر عباس اور اس کے بھائیوں نے جن قاتلوں کی بیگمات کو صرف خواتین ہونے کی رعایت اور احترام میں نقصان نہیں پہنچایا تھا آج وہی قاتل اس کے گھر تک آ گئے تھے۔ سکھ چین کے بیڑ کے نیچے بچے تخت پر کنیز کا جسم تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تھا جب وہ دونوں اسے دیکھ چھوڑ کر اپنی چادریں سنبھالتے ہوئے اندرونی کمروں کی طرف بڑھے تھے۔ کنیز کے ساتھ والا کمرہ اس کی بہن ظہرہ اور نظر عباس کا تھا۔ نظر عباس کی گرفتاری کے بعد وہاں ظہرہ اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر علیحدہ سوئی تھیں۔ فیاض ملک نے آگے بڑھ کر اسی کے کمرے کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔

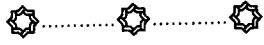
ظہرہ گہری نیند سے جاگی تھی۔ وہ سمجھی اسے کنیز نے جگانے کے لیے دستک دی ہے اس کے سوارات کے اس پہر بھلا اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے بھی کون سکتا تھا تبھی بنا تصدیق کیے اس نے پٹ سے دروازہ کھول دیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی دیر تھی کہ کمرے سے باہر کھڑے ملک فیاض اور ملک نیاز نے بلی کی طرح لپک کر اسے مرغی کی طرح دبوچ لیا۔ ملک نیاز کے مضبوط فولادی ہاتھوں نے اس کے جڑے کو اتنی سختی سے دبوچا تھا کہ اس کی چیخ حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ اگلے ہی پل دونوں بھائیوں نے اسے کمرے کے اندر گھسیٹ کر دروازہ بند کر دیا۔ کنیز کی طرح اس کے منہ کو بھی اس کے پراندے سے باندھ دیا گیا تھا۔ وہ رات اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ اسی حویلی کی ایک اور کمین کے لیے قیامت کی رات ثابت ہونے جا رہی تھی۔ ملک وقار کے درندہ صفت بیٹوں نے ظہرہ کا حال کنیز سے بھی برا کیا تھا۔ وہ ایک بے حد خوبصورت جوان عورت تھی۔ ملک نیاز کی رال ٹپک گئی۔ اگلے تین گھنٹے تک ان دونوں انسان نما جانوروں نے اسے بری طرح بھنبھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اچھی طرح اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد انہوں نے ظہرہ کا گلا یوں گھونٹا کہ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آ گئی تھیں۔ جس وقت وہ دونوں اسے موت کے گھاٹ اتار رہے تھے اس کی سات سالہ بیٹی کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تبھی ملک نیاز نے لپک کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ اگلے روز کی ہولناک صبح ابھی اپنے پر پھیلا نہیں پائی تھی جب ملک ریاض جیسے آوارہ بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے انتقام میں پاگل ملک نیاز جیسے درندے نے حیوانیت کی انتہا عبور کرتے ہوئے ظہرہ کی سات سالہ بیٹی کو گود میں اٹھایا اور ملک اظہار کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اظہار ملک صاحب کے کمرے کا دروازہ مقفل نہیں تھا۔ لہذا وہ بچی کو اٹھائے اٹھائے پاؤں کی ٹھوک سے بند دروازے کو کھولتے ہوئے اندر چلا آیا جہاں فالج کی لپیٹ میں آئے اظہار ملک صاحب زندہ لاش کی صورت اپنے بستر پر پڑے جاگ رہے تھے۔

اماؤس کی رات کی طرح وہ خوفناک رات ایک اور قیامت بپا کرنے جا رہی تھی۔ اپنی ماں کو تڑپتے دیکھ کر گھبرانے والی روتی ہوئی سات سالہ بچی کو زمین پر پٹخ کر اگلے ہی ملک نیاز نے اس کے معصوم بدن کو رگیدنا شروع کر دیا تھا۔ سامنے بستر پر زندہ لاش کی طرح پڑے اظہار ملک صاحب اس خونی منظر کو دیکھ کر تڑپ اٹھے تھے مگر عجیب بے بسی تھی کہ چاہنے کے باوجود اپنے جسم کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت میں نہ لاسکے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اپنے بے جان جسم کو بے حد کوشش اور مشقت کے بعد حرکت دے کر جس وقت وہ بستر سے

نیچے زمین پر اوندھ منہ گرے نظر عباس کی معصوم کلی چکی جا چکی تھی۔

سورج طلوع ہونے سے پہلے ملک فیاض اور ملک نیاز اپنا سارا کام مکمل کر کے حویلی سے نکل چکے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے خضر عباس اور نظر عباس کے باقی سوئے ہوئے بچوں کو بھی اٹھالیا تھا جن کی لاشیں گاؤں والوں کو کئی روز کے بعد بور یوں میں بند لی تھیں۔ عُمران دونوں کراچی میں تھا۔ حویلی پر ٹوٹنے والی نئی قیامت نے اس کا خون جیسے رگوں میں نمود کر دیا۔ اس پر افتاد یہ کہ خضر عباس اور نظر عباس دونوں بھائیوں کو قطعی بے گناہی کے باوجود جھوٹے گواہوں اور جھوٹے ثبوتوں کو مد نظر رکھ کر انصاف کے ایوانوں نے موت کی سزا سنائی دی تھی۔ عمر عباس کے لیے یہی اذیت و پریشانی ناقابل برداشت تھی کہ پیچھے اس کی غیر موجودگی میں حویلی کے آخری خیمے بھی اکھڑ گئے تھے۔

اماؤس کی رات کی طرح خوفناک وہ رات اپنے بچوں میں ملک اظہار صاحب کی زندگی کی آخری رہی سہی سانس بھی دبوچ کر لے گئے تھی۔ عمر کو لگا جیسے وہ تپتی سلگتی زمین پر آگ اگلے سورج کے تلے بالکل اکیلا و تہی دست رہ گیا ہو، آندھیوں کی زد میں آیا اس کا وجود جیسے لوگوں کے پاؤں نلے کچلتا جا رہا ہو۔ دنیا اور دنیا کے لوگ اس کی ذات کو روندتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے ہوں۔



جس وقت وہ طویل سفر کر کے کراچی سے حویلی پہنچا شام ڈھل رہی تھی۔ حویلی کے صحن میں سکھ چین کے نیچے پڑے تخت پر کنیز کی لاش نے اس کے پاؤں من من بھاری کر دیے تھے۔ اندر کمر میں ظہرہ اور اس کی معصوم بیٹی کو گاؤں والوں نے بڑی چادریں دے کر ڈھانپ دیا تھا مگر پھر بھی وہ ان پر ٹوٹنے والی قیامت کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اظہار ملک صاحب اپنے کمرے میں تاحال اوندھے پڑے تھے۔ پولیس اپنی ضروری کارروائی کر کے جا چکی تھی عمر عباس کی تھکن اور ضبط سے سرخ آنکھوں میں جیسے لہو اتر آیا تھا۔ علاقے کے تھانیدار نے ساری کہانی معلوم ہونے کے باوجود اس سے اظہار افسوس کرتے ہوئے پوچھا تھا کہ اسے کس پر شک ہے تاکہ وہ اسی فرد کے خلاف ایف آئی آر کالے مگر عمر نے کسی بھی فرد کے خلاف ایف آئی آر کٹوانے سے انکار کر دیا تھا۔ ایف آئی آر کٹوانے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ اندھے قانون کے انصاف اور اس کے تقاضوں سے وہ بہت اچھی طرح آشنا ہو چکا تھا۔ کل رات کی تاریکی نے جو بھونچال حویلی میں اٹھایا تھا اس نے سارے گاؤں میں ایک عجیب سی چپ اور سوگواریت بکھیر دی تھی۔ حویلی کے اجڑنے کی کہانی پر گاؤں کا کوئی فرد ایسا نہیں تھا جس کی آنکھ میں آنسو نہ ہوں۔ شہر بانو اپنی چند ماہ کی بچی کے ساتھ اسی شام حویلی پہنچی تھی۔ وہ حویلی جو محبت اور امن کا گہوارا تھی۔ وہ حویلی جس نے اس کے دامن میں خوشیوں کے بہت سے پھول ٹانکے تھے۔ وہ حویلی جہاں بسنے والے مکینوں سے اس نے محبت کرنا سیکھا تھا۔ محبت کے معنی جانے تھے۔ وہی حویلی اجڑ گئی تھی۔ عمر عباس اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ رات تک دھائیں مار مار کر روتی رہی مگر اب وہاں بے جی نہیں تھیں جو اسے روتے دیکھ کر اپنی مہربان آغوش میں چھپا لیتیں۔ اظہار ملک صاحب بھی نہیں رہے تھے جو اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر اسے چپ کر دیتے۔ ظہرہ اور کنیز جیسی محبت لٹانے والی بھابھیاں بھی چپ کی ہل مارے ابدی نیند سو گئی

تھیں۔ وہ کس کس نقصان پر ماتم کرتی؟ پتھر کی مورت بنے عمر عباس نے اکیلے ان سب پیاروں کو کندھا دیا اور پھر انہیں آخری آرام گاہوں تک کس طرح پہنچایا تھا صرف وہی جانتا تھا۔ وقار ملک صاحب نے فوری طور پر ملک فیاض اور اس کے بیوی بچوں کو ایروڈ بھجوا دیا تھا۔ نیاز اور اس کی فیملی پہلے ہی شہر میں سکونت پذیر ہو چکی تھی۔ صرف ملک اعجاز تھا جو گاؤں میں تھا اور اس کی عادات اپنے تینوں بھائیوں سے قطعی مختلف تھیں۔ شادی بھی اس نے اپنی پسند سے اپنی یونیورسٹی فیلو کے ساتھ کی تھی جسے ملک وقار اور کے باقی تینوں بھائی خاص پسند نہیں کرتے تھے۔

پرانی حویلی پر ٹوٹی قیامت کو تقریباً ایک ماہ ہو گیا تھا جب کسی ضروری کام کے سلسلے میں ملک نیاز کو گاؤں آنا پڑا تھا عمر عباس جو اب تک پل پل انگاروں پر لوٹ رہا تھا اس نے موقع کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ نتیجتاً ملک ریاض کی طرح ملک نیاز بھی اسی کے ہاتھوں شہر اور گاؤں کے درمیانی راستے میں ہی اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچ گیا۔ ملک اعجاز جو اس وقت اپنے بھائی کے ساتھ ہی حویلی آ رہا تھا عمر عباس کے ساتھ لڑائی میں بری طرح زخمی ہو گیا۔ عمر عباس کی ٹانگ اسی کے ہسپتال سے نکلنے والی گولی سے زخمی ہوئی تھی۔ صرف ایک عورت کے لیے شروع ہوئی اس جنگ نے دونوں حویلیوں کے اندر سنائے بکھیر دیے تھے۔ سارے گاؤں کی فضا میں جیسے وحشت پنچے گاؤں کی طرح گئی تھی۔ ملک اعجاز تقریباً ایک ماہ اسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد راہ عدم کا مسافر ہو گیا تھا۔ نئی حویلی کے وارثین میں صرف ملک فیاض نے اپنی جان بچائی تھی جبکہ پرانی حویلی کے سپوتوں میں صرف عمر عباس حیات رہا تھا۔

تین زندہ گیسوں کے چراغ گل کرنے کے باوجود قانون کے لمبے ہاتھ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے تھے جبکہ خضر عباس اور نظر عباس جو قطعی بے گناہ تھے بے خبر تھے۔ عمر عباس کی لاکھ کوشش اور بھاگ دوڑ کے باوجود انصاف کی بھیئت چڑھ کر سویلوں کی نذر ہو گئے تھے۔

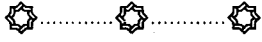
اپنے تین بیٹوں کے قتل کے بعد ملک وقار کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً دو سال کے اندر اندر وہ بھی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

عمر عباس نے خضر عباس اور نظر عباس کی حویلی میں تدفین کے بعد وہ گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ شہر بانو اپنی کمسن بیٹی کے ساتھ اپنے ایک کزن کے پاس دیار غیر شفت ہو گئیں جو اس کے ماموزاد تھے اور جنہوں نے ہمیشہ بھائیوں کی طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ شہزاد نے انہی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔ عمر عباس اپنی بے حد مصروف زندگی کے سبب بہت کم ان دونوں ماں بیٹی سے آکر ملتا تھا۔

مریہ رحمان کے نمبر پر اس نے جب بھی کال کی اسے وہ نمبر آف ملا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ صرف اسی کی وجہ سے صمد نے مریہ کا نمبر تبدیل کر دیا تھا۔ یہ سچائی اسے تب پتا چلی جب مریہ صمد حسن کا گھر چھوڑ کر اس کی زندگی سے نکل آئی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ پرانی حویلی کی کہانی ماضی کا حصہ بنتی گئی۔ عمر عباس کو امریکہ میں اچھی جاب کی آفر ہوئی تو اس نے پاکستان چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ نیویارک میں گیس اسٹیشن پر کام کرنے کے بعد وہ بیکرز فیلڈ میں شفت ہو گیا۔ تین سال کے بعد وہ پاکستان واپس لوٹا تو پرانی حویلی کسی کھنڈر کی طرح

دیران اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ تبھی اس نے حویلی کی دیکھ بھال کے لیے ایک عدد گارڈ اور خاکروب کا بندوبست کر دیا تھا۔

حویلی کے پچھواڑے میں ابدی نیند سوئے اس کے پیاروں کی آخری آرام گاہیں حویلی کا راز بن گئی تھیں۔ یہی راز حل کرنے کے لیے قمر عباس کی بیٹی شہزاد نے ایک مرتبہ پھر حویلی کے بند کواڑ کھول دیے تھے۔



جدائی دینے والے تم سے امد وفا کیسی؟
تعلق ٹوٹ جائے جب محبت روٹھ جائے تب
تو پھر رسم دعا کیسی، ملن کی التجا کیسی؟
بھنور میں ڈوبتی کشتی پہ ساحل کی تمنا کیا؟
اکھڑتی سانس ہو تو زندگی کی آرزو بھی کیا؟
جو منزل کھو چکے ہوں اس کی جستجو بھی کیا؟
رضائے دوست پہ اچھا سر تسلیم خم کرنا
سکھنے سے یہی بہتر ہے نا امید ہی مرنا
بھلا دل نے تمہیں کس واسطے سے یاد رکھا ہے
تمہیں یوں شاعری میں آج تک آباد رکھا ہے
ابھی تک میں نے کیوں خود کو بہت برباد رکھا ہے
جدائی والے آشنائی کی قسم تم کو
تمہاری بے وفائی کج ادائی کی قسم تم کو
مجھے اتنا بتا دینا

وفا کی چاہتوں کی مشعلیں کیسے بجھاتے ہیں؟

بھلا نا ہو جنہیں ان کو کیسے بھلاتے ہیں؟

درکنون دروازہ بند کر کے ابھی پلٹی تھی کہ اس کا سیل بج اٹھا۔ مریہ رحمان کی کال تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سائیڈ پر رکھ کر کال پک کی۔

”السلام علیکم ماما!“

”وعلیکم السلام! کیسی ہو۔“

”آپ کے بغیر کیسی ہو سکتی ہوں ماما۔“ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے بے حد لگاؤ سے کہا تھا۔ مریہ اس کے لہجے سے جان گئی کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ تبھی اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”جی ماما۔“

”تم نے جھوٹ کب سے بولنا شروع کر دیا ہے دری۔“ وہ اس کی ماں تھیں لہذا اگلے ہی پل اس کے لہجے کا چور پکڑتے ہوئے اس نے اس کو سرزنش کی تو درمکنوں زبان دانتوں میں دباتے ہوئے مسکرا دی۔

”جھوٹ کہاں بول رہی ہوں ماما، بس تھکن سے تھوڑا سا بخار ہو گیا ہے اور بس۔“

”دوائی لی ہے کوئی؟“

”جی ابھی دوا لینے لگی تھی۔“

”ٹھیک ہے دوا لے کر آرام کرلو، میں کل صبح کی فلاحیٹ سے پاکستان پہنچ رہی ہوں۔“

”خیریت۔“

”ہاں کچھ ضروری کام ہے۔“

”مگر آپ تو کینیڈا جانے والی تھیں ناں۔“

”ہوں، مگر اب نہیں جا رہی کیونکہ اب میری جگہ وہاں تم جا رہی ہو۔“

”وہاں..... مگر میں وہاں جا کر کیا کروں گی ماما۔“

”وہی جو مجھے کرنا تھا۔“ مریرہ کے لہجے میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ تھا۔ درمکنوں بحث نہ کر سکی۔

”صیام بھی ساتھ جائے گا؟“

”ہوں، وہ بھی ساتھ جائے گا میں اس سے بات کر لوں گی۔“

”ٹھیک ہے ماما، میں چلی جاؤں گی۔“

”گڈ۔“ درمکنوں کی فرماں برداری پر اس نے محبت سے کہا پھر کال کانتے کانتے یاد آنے پر بولی

”شہر بانو بھابی صیام کے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہیں کیا وہ شہر شفٹ ہو گیا ہے۔“

”جی ماما، مگر آنٹی اس کی فیملی سے کیوں ملنا چاہتی ہیں؟“

”وہ شاید شہر زاد اور صیام کے رشتے کی بات چلانا چاہتی ہیں۔ مجھ سے صیام کے بارے میں پوچھ

رہی تھیں۔ میں نے بتا دیا کہ قابل اور بہترین انسان ہے۔“ مریرہ بتا رہی تھی اور درمکنوں کا دل جیسے مضطرب ہو کر رہ گیا تھا۔

”کیا اس کے لیے صیام کو شہر زاد کے ساتھ دیکھنا آسان تھا؟“

”چپ کیوں ہو گئی ہو دری۔“ اس کی خاموشی محسوس کر کے مریرہ نہ پوچھا تو وہ بولی۔

”کچھ نہیں ماما، بس سر میں درد ہے بخار کی وجہ سے۔“

”ٹھیک ہے پھر تم آرام کرو، کل بات ہوگی۔“

”جی ٹھیک ہے خدا حافظ۔“ مجھے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی تھی۔ اس کا

جسم بخار سے جل رہا تھا مگر اس وقت اسے اپنے جلتے ہوئے جسم سے زیادہ جلتے ہوئے دل کی پروا تھی تھی اس نے دوا نہیں لی تھی۔

اگلے روز میٹنگ تھی مگر اس کی آنکھیں اتنی بوجھل تھیں کہ کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ کافی دیر

کسمندی سے بستر میں پڑے رہنے کے بعد بمشکل وہ ہمت کر کے ابھی تھی تبھی زور کا چکر آیا تو پھر بستر پر ڈس گئی۔ چند منٹ یونہی پڑے رہنے کے بعد وہ دوبارہ ابھی اور واش روم میں جا کرتے ہوئے چہرے پر ٹھنڈے پانی کی چھپکے مارتے ہوئے خود کو فریش کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

ویٹر اس دوران کئی بار اس کے کمرے کا دروازہ بجا چکا تھا۔ اپنے کمرے میں موجود صیام کا سارا دھیان، ساری توجہ بھی اس کی طرف تھی لاکھ کوشش کے باوجود بھی وہ اپنے دھیان کو اس کی طرف سے ہٹا نہیں پایا تھا۔ میٹنگ کا ٹائم ہو رہا تھا مگر درمکنوں ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ صیام کی جان پر بن گئی تھی۔

کیسی عجیب بے بسی تھی کہ وہ جا کر اس کا حال بھی نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اگلے کچھ لمحے مزید اسی بے قراری کے سپرد کرنے کے بعد اس سے رہا نہ گیا تو اس نے خود جا کر درمکنوں کے کمرے کے بند دروازے پر دستک دے ڈالی۔ اس کی دستک کے جواب میں اگلے دو منٹ کے بعد دروازہ کھل چکا تھا۔ باریک کریب کے مکمل بلیک سوٹ میں ملبوس، درمکنوں نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت دھانی دے رہی تھی۔ اس کی قمیض پر دکتے سفید چھوٹے چھوٹے ٹیگنے ستاروں کی مانند دکتے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا گئے تھے۔

چہرہ میک اپ سے عاری ہونے کے باوجود فریش لگ رہا تھا تاہم آنکھوں کی سرخی اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کی طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں۔ صیام نے دیکھا اپنے شانوں کے گرد لپٹی گرم شال کے باوجود اس کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا تبھی وہ بولا۔

”مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی، بہتر ہوگا اگر آپ.....!“

”میں ٹھیک ہوں آپ کو خواخواہ میری فکر میں گھلنے کی ضرورت نہیں ہے، ویسے بھی بہتر ہوگا اگر آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔ میں درکرز کا زیادہ فری ہونا پسند نہیں کرتی۔“ صیام کی بات درمیان میں ہی کاٹتے ہوئے اس نے اتنی درشتگی سے کہا کہ وہ اپنی جگہ پتھر ہو کر رہ گیا۔

”ایم سوری۔“ اپنی تذلیل پر ہمیشہ کی طرح ضبط کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ سر جھکا گیا تھا۔ درمکنوں بنا اس کے جھکے سر پر نظر ڈالے تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کل کی رات جس کرب میں اس نے گزاری تھی اس کے بعد جانے کیوں اسے شہر زاد کے ساتھ ساتھ صیام پر بھی بے حد غصہ آ رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دیتی۔ میٹنگ ہال میں اندھیرا تھا۔

صرف پروجیکٹر کی روشنی پھیلی ہوئی تھی جس پر بار بار سین بدلتے جا رہے تھے۔ صیام بہترین مشورے دیتا ہوا گائیڈ کر رہا تھا مگر درمکنوں کی سماعتیں بھلا کہاں کچھ سن رہی تھیں۔ خالی خالی سی آنکھوں کے ساتھ دیوار پر آن ہونے والے پروجیکٹر کی اسکرین کو دیکھتی وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھی۔ تین گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد بالآخر یہ میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچی تو اس ہوش آیا کہ وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ صیام اپنی ضروری فائلز سمیٹ رہا تھا۔ وہ اچلتی سی ایک نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد اپنے چند جاننے والے لوگوں سے دعا سلام کرتی میٹنگ ہال سے نکل آئی۔

گزرتے ہر لمحے کے ساتھ چہرے کی سرخی اور بخار کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ ہائی ہیل کا جوتا پہنے،

شانوں پر بکھری شال کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی جب اچانک اسے زور کا چکر آیا اور وہ بنا سنبھلے لڑکھڑا کر رہ گئی۔ صیام بروقت اپنے بازوؤں میں نہ تھا تو اس کا زمین بوس ہو جانا لازمی بات تھی۔ اس کا جسم جیسے دکھتا ہوا تندور بنا تھا۔ صیام اسے اپنے مضبوط بازوؤں کا سہارا دیے بمشکل گاڑی تک لایا تھا۔ اگلے پانچ منٹ کے بعد اس کی گاڑی اسلام آباد کی کشادہ سڑکوں پر فرمائے بھر رہی تھی۔

درمکنوں کو ہوش نہیں تھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ تو اس وقت چونکی جب گاڑی مطلوبہ ہوٹل کے سامنے رکنے کی بجائے ایک شاندار پرائیویٹ ہسپتال کے سامنے ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر موجود درمکنوں کی آنکھیں بے حد جھل بھر رہی تھیں۔ صیام نے کچھی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے مخاطب کیا۔ ”باہر آئیے پلیز۔“ درمکنوں نے اس کا استدعا پر بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہوئے گاڑی سے باہر قدم رکھا تو سامنے فائو اسٹار ہوٹل کی بجائے ایک شاندار اسپتال تھا۔ وہ چڑ گئی۔

”یہاں کیوں لائے ہیں آپ مجھے؟“

”ضرورت تھی اس لیے۔“

”مسٹر صیام آپ.....؟“ شہادت کی اگلی اٹھا کر شدید غصے میں وہ اس کی انسلٹ کرنا ہی چاہتی تھی جب صیام نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔

”میں جانتا ہوں میں اپنی حدود کراس کر رہا ہوں مجھے آپ کا ایک معمولی ملازم ہوتے ہوئے یہ قطعی زیب نہیں دیتا کہ میں آپ کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی کروں مگر ایم سوری مادام آپ کا ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ میں ایک انسان بھی ہوں اور اس ناطے سے میں اپنی باس کو کسی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا وہ بھی ایسی صورت حال میں جب یہاں میرے سوا کوئی بھی آپ کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے۔“ مضبوط لہجے میں کہتا ہوا وہ اسے لا جواب کر گیا تھا۔ درمکنوں سر جھٹک کر رہ گئی۔ اس کا بخار ایک سو تین سے تجاوز کر گیا تھا ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کے بعد میڈیسن لکھ دی۔ ساتھ ہی اسے سردی سے سخت احتیاط کی ہدایت بھی کر ڈالی تھی۔

صیام اپنی جیب سے ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں کی میمنٹ کرنے کے بعد جس وقت دوبارہ ہوٹل پہنچا رات کی گنہیر تاریکی نے گرد و نواح کی ہر چیز کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ درمکنوں کا وجود ابھی بھی بری طرح کپکپا رہا تھا۔ وہ اس کے ہمراہ گاڑی سے نکل کر اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اسی کے کمرے میں چلا آیا۔ روم ہیئر آن کرنے کے بعد اس نے درمکنوں پر کمبل پھیلا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ویز اس کے حکم پر گرم دودھ لے آیا صیام نے دیکھا اس کی کل رات والی دوا بھی بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر جوں کی تو دھری تھی۔ تبھی اس نے گولیاں ہتھیلی پر نکال کر دودھ کا گلاس تھا م لیا۔

”یہ دوا کھالیں پلیز۔“

”میں کھالوں گی آپ اپنے کمرے میں جائیں۔“ بے حد بھاری پلکوں کو بمشکل وا کرتے ہوئے اس

نے سختی سے کہا تھا جب وہ بولا۔

”چلا جاؤں گا بس آپ یہ دوا کھالیں، پلیز۔“

”مسٹر صیام آپ.....!“

”میں جانتا ہوں میں اپنی حدود کراس کر رہا ہوں یہ سب میری اوقات سے بہت بڑھ کر ہے مگر ابھی آپ کو ہر قیمت پر یہ دوا کھانی ہوگی۔“ ایک مرتبہ پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ سختی سے بولا تھا۔ درمکنوں کو مجبوراً اس کی بات ماننی پڑی۔ وہ اس وقت اس کے ساتھ بحث افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ صیام اس کے دوا لیتے ہی خاموشی سے اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔ مگر اس رات وہ پھر ایک پل کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ درمکنوں کے ملبوس کی خوشبو جو اس کے لباس میں جذب ہو گئی تھی رات بھر اسے بے کل کرتی رہی تھی۔



آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا شہر زاد حویلی سے نکلی تو بارش کے دور دور تک امکانات نہیں تھے، مگر حویلی سے کچھ ہی فاصلے پر اس کی گاڑی کا نائز پتچر ہو گیا تو مجبوراً اسے رکتا پڑا۔ کچھ ہی دوری کے فاصلے پر اسی کے گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی، گدھا گاڑی پر مدہوش بڑی شہر لے جاتی جا رہی تھی۔ ساتھ اس کی ماں اور دیگر رشتہ دار خواتین بھی تھیں۔ جہاں تک شہر زاد دیکھ سکی یہ زچگی کا معاملہ تھا۔ لڑکی کی حالت شاید بے حد نازک تھی تبھی اس کی ماں اور رشتہ دار خواتین رو رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے کٹ کر رہ گیا۔

گاؤں میں ضروریات زندگی کی بہت سی ضروری سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے آئے روز جانے کتنی ہی خواتین اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتی تھیں۔ عجیب بے بسی کی موت تھی۔ اگر اس کی گاڑی کا نائز پتچر نہ ہوتا تو وہ بنا انسانی درجہ بندی کی پروا کیے اس بدنصیب لڑکی کو اپنی قیمتی کار میں ڈال کر فوراً سے پیشتر شہر کے کسی اچھے ہسپتال میں لے جاتی، مگر انفسوس کہ اس وقت یہ اس کے بس میں نہیں تھا، تبھی وہ افسردہ نگاہوں سے مشکل میں گھرے اس غریب قافلے کو خود سے دور جاتے دیکھتی رہی تھی کہ جن کا کیس گاؤں کی ایک کم تجربہ کار عورت نے بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر اس غریب گھرانے کا کچی اینٹوں اور گارے سے بنا دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر صاف نظر آ رہا تھا۔ شہر زاد نے دیکھا وہاں اس گاؤں میں ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی اس کی ماں نے اے کئی سال پہلے کی بتائی ہوئی تھی۔ گاؤں کے آوارہ کتے بے فکری سے گاؤں کی کچی کشادہ گلیوں میں گھومتے پھر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اسی طرح آدھے ننگے گاؤں کے جوڑ میں بھینسوں کے ساتھ نہا رہے تھے جبکہ کچھ بچے میلے پکڑوں کی پروا کیے بغیر گلی میں ”گلی ڈنڈا“ کھیل رہے تھے۔ جگہ جگہ کوڑے اور گوبر کے ڈھیر بھی اسی طرح گندگی اور مچھروں کا مسکن بنے دکھائی دے رہے تھے۔ شہر زاد ابھی اپنے ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ اچانک ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ وہ بے ساختہ چونکی تھی اور پھر اوپر نیلے آسمان کو دیکھا تھا جہاں گد لے بادل بنا کسی گز گڑا ہٹ کے چپکے سے برسا شروع ہو گئے تھے۔ وہ پلٹی تھی اور پھر سے گاڑی کے پتچر ہوئے نائز کا جائزہ لینے لگی تھی۔ عین اسی اثنا میں بالکل نیو پجارو کے نائز اس کی گاڑی کے قریب پہنچ کر چر چرائے تھے۔ شہر زاد کی نگاہ بے ساختہ اٹھی تھی۔ نظر کے سامنے اس وقت پجارو میں ایک نہایت وجیہ شخص بیٹھا تھا جس میں شکاری ہندو تھا صے اشتاق سے اسے دیکھ رہا تھا۔

شہر زاد کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔



پجارو میں بیٹھے اس خبر سے شخص کو دیکھا جو خود بھی قدرے الجھی ہوئی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا اور تبھی اسے اپنی ماں کی بات یاد آئی۔ اس کی ماں نے کہا تھا

”کچھ کہانیاں راکھ کا ڈھیر بھی بن جائیں تب بھی ان میں دبی چنگاریاں کسی بھی پل کریدنے والوں کے ہاتھ جلا کر رکھ دیتی ہیں۔ پرانی حویلی کے مکین ابدی نیند سوچکے ہیں مگر انہیں ابدی نیند سلانے والوں کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی، ملک فیاض ابھی زندہ ہے ملک وقار کا منجھلا بیٹا اس کے بھی بیٹے ہیں کڑیل جوان، جو یہیں اسی گاؤں کی گلیوں میں صبح و شام دندناتے پھرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی جو میری کل کائنات ہے کبھی ملک فیاض یا اس کے بیٹوں کی نظر میں آئے، ہمارے پاس اب کھونے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے شہر۔“ کتنا خوف تھا اس کی ماں کے لہجے میں۔

کیا وہ ملک فیاض کا بیٹا تھا۔ ایسا کیا کہا تھا ملک وقار اور اس کے بیٹے ملک فیاض نے ماضی میں کہ جس نے اس کی ماں کے دل کو خوف سے بھر دیا تھا۔ آخر کیوں عمر عباس اور اس کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ وہ وہاں اس گاؤں میں رہے؟ کیا حویلی کے پچھواڑے میں بنی آخری آرام گاہوں کے ساتھ ملک فیاض اور اس کے باپ ملک وقار کا کوئی تعلق تھا؟ کتنے سوال تھے جو اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے تبھی پجارو میں بیٹھے شخص نے اس سے پوچھا تھا۔

”کیا ہوا گاڑی کو، کسی قسم کی مدد چاہیے تو بتائیں؟“

”نہیں شکریہ۔“ بغیر مسکرائے بنا کسی مروت کے اس نے کہا تھا تبھی پجارو میں بیٹھے اس خبر سے شخص نے گاڑی زن سے آگے بڑھائی تھی۔ شہر زاد کچی سڑک پر کھڑی کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی یہاں تک کہ گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے سیل پر مریرہ رحمان کی کال آ رہی تھی۔ شہر زاد نے نگاہیں گاڑی سے ہٹا کر سیل کی اسکرین پر جمادیں۔

”السلام علیکم پھوپھو کیا حال ہیں؟“

”علیکم السلام! میں ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟“ اس کے کال اینڈ کرنے پر مریرہ نے پوچھا، جب وہ

بولی۔

”میں بھی آپ کی دعاؤں سے فٹ فاٹ ہوں الحمد للہ، البتہ میری گاڑی بیمار ہو گئی ہے وہ بھی گاؤں کی سڑک کے عین وسط میں اور میں آفس سے لیٹ ہو رہی ہوں۔“

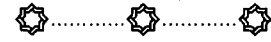
”اوہ..... تم کہو تو شہر سے کسی کو بھیج دوں گاڑی بھی دیکھ لے گا اور تمہیں بھی پک کر لے گا۔“

”نہیں فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میرے خیال میں نائز میں کوئی مسئلہ ہے میں دیکھ لوں

گی آپ پریشان نہ ہوں۔“

”چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔“

وہ سب سوال جو میری سمجھ سے باہر ہیں
میں جاگ جاگ کے ان کے جواب سوچتی ہوں
پلٹ کر دیکھتی ہوں جب راہ وفا کی طرف
تو عمر بھر کے دکھوں کا حساب سوچتی ہوں



کوئی نئی چوٹ پھر سے کھاؤ اداس لوگو
کہا تھا کسی نے کہ مسکراؤ اداس لوگو
گزر رہی ہیں گلی سے پھر ماتی ہوائیں
کواڑ کھولو، دیے بجھاؤ اداس لوگو
جورات مقتل میں پال کھولے اتر رہی تھی
وہ رات کیسی رہی سناؤ اداس لوگو
کہاں تلک بام و در چراغاں کیے رکھو گے
پھچھڑنے والوں کو بھول جاؤ اداس لوگو
اجاڑ جنگل، ڈری فضا، ہانپتی ہوائیں
یہیں کہیں بستیاں بساؤ اداس لوگو
یہ کس نے سہی ہوئی فضا میں ہمیں پکارا
یہ کس سے آواز دی کہ آؤ اداس لوگو
یہ جاں گوانے کی رت کہیں رائیگاں نہ جائے
سر سناں کوئی سر سجاؤ اداس لوگو
اسی کی باتوں سے ہی طبیعت سنبھل سکے گی
کہیں سے محسن کو ڈھونڈ لاؤ اداس لوگو

بارش گزرتے ہر پل کے ساتھ تیز ہو رہی تھی۔ شہر زاد نے دور جاتی گدھا گاڑی سے نظر ہٹا کر سامنے

”وری سے بات ہوئی آپ کی؟“

”نہیں اس کا سیل مسلسل آف مل رہا ہے اسی لیے تو تمہیں کال کی ہے تمہارا رابطہ ہوا اس سے؟“

”جی صبح بات ہوئی تھی بہت بخار تھا اسے۔“

”ہوں، شاید اسی لیے سوری ہوگی صیام بھی فون نہیں اٹھا رہا۔“ صیام کے ذکر پر اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ مریرہ کو بھی کال ڈراپ کرتے کرتے یاد آ گیا۔

”شہر بانو بھابی بتا رہی تھیں کہ تم صیام کو پسند کرتی ہو، کیا ایسا ہی ہے؟“

”جی پھوپھو۔“

”ہوں..... وری کو بتایا تم نے۔“

”جی..... وہ سب جانتی ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے میں ایک دو روز میں پاکستان کا چکر لگا رہی ہوں پھر صیام کے گھر والوں سے خود مل کر تفصیل سے بات کروں گی ویسے اچھا لڑکا ہے صیام، تم خوش رہی گی اس کے ساتھ۔“

”جی پھوپھو۔“

”اپنی ماما کو میرا سلام کہنا، اب فون رکھتی ہوں۔“

”جی ٹھیک ہے اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ کال کٹ چکی تھی۔ شہر زاد نے موبائل جیب کی پاکٹ میں ڈالا اور پھر سے گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ صیام شہر میں نہیں تھا تو اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ آفس جانے کا بھی قطعی موڈ نہیں تھا مگر پھر بھی اسے شہر جانا تھا۔ صیام کے گھر والوں سے ملنا تھا۔ رات شہر بانو نے اس کے سامنے ہی مریرہ سے بات کی تھی جواب میں مریرہ نے اسے صیام سے متعلق اچھا خاصا مطمئن کر دیا تھا۔

گیند اب مریرہ رحمان کے کورٹ میں تھی جب تک وہ صیام کے گھر والوں سے مل کر کوئی بات نہ کر لیتی شہر بانو کو خاموش رہنا تھا۔ گاڑی کے ٹائر پر تفصیلی نظر ڈالنے کے بعد اس نے حویلی کال کر کے شہر بانو کو گاڑی کے اچانک خراب ہونے کی اطلاع دی پھر درکنوں کو کال ملائی مگر اس کا نمبر رسپانس نہیں دے رہا تھا تبھی اس نے صیام کے نمبر پر کال کی۔ تین چار بار ٹرائی کرنے کے بعد اس نے اس کی کال پک کی تھی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“ صیام کی آواز نیند کے غمار میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شہر زاد نے حیرانی سے موبائل کی اسکرین کو دیکھا پھر پوچھنے لگی۔

”آپ سوری تھے؟“

”جی۔“

”اوہ..... ایم سوری، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ ابھی تک سوری ہوں گے اصل میں وری کا نمبر بند مل رہا تھا تو مجھے پریشانی ہوئی کہ کہیں اس کی طبیعت زیادہ خراب نہ ہو، آپ ٹھیک ہیں؟“

”الحمد للہ۔“

”چلیں ٹھیک ہے آپ سو جائیں پھر بات ہوگی۔“

”او کے اللہ حافظ۔“ صیام کا بات کرنے کا موڈ نہیں تھا، شہر زاد کو مجبوراً کال کاٹنی پڑی۔

اس کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کی آواز سن لی تھی۔ آسمان پر بادل موسلا دھار برسنے کو بے تاب دکھائی دے رہے تھے۔ شہر زاد نے ایک نظر سر اٹھا کر اوپر بادلوں سے بھرے آسمان کو دیکھا پھر گاڑی لاک کر دی۔ دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے مگر آسمان پر چھائے کالے گہرے بادلوں کی وجہ سے وہاں شام کا گمان ہو رہا تھا۔ وہ ابھی حویلی واپس جانے کے لیے چند قدم ہی اٹھا پائی تھی کہ ایک طرف سے گاؤں کے شریر بچوں کو ایک بڑھیا کے پیچھے بھاگ کر اسے تنگ کرتے دیکھا تو رک گئی۔ بڑھیا اپنی جان بچاتی جیسے اس کے قریب آئی اس نے بچوں کو ڈانٹ کر دور بھگا دیا۔

جھریوں سے اٹے چہرے والی بڑھیا کے پھٹے پرانے کپڑوں میں مہینوں کی گرد جمع تھی مگر شہر زاد نے پھر بھی اس سے گھن محسوس نہیں کی۔ وہ اس بڑھیا کو اپنے ساتھ حویلی لے آئی تھی۔



ستاروں سے کہو اب رات بھر

ہم ان سے باتیں کر نہیں سکتے

کہ ہم اب تھک گئے جاناں

ہمیں جی بھر کے سونا ہے

کسی کا راستہ تنکے کا یا را بھی نہیں ہم کو

مسافر آ گیا تو ٹھیک لیکن..... نہیں آتا تو نہ آئے

ان آنکھوں میں ذرا بھی روشنی باقی نہیں شاید

وگرنہ تیرگی ہم کو یوں گھیرے میں نہیں لیتی

مگر یہ سب ازل سے لکھ دیا تھا لکھنے والے نے

ستاروں سے کہو بہتر ہے ہم کو بھول ہی جائیں

ہمیں آرام کرنا ہے

ضروری کام کرنا ہے

حویلی کے پچھواڑے میں بنی آخری آرام گاہ کے قریب بیٹھی وہ آنسوؤں بھری نگاہوں کے ساتھ

”وہاٹ“

”ہوں..... اس عورت نے بھری پنچائیت میں ملک وقار اور اس کے بیٹے کی درندگی کے خلاف گواہی دی تھی نتیجتاً ملک وقار اور اس کے بیٹوں نے اس کے جوان بیٹے کے بعد جوان اکلوتی بیٹی کو بھی نہایت درندگی کے ساتھ موت سے ہمکنار کر کے اس کا ذہنی توازن خراب کر دیا، پچھلے پندرہ سالوں میں اس گاؤں کے کسی فرد نے مائی جیراں کو یہاں اس گاؤں میں نہیں دیکھا۔“ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ اسے بتا رہی تھی۔ شہزاد کو لگا جیسے کسی نے اس کے وجود سے سارا الہو نچوڑ لیا ہو۔

کیا انسانیت اتنی بے رحم ہو سکتی تھی۔ کیا اشرف المخلوقات کہلانے والی قوم اس درجہ حیوانیت کا مظاہرہ کر سکتی تھی، شہزادو دھیمے لہجے میں ماضی کے ایک راز سے پردہ اٹھاتی اسے مائی جیراں کی کہانی سنارہی تھیں اور وہ سن ہوئے اعصاب کے ساتھ سب سنتی جا رہی تھی۔



بارش شروع ہو چکی تھی۔ متوازن قدم اٹھاتا وہ ڈیرے سے حویلی پہنچا تو ملک فیاض پشت پر دونوں ہاتھ باندھے وسیع و عریض لان میں ادھر سے ادھر ٹہلنے ہوئے خاصی بے قراری کے ساتھ اسی کا انتظار کر رہے تھے۔

”السلام علیکم۔“ قریب پہنچتے ہی اس نے با آواز بلند کہا تھا۔ ملک فیاض اس کی آواز پر فوراً پلٹے۔

”وعلیکم السلام برخوردار! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”خیریت؟“

”خیریت ہی ہے میرب کو ہاسٹل سے حویلی لانا ہے۔ ابھی فون آیا تھا اس کا ساتھ والے گاؤں کے نمبردار کی بیٹی کی شادی ہے اور میرب نے اس شادی میں شرکت کرنی ہے۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں جو ہوئیں۔“

”جی ٹھیک ہے، کب تک جانا ہے۔“ وہ ملک اعجاز کا بیٹا تھا بھلا ملک فیاض کو انکار کیسے کر سکتا تھا۔ وہ تو سولی پر ہوتا تب بھی اسے ملک فیاض کے ہر حکم کی تعمیل کرنی تھی مقروض جو تھا ان کا تبھی تھکن سے چور ہونے کے باوجود اس نے پوچھا تھا جب وہ بولے۔

”ابھی نکل جاؤ تو بہتر ہے، موسم کا کوئی اعتبار نہیں، بارش تیز ہو گئی تو واپسی میں مشکل ہو جائے گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ ہمیشہ کی طرح وہ انہیں یہ نہیں بتا سکا تھا کہ وہ بے حد تھکا ہوا ہے۔ ابھی شہر سے ہو کر آیا ہے اتنی ہمت اور جرأت ہی نہیں تھی اس میں۔

ملک فیاض کی ضروری کال آ گئی تھی لہذا وہ حویلی کے لان سے اندر وسیع ہال میں چلا آیا جہاں عائشہ بیگم جائے نماز پر بیٹھی اس کی زندگی اور صحت کے لیے دعائیں کر رہی تھیں عبدالہادی نے وہیں قالین پر لیٹنے ہوئے اپنا سران کی گود میں رکھ دیا۔ عائشہ بیگم نے دعا کے لیے پھیلے ہاتھ سمیٹ کر اس کی کشادہ پیشانی چوم لی۔

دونوں ہاتھ پھیلائے پرانی حویلی کے مکینوں کی مغفرت کے لیے دعا کر رہی تھیں جب شہزاد نے اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اسے آواز دی۔

”مما جانی۔“ شہزادو نے اس کی پکار پر جلدی جلدی آنسو صاف کرتے ہوئے دعا میں اٹھے ہاتھ سمیٹ لیے۔

حویلی کے پچھواڑے سے وہ حویلی کے لان میں آئی تو شہزاد کے قریب کھڑی بڑھیا کو دیکھ کر چونک گئی۔

”تم آفس نہیں گئیں شہر؟“ بڑھیا سے نظریں ہٹا کر اس نے شہزاد کی طرف نگاہ کی تھی جب وہ بولی۔

”کیسے جاتی ممما، گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ میں نے آفس میں فون کر کے کسی اچھے مکینک کو بھیجنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ صیام اسلام آباد نہ گیا ہوتا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا، وہ بہت اچھا مکینک ہے۔“

”ہوں، یہ کہاں ملیں تمہیں؟“ اب وہ بڑھیا کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، شہزاد نے بڑھیا کو کین کی چیئر پر بٹھا دیا۔

”کیا آپ انہیں جانتی ہیں؟“ بجائے اپنی ماں کے سوال کا جواب دینے کے اس نے الٹا ان سے سوال کر دیا۔ شہزادو نے نظریں چرائیں۔

”ہاں۔“

”واؤ..... پھر تو آپ جانتی ہوں گی کہ یہ کون ہیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”مجھے فرق پڑتا ہے ممما، پلیز بتائیں نا یہ کون ہیں؟“ وہ بے تاب تھی شہزادو بے حد تھکے تھکے سے انداز میں وہیں لان میں بیٹھ گئی۔

”ایک شرط پر بتاؤں گی۔“

”کیسی شرط؟“

”شرط یہ کہ تم اسی ہفتے گاؤں چھوڑ کر مریرہ کے گھر شفٹ ہو جاؤ گی اور تبھی میں سکون سے واپس انگلینڈ جاسکوں گی۔“

”یہ کیسی شرط ہے ممما، کیا اس بڑھیا کا تعلق حویلی کے مکینوں کی زندگیوں اور موت سے ہے۔“

”ہوں۔“ شہزادو کے ”ہوں“ نے شہزاد کے دل کو جیسے منھی میں جکڑ لیا تھا۔

”ٹھیک ہے مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔“ شہزادو جانتی تھیں کہ اس کا جواب یہی ہو گا تبھی اس نے

یہ شرط رکھی تھی۔ شہزاد نے نظریں اس کے چہرے کی یاسیت پر گاڑھ دیں۔

”یہ مائی جیراں ہے، تمہارے بابا کے قتل کی چشم دید گواہ۔“

میں نے، کتنے خواب تھے جو ہم دونوں نے مل کر دیکھے تھے مگر ہمیں ان خوابوں کی تعبیر دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ نئی حویلی اور پرانی حوالی کی وحشیانہ جنگ نے میرے سارے خواب بکھیر کر رکھ دیے۔ بنا کسی گناہ کسی قصور کے تمہارے بابا کو اس دشمنی کی بھیٹ چڑھنا پڑا۔ میں نہیں چاہتی جس نفرت اور بدلے کی آگ نے مجھ سے میرا محبوب شوہر چھین لیا اس آگ میں میرا بیٹا بھی کود پڑے۔ عمر عباس ابھی زندہ ہے عبدالہادی اس کی نفرت اور دشمنی کی آگ میں ابھی بھی بدلے کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں۔ میں نہیں چاہتی تمہاری کوئی بھی غلطی اسے پھر سے ماضی کی طرف دھکیل دے۔ میں تھک گئی ہوں عبدالہادی تمہاری ماں تھک گئی ہے۔“ عائشہ بیگم کے ہیکے ہوئے لہجے میں شکستگی تھی۔ عبدالہادی نے ایک مرتبہ پھر ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے۔

”ایسا کچھ نہیں ہو گا امی، آپ بے فکر رہیں۔“

”خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے عبدالہادی خدا تمہارا نگہبان ہو۔“ عبدالہادی کی تسلی پر انہوں نے اس کی کشادہ پیشانی چومی تھی۔



پرانی حویلی پر ٹوٹنے والی قیامت کی خبر مریرہ رحمان کو اس وقت ہوئی تھی جب زاویار آٹھ ماہ کا تھا۔ دیار غیر میں کرنل شیرعلی کی بہو سکندر علوی کی بیوی اور ننھی عائشہ علوی کی ماں اپنی آخری سانسیں پوری کر چکی تھی جبکہ اس کی جدائی کے غم میں سلگتے سکندر علوی کو ڈاکٹرز نے کثرت شراب نوشی کے سبب گردے فیل ہو جانے پر لاعلاج قرار دے گیا تھا۔ کرنل شیرعلی اس کی وفات تک وہیں اس کے پاس انگلینڈ میں رکے رہے تھے کیونکہ شدید بیماری کے سبب وہ سفر کرنے سے معذور تھا۔ کرنل شیرعلی اپنے اکلوتے بیٹے کی وفات کے بعد خود اپنے ہاتھوں سے اس کی تدفین کر کے ننھی سی بچی کے ساتھ تقریباً تین سال کے بعد وطن واپس لوٹے تھے۔ مریرہ ان کے پاکستان واپس لوٹنے ہی دوبارہ اسی گھر میں شفٹ ہو گئی۔ حیرانی کی بات یہ رہی کہ اس بار صمد حسن نے بھی کوئی غیر معمولی احتجاج نہیں کیا۔ پاکستان واپسی کے بعد کرنل صاحب اظہار ملک صاحب سے ملنے کی نیت سے گاؤں گئے تھے جب حویلی پر ٹوٹنے والی قیامت نے گویا ان کے اعصاب مفلوج کر ڈالے۔ گاؤں سے گھر واپسی کے بعد مریرہ نے انہیں بے حد شکستہ اور ملول دیکھا تھا تبھی وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

”کیا بات ہے بڑے ابو، سب خیر تو ہے؟“ کرنل شیرعلی نے اس کے سوال پر سرسری سی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر آہستہ سے سرفی میں ہلا کر آگے بڑھ گئے تھے۔ مریرہ آٹھ ماہ کے زاویار کو ہاتھوں میں دبوے فوراً ان کے پیچھے لپکی تھی۔

”کیا ہوا ہے اتنے رنجیدہ تو آپ اپنی بہو اور اکلوتے بیٹے کی وفات پر بھی نہیں تھے۔“ وہ متوحش تھی۔ کرنل صاحب کو اپنا دکھ بیان کرنا پڑا۔

”پرانی حویلی اجڑ گئی ہے مریرہ۔ خاندانی دشمنی نے سوائے عمر عباس کے حویلی کے کسی کین کو زندہ نہیں

”ماں یاد آگئی میرے بیٹے کو؟“ وہ گلہ کر رہی تھیں۔ عبدالہادی نے محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے۔

”ماں کو بھولا کب ہوں امی جان، آپ جانتی ہیں آپ میری زندگی کا واحد مقصد ہیں۔“

”ہوں، بالکل ویسے ہی جیسے میرا بیٹا میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ چلو ہاتھ منہ دھولو، میں کھانا نکالتی ہوں۔“ وہ اب پیار سے اس کے بال سہلا رہی تھیں تبھی وہ بولا۔

”نہیں امی ابھی وقت نہیں ہے میرے کو شہر سے حویلی لانا ہے۔“

”لیکن ابھی تو تم شہر سے آئے ہو۔“

”تو کیا ہوا، میں سولی پر بھی ہوتا تب بھی بڑے ابو کا حکم تو پورا کرنا ہی ہے، ایک مزے کی بات بتاؤں

آپ کو۔“

”ہوں۔“

”آج شہر سے گاؤں میں داخل ہوتے وقت میں نے قمر عباس کی بیٹی کو دیکھا پرانی حویلی کی اکلوتی جانشین کو۔“ اس نے کہا اور عائشہ بیگم کے چہرے کا رنگ جیسے فق ہو گیا۔

”پھر.....؟“

”پھر کچھ نہیں، بارش ہو رہی تھی میں رکے بغیر چلا آیا۔“

”اچھا کیا میری دعا ہے دوبارہ کبھی تمہارا اس سے سامنا نہ ہو۔“

”نہیں امی، میری دعا ہے وہ بار بار میرے راستے میں آئے اور پھر میں اس سے اپنے سارے حساب کلیئر کر دوں۔ وہ آگ جو سالوں سے میرے سینے میں دہک رہی تھی کچھ تو کم ہو۔“ عبدالہادی کی پُرسوج نگاہوں میں کچھ ایسا تھا عائشہ بیگم دل کر رہ گئی تھیں۔

”نہیں..... ایسا کبھی سوچنا بھی مت عبدالہادی نہیں تو میں کبھی تمہیں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں تاریخ کے پنوں کو دوبارہ مت کھولنا مجھ میں اب کچھ بھی کھونے کی ہمت نہیں ہے۔“ وہ اب باقاعدہ رونے لگی تھیں۔ عبدالہادی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

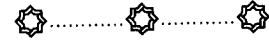
”ایسا مت کریں امی آپ جانتی ہیں میں آپ کو تکلیف نہیں دے سکتا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے اندر بہت گھٹن ہے اگر یہ باہر نہ نکلی تو میں مر جاؤں گا۔“

”میں جانتی ہوں مگر میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتی۔ تم نہیں جانتے عبدالہادی میں نے نئی حویلی اور پرانی حویلی کی اس جنگ میں کیا کھویا ہے۔“ عائشہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔

”میری محبت تھے تمہارے بابا، ساری دنیا سے اپنے گھر والوں سے لڑ کر ان سے شادی کی تھی

چھوڑا۔“ جتنا درد اس لمحے کرنل صاحب کی آواز میں تھا اس سے کہیں زیادہ اذیت مریرہ کو ہوئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔“ وہ بے یقین تھی کرنل صاحب نے چپ سادہ لی۔ اب وہ بھلا اس سے کی اکتے کہ تمہاری بے خبری نے لوٹ لیا جان سے پیارے عزیز دوست کا آخری دیدار بھی نہ کرنے دیا؟ پرانی حویلی کے اجڑنے کے دکھ نے مریرہ رحمان کے اندر ایک عجیب سی چپ بکھیر دی تھی۔ حویلی پر اتنی بڑی قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور اسے خبر ہی نہیں تھی۔ کیا سوچتا ہوگا عمر عباس اس کے بارے میں۔ اس نے تنہا کیسے اپنے سب یاروں کو کندھے پر اٹھا اٹھا کر مٹی کے سپرد کیا ہوگا؟ وہ کیسے اسے اپنی صفائی دے سکے گی۔ کیسے بتائے گی کہ اس کے شوہر نے اس کا نمبر ہی تبدیل کر کر عمر عباس سے اس کے رابطے کی واحد کڑی ہی توڑ ڈالی تھی۔ وہ زندگی میں عمر عباس کا سامنا کیسے کرے گی؟ سامنا ہو بھی گیا تو اس سے نظریں کیسے ملائے گی؟ یہ دو سوال تھے جس نے اس کا دماغ چکرا ڈالا تھا۔ اگلے ایک ہفتے تک کرنل صاحب بخار میں مبتلا رہے تھے لہذا مریرہ رحمان کو اپنے آٹھ ماہ کے بچے کے ساتھ ساتھ کرنل صاحب اور ان کی تین سالہ پوتی عائکہ علوی کو بھی سنبھالنا پڑا تھا۔ صمد حسن نے اس دوران صرف دو بار کرنل صاحب کے گھر کا چکر لگایا وہ بھی بے حد مختصر وقت کے لیے۔ مریرہ احساس جرم میں مبتلا نہ ہوتی تو ضرور اس کی یہ تبدیلی نوٹ کرتی، صمد حسن سے اپنا دکھ شیر کر کے دل ہلکا کرنے کی خواہش، خواہش ہی رہ گئی تھی۔ تبھی اس روز وہ اپنے گھر چلی آئی تھی۔



بہت دنوں کے بعد اس روز قدرے ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تھی۔ مریرہ، عائکہ اور زویا کو ساتھ لیے اپنے گھر آ گئی۔ کرنل صاحب کو شہر سے باہر کچھ کام تھا لہذا وہ ایک ہفتے کے لیے شہر سے باہر چلے گئے تھے۔ صمد بھی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھا۔ مریرہ چونکہ اس سے ناراض تھی لہذا اس نے اسے اپنی گھر واپسی کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو سارا کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ بے حد نفیس لباس میں ملبوس ہلکا ہلکا سا میک اپ کیے اس کی شخصیت بے حد نکھری ہوئی لگ رہی تھی جبکہ اس کی بیٹی کے تن پر بھی بے حد قیمتی لباس تھا اور وہ جن کھلونوں سے کھیل رہی تھی وہ بھی اچھے خاصے قیمتی تھے۔ وہ بے حد حیران ہوئی کہاں تو اس کے پاس اپنی بیٹی کی دوا کے لیے بھی پیسے نہیں تھے اور کہاں صرف پندرہ ہی دنوں کے بعد وہ گھر کی نوکرائی سے ایک سلجھی ہوئی نفیس خاتون دکھائی دینے لگی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر سارا منیر نے مسکراتے ہوئے جیسے ہی پلٹ کر دیکھا اس کے چہرے کا رنگ فق ہوا تھا مگر اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔

”السلام علیکم! آپ کب آئیں؟“

”وعلیکم السلام! ابھی آئی ہوں۔ تم کہیں جا رہی ہو کیا؟“ اس کی نظر اس کے قیمتی لباس اور میک اپ سے دکتے چہرے پر تھی۔ سارا منیر کو بے ساختہ نظر چرائی پڑی۔ وہ یوں اچانک بنا کسی اطلاع کے آ جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تبھی اسے اپنا اور صمد کا بھرم رکھنا پڑا تھا۔

”نہیں۔“

”نہیں تو پھر یہ تیاری۔“

”یہ..... یہ تیاری اصل میں میری ایک دوست کے لیے ہے جسے میں نے دعوت پر مدعو کیا ہے۔ مجھے بہت اچھی جاب مل گئی ہے اسی خوشی میں۔“

”اوہ، مبارک ہو بہت بہت۔“

”خیر مبارک بہت شکریہ، آپ نے آنے سے پہلے اطلاع ہی نہیں دی۔“ مریرہ کی تسلی کرا کر اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی جب وہ بولی۔

”میں نے ضروری نہیں سمجھا صمد کب سے شہر سے باہر ہیں۔“

”پتا نہیں میں بہت کم اپنے کمرے سے باہر نکلتی ہوں۔ میرا سامنا بھی نہیں ہوتا صمد صاحب سے۔“

”ہوں، چلو خیر ہے۔“ مطمئن سے انداز میں سر ہلا کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی جب سارا

بیگم نے فوراً سے پیشتر موبائل نکال کر صمد کو کال کھڑکا دی۔ وہ فارغ ہی بیٹھا تھا لہذا پہلی بیل پر کال پک کر لی۔

”جی کیسے بیگم اب کیا حکم ہے۔“

”مریرہ گھر واپس آ گئی ہیں۔“ صمد کے سوال کے جواب میں اس نے انہیں اطلاع دی تھی۔ اگلے

ہی لمحے وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”چلیں ٹھیک ہے پھر آپ کھانا وغیرہ کھالینا میں لیٹ گھر آؤں گا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ سارا منیر نے آہستہ سے کہا اور کال ڈسکنیکٹ ہو گئی۔ صمد حسن اس رات واقعی

بہت تاخیر سے گھر واپس آیا تھا۔ مریرہ اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی مگر سارا منیر جاگ رہی تھی۔ صمد کے

لیے اسی نے کھانا گرم کر کے پیش کیا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ صاف کر کے جب وہ اٹھنے لگا تو اس نے

حسب معمول سارا منیر کا ہاتھ تمام کر ہلکے سے چوما تھا۔

”شکریہ، اتنا اچھا کھانا کھلانے کے لیے۔ مریرہ نے کھانا کھایا؟“

”نہیں وہ تھکی ہوئی تھیں سو گئیں۔ میں نے دو مرتبہ جا کر پوچھا بھی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔“

”ہوں، آپ نے کھالیا۔“

”جی..... آپ تو جانتے ہیں مجھ سے بھوک برداشت نہیں ہوتی۔“

”ہوں، جانتا ہوں۔ مریرہ کے کمرے سے اپنی ساری چیزیں اٹھالی تھیں کہ نہیں۔“

”نہیں موقع ہی نہیں ملا وہ اچانک آ گئی تھیں۔ صبح صفائی کے دوران اٹھالوں گی۔“

”ٹھیک ہے اب آپ سو جائیں بہت رات ہو گئی ہے میں تھوڑی واک کروں گا۔“

لا تعلقی پر کس قدر ہرٹ تھی اور جب اسے احساس نہیں تھا تو بھلا وہ کیسے اسے یہ احساس دلا سکتی تھی کہ اسے کتنا فرق پڑا ہے صمید کے نظر انداز کرنے سے۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ ان دونوں کے رشتے میں کہیں کچھ غلط ہونا شروع ہو گیا تھا۔

مگر کیا.....؟

وہ جتنا سوچتی اتنا الجھتی جاتی۔ وہ شروع سے جیسی تھی اب بھی ویسی ہی تھی تو پھر صمید حسن کیوں بار بار بدل رہا تھا، مریرہ رحمان کے لیے اس کی محبت اور توجہ پہلے جیسی کیوں نہیں رہی تھی۔ کیا وہ اپنے لیے مریرہ رحمان کی جذباتیت اور حساسیت سے واقف نہیں تھا۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی ذرا سی نظر اندازی اور لا تعلقی اسے کیسے اندر سے توڑ کر رکھ دیتی تھی؟ جب وہ سب کچھ جانتا تھا تو پھر اسے تکلیف کیوں دے رہا تھا؟ اسی سوچ کے زیر اثر اس نے صمید حسن کا ہاتھ جھٹکا تھا جب وہ بولا۔

”کیا ہوا ناراض ہو؟“

”جی نہیں۔“

”تو پھر ایسے بی ہو کیوں کر رہی ہو؟“

”پتا نہیں بہتر ہوگا اگر آپ اپنے کام سے کام رکھیں پلیز۔“ جتنی حُفلی واجبیت وہ اپنے لہجے میں سمو سکتی تھی اس نے سموئی تھی۔ صمید گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

”ٹھیک ہے مگر میرا قصور؟“

”کوئی قصور نہیں آپ کا۔“ تنخی سے کہتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے ریشمی بال سیٹتی بیڈ سے اتر گئی تھی۔ اسی اثناء میں اس کا سیل بج اٹھا۔ حمزہ حسین کی کال تھی۔ مریرہ نے کال اوکے کرنے میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔

”کیسی ہو میرو؟“

”ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ امی کی طرف آئی ہوں، آ جاؤ ملنے پلیز۔“

”ٹھیک ہے فریش ہو کر آتی ہوں۔“ اسے خوشی ہوئی تھی یہ جان کر کہ حمزہ اس کے پاس آئی ہوئی تھی۔ سنڈے کی چھٹی کے باعث صمید گھر پر ہی تھا۔ وہ فریش ہو کر ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد حمزہ کی طرف چلی گئی۔

عائلہ سوری تھی جبکہ زاویار کو وہ ساتھ لے گئی۔ صمید اس کے گھر سے نکلنے کے بعد ہاتھ لے کر ناشتے کی میز پر آیا تھا۔ سارا نے اسے دیکھتے ہی فوراً ناشتا لگا دیا۔

”السلام علیکم، صبح بخیر!“

”مجھے نیند نہیں آرہی آپ واک کریں میں ساتھ چلتی ہوں۔“

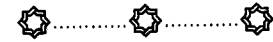
”نہیں مریرہ کی آنکھ کھل سکتی ہے۔ اب آپ کو تھوری احتیاط سے کام لینا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”گڈ گرل۔“ سارا منیر کے مایوسی سے سر ہلانے پر صمید حسن نے پیار سے اس کا گال تھپتھپایا پھر مریرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

مریرہ جاگ رہی تھی مگر صمید حسن کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے ہی پلکیں موند لیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اتنے دنوں کی دوری کے بعد صمید حسن کا ری ایکشن کیا ہوتا ہے ادھر صمید نے دروازہ لاک کرنے کے بعد ایک نظر سوئی ہوئی مریرہ رحمان پر ڈالی پھر اسے بنا ڈسٹرب کیے سوئے ہوئے زاویار اور عائکہ پر جھک گیا۔

دونوں کو یکساں پیار کرنے کے بعد اس نے پھر ایک نظر سوئی ہوئی مریرہ رحمان پر ڈالی اور پھر پلٹ کر باہر نکل گیا۔ مریرہ نے اس کے کمرے سے نکلتے ہی فوراً آنکھیں کھول دی تھیں۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اتنے دنوں کی دوری کے باوجود صمید اسے جگائے بغیر کمرے سے نکل گیا تھا جبکہ اس سے پہلے وہ اگر اس کے آفس سے آنے سے پہلے سو بھی جاتی تو وہ اسے زبردستی اٹھا کر بٹھا دیتا تھا۔ تب مریرہ کو اس کی یہ حرکت سخت ناپسند تھی مگر اب جبکہ وہ اس کی اس عادت کی بھی عادی ہو گئی تھی تو اس نے اپنی عادت بدل لی تھی۔ وہ عورت تھی جان بھی نہیں سکی کہ مرد جب اپنی حرکتیں اور عادتیں بدل لیتے ہیں تو اس کے پیچھے کہیں کوئی بہت گہری کہانی چھپی ہوتی ہے۔ صمید حسن جان ہی نہ سکا اور مریرہ رحمان رات بھر بنا سوئے بے آواز روتی رہی تھی۔



اگلی صبح مریرہ کی آنکھ کھلی تو صمید زاویار کو اپنے سینے پر لٹائے اس کے ساتھ کھیل رہا تھا جبکہ عائکہ اس کے پہلو میں دوسری طرف بے خبر سو رہی تھی۔ مریرہ نے چپ چاپ کروٹ بدل لی۔ اس کا دل عجیب سی آگ میں جل رہا تھا۔ صمید حسن کی بے نیازی کسی تلوار سے کم نہیں تھی اس کے لیے۔ تبھی اس نے کروٹ بدلی تھی جواب میں صمید نے ہاتھ بڑھا کر اسے انے قریب کھینچ لیا۔

”ابھی تک نیند پوری نہیں ہوئی تمہاری۔“ وہ نارمل لہجے میں پوچھتا سخت زہر لگ رہا تھا۔ تبھی اس نے رخ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں۔“

”میرا انتظار بھی نہیں کیا رات، گھر واپس آنے کی اطلاع بھی نہیں دی اتنی لا تعلقی۔“ الٹا چور کو توال کو ڈانٹ رہا تھا۔

مریرہ کا رہا سہا خون بھی جل کر خاک ہو گیا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی بے نیازی و

”وعلیکم السلام! تم نے کر لیا ناشتہ؟“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں تھی۔“

”کیوں، کیا مریرہ کے ساتھ کوئی بات ہوئی ہے؟“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تو پھر اس کا موڈ کیوں آف ہے؟ کہیں اسے کچھ پتا تو نہیں چل گیا؟“

”پتا نہیں، میری زیادہ بات نہیں ہوئی اس سے مگر میں چاہتی ہوں آپ اسے ہمارے رشتے کا بتادیں

تاکہ ہر وقت جو خوف کی تلوار سر پر لٹکتی رہتی ہے اس سے جان چھوٹ جائے۔“

”نہیں ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔“

”کیوں..... اتنا ڈرتے ہیں آپ اس سے؟“

”نہیں..... ڈرتا نہیں ہوں، بس میں اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔“

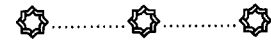
”یہ تکلیف تو کسی نہ کسی دن اسے برداشت کرنی ہے صمد پھر ابھی کیوں نہیں؟“

”ابھی وقت نہیں ہے، اب ناشتہ کر لو پلیز۔“

”آپ کر لیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ سنجیدگی سے کہتی وہ دوبارہ کچن میں چلی گئی تھی۔

صمد اللہ کی پکڑ سے خوفزدہ دونوں کے مساوی حقوق ادا کرنے کے چکر میں خوار گہری سانس بھر کر رہ

گیا۔



اس روز بہت دنوں کے بعد ہلکی ہلکی دھوپ نکلی تھی۔ مریرہ حمنہ حسین کی طرف آئی تو اسے لان میں

پودوں کے ساتھ مصروف پایا۔ مریرہ رحمان کی طرح حمنہ حسین کو بھی پھول پودوں سے بے حد لگاؤ تھا۔ اپنے گھر

کے لان میں اس نے تقریباً ہر قسم کے پھول پودے لگا رکھے تھے بھی فرصت کے لمحات میں وہ زیادہ تر انہی پھول

پودوں کے ساتھ مصروف پائی جاتی تھی۔ مریرہ زاویار کو نیچے گھاس پر چھوڑ کر خود کین کی چیئر پر بیٹھ گئی۔

”ارے تم آگئیں بندہ سلام دعا ہی کر لیتا ہے یار.....“ پانی کا پائپ پھینک کر حمنہ اس کے قریب آئی

پھر اس کا خراب موڈ دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”کیا ہوا..... کسی سے لڑ کر آ رہی ہو کیا؟“

”نہیں۔“

”موڈ کیوں آف کیا ہوا ہے؟“

”بس ویسے ہی، تم یہاں اچانک کیسے؟“

”رات امی کی طبیعت خاصی خراب ہو گئی تھی، بھائی نے فون پر بتایا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ امیر جنسی

لیو لکھ کر رات ہی چلی آئی۔“ اپنے مخصوص انداز میں وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی۔ مریرہ کو تشویش نے گھیر لیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آنٹی کی؟“

”اب بہتر ہی، تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے؟“

”اچھی گزر رہی ہے مگر میں بہت تکلیف میں ہوں حمنہ..... عمر عباس کی حویلی اجڑ گئی ہے۔ اس کے

سارے خونی رشتے خاندانی دشمنی کی بھیٹ چڑھ گئے۔ وہ بھری دنیا میں اکیلا ہو گیا حمنہ اور میری بد نصیبی دیکھو

میں اس کی اذیت کے ان لمحوں میں اس سے ہمدردی کے دو بول تک نہ کہہ سکی۔“

”اوہ، کیا تمہارا رابطہ نہیں ہے عمر عباس سے؟“

”نہیں.....“

”کیوں؟“

”صمد حسن کو پسند نہیں ہے، اسے لگتا ہے جیسے میرے اور عمر عباس کے درمیان ماضی میں کوئی افیئر رہا

ہے۔“

”کیا..... یہ کیا بکواس ہے؟“

”یہ حقیقت ہے، اس نے میرا سیل نمبر تبدیل کر دیا تھا، عمر کا نمبر میں نے کبھی دماغ میں محفوظ نہیں

کیا۔“

”اوہ..... میرے خیال سے صمد حسن کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، یہ حرکت کر کے اس نے تنگ نظری کا

ثبوت دیا ہے۔“

”وہ پہلے ایسا نہیں تھا حمنہ مگر اب پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے وہ بہت بدل گیا ہے۔“

”بدلنا تو تھا ہی، پرانی عورتوں کے چکر میں پڑنے والے مردوں کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔“

”نہیں، پرانی عورتوں والی بات نہیں ہے وہ کلیئر کر دی تھی صمد نے۔“

”کیا کلیئر کیا ہے اس نے؟“

”یہی کہ اس کا کسی لڑکی کے ساتھ کوئی چکر نہیں تھا، وہ لڑکی جسے تم نے ان کے ساتھ ہسپتال جاتے

ہوئے دیکھا، وہ ان کے بزنس پارٹنر منیر حسین صاحب کی اگلوٹی بیٹی تھی جو نامساعد حالات کی وجہ سے کچھ مسائل

کا شکار تھی۔ صمد نے مجھے وہ سارا معاملہ کلیئر بتا دیا وہ لڑکی ان کی زندگی میں کہیں بھی نہیں ہے۔“

”چلو شکر ہے، ہو سکتا ہے مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہو بہر حال تم اس پر توجہ دو۔ میاں بیوی کے درمیان

ایک بار فاصلوں کی دیوار کھڑی ہونی شروع ہو جائے تو پھر یہ فاصلے کبھی سمٹتے نہیں ہیں۔“

”ہوں، شاید میں ہی زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔“

”شاید ایسا ہی ہو، پلیز خوش رہا کرو۔ میری دعا ہے تمہاری زندگی میں وہ عذاب راتیں کبھی نہ آئیں

جنہوں نے میرا سکون برباد کر دیا۔“

”آمین۔“

”اور سناؤ کرنل انکل ٹھیک ہیں؟“

”ہوں ٹھیک ہیں مگر پرانی حویلی کی بربادی نے ان کے لبوں پر چپ کا قفل لگا دیا ہے۔“

”دکھ بھی ایسا ہے یار..... تم ابھی چند دن اور رہ لیتیں ان کے پاس۔“

”رہ تو لیتی مگر یہاں صمد کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں شاید اسی بات کی وجہ سے وہ خفگی میں مجھ سے کچھ

کچھ سا ہے پھر سارا بھی اکیلی نہیں رہ سکتی۔“

”سارا کون؟“ وہ اپنی ہی رو میں تفصیل بتا رہی تھی جب حمنہ نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ مریرہ کو اسے

سارا کی مختصر کہانی سنانی پڑی۔

”بہت دکھی عورت ہے سارا حسین..... بھری دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے بے چاری کا، ایک چھوٹی سی

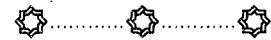
بٹی ہے پر ہیان، بہت پیاری ہے، صمد نے اسے میری محبت میں میری سہولت کے لیے گھر میں کام کاج کی

ذمہ داری سونپ دی ہے، اب تو جاب بھی مل گئی ہے اسے۔“

”ٹھیک ہے مگر پھر بھی احتیاط کرنا، یہ نیکیاں اکثر گلے پڑ جاتی ہیں۔“ وہ ایک تخلص والا مشورہ

دے رہی تھی۔ مریرہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے چند لمحوں کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔



اس رات کی صبح بہت اداس تھی۔ پوری وادی کی فضا پر عجیب سے سوگواریت کے بادل چھائے ہوئے

تھے۔ سدید پچھلے دو تین دن سے چیوا میں نہیں تھا تبھی اسے چیوا کے باسیوں پر ٹوٹنے والی اس رات کی قیامت کا

احوال پتا نہیں چل سکا تھا۔ طیب احمد کے گھر میں بھی عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ سدید چونکہ بے حد تھکا ہوا

تھا، تبھی کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔ کتنے دن ہو گئے تھے اس نے عائدہ علوی کی آواز نہیں سنی تھی۔ بے حد چاہتے

ہوئے بھی چند مجبوریوں کے پیش نظر وہ اس کو کال نہیں کر سکا تھا۔ کرنل صاحب نے خود بھی اس سے رابطہ کرنے

کی کوشش نہیں کی تھی تبھی وہ مطمئن تھا۔ چیوا میں اسے جو کام سونپا گیا تھا اس نے بخوبی سرانجام دے دیا تھا۔

”را“ کی تحویل میں قید اپنے ساتھی کا پتا بھی چلا لیا تھا جس نے ابھی تک کھال اتروانے کے باوجود زبان نہیں

کھولی تھی۔ اپنے ملکی راز سینے میں دفن رکھے تھے۔ سدید یہ بھی جان چکا تھا کہ اس ساتھی کی گرفتاری میں ان کے

اپنے ہی ملک کے ایک غدار کا ہاتھ تھا جس نے اپنی وطنیت اور ایمان کا روپوں میں سودا کر لیا تھا۔ ساری رپورٹ

مکمل تیار کرنے کے بعد اس نے اپنے اعلیٰ افسران کو بھجوا دی تھی۔ جو معلومات پچھلے ایک ماہ کی مسلسل کوشش کے

بعد اس نے چیوا میں ایک بھارتی فوجی سے اس کا ہمنوا بن کر بے حد ہوشیاری سے حاصل کی تھی وہ کوئی آسان

کام نہیں تھا تبھی وہ بے حد مسرور تھا۔ دن کے تقریباً ڈھائی تین بجے اس کی آنکھ کھلی تو وادی کی فضاؤں میں پھر

کالے بادلوں کا راج قائم دکھائی دے رہا تھا۔

سدید نے اپنا ضروری سامان بیگ میں ٹھونسا پھر بیگ کی زپ بند کر کے واش روم میں گھس گیا تقریباً

پندرہ منٹ کے بعد وہ کمرے سے باہر آیا تو فاطمہ چولہے کے قریب بیٹھی گیلی لکڑیوں سے آگ جلانے کی کوشش

کر رہی تھی۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے وہیں اس کے پاس چلا آیا۔



”رات کیا ہوا فاطمہ؟“ سدید علوی اگلے روز سہ پہر کے بعد چیوا آیا تھا جہاں بستی میں پھیلی عجیب سی

سوگواریت نے اسے شدید تھکن کے باوجود فاطمہ کے سامنے لا کھڑا کیا جو خود بکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

فاطمہ نے اس کے سوال پر بے ساختہ مڑ کر قدرے غصیلی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ عائنہ گھر پر نہیں تھی

جبکہ ماں جی کو تیز بخار نے اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا تبھی وہ بولی تھی۔

”کیسے مجاہد ہیں آپ جو آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کہ رات بستی میں کیا ہوا تھا؟“ اس کا غصہ اور شکایت

جائز تھی، سدید بے ساختہ نظریں چرا گیا۔

”میں پچھلے دو دن سے چیوا میں نہیں تھا۔“ ناچاہتے ہوئے بھی اسے وضاحت دینی پڑی تھی۔ فاطمہ

نے چولہے میں سلگتی لکڑیوں کو پھونکیں مار مار کر بالآخر آگ پکڑنے پر مجبور کر دیا۔

”چیوا میں نہیں تھے تو کہاں تھے آپ؟“ آنکھوں میں عجیب سی الجھن لیے وہ پوچھ رہی تھی۔ سدید کو

بے ساختہ نگاہیں چرانا پڑیں۔

”ایم سوری یہ ابھی میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔“

”میں جانتی ہوں آپ نہیں بتائیں گے کیونکہ آپ مجاہد ہیں ہی نہیں۔ آپ کچھ اور ہیں یونہی بھی بدل

کر کشمیر کی گلیوں میں، کشمیریوں کے جذبات سے کھیلنے کے لیے آ گئے ہیں آپ..... آپ کو کیا جو ہمارے گھر

جلس، شب بھر درندے ہمارے گھروں کی چوکھٹیں روند کر ہماری عصمتوں کی کلیاں کچلتے رہیں۔ آپ کو کیا جو

یہاں انسانیت منہ چھپائے سکتی پھرے، جب آپ سچے مجاہد ہی نہیں ہیں تو آپ کو کیا فرق پڑتا ہے چاہے کچھ

بھی ہوتا رہے۔“ فاطمہ کے لہجے میں بے حد تلخی تھی، سدید نے سر جھکا لیا۔

”صحیح سمجھی ہو تم، میں واقعی تمہارا مسیحا نہیں ہوں میری زندگی کے مقاصد کچھ اور ہیں مگر خدا جانتا ہے

جتنی میرے دل میں اس خطہ ارض کے باسیوں کی اذیت ناک زندگی کے لیے تکلیف ہے بہر حال میں آج

یہاں سے واپس جا رہا ہوں تمہاری مہمان نوازی کا بے حد شکریہ۔“ وہ مڑا تھا پھر کچھ یاد آنے پر بے ساختہ رک

گیا۔

”تمہارے لیے ایک بُری خبر ہے۔“

”کیا؟“ فاطمہ کا دل دھڑکا تھا۔ اس کا پہلا خیال اپنے چھوٹے بیمار بھائی طلحہ کی طرف گیا تھا جسے ابھی دو تین دن پہلے ہی بھارتی فوج تیز بخار کی حالت میں گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ سدید اب چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بتا رہا تھا۔

”طیب احمد کو بھارتی فوج نے گرفتار کر لیا ہے۔“ اس کا لہجہ قدرے ٹھہرا ہوا تھا۔ فاطمہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

”کب؟“

”تین دن پہلے جب بھارتی فوج طلحہ اور بستی کے دوسرے بے گناہ لوگوں کو گرفتار کر کے لے کر گئی تھی تب..... انہیں اطلاع مل گئی تھی اسی لیے ناساز طبیعت کے باوجود وہ یہاں گھر آ رہے تھے مگر راستے میں حالت اتنی خراب ہوئی کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے، اسی حالت میں سنا ہے کتے کی طرح بوسوگتھی فوج کے کارندوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔“ وہ رُخ پھیرے تفصیلات بتا رہا تھا۔ فاطمہ کی پتھر ہوئی آنکھوں سے جے ہوئے آنسو بہہ نکلے۔

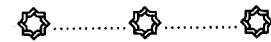
”یا اللہ خیر..... اب کیا ہوگا؟“

”تم پریشان مت ہو اللہ کرم کرے گا۔“ اسے تسلی دے کر وہ پلٹ گیا تھا۔ فاطمہ وہیں چولہے کے قریب بیٹھ گئی۔

سدید کو چیوا سے رخصتی کے احکامات مل گئے تھے لہذا نہ چاہتے ہوئے بھی بوجھل دل کے ساتھ اسے چیوا اور طیب احمد کے گھر سے رخصت ہونا پڑا تھا، تاہم رخصتی سے قبل وہ فاطمہ کے پاس رکا تھا۔

”دروازہ اچھی طرح بند کر لو فاطمہ..... میں نے طلحہ کا پتا چلا لیا ہے وہ ایک دو روز تک گھر آ جائے گا، ان شاء اللہ البتہ طیب بھائی کا بھی کچھ نہیں پتا کہ انہیں وہ لوگ کہاں لے گئے ہیں۔ آپ ایک مضبوط بہادر لڑکی ہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ طیب بھائی کی رہائی تک آپ اپنے گھر والوں کا خیال رکھیں گی۔ میں چیوا سے باہر جا رہا ہوں دعا کرنا اللہ مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔“

”آمین..... میں دعا کروں گی۔“ روٹی روٹی سی سرخ آنکھوں کے ساتھ صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ سدید ماں جی کے ہاتھ کو بوسہ دے کر شب کے اندھیرے میں طیب احمد کے گھر کی چوکھٹ پار کر آیا۔



چیوا میں سدید کا ورک مکمل ہو چکا تھا۔ اس کا ایک ساتھی ”را“ کی تحویل میں تھا اسے اپنے اسی ساتھی کو ”را“ کی تحویل سے چھکارا دلانا تھا۔ چیوا میں قیام کے دوران وہ یہ پتا لگانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کا مطلوبہ ساتھی کس شہر کی جیل میں تھا۔ اس بڑی کامیابی کے بعد کچھ دن پاکستان میں سیف ہاؤس میں رہ کر اسے

اپنے افسر کے اگلے حکم کا انتظار کرنا تھا۔ چیوا سے رخصتی کے بعد اس کا اگلا پڑاؤ آزاد کشمیر جمنٹ تھا۔ چیوا سے اس کے دو ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی پاکستان اپنے دیس واپس آئے تھے۔ کپواڑہ میں بھارتی فوج کو کشمیری مجاہدین نے ان کی وحشیانہ حرکتوں پر سبق سکھاتے ہوئے خوب آڑے ہاتھوں لے رکھا تھا۔ سدید اپنے ساتھیوں کے ساتھ بانڈی پورہ سے لولاب اور لولاب سے اجس بازی پورہ کے دشوار گزار پہاڑوں اور گھنے جنگلوں کو ہمت اور مردانگی سے عبور کرتا کپواڑہ پہنچ گیا تھا۔ سردی ابھی تک اپنے جوبن پر تھی۔ برف کی سفید شال نے بلند پہاڑوں کی چوٹیوں کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ چند روز قبل ہونے والی بھارتی فوج کی شدید فائرنگ کی وجہ سے شاہراہ نیلم مکمل طور پر بند کر دی گئی تھی لہذا واپسی کے سفر میں سدید کو یہ راستے بھی پیدل عبور کرنے پڑے تھے۔ اربل چلمہانہ سے ہوتا ہوا وہ اپنے دونوں ساتھی افسران کے ساتھ ڈوماری کی بلند و بالا چوٹیوں سے دشمن کے غرور کو پاؤں تلے روندتے ہوئے بارڈر کراس کر رہا تھا۔ اس وقت اس کے ذہن میں اپنی کامیابی کی خوشی کے ساتھ ساتھ طیب احمد کے گھرانے کو درپیش مشکلات اور کشمیر کے چپے چپے میں سسکیاں لیتی انسانیت کا درد کلبلا رہا تھا۔

وہ دعا کر رہا تھا کہ سالوں سے ظلم اور جبر کی چکی میں پستے، سادہ لوح معصوم کشمیری جلد آزادی جیسی نعمت کو پا کر پھر سے اپنے وطن کی خوبصورت وادیوں میں خوشنما پرندوں کی طرح خوشی کے گیت گائیں۔ کوئی فرعون انہیں جبر اور طاقت کے پنچے میں دبوچ کر شب و روز خون کے آنسو بہانے پر مجبور نہ کرے۔ مسلسل سفر کی وجہ سے سدید کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ بھوک پیاس کی تکلیف کے علاوہ جسمانی تھکن نے اسے بری طرح نڈھال کر چھوڑا تھا۔ برف سے ڈھکے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر آگے کو بڑھتا ہوا ہر قدم اس کی تھکن میں مزید اضافہ کر رہا تھا مگر وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ منزل قریب تھی لہذا اسے اپنے حوصلے بلند رکھنے تھے۔ اس وقت وہ اپنے ساتھی افسران کے ساتھ پہاڑی چوٹی کو عبور کر رہا تھا جب اچانک اس کا پاؤں برف کے کوہساروں سے پھسل گیا۔ اس کے پاس سنبھلنے کا کوئی ایک موقع بھی نہیں تھا۔ وادی نیلم کی شاہراہ کے اس پار، پہاڑی کی چوٹی سے پھسلتا وہ کئی فٹ نیچے لڑھکتا چلا گیا تھا اس کے ساتھی اس وقت وہاں برف کی وادی میں چاہتے ہوئے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے تھے۔

چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ سینہ تانے کھڑے تھے جبکہ پہاڑوں کے دامن میں خود رو جھاڑیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پاک آرمی کو اس حادثے کی اطلاع فوری کر دی گئی تھی مگر..... سدید علوی کو نہیں ملنا تھا سو وہ نہیں ملا۔ ڈوماری کی چوٹیوں نے پاک آرمی کے ایک نہایت ایماندار اور قابل افسر کو نگل لیا تھا۔



طلحہ کی رہائی ہو گئی تھی۔ سدید علوی کی اطلاع کے عین مطابق وہ ٹھیک پانچ دن کے بعد اسی ہفتے میں گھر واپس آ گیا تھا۔ اللہ یار صاحب گھر پر نہیں تھے۔ چیوا کے گرد و نواح میں موجود وہ اپنے سیبوں کے باغات

کی دیکھ بھال اور پھل کی فروخت و حساب کتاب کے لیے چپو اسے باہر گئے ہوئے تھے۔ طیب احمد کے بارے میں فاطمہ کو مزید اطلاع نہیں مل سکی تھی وہ کہاں کس حال میں تھا خدا کی پاک ذات کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا مگر پھر بھی فاطمہ خوش تھی۔

نہنے طلحہ کی رہائی اس کے لیے بہت بڑی خوشی تھی۔ وہ بار بار اس کا منہ چومتے ہوئے رو رہی تھی جبکہ طلحہ اسے اور نور بانو بی بی کو اپنے ساتھ ساتھ بستی کے دوسرے لوگوں پر ہونے بھارتی فوج کے مظالم کی مختلف کہانیاں سنارہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی رہائی کیسے ہوئی خود فاطمہ کو بھی اس کی خبر نہیں تھی تاہم ان کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ گھر آ گیا تھا۔ نور بانو بی بی کی طبیعت گزرتے ہر دن کے ساتھ بگڑتی جا رہی تھی، ان کا بخار تھا کہ اترنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ادھر چند دن وادی میں سکون رہا تھا کہ پھر بھارتی فوج کی پُر تشدد کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ایک سرد سوگوار صبح تھی۔ کہر نے چپو کی فضا کو عجیب سے حزن میں لپیٹ رکھا تھا۔ کل رات سے ایک مرتبہ پھر وادی میں بھارتی فوج کی بکتر بند گاڑیوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔

اللہ یار صاحب دو روز کے بعد گھر واپس آئے تھے۔ فاطمہ ناشتہ بنا رہی تھی جبکہ نہنی عائشہ اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اللہ یار صاحب قرآن پاک کی تلاوت سے فارغ ہو کر آئے تو فاطمہ نے ناشتہ لاکر پیش کر دیا تبھی انہوں نے پوچھا تھا۔

”سید نہیں آیا؟“

”نہیں پاپا..... چند روز پہلے آیا تھا کہہ رہا تھا چپو میں اس کا کام ختم ہو گیا ہے لہذا کہیں اور چلا گیا ہے وہ۔“

”اور طیب؟“ انہوں نے پوچھا اور فاطمہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

کیا اس کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ انہیں طیب احمد کی گرفتاری کے بارے میں بتا دیتی؟ نہیں..... وہ ایک مرے ہوئے انسان کو بار بار نہیں مار سکتی تھی تبھی اس نے جھوٹ بولا تھا۔

”اس کا بھی کچھ پتا نہیں ہے بابا شاید وہ دوسرے علاقوں کی طرف آگے نکل گئے ہیں۔“

”چلو اللہ کیا مان میں۔“ قدرے مطمئن ہو کر کہتے ہوئے ابھی انہوں نے پہلا نوالہ توڑا تھا کہ دروازے پر زوردار دستک نے فاطمہ کا دل دھڑکا دیا۔ دستک سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ خیر کی دستک نہیں تھی۔ چولہے میں جلتی لکڑیوں نے ایک دم سے دھواں اگلنا شروع کر دیا تھا۔ اللہ یار صاحب روٹی دوبارہ چنگیر میں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”میں دیکھتا ہوں۔“

”نہیں، آپ رہنے دیں، وادی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“ فاطمہ ہراساں ہو کر قریب آئی تھی۔ اللہ یار صاحب نے جواب میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”حوصلہ رکھو بیٹی، اللہ مہربان ہے، مجھے بوڑھے کے ساتھ بھلا کیا دشمنی ہو سکتی ہے ان کو۔“

”دشمنی تو ان کی کسی کے ساتھ نہیں ہے بابا مگر پھر بھی یہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔“

”اللہ مالک ہے، زندگی اور موت اسی پاک ذات کے ہاتھ میں ہے، میں دیکھتا ہوں اب کیا فتور سایا ہے ان کے دماغ میں۔ وہ ایک نڈر نیک انسان تھے۔ فاطمہ کو لگا جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ دروازہ اب کے یوں بج رہا تھا گویا کھولنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی ہوئی تو ٹوٹ جائے گا۔ اللہ یار صاحب نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ باہر آرمی کے کچھ افراد ہاتھ میں اسلحہ لیے کھڑے تھے۔

”کیا بات ہے کیوں صبح صبح دروازہ پیٹ رہے ہوں؟“

”طیب احمد تمہارا بیٹا ہے؟“ اللہ یار صاحب کے سوال کے جواب میں ایک فوجی نے آگے بڑھ کر ان کی قمیض کا کارڈ پکڑ لیا تھا۔

”ہوں میرا بیٹا ہے“

”پھر یقیناً اس کے ساتھی بھی تمہارے گھر میں ہی چھپے ہوں گے۔“ اللہ یار صاحب کے اقرار کرنے کی دیر تھی کہ چار پانچ فوجی دندناتے ہوئے ان کے گھر میں گھس گئے، وہ محض منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ فقط چند لمحوں میں ان کے پورے گھر کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔

”کہاں چھپایا ہے انہیں، بتاؤ؟“ کافی دیر تلاشی کے بعد جب انہیں کچھ نہیں ملا تو انہوں نے اللہ یار صاحب پر اسلحہ تان لیا۔ فاطمہ نہنی عائشہ کو اپنی بانہوں میں دبوچے کھڑی رہی۔ اس کے لب مسلسل کلمہ طیبہ کا ورد کر رہے تھے، اللہ یار صاحب نے خود پر تانا ہوا اسلحہ سائیڈ پر کیا۔

”میرے گھر میں کوئی پناہ گزین نہیں ہے۔“

”بکواس کرتے ہو، پاگل سمجھتے ہو ہمیں؟“ ایک فوجی نے اشتعال میں اتنی زور سے ان کو گن کا بٹ مارا کہ وہ سنبھل بھی نہ سکے اور زمین پر گر پڑے۔

”پاکستانیوں کا ساتھ دیتے ہو ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر، ہمیں پکی خبر ملی ہے کہ تمہارے گھر میں پاکستانی ملی ٹینٹ ہائیڈز بنا کر گھسے ہوئے ہیں۔“

”یہ جھوٹ ہے۔“

”تو جی کیا ہے بتاؤ۔“ ان لوگوں نے اب اس معزز بزرگ کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ گھر سے باہر نکلتے محلے میں کئی عورتوں اور مردوں نے یہ درندگی اپنی آنکھوں سے دیکھی مگر صدا فسوس کہ اس وقت کوئی بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ جو بھی ان کی مدد کے لیے آتا وہی گولی کا نشانہ بنتا۔

فاطمہ کو نور بانو بی بی نے اپنی قسم دے دی تھی کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھے گی۔ وہ اسی قسم کی ڈوری میں بندھی گھر کے اندر تڑپتی رہی اور باہر بھارتی فوجی اللہ یار کشمیری کو اپنے تشدد کا

نشانہ بناتے رہے۔

کافی دیر کی کوشش کے بعد بھی جب وہ ان سے اپنا مطلوبہ جواب حاصل نہ کر سکے تو جاتے ہوئے ان کے سر میں تین گولیاں مار گئے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہندو راجہ نے جس وقت سات سو روپے فی کشمیری کی قیمت لگا کر کشمیری عوام کا سودا کیا تھا تب سے کشمیریوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا آ رہا تھا مگر..... فاطمہ بنت اللہ یار کے لیے وہ انہونی تھی۔ ایک فرضی خبر پر وہ لوگ اس کے مشفق پرہیزگار باپ کو گولیاں مار کر چلے جائیں گے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ قیامت کیسے آتی ہے سر پر اچانک آسمان کیسے ٹوٹتا ہے اس وقت اس نے جانا تھا۔ محلے میں کہرام مچ گیا تھا مگر..... اس کے اندر خاموشی اور سناٹا اترتا جا رہا تھا۔



وہ ایک سرد خوشگوار صبح تھی۔ مریرہ رحمان کو لندن میں کچھ کام تھا لہذا وہ دہلی سے لندن چلی آئی۔ اس وقت وہ لندن کے معروف شاپنگ سینٹر OXFORD STREET میں شاپنگ کر رہی تھی جب اس نے زاویار کو دیکھا۔ چھ فٹ سے نکلنے ہوئے قد کے ساتھ بے حد ڈسینٹ حلیے میں ملبوس بلا شک و شبہ وہ اس کی کاپی تھا۔ مریرہ کے ساتھ سرد پڑ گئے۔ اس کا دل اسی لمحے بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہلکی بڑھی ہوئی شیو کے ساتھ اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں وہ اپنے لیے کوئی شرٹ پسند کر رہا تھا جب مریرہ کی نظر اس پر پڑی اور پھر جیسے وہیں جم کر رہ گئی۔ وہ اس کا زاویار تھا۔ اس کا بیٹا..... اس کے جگر کا ٹکڑ۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ وہ خود کو اس کے قریب جانے سے نہیں روک سکی تھی۔

”زاویار.....“ اس نے پکارا اور وہ جولی رابرٹ کے ساتھ کسی بحث میں مصروف تھا اس پکار پر بے ساختہ چونک کر پلٹا۔

نظر سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑی مریرہ رحمان کو دیکھ کر اس کا دل بھی بہت تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں کبھی سر راہ بھی مل سکتی ہیں۔ تبھی اس کی آنکھیں ششدر رہ گئیں۔

”جی فرمائیے۔“ اپنے اندر کے مدوجزر پر قابو پاتے ہوئے اس نے یوں پوچھا جیسے وہ ان کو حقیقتاً جانتا بھی نہ ہو۔ مریرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا کہے۔ آنکھیں تھیں کہ بے دریغ آنسو لٹائے جا رہی تھیں تبھی وہ بولا تھا۔

”کچھ کہنا ہے آپ کو؟“

”ہوں۔“ لب بھینچتے ہوئے وہ بے اختیار سر اثبات میں ہلا رہی تھی۔ زاویار کے ساتھ جولی رابرٹ اور ایک نے بھی اسے خاصی حیرانی سے دیکھا۔

”جی کہیے.....“ وہ یوں بے گانہ بن گیا تھا جیسے جانتا ہی نہ ہو کہ وہ اس کی ماں ہے۔ مریرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا کہے؟ جولی رابرٹ نے اسی وقت ایک کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

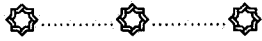
”مجھے یہ عورت زکی کی موم لگتی ہے ان کے نقش زاویار سے کتنے ملتے ہیں۔“

”ہوں، مجھے تمہاری بات سے مکمل اتفاق ہے۔“

ایک نے سر ہلا کر اس کے خیال کی تصدیق کی تھی جبکہ زاویار اپنے اندر کے آتش فشاں کو چھپائے خاموش سرد نگاہوں سے مریرہ کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کچھ لمحے ہونٹ بھیجنے کر آنسو بہانے کے بعد مریرہ نے اس سے کہا تھا۔

”کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

”شیور۔“ زاویار کے کندھے اچکانے پر ایک نے اسے خاصی حیران نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ شخص اتنی آسانی سے اپنے کسی بھی رشتے کو معاف کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔



کہیں یہ نہ ہوتی سمندر میں اس کو ڈھونڈنا اور وہ
ساحلوں پر کھڑا مسکراتا رہے!



مریہ رحمان نے اپنے بیٹے زاویار کو Tayyabs میں رات کھانے کی دعوت دے ڈالی تھی جسے
زاویار نے بنا کوئی سوال کیے فوراً قبول کر لی تھی۔ انڈین پاکستانی اور ایشیائی کھانوں کا مرکز Tayyabs لندن
میں اس کا سب سے پسندیدہ ریستورانٹ تھا۔ وہ فاسٹ فوڈ اور باری کیوز کا دیوانہ تھا اور یہ بات مریہ بہت
سالوں سے جانتی تھی۔ تب ہی اس نے اسے اگلے روز رات کے کھانے کے لیے Tayyabs میں بلایا تھا۔
زاویار نے اس سے کہہ دیا تھا کہ وہ اگلے روز ضرور آئے گا۔

اپنے دوستوں کے ساتھ Oxford Street سے سیدھا بار کلب آیا تھا جہاں جولی رابرٹ نے
اس سے پوچھا۔

”کیا تم اس عورت کو جانتے ہو جی؟“
”نہیں۔“ زاویار نے اس کی طرف دیکھے بغیر بے حد سرد لہجے میں جواب دیا۔ تب ہی ایک بول
اٹھا۔

”اگر تم اسے نہیں جانتے تو تم نے اس کی دعوت کیوں قبول کی؟“
”کیونکہ وہ رورہی تھی اس لیے؟“
”شیور؟ تم اتنے رحم دل کب سے ہو گئے کہ کسی کے آنسو دیکھ کر پگھل جاؤ۔“ ایک کی ہنسی میں طنز
پنہاں تھا۔ زاویار نے سامنے دھرا گلاس ایک بڑے سے گھونٹ میں خالی کر دیا۔
”ہمیشہ سے ہوں۔“

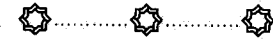
”اوہ..... خاصی حیران کن اطلاع ہے یہ۔“
”کیوں تمہیں میری رحم دلی پر شک ہے؟“
”کیونکہ ہم نے ہوزان کے معاملے میں تمہاری سنگ دلی کی انتہا دیکھی ہے۔“
”میں ہوزان کو پسند نہیں کرتا۔“

”مگر وہ تمہیں جنون کی حد تک پسند کرتی ہے۔“
”یہ اس کا مسئلہ ہے میں نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔“
”تم کبھی کسی بھی لڑکی کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتے۔“ اس بار جولی نے چڑ کر کہا۔ زاویار مسکرا دیا۔
”تم لوگ کیوں چاہتے ہو کہ میں لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کروں؟“

”ہم نے لڑکیوں کی بات نہیں کی۔ ہم صرف ہوزان کی بات کر رہے ہیں اس نے تمہارے لیے اپنا
مذہب بھی چھوڑ دیا۔“

”سو وہاٹ؟ میں نے اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا اور پلیز تم لوگ ذرا اس کی وکالت کم کیا کرو
مجھے پسند نہیں۔“

سب فسانے ہیں دنیا داری کے
کس نے کس کا سکون لوٹا ہے
سچ تو یہ ہے کہ اس زمانے میں
میں بھی جھوٹا تو بھی جھوٹا ہے



ضروری نہیں ہے
جو ساحل کی گیلی خنک ریت پر
ہاتھ میں ہاتھ دے کر
سفر اور تلاطم کے قصے سنائے
جزیروں، ہواؤں اور آن دیکھے موسم
آنکھوں سے اوجھل کناروں پر بکھرے ہوئے
منظروں، ذائقوں اور رنگوں کی باتیں کرے
وہ ان وارداتوں سے گزرا بھی ہو!
اگر وہ کہے.....
آؤ ہم ان پریشان موجوں کا پیچھا کریں
جو تیرے اور میرے پاؤں کو چومتی ہیں
تلاطم ہی بے نام منزل گزریں
یہ دیکھیں ہوائیں کسے ڈھونڈتی ہیں
تو چلنے سے پہلے ذرا سوچ لینا
ضروری نہیں ہے
جو آن دیکھے راستوں کی خبریں سنائے
وہ ان راستوں کا شناسا بھی ہو

”تم یہاں؟“ وہ اسے سامنے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی جبکہ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”جی ہاں..... ابھی میری شہرت اتنی خراب نہیں ہوئی کہ ہوٹل والے میرے یہاں داخلے پر پابندی عائد کر دیں۔“ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور نکھر نکھرا سا دکھائی دے رہا تھا۔ درمکنوں کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کیا تم میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آئے ہو؟“

”جی نہیں۔“ وہ چڑا۔ ”تم ابھی اتنی اچھی نہیں ہوئیں کہ تمہاری تلاش میں در بدر کی خاک چھانتا

پھروں۔“

”اچھا تو پھر یہاں تشریف آوری کیسے ہوئی؟“

”ویسے ہی میٹنگ ائینڈ کرنے آیا تھا۔“

”ہوں گڈ، میری یہاں موجودگی کا کیسے پتہ چلا؟“

”بس دیکھ لو دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔“

”اوکے، تو جناب کی آج کیا مصروفیات ہیں؟“

”کچھ نہیں، آج سارا دن اسلام آباد کی سڑکیں ناہیں گے گپ شپ کریں گے بس۔“

”ٹھیک ہے۔“ ساویز کی پلاننگ پر درمکنوں نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دونوں بے حد مسرور انداز میں لفٹ کی طرف بڑھ رہے تھے ہوٹل کی لابی میں کھڑے صیام آفندی نے انہیں بے حد اچنبھے سے دیکھا تھا۔ درمکنوں اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ وہ ساویز آفندی کے ساتھ باتوں میں مصروف اس کے قریب سے گزر گئی تھی۔ صیام کو لگا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا خون سیاہ لاوا بن گیا ہو۔



کبھی عشق ہو تو پتہ چلے

جو یہ روگ سے ہیں چھپے ہوئے پس دوستاں

تو یہ کون ہیں؟

یہ جو روگ سے اس چھپے ہوئے پس جسم و جاں تو یہ کس لیے

یہ جو کان ہیں میرے آہٹوں پر لگے ہوئے تو یہ کیوں بھلا؟

یہ جو ہونٹ ہیں صف دوستاں میں سلے ہوئے تو یہ کس لیے؟

یہ جو سنگ سا کوئی آگرا ہے جمود میں تو یہ کس لیے؟

یہ جو دل میں درد چھڑا ہوا ہے لطیف سایہ کب سے ہے؟

یہ جو آنکھ میں کوئی برف سے جمی ہوئی ہے تو کس لیے؟

یہ جو دوستوں میں نئی نئی کمی ہوئی ہے تو کس لیے؟

یہ جو لوگ پیچھے پڑے ہوئے ہیں فضول میں

انہیں کیا پتہ انہیں کیا خبر؟

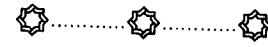
”اوکے لیکن کیا تم سچ میں کل Tayyabs جاؤ گے۔“

”ہوں۔“

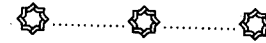
ہمیں ایسا لگتا ہے زی جیسے وہ عورت تمہاری کوئی رشتہ دار ہیں، تمہاری موم، تمہاری خالہ، ممانی،

پھوپھو، کچھ بھی۔“

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ اس موضوع سے بھی بے زار تھا۔ ایک نے کندھے اچکا دیئے۔



رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے وہ اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آیا اور بستر پر آتے آتے چارنج گئے۔ اس کا دماغ کثرت شراب نوشی کے باعث سن ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اسے نیند نہیں آئی۔ اس کا سن دماغ مریرہ رحمان کے تصور کو جھٹکنے میں قطعی ناکام رہا تھا۔ پچھلے تین ماہ اس نے جس اذیت میں بسر کیے تھے صرف وہ ہی جانتا تھا۔ کتنی مفاد پرست عورت تھی اس کی ماں کہ جس نے صرف اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنی اولاد کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ کتنا رویا تھا وہ پچھلے تین ماہ میں یہ جان کر کہ سارا منیر حسین اس کی سگی ماں نہیں اور جو سگی ماں تھی اس کا حوالہ کتنا شرمناک تھا۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سورج کو گھما کر رات کی تاریکی کو دن کے اجالے میں بدل دیتا اور پھر دن ڈھلتے ہی Tayyabs پہنچ جاتا۔ بہت سے حساب تھے جو اس عورت کی طرف نکلتے تھے۔ بہت سالوں کا قرض تھا جو اس عورت پر واجب تھا۔ رات قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی اور وہ رو رہا تھا۔ ایک مدت کے بعد ہی سہی بلا خر اس عورت کو اپنا بیٹا یاد آ گیا۔ زاویار نے سوچ لیا وہ انہیں آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔



وہ ایک سرد خوشگوار صبح تھی۔ درمکنوں کی آنکھ کھلی تو اس کا بخار بہت حد تک کم ہو چکا تھا۔ تازہ پانی سے شاور لینے کے بعد وہ ابھی کمرے سے نکلتا ہی چاہتی تھی کہ اس کا سیل بج اٹھا۔ اجنبی نمبر تھا۔ اسے نا چاہتے ہوئے بھی کال پک کرنی پڑی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام! کیسی ہو؟“ دوسری جانب موجود شخص کی آواز لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔ تبھی خوشگوار

لہجے میں بولی۔

”میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو اور کہاں ہو؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں اور تمہارے بہت پاس ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب جب کمرے سے باہر نکلو گی سمجھ جاؤ گی۔“ ساویز کا لہجہ بھی بے حد خوشگوار تھا۔ وہ مسکرا دی۔

”کیا تم پاکستان میں ہو۔“

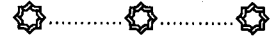
”جی ہاں۔“

”ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے جیسے ہی کمرے سے باہر نکلی ساویز آفندی نے

اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے اسے حیران کر دیا۔

کسی راہ کے کسی موڑ پر جو انہیں ذرا
کبھی عشق ہو تو پتہ چلے!

شہر زاد نے اپنی ماں شہر بانو کی شرط پوری کر دی تھی۔ مائی جیراں کی زندگی کی کہانی سننے کے بعد اپنے وعدے کے عین مطابق وہ گاؤں سے شہر مریرہ رحمان کے گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ پرانی حویلی کے پچھواڑے میں بنی آخری آرام گاہوں کا راز، پھر راز رہ گیا تھا۔ مگر وہ اتنی آسانی سے اپنے مقصد سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔ شہر بانو نے اسے گاؤں سے شہر شفٹ ہونے کا حکم دیا تھا، گاؤں سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑنے کا نہیں۔ لہذا اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ گاؤں کے چکر لگانا ترک نہیں کرے گی۔ شہر بانو نے مریرہ رحمان کو اس کی شہر میں رہائش کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ خوش تھی۔ درمکنون اور صیام کی واپسی سے پہلے وہ گاؤں کا ایک اور چکر لگانا چاہتی تھی لہذا اپنی ماں کو ایئر پورٹ سی آف کر کے بعد میں وہ گاؤں چلی آئی۔



عبدالہادی اس وقت کپاس کی چٹوائی کروانے میں مصروف تھا جب اس نے شہر زاد کو دیکھا۔ وہ کسی کی تلاش میں تھی۔ شاید اسی لیے رُک رُک کر پاس سے گزرنے والے ہر فرد سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ عبدالہادی کی توجہ کام سے ہٹ گئی۔

شہر زاد اسی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ چہرے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے قریبی درخت کے نیچے دھری چارپائی پر ٹک گیا۔

”ایکسیکوزی“ عبدالہادی نے یوں پلٹ کر دیکھا جیسے اس کی آمد کی خبر ہی نہ ہو۔

”جی؟“

”کیا آپ ملک فیاض کے بیٹے ہیں؟“ وہ اب اس کے مقابل آکھڑی ہوئی تھی۔ عبدالہادی بھی اٹھ

کھڑا ہوا۔

”نہیں۔“

”تو پھر نئی حویلی سے کیا تعلق ہے آپ کا؟“

”میں ملازم ہوں جی نئی حویلی کا، فرمائیں کیا حکم ہے میرے لائق؟“

”ملازم۔“ شہر زاد نے خاصی حیرانی سے اس کے لباس اور پرسنٹی کو دیکھا وہ کہیں سے نئی حویلی کا

ملازم نہیں لگ رہا تھا تبھی وہ بولی۔

”لگتا تو نہیں ہے کہ آپ نئی حویلی کے ملازم ہیں۔“

حسن نظر ہے جی آپ کا، ورنہ حقیقت یہی ہے کہ مجھے ملک فیاض سائیں نے اپنی اکلوتی بیٹی میرب فیاض کی ڈرائیوری کے لیے ہی حویلی میں جگہ دے رکھی ہے، میرب بی بی کے حکم پر حویلی کے سارے ملازمین بھی بہت عزت کرتے ہیں۔“

”ہوں، کیا اسی گاؤں کے رہنے والے ہو؟“

”ہاں جی۔“

”پھر تو مائی جیراں کا بھی پتہ ہو گا تمہیں؟“

”آہو جی سارا پتہ ہے، بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ سنا ہے اس کے گھر والا حویلی کا خاص مزارع تھا۔“

”ہوں، اس کے بیٹے اور جوان بیٹی کے ساتھ ملک فیاض اور اس کے باپ نے جو کیا یقیناً وہ بھی بتایا ہو گا کسی نے تمہیں؟“

”ہاں جی سب پتہ ہے۔“

”ان دنوں وہ گاؤں میں کس کے پاس رہتی ہیں بتا سکتے ہو؟“

”ہاں جی، ملک فیاض کے چھوٹے بھائی ملک اعجاز کے بیٹے کے پاس رہتی ہے جی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ملک اعجاز کا بیٹا نئی حویلی میں نہیں رہتا؟“

”رہتا تو حویلی میں ہی ہے جی مگر مائی جیراں کو اس نے خصوصی محبت کے ساتھ کہیں اور رکھا ہوا ہے۔“

”کہاں؟“

”پتہ نہیں جی یہ تو ملک اعجاز سائیں کا بیٹا ہی بتا سکتا ہے، ویسے آپ اگر ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“

”ہوں پوچھو؟“ سامنے کھڑے شخص کی حیثیت بدلی تھی تو شہر زاد کا لہجہ بھی بدل گیا تھا۔ نئی حویلی کے ملازم کے لیے اس کے لفظوں اور جملوں میں عزت نہیں تھی۔ عبدالہادی اب اس سے پوچھ رہا تھا۔

”آپ مائی جیراں کو تلاش کر رہی ہیں؟“

”ہوں۔“

”مگر وہ تو اپنا دماغی توازن کھو چکی ہیں، آپ ان سے مل کر کیا کریں گی؟“

”چیک کروں گی، کیا واقعی انہوں نے اپنا دماغی توازن کھویا ہے یا پھر یہ صرف کہانی ہی ہے۔“

”اچھا جی تو پھر آئیں میرے ساتھ، مائی جیراں ابھی پرانے قبرستان والے کھو (کنواں) کے قریب بیٹھی ہے میں نے تھوڑی دیر پہلے دیکھا تھا جی۔“

”ٹھیک ہے چلو۔“ اس وقت وہ اپنی ماں کی نصیحت کو قطعی طور پر بھول چکی تھی۔ دماغ پر اگر کوئی دھن سوار تھی تو صرف اور صرف..... پرانی حویلی کے راز جاننے کی، ماضی کی کتاب کے اوراق پلٹنے کی۔ لہذا عبدالہادی کی آفر پر وہ اس کے ساتھ چل دی تھی۔



فضا میں خنکی تھی۔ عبدالہادی کی ہمراہی میں وہ پرانے قبرستان والے کھو کے قریب پہنچی تو وہاں کچی سڑک کے اس پار واقعی مائی جیراں موجود تھی۔ بکھرے ہوئے کچھری زدہ بالوں کے اوپر اوڑھی ہوئی چادر کئی جگہوں سے پھٹ چکی تھی مگر اسے احساس نہیں تھا۔ کچی سڑک کے اس پار مٹی کے ڈھیلوں کے قریب بیٹھی وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ہی کھیل رہی تھی۔ عبدالہادی ذرا فاصلے پر رک گیا تھا۔ شہر زاد دست قدموں سے چلتی

اس کے قریب آرکی۔ قریب آ کر اس نے دیکھا تھا مائی جیراں نے اس وقت مٹی کی دو چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں ایک دوسرے کے برابر میں بنائی ہوئی تھیں اور وہ باری باری ان دونوں ڈھیریوں پر بہت محبت سے ہاتھ پھیر رہی تھی۔ شہزاد سمجھ گئی کہ اپنی دانست میں وہ اپنے بچوں کی آخری آرام گاہیں بنا کر انہیں پیار کر رہی تھی۔ اس وقت نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ مائی جیراں نے اس کے قریب آنے اور بیٹھے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے تصور میں اتنی منہمک تھی کہ اسے وہاں کسی کے بھی آنے اور آ کر بیٹھے کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔

تجی وہاں کچی سڑک سے ملک فیاض کی گاڑی گزری تھی۔ شہزاد نے دیکھا کہ مائی جیراں کی سماعتوں میں جیسے ہی گاڑی کی آواز آتری وہ پھری ہوئی ناگن کی طرح پھنکار کر اٹھی اور ہاتھوں میں موجود مٹی گاڑی کی طرف پھینکنا شروع کر دی۔ مٹی کے بعد اس نے پاس پڑے پتھر اٹھا اٹھا کر گاڑی پر پھینکنے شروع کر دیئے تھے مگر اس سے پہلے کہ کوئی پتھر گاڑی پر لگتا گاڑی فرار لے بھرتی ہوئی آگے بڑھ گئی تھی۔

مائی جیراں کا غصہ پھر بھی کم نہیں ہوا۔ وہ اب زور زور سے چلا رہی تھی۔ کبھی ہاتھ تو کبھی جھولی اٹھا اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی مگر پھر وہ چننا اور چلانا نہیں بھولی تھی۔ شہزاد جانتی تھی دیہاتوں میں ایسی کتنی ہی کہانیاں روزِ جنم لیتی تھیں اور دم توڑ دیتی تھیں۔ تعلیم کے فقدان کے باعث دیہاتی ماحول میں پرورش پانے والے افراد میں جذباتیت جیسے کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی معمولی باتوں پر مشتعل ہو کر اپنی جان دے دینا اور کسی دوسرے کی قیمتی ترین جان لے لینا دیہی علاقوں میں عام تھا۔ تعلیمی فقدان اور شعور کی قلت نے سینکڑوں دیہاتوں میں کیسے قیمتی ترین زندگیوں کو داؤ پر لگایا تھا وہ جانتی تھی۔ اس کے علم میں تھا کہ جرائم کی شرح دیہی علاقوں میں زیادہ ہونے کے باعث اندھے قانون کی بھینٹ چڑھنے والوں میں بھی زیادہ تعداد دیہاتی نوجوانوں ہی کی تھی۔ اسے ایک ایک قیمتی جان کا دکھ تھا مگر..... وہ بے بس تھی۔ اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ گاؤں گاؤں جا کر وہاں جہالت اور جذباتیت کا گلہ گھونٹ سکتی۔ بڑے بڑے وڈیروں نمبرداروں اور چوہدریوں کو ان کی نام نہاد خدائی سے باز رکھ سکتی۔ تجی بے حد ملول اور بے چین تھی۔ عبدالہادی نے دیکھا وہ مائی جیراں کو بے حد تکلیف سے دیکھ رہی تھی۔ تجی وہ قریب آیا۔

”کیا آپ کا مائی جیراں سے کوئی خاص رشتہ ہے۔“

”ہاں۔“ گاڑی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتی جیراں پر نظریں ٹکائے اس نے بے حد وحشیہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ جب وہ چونک اٹھا۔

”کیا..... کیا خاص رشتہ ہے آپ کا؟“

”انسانیت کا، ہمدردی کا خلوص کا، جس کے لیے اللہ رب العزت نے انسان کی تخلیق کی تھی وگرنہ اپنی عبادت کے لیے تو اسے فرشتے بھی کم نہیں تھے۔“

”ہوں، لگتا ہے خاصا درمندانہ دل رکھتی ہیں آپ۔“ وہ بولا مگر اس بار شہزاد نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اس کا دل وہاں ہر چیز سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

مائی جیراں اگر اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی تو اس کا وہاں گاؤں میں در بدر بھٹکنا بے کار تھا۔ وہ وہاں

ایسے کسی فرد کو نہیں جانتی تھی جو اسے ماضی کے رازوں سے آگاہ کر سکتا۔ تجی وہ آگے بڑھی تھی کہ عبدالہادی نے پکار لیا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“ شہزاد آرکی مگر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔
”واپس شہر۔“

”مائی جیراں سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟“

”تم سے مطلب؟“ وہ اس کی جرأت پر حیران ہوتی پلٹی تھی جب وہ بولا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو مائی جیراں سے کوئی بہت خاص کام تھا۔“

”ہوں تھا خاص کام، لیکن اگر وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتیں تب۔“

”ایسا کیا کام تھا جو صرف مائی جیراں ہی کر سکتی تھی؟“

”تم جان کر کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں مگر ہو سکتا ہے میں آپ کے کسی کام آ جاؤں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔

شہزاد بہت توجہ سے اس کی ذہنی آنکھوں میں دیکھتی سر ہلا گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

”نئی حویلی اور پرانی حویلی کی جنگ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”آپ کیا جانا چاہتی ہیں؟“ اس کے سوال کے جواب میں اس نے سوال جڑ دیا تھا۔ شہزاد گہری

سانس بھرتی قریب ہی ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

”میں جو جانا چاہتی ہوں تم مجھے وہ سب بتا سکو گے؟“

”ہوں کوشش کروں گا۔“

”پرانی حویلی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ بے حد مطمئن بیٹھی

تھی۔ عبدالہادی قدرے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

”پرانی حویلی کے بارے میں تو سارا گاؤں جانتا ہے۔ سائیں اظہار ملک کی حویلی تھی وہ جن کے تین

جوان بیٹوں نے ان کی زندگی میں وفات پائی تھی۔“

”صرف بیٹوں نے نہیں، پرانی حویلی کے تمام مکینوں نے ان کی زندگی میں ہی موت کا ذائقہ چکھ لیا

تھا۔ مگر سوال یہ نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ انہیں کس نے مارا اور کیوں؟“ عبدالہادی کی تصحیح کرتے ہوئے وہ ہمیشہ

کی طرح جذباتی ہوئی تھی۔ عبدالہادی نے نظریں پھیر لیں۔

”سارا گاؤں جانتا ہے نئی حویلی اور پرانی حویلی کے درمیان دشمنی پڑ گئی تھی، نئی حویلی اور پرانی حویلی

کے مکین اسی دشمنی کی نذر ہو گئے۔“

”نئی حویلی کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”نئی حویلی اظہار ملک سائیں کے بڑے بھائی ملک وقار کی رہائش گاہ تھی۔ ملک وقار کے تین بیٹے

ملک نیاز، ملک اعجاز، اور ملک ریاض دشمنی کی اسی آگ میں بھسم ہو گئے۔ ملک اعجاز سائیں کا تو کوئی قصور بھی

نہیں تھا۔ نئی حویلی ان کا مسکن نہیں تھی وہ شہر میں رہتے تھے، اپنے باپ اور بھائیوں کے فیصلوں کے خلاف آواز

اٹھاتے تھے، مگر پھر بھی انہیں نئی حویلی اور پرانی حویلی کے درمیان بھڑکتی دشمنی کی آگ میں جل جانا پڑا۔“

”ہوں، نئی حویلی کے وارثین میں کون کون ہے اب؟“

عبداللہادی جو بات سناتے ہوئے از حد رنجیدہ ہو گیا تھا شہزاد کے لیے وہی بات بے حد معمولی حیثیت کی حامل رہی تھی۔ عبداللہادی اب اسے بتا رہا تھا۔

”نئی حویلی میں ملک فیاض، ان کی بیگم، ایک بھابی اور بھتیجا رہتے ہیں۔ ان کے تین بیٹے ملک سے باہر ہیں جبکہ اکلوتی بیٹی میرب شہر میں پڑھتی ہے۔“

”ہوں اور ملک نیاز، ملک ریاض اور ملک اعجاز کی فیملیز؟“

”ملک اعجاز کا صرف ایک بیٹا ہے جو حویلی میں ہی اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے، جب کہ ملک نیاز اور ملک ریاض کے بچے، نئی حویلی اور پرانی حویلی کے درمیان دشمنی کے بعد دیار غیر کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ملک وقار نے اپنی زندگی میں ہی انہیں دیار غیر میں محفوظ کر دیا تھا۔“

”ہم..... کیا تم پرانی حویلی کے پچھواڑے میں بنی آخری آرام گاہوں کا راز جانتے ہو؟ کیا تم اس تاریک رات کے بارے میں جانتے ہو جس نے حویلی کے سارے چراغ بجھا دیئے تھے؟“ اس بار شہزاد کا سوال عبداللہادی کے لیے قطعی حیران کن تھا۔ کیونکہ اس کی ماں نے بچپن سے اب تک اسے پرانی حویلی کی کسی تاریک رات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

”کیا وہ بے خبر تھیں یا اسے بے خبر رکھنا چاہتی تھیں؟“ وہ الجھا اور اس نے قطعی حیرانگی کے ساتھ شہزاد کی طرف دیکھا تھا۔

”کیسی تاریک رات؟ میری معلومات میں پرانی حویلی کی کوئی تاریک رات نہیں ہے۔“

”حیرت ہے، تم نئی حویلی اور پرانی حویلی کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو مگر پھر بھی تمہیں پرانی حویلی پر قیامت کی طرح ٹوٹنے والی تاریک رات کا نہیں پتا۔“ اب وہ آزرہ تھی۔ اس سے پہلے عبداللہادی کوئی جواب دیتا، میرب فیاض اپنی گاڑی سے گاؤں کی کچی سڑک کو روندتی وہاں چلی آئی۔ شہزاد کے لیے اس کے حلیے سے اس کی حیثیت کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں تھا۔

میرب فیاض کی گاڑی کے نائر جیسے ہی ان دونوں کے قریب رکے، شہزاد کپڑے بھاڑتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ تنگ ٹراؤزر اور لانگ ریشمی قمیض میں ملبوس دوپٹے کو گلے میں ڈالے وہ خاصے بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ گاڑی سے نکلے تھی۔

”حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری اور بے پروائی کی بھی، تم یہاں عیاشی کر رہے ہو اور میں وہاں حویلی میں پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے تمہاری واپسی کا انتظار کر رہی ہوں۔“ اس کا لہجہ اور الفاظ ایسے تھے کہ شہزاد کو عبداللہادی کے ڈرائیور ہونے کا یقین کرنا پڑا۔ وہ اس وقت ملک فیاض کی بیٹی کے ساتھ کسی بھی قسم کے ٹکراؤ کے موڈ میں نہیں تھی، تب ہی ایک طرف خفت زدہ کھڑے عبداللہادی کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے، آپ اپنی ڈیوٹی نبھائیں، میں چلتی ہوں اب، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔“ عبداللہادی نے اثبات میں سر ہلایا تھا، جبکہ میرب فیاض اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ شہزاد کے وہاں سے چلے

جانے کے بعد اس نے عبداللہادی سے پوچھا تھا۔

”کون تھی یہ لڑکی؟“

”پتہ نہیں، کسی کا پتہ پوچھتی پھر رہی تھی۔“ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے خشک لہجے میں کہا۔

میرب اثبات میں سر ہلاتی گاڑی میں آ بیٹھی۔ تب ہی وہ اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارا ملازم ہوں نہ شوہر، نہ ہی کسی قسم کا قرضدار ہوں، میرا باپ رشتے میں تمہاری باپ کا اکلوتا بھائی تھا، لہذا آئندہ مجھ سے مخاطب ہوتے وقت ذرا تمیز کے دائرے میں رہنا ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم سے میرا کیا رشتہ ہے تو خاصی مشکل میں پڑ جاؤ گی تم۔“ اس کا لہجہ قطعی بے لچک تھا۔ میرب فیاض سر جھٹکتی، اس کی نصیحت کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتی، لاپرواہی سے گاڑی سے باہر دیکھنے میں مگن ہو گئی تھی۔



درمکنون ساویز آفندی کے ساتھ خراماں خراماں چلتی ہوٹل سے باہر نکل گئی تھی۔ صیام اپنی جگہ پر جامد کھڑا اسے ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھتا رہا۔ اس نے اسے مطلع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ ہوٹل سے باہر جا رہی ہے۔ دل تھا کہ سینے میں لہو لہان ہو رہا تھا مگر اس نے لب سے لیے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ کیوں اپنی حیثیت جانتے بوجھتے ہوئے وہ آسمان کو چھونے کی خواہش کر بیٹھا تھا، وہ کیوں بھول گیا تھا کہ درمکنون صمید کے سامنے اس کی حیثیت سوائے ایک ملازم کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ جب چاہے اسے اپنے دفتر سے بے دخل کر سکتی ہے، دل میں جگہ دینا تو بڑی بات تھی۔ ساویز نے ہوٹل سے نکلتے ہوئے درمکنون سے کہا۔

”یار مجھے تمہارا یہ سیکرٹری ایک آنکھ نہیں پسند۔“ درمکنون اس کے الفاظ پر بے ساختہ رکی۔

”کیوں.....! تمہیں کیا کہہ دیا اس نے؟“

”مجھے کیا کہنا ہے، بس تمہارا سایہ بنا اچھا نہیں لگتا، کیا پتہ کب تم اس کی وجاہت کے سامنے دل ہار جاؤ۔“ اس نے اپنے دل کی بات کی۔ درمکنون صمید کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ صرف مسکرائی تھی۔ ساویز آفندی کے خدشے کی وضاحت کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ساویز نے راول جھیل کے قریب گاڑی روک دی تھی۔

”تم نے مریرہ آنٹی سے ہمارے رشتے کی بات کی در؟“ گاڑی سے نکلتے سے پہلے اس نے پوچھا تھا۔ درمکنون نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ہاں کی تھی۔“

”پھر کیا کہتی ہیں وہ؟“

”وہ اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہیں۔“ اس بار وہ دروازہ کھول کر اس سے پہلے ہی گاڑی سے باہر نکل آئی تھی۔ ساویز بے چین ہو گیا۔

”کیوں..... کیوں راضی نہیں ہیں؟“

”پتہ نہیں، ان کا خیال ہے کہ تمہیں اپنی سابقہ مگنیت پر ہیان کے ساتھ ہی شادی کرنی چاہیے۔“

”مگر کیوں؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں، شاید وہ جانتی نہیں ہیں کہ پرہیان ان کی سوتن کی بیٹی ہے، اس سوتن کی بیٹی جس نے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا۔“

”ہوں، پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”پتہ نہیں، فی الحال تو میں اپنی ماما کے فیصلے کے خلاف نہیں جاسکتی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں کون سا بوڑھا ہو رہا ہوں۔“

”ہوں بات تو ٹھیک ہے مگر پھر بھی تم اپنی پسند سے کہیں اور شادی کرنے میں بالکل آزاد ہو۔ کیونکہ تم جانتے ہو ہمارے درمیان صرف دوستی ہے، عشق محبت والا کوئی چکر نہیں ہے۔“

”ہوں میں جانتا ہوں مگر پھر بھی میں تمہارا ویت کروں گا۔“

”تمہاری مرضی۔“ درمکنون نے کندھے اچکائے تھے۔ ساویز اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا رہا۔

”پرہیان کا کیا بنا؟ کیا اس نے رشتہ ختم ہونے کے بعد دوبارہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کی تھی، جب میں نے اس رشتہ کو ختم کیا وہ بہت دکھی اور جذباتی ہو گئی تھی، مگر جب میں نے اسے اس کی اصلیت بتائی تو اس کے بعد دوبارہ تنگ نہیں کیا اس نے۔“

”چلو شکر ہے، تم آج کل کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ خاص نہیں، لندن میں میرا ایک دوست ہے ایل، اس کے ساتھ بزنس پارٹنرشپ کا سوچ رہا ہوں۔“

”گڈ“ کافی ذمہ دار ہو گئے ہو۔“

”ہونا ہی پڑتا ہے، والدین ساری عمر منہ میں نوالے نہیں ڈال سکتے۔“

”صحیح کہا، پاکستان میں کب تک ٹھہرے ہوئے ہو؟“

”کل تک، پرسوں واپس چلا جاؤں گا۔ اگلے ماہ کینیڈا میں بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے میری۔“

”واؤ..... کینیڈا کی میٹنگ کے لیے تو ممانے بھی خصوصی فون کر کے اٹینڈ کرنے کا کہا ہے۔“

”چلو اچھا ہے، ایک بار پھر ٹکراؤ ہو جائے گا ہمارا، میرا ارادہ اس بار کینیڈا سے افریقہ کے جنگل میں تھوڑی سی روتفریح کرنا ہے۔“

”ارادہ تو اچھا ہے مگر سنا ہے کہ افریقہ کے جنگل خاصے خطرناک ہیں۔“

”مجھ سے زیادہ خطرناک نہیں ہیں۔“ وہ مسکرایا تھا۔ درمکنون بھی کھل کر مسکرا دی۔ اس روز ساویز نے اسے پورا اسلام آباد گھمایا تھا۔ ایک دوسرے کی ہمراہی میں گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کرتے، انہیں پورا دن گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ دونوں بے حد تھک کر جس وقت ہوٹل پہنچے رات اچھی خاصی گہری ہو چکی تھی۔

درمکنون اپنے کمرے میں آئی تو سب سے پہلا خیال اسے صیام کا آیا۔ وہ اسے بتا کر نہیں گئی تھی۔ شاید وہ اس کی طبیعت کی وجہ سے اس کے لیے پریشان ہوتا رہا ہو، وہ اسے کال کر کے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ہوٹل واپس آ چکی ہے مگر پھر ٹائم دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اس کے خیال میں صیام اس وقت تک سو چکا تھا۔ مگر وہ نہیں

جانتی تھی کہ ہوٹل سے اس کی رخصتی سے لے کر واپسی تک وہ بے حد بے قرار وہیں لابی میں براجمان ایک ایک لمحہ سلگتا رہا تھا۔ کچھ جذباتوں کی زبان نہیں ہوتی مگر وہ بہت خودمر ہوتے ہیں۔ صیام کے جذبات کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔



”ایکسکیوز می۔“ اس روز ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد وہ اسٹور سے واپس آ رہی تھی جب ایک نرم سی پکار نے اسے چونکا دیا۔ وہ لڑکی اور بے ساختہ پیچھے پلٹ کر اس نے دیکھا تھا، جہاں نیلی آنکھوں اور گھنگھریالے بالوں والی ایک گڑیا سی لڑکی آنکھوں میں بے حد زماہٹ لیے اس کی طرف ہی دیکھے جا رہی تھی۔ تب ہی وہ بولی تھی۔

”جی فرمائیے۔“ لڑکی اس کے متوجہ ہونے پر قدرے کنفیوژ ہوئی تھی۔

”میرا نام ہوزن ہے، کیا آپ زاویار صمد حسن کی بہن ہیں؟“ خالص انگلش میں خاصی اپنائیت کے ساتھ اس نے پوچھا تھا۔ پرہیان کا دل اس حوالے سے کٹ کر رہ گیا۔

”کیا آپ کو زاویار صمد حسن سے کوئی کام ہے؟“

”نہیں، مجھے زاویار سے نہیں، بلکہ اس کی بہن سے کام ہے۔“ پرہیان کے سوال کے جواب میں سوال پر وہ قدرے اعتماد سے بولی تھی۔ پرہیان کی الجھن بڑھ گئی۔ اگلے چند لمحوں کے بعد اس نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔

”جی کہیے، میں ہی زاویار صمد حسن کی بہن ہوں۔“

”شکریہ، میں پہلے سے جانتی تھی کہ آپ زاویار صمد حسن کی بہن ہیں، میں نے ایک دو بار آپ کو اس کے ساتھ دیکھا تھا۔“ اس کے اقرار پر سامنے کھڑی وہ باربی ڈول سی لڑکی مسکرائی تھی۔

”اگر آپ مجھے تھوڑا وقت دے سکیں تو کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟“

”ہوں وائے ناٹ۔“ پرہیان کی دلچسپی اس لڑکی میں بڑھ گئی تھی۔ لہذا اس نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہوزن خوش ہو گئی۔

اگلے کچھ منٹس کے بعد وہ قریب کے ایک ہوٹل میں ایک دوسرے کے مد مقابل بیٹھی تھیں۔ پرہیان نے ایک نظر بائیں کلائی پر بندھی رسٹ وائچ کی طرف دیکھا پھر ہوزن پر نظریں جمادیں۔

”جی کہیے، زاویار صمد حسن سے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”میری کہانی چند لفظوں میں سمیٹنے والی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں، میرے پاس ایک گھنٹہ ہے آپ ایک گھنٹہ میں جو کہنا چاہتی ہیں کہہ سکتی ہیں۔“

”شکریہ۔“ میرا نام ہوزن ہے، یہ نام خالص میری ماں کی پسند اور خواہش پر رکھا گیا۔ حالانکہ میری ماں کو اسلام کی قبولیت کا شرف حاصل نہیں ہو سکا مگر پھر بھی وہ اسلام سے بے حد متاثر تھیں۔“

”ہوں، مگر اسلام قبول کرنے کا شرف کیوں حاصل نہیں ہو سکا انہیں؟“

”وہ اُن پڑھ تھیں، ایک بروکن فیملی کا قطعی اُن چاہا نہیں..... ان کے ماں باپ میں سے کسی کو بھی ان

نہیں ہے، کیا ہم دوبارہ کہیں مل سکتے ہیں؟“

”شیور“ ہوزان نے اس کی غلت پر بناؤا منائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پر ہیان نے بے ساختہ گہری سانس خارج کی۔

”شکریہ، آپ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دے دیں، کل میں آپ سے آپ کے گھر پر آ کر مل لوں گی۔“

”ٹھیک ہے۔“ پر ہیان کی آفر پر ہوزان نے پاس پڑے بیگ سے قلم اور چھوٹا سا سفید کاغذ نکالا پھر اس پر اپنے گھر کا پتہ لکھ دیا۔

ان کی منگوائی ہوئی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ پر ہیان کے اٹھنے سے پہلے اس نے میمنٹ کلیئر کی اور پھر ہوٹل سے نکل آئی! اپنی کہانی مکمل کرنے کے لیے اب اسے بے تابی سے اگلے دن کا انتظار کرنا تھا۔



زاویار صمد حسن مریرہ رحمٰن سے ملنے کی گئی ملاقات کے تحت مقررہ وقت سے کچھ منٹ پہلے ہی Tayyabas پہنچ گیا تھا۔ مکمل بلیک پینٹ شرٹ میں ملبوس اس کی شخصیت اس وقت بے حد بکھری بکھری سی دکھائی دے رہی تھی۔ آنکھوں کی سرخی اس بات کا واضح ثبوت تھی کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ مریرہ کوشش کے باوجود مقررہ وقت پر Tayyabas نہیں پہنچ سکی تھی۔ زاویار کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس کا دل چاہا وہ اس عورت کی کوئی بات نہ سنے، اس کی شکل بھی نہ دیکھے مگر پھر بھی وہ ڈھیٹ بنا وہیں بیٹھا رہا۔ تقریباً تیس منٹ کی تاخیر کے ساتھ وہ ہوٹل کے داخلی دروازے سے اندر آتی دکھائی دی۔ زاویار اپنے اندر کے طوفانوں کو دبائے بیٹھا رہا۔

”سوری..... میں بہت کوشش کے باوجود مقررہ وقت پر نہ پہنچ سکی۔“ مکمل سفید شلوار قمیض میں ملبوس سر پر گرے اسکارف لیے وہ بے حس نفیس لگ رہی تھی۔ زاویار نے اس کی معذرت پر خفیف سا سر ہلاتے ہوئے نظر پھیر لی۔

”اٹس اوکے..... مجھے فرق نہیں پڑتا۔“ لبوں پر تلخ سی مسکراہٹ بکھرائے اس نے کہا۔ مریرہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

”میرا نام مریرہ ہے، میرا ایک بیٹا تھا زاویار بچپن میں چھن گیا تھا مجھ سے، تمہاری شکل میرے بیٹے سے بہت ملتی ہے، کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام زاویار نہیں ہے۔“ مریرہ کے سوال پر نظریں چرائے چرائے اس نے خاصی درشتگی سے جواب دیا تھا۔ مریرہ کے دل پر جیسے گھونسہ لگا۔

”کیا تم مریرہ رحمٰن کے بیٹے نہیں ہو؟“

”جی نہیں، میں صرف سارا امیر حسین اور صمد حسن کا بیٹا ہوں بس..... مریرہ رحمٰن نامی کسی عورت کو نہیں جانتا۔“ زاویار کے لہجے کی سفاکی نے مریرہ کے حوصلے پست کر دیئے تھے مگر سامنے بیٹھے شخص کے الفاظ میں اس بات کی سچائی اور یقین تھا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے تب ہی اس کی آنکھیں بھرائی تھیں اور ہونٹ کپکپائے تھے۔

کی ضرورت نہیں تھی لہذا ماں کے جنم دینے کے بعد ان کی ماں نے کسی اور مرد سے مراسم بڑھالیے۔ باپ پہلے ہی خود کو کہیں اور مصروف کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بہت چھوٹی عمر میں دکھ سینے شروع کر دیئے تھے۔ وہ بہت زیادہ حساس تھیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے ان کے اندر کڑواہٹ بھری تھی مگر پھر بھی میں نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا، وہ اکثر راتوں میں اٹھ اٹھ کر دیئے جلایا کرتی تھیں۔“

”اوہ..... کیا اب وہ حیات نہیں رہیں؟“

”نہیں، ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی ڈیڑھ تھ ہوئی ہے۔“

”اوہ ویری سیڈ۔“ پر ہیان کو واقعی دکھ ہوا تھا جب وہ بولی۔

”میری ماں کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ایک مسلمان تھا، تب ماں جوان تھی اور میری طرح ایک اسٹور میں ملازمت کرتی تھی، وہ شخص وہیں ان سے ملا، وہ پہلا واحد شخص تھا جس نے میری ماں کو عزت دی، جس کے لہجے میں میری ماں کے لیے بے حد نرمی اور اپنائیت تھی، ماں اس سے بہت متاثر تھی، وہ شخص رفتہ رفتہ ان کے بہت قریب آ گیا تھا، ماں بتایا کرتی تھی کہ وہ یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے..... وہ اعلیٰ تعلیم جو صرف اور صرف کسی اچھی ملازمت میں اس کے کام آ سکتی تھی اور بس.....“

”میں سمجھی نہیں۔“

”میں نے بہت مشکل بات تو نہیں کی۔“ پر ہیان کے الجھ کر دیکھنے پر وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔

”یہاں مختلف ممالک سے سینکڑوں مسلمان اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے آتے ہیں، وہ اعلیٰ تعلیم صرف ان کی ڈگریوں میں اضافہ کرتی ہے، انہیں بہتر جاب دلاتی ہیں، دنیاوی اور آخری دنیا میں ان کے کردار کو بے مثال نہیں بناتیں جیسے کہ اسلامی مدارس اور اسلامی تعلیمات بناتی ہیں۔ میری ماں کبھی کبھی بہت دکھ سے کہتی تھی جانے ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے حقیقی اعلیٰ تعلیم جو ان کا مذہب ان کی شریعت انہیں دیتی ہے، چھوڑ کر یہودیوں کی زبان، ان کے بنائے گئے تعلیمی فارمولے، ان کے نظریات اور ان کی درسگاہوں کے ٹیوٹیکٹ کو اپنی حقیقی کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقی کامیابی تو وہ تعلیم ہے جس پر عمل پیرا ہو کر انسان خواہ وہ دنیا کے کسی بھی علاقے، مذہب یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اپنی زندگی اپنا اخلاق اور اپنا کردار سنوارتا ہے۔ میرا ماں کو ساری زندگی اپنے اُن پڑھ رہنے کا دکھ رہا، ان کے پاس انگلش ترجمے والا قرآن پاک تھا مگر وہ اسے پڑھ نہیں سکتی تھیں، سمجھ نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے کسی اسکالر سے بس قرآن پاک کی سورۃ النساء کا مکمل ترجمہ و تشریح سنی تھی اور بس اسی ایک سورۃ نے ان کا اندر بدل دیا۔ وہ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتی تھیں سمجھنا چاہتی تھیں۔ اسلام کی پناہ میں آنا چاہتی تھی مگر ان کی تقدیر اور حالات نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ساری زندگی انہوں نے انگلش ترجمے والا قرآن پاک سینے سے لگا کر سنبھال کر رکھا۔“ ہوزان کھوئے کھوئے سے انداز میں بتا رہی تھی اور پر ہیان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے یہ کہانی کیوں سن رہی ہے؟

”بھلا زاویار صمد حسن کی بہن کا اس کی ماں کی کہانی کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا تھا؟ اس نے ایک نظر

بائیں کلائی پر بندھی رسٹ واپس پر ڈالی پھر بولی۔

”آپ کی کہانی بہت دلچسپ ہے مگر میں معذرت چاہوں گی کہ میرے پاس اس وقت زیادہ وقت

”کیا تمہیں اس عورت کی زندگی کی کہانی جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں جس نے تمہیں جنم دیا۔“
 ”نہیں۔“ زاویار کے نہیں نے مریرہ کے دل پر ایسے ایک بار پھر گھونسا رسید کیا۔

”میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میری ماں ایک بدکردار عورت تھی اسی لیے وہ مجھے اس وقت جب مجھے اس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی چھوڑ کر چلی گئی۔ آج اگر معاشرے میں میری پہچان ہے تو میرے باپ کے حوالے سے ہے۔ صرف مجھے ٹوٹ پھوٹ سے بچانے کے لیے میرے باپ نے کبھی مجھے یہ پتہ نہیں لگنے دیا کہ مجھے جنم دینے والی عورت کون تھی۔ مت کہیں مجھے کہ آپ میری ماں ہیں، میری ماں وہ عورت ہے جس نے آپ کے چلے جانے کے بعد مجھے ماں کا پیار دیا۔ میرے باپ کو سنبھالا۔ زندگی میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس عورت نے مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ میری سگی ماں نہیں ہے۔“ مریرہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ شروع ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”اپنی سگی اولاد سے تو ہر کوئی پیار کرتا ہے مگر عظیم تر وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی دوسرے کی چھوڑی ہوئی اولاد کو سگوں جیسا پیار دیں، ماں قربانی کا دوسرا نام ہے، صرف اپنی خوشیوں کے لیے اپنا گھر اور اپنی اولاد چھوڑ کر بھاگ جانے والی عورتیں قطعی اس قابل نہیں کہ انہیں ماں کہا جاسکے۔“ وہ اپنے اندر کا غبار نکال رہا تھا۔ مریرہ نے آنسو پونچھ لیے۔

”تمہارا باپ ایک دھوکہ باز جھوٹا انسان ہے زاویار اس نے.....“

”جسٹ شٹ اپ اوکے۔“ بھیکے لہجے میں ابھی وہ اسے سچ بتانا ہی چاہتی تھی جب وہ خود پر قابو نہ رکھتے ہوئے اٹھا۔ قرب و جوار میں بیٹھے لوگوں نے خاصی حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

مریرہ کو لگا جیسے کسی نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ اس کا سانس جیسے حلق میں انک گیا تھا۔ سامنے بیٹھا خوب شخص اس کا بیٹا نہیں تھا۔ وہ صرف اور صرف صمد حسن کا بیٹا تھا اس شخص کا بیٹا جس نے اسے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دیا۔ زاویار قرب و جوار میں بیٹھے لوگوں سے ایکس کیوز کر رہا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ وہاں سے اٹھ آئی۔ اس کا دل جیسے پھٹ رہا تھا۔ سالوں بعد اس کا بیٹا جس کے لیے وہ اب تک پاگل ہو رہی تھی اسے ایسے ملے گا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ وہ بھگنے کی پروا کیے بنا بغیر پیدل ہی چلتی رہی۔ ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ عمر عباس کی کال آ گئی۔ مریرہ اس وقت اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی مگر پھر بھی اس نے بہتے آنسوؤں کی پروا کیے بغیر کال اٹینڈ کر لی۔ عمر عباس پوچھ رہا تھا۔

”ہیلو میرا! کیا تم لندن میں ہو؟“

”ہوں۔“ بمشکل وہ حلق سے آواز نکال پائی تھی۔ عمر ناراض ہو گیا۔

”تم لندن میں ہو اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”رات ہی آئی تھی، مصروفیت ایسی تھی کہ تمہیں بتانا یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ سچ

بولنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

”ٹھیک ہے، میں کل شام تک لندن پہنچ جاؤں گا۔ تم کل شام تک روکو گی ناں؟“

”نہیں..... مجھے آج ہی واپس جانا ہے عمر.....“

”تم میرے بیٹے ہو زاویار، میں نے جنم دیا تھا تمہیں۔“

”جھوٹ..... میری ماں سارا منیر حسین ہے، ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک انہی کا چہرہ اپنی ماں کے روپ میں دیکھا ہے میں نے، اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کوئی بھی دوسری عورت فرضی کہانی سنا کر مجھے میری ماں سے دور کر دے گی۔“

”فرضی کہانی نہیں ہے یہ، حقیقت ہے حقیقت، یقین نہیں آتا تو ابھی اپنے باپ کو کال کر کے ساری سچائی کے بارے میں جان سکتے ہو۔“

”مجھے کسی کو کال کرنے کی ضرورت نہیں ہے سمجھیں آپ؟“ اس بار وہ تھوڑا روڈ ہوا تھا۔ مریرہ نے بے بسی سے لب بھینچ لیے۔

”تمہیں میرا یقین کرنا ہو گا زاویار کہ میں تمہاری ماں ہوں۔“

”اوکے، ایک لمحے کے لیے میں آپ کی بات سچ مان لیتا ہوں پھر؟ وہ اتنا تلخ کیوں ہو رہا تھا اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ مریرہ لاجب ہو گئی۔

”میں چاہتی ہوں میرا بیٹا دل سے میری بات کا یقین کرے تاکہ اتنے سال جو دوری کا کرب میں نے برداشت کیا ہے وہ کچھ تو کم ہو۔“

”کیسی دوری..... کیسا کرب؟ آپ کے بقول اگر میں آپ کا بیٹا ہوں، آپ میری ماں ہیں تو پھر یہ اتنے سالوں کے بعد کیوں یاد آیا آپ کو؟ پہلے کہاں چلی گئی تھیں آپ؟ معاف کرنا مگر آپ جیسی عورتیں بے اولاد ہی رہیں تو اچھا ہے۔“

”نہیں..... میرے ساتھ اس لہجے میں بات مت کرو بیٹا پلیز۔“

”مت کہیں مجھے بیٹا..... میں ایک بدکردار عورت کا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا کبھی۔“

”چٹا خ.....“ زاویار صمد حسن کے ہونٹوں سے نکلے وہ الفاظ، صرف الفاظ نہیں تھے بلکہ مریرہ رحمن کے منہ پر طمانچہ تھے۔ کتنی ہی دیر تک وہ ساکت نگاہوں سے اپنے بیٹے کو دیکھتی رہی تھی۔

”میں بدکردار نہیں ہوں۔“ اس کے حلق سے کچھ لمحوں کے بعد پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔ زاویار نے تنفر سے سر جھٹک دیا۔

”بدکردار نہ ہوتی تو اپنی سگی اولاد کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاتیں، اپنے گھر میں آباد ہوتیں۔“

”میں نہیں گئی تھی اپنی سگی اولاد کو چھوڑ کر، وہ آئی تھی میرے گھر میں ڈاکہ ڈالنے جسے تم معتبر کہہ رہے ہو، جا کر پوچھو اس نے کیا کیا اس نے میرے ساتھ صمد حسن کے ساتھ مل کر، اپنے باپ سے پوچھو جا کر، میں تمہیں چھوڑ کر گئی تھی یا اس نے تمہیں مجھ سے چھینا تھا۔“ وہ جذباتی ہو گئی تھی۔ زاویار بے نیاز بنا بیٹھا رہا، چند لمحوں کے بعد اس کے لبوں نے جنبش کی تھی۔

”کیا آپ نے یہی سب بتانے کے لیے مجھے یہاں بلایا تھا؟“

”نہیں..... میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ ماضی میں کیا ہوا؟“

”سوری..... مجھے آپ کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ بیزار تھا۔ مریرہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

”ہوں گد“ مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی ضرور کامیاب لوٹے گی۔“
 ”شکر یہ مگر اس کامیابی کے پیچھے ستر فیصد ہاتھ صیام کی قابلیت کا ہے ماما، اس نے یوں بریفنگ دی کہ میں خود چیراں رہ گئی۔“

”جانتی ہوں، بہت قابل لڑکا ہے۔ اسی لیے تو شہر بانو بھابی نے شہزاد کے لیے پسند کیا ہے اسے۔“
 وہ اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔ درکنون کے اندر ایک بے نام سی اداسی اتر آئی۔
 ”آپ نے بتایا نہیں، آپ کیوں ڈسٹرب ہیں؟“ وہ بات بدل گئی۔ دوسری طرف موجود مریرہ نے بے ساختہ گہری سانس بھری۔

”میں کل زاویار سے ملی تھی دری، بہت ہرٹ کیا اس نے مجھے، اس کا کہنا ہے کہ اس کی ماں ایک بدکردار عورت تھی۔“

”اُف..... آپ نے منہ کیوں نہیں توڑا اس کا؟“
 ”کیسے توڑ سکتی تھی، وہ میرا بیٹا تھا ہی نہیں، وہ تو سارا منیر حسین اور صمد حسن کا بیٹا تھا۔“
 ”ماما آپ بھی ناں بس..... اگر وہ زندگی میں کبھی مجھے مل گیا ناں تو دیکھیے گا کیا حشر کرتی ہوں میں اس کا۔“

”نہیں دری، وہ تمہارا بھائی ہے، تم اس کے لیے زندگی میں کبھی برا سوچنا بھی مت۔“
 ”وہ بھائی ہے تو آپ میری ماں ہیں ماما، میری پوری کائنات ہی آپ، میں پوری دنیا میں کسی کو بھی اجازت نہیں دوں گی کہ آپ کو ہرٹ کرے خواہ میرا اپنا سا باپ ہی کیوں نہ ہو۔“

”میں جانتی ہوں مگر وہ حقیقت سے ناواقف ہے میری جان، وہ وہی جانتا ہے جو اسے تمہارے پاپا اور سارا منیر حسین نے بتایا ہوگا۔“
 ”اگر انہوں نے ایسا کیا ہے تو بہت غلط کیا ہے ماما، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے پاپا اتنا گر سکتے ہیں۔“

”ہوں..... سوچ تو میں بھی نہیں سکتی تھی مگر جانے دو، تم آرام کرو ابھی مجھے کچھ کام ہے۔ بعد میں کال کرتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے اپنا خیال رکھیے گا۔“
 ”تم بھی اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔“
 ”اللہ حافظ۔“ لائن کٹ چکی تھی۔ درکنون سوچوں کے تانے بانوں میں ابھی بہت دیر تک جاگتی رہی تھی۔

موسم بے حد خوشگوار ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی سے بھرے کالے بادل آسمان کی نیلاہٹ کو چھپائے پورے آسمان پر بکھر گئے تھے۔ عالمہ نے جلدی جلدی سبزی کاٹی اور صحن میں بکھری ہوئی چیزیں سیٹنا شروع کر دیں۔ کرنل صاحب گھر پر نہیں تھے۔ صحن میں بکھری ہوئی چیزوں کو سینٹے کے بعد اس نے جلدی جلدی

”میں کچھ نہیں جانتا، تم کل تک وہیں ٹھہرو، میں کل آ رہا ہوں۔“ دھونس سے کہتے ہوئے اس نے کال ڈس کنکٹ کر دی تھی۔

مریرہ نے سیل پھر سے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور وہیں قریبی بیٹنج پر بیٹھ گئی۔ آج بہت مدت کے بعد اس کے دل کے زخم ادھر سے تھے۔ تب ہی آنکھیں ہوں آنسو لٹا رہی تھیں جیسے مدت کے بعد کوئی دریا چڑھ کر اترتا ہو۔

اس رات اس نے پھر بہت شراب پی تھی۔ Tayyabas سے مریرہ حُسن کے اٹھے جانے کے بعد وہ سیدھا بار کلب گیا تھا اور پھر آدھی رات کے بعد وہاں سے گھر واپسی ہوئی تھی۔ ایک اسے مسلسل فون کر رہا تھا مگر اس نے ایک کی کال نہیں سنی۔ وہ سن ہی نہیں سکتا تھا۔ اس وقت بھلا وہ اپنے آپ میں تھا ہی کب؟ دل کے اندر تو جیسے جھکڑ چل رہے تھے اس نے جو سوچا تھا وہی کیا تھا۔ دل کی بھڑاس نکل چکی تھی۔ اپنی سگی ماں کو وہ دھول چٹا کر آیا تھا مگر..... اندر کہیں بہت سے زخموں کے منہ کھل گئے تھے۔ اپنے کمرے کی ہر چیز اٹھا اٹھا کر اس نے دیوار پر دے ماری تھی مگر پھر بھی قرار نہیں آیا تھا۔ بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگا کر وہ کتنی دیر تک بچوں کی طرح بلک بلک کر روتا رہا تھا۔ جس چہرے کو دیکھنے کی اسے حسرت تھی آج، اسی چہرے کو وہ زلا کر آیا تھا۔ چھوڑ آیا تھا توڑ آیا تھا اور جب توڑ آیا تھا تو اب رو رہا تھا۔ رات قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی اور وہ بیڈ کی پٹی سے ٹیک لگائے پلکیں موندے روتا رہا۔

درکنون صیام کے ساتھ کراچی واپس آ گئی تھی۔ ایک بات جو اس نے نوٹ کی تھی، صیام خاموش تھا۔ پورے سفر کے دوران وہ مسلسل خاموش رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کا حال پوچھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ رات ڈھل رہی تھی جب شدید تھکن کے باوجود اس نے مریرہ کو کال ملائی۔
 ”السلام علیکم۔“ کئی بار کوشش کے بعد اس کی کال پک ہوئی تھی اس پر مریرہ کے تھکے تھکے سے السلام علیکم نے قدرتشویش میں مبتلا کر دیا۔

”وعلیکم السلام کیسی ہیں آپ ماما؟“
 ”میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟“
 ”میں بھی ٹھیک ہوں مگر مجھے آپ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ کیا زکام ہوا ہے۔“
 ”ہاں۔“

”نہیں ماما، مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔“
 ”تم سے کچھ نہیں چھپا سکتی میں درکنون۔“
 ”تو ٹھیک سے پھر بتائیے کیا ہوا ہے کیا عمر انکل کے ساتھ کوئی فائیٹ ہوئی ہے۔“
 ”نہیں، پہلے تم بتاؤ میٹنگ کیسی رہی؟“
 ”بہت اچھی ہماری کپنی کو بہت بڑا کنٹریکٹ ملا ہے ماما۔“

شام کے کھانے کی تیار شروع کر دی۔ جب تک سدید تھا اسے کبھی گھر واپسی کے بعد کسی کام کی ٹینشن نہیں ہوئی تھی مگر اس کے جانے کے بعد آفس سے واپسی پر شام کے کھانے سمیت بیسیوں کام اس کے منتظر ملتے تھے۔ حقیقی معنوں میں پہلی بار اسے سدید کی بے تحاشہ کمی محسوس ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے اس کی قدر و قیمت کا پتا چلا تھا۔ وہ روز اس کی کال کا انتظار کرتی مگر ہر روز دن ڈھل جاتا اور رات آ جاتی۔ جانے وہ اسے بھول گیا تھا۔ یا پھر بہت زیادہ مصروف ہو گیا تھا۔ کچھ بھی تھا وہ ہر نماز میں اس کی خیریت اور سلامتی کی دعا مانگتا نہیں بھولتی تھی اس وقت بھی مغرب کی نماز کے بعد اس نے سدید کے لیے خلوص دل سے دعا مانگی۔ بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں وہ رنگ اس وقت بھی جگمگا رہی تھی جو وہ خود اپنے ہاتھوں سے پہنا کر گیا تھا۔

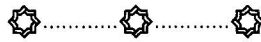
بارش تقریباً پندرہ منٹ موسلا دھار برسنے کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ عائکہ نے جلدی جلدی کھانا پکانا شروع کر دیا تب ہی بیرونی دروازے پر کرنل صاحب نے دستک دی تھی۔ وہ پوچھنے کی آنج دھیمی کر کے باہر دروازہ کھولنے آ گئی۔

”السلام علیکم۔“ قدرے ہشاش بشاش انداز میں اس نے سلام کیا تھا۔ مگر کرنل صاحب نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا۔ وہ بے حد ٹھہل ڈھلے دے رہے تھے۔ عائکہ کا دل زور سے دھڑک اٹھا۔

”کیا بات ہے بابا، آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“ وہ ان کے پیچھے آئی تھی۔ کرنل صاحب نے اس کے سوال کے جواب میں اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

”کیا ہوا ہے..... سدید تو ٹھیک ہے نا؟“ جانے کیوں بے ساختگی میں اس نے منہ سے نکلا تھا۔ جواب میں کرنل صاحب کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بولے تو انکا لہجہ بے حد ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔

”سدید اب اس دنیا میں نہیں رہا بیٹی۔ اسے ژوماری کی پہاڑیوں نے نگل لیا۔“ الفاظ نہیں کوئی آتش فشاں تھا جو پھٹا تھا۔ عائکہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔



(بقیہ ناول حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیں۔ Q-17end)